The "Nadeem January 1942. Regd No P 294

سکولوں اور اسکولوں کیلئے سنہ ۱۹۳۱ء سے منظور شدہ ماہنامہ

ندیم

قیمت سالانہ للعہ ششماہی ۱۲/
قیمت فی پرچہ ۵/

مرتبہ :- سید حسن امام وارثی

نمبر ۱	جنوری سنہ ۱۹۴۲ء	جلد ۱۹

فہرست

تصویر :- آنریبل ڈاکٹر سر سید سلطان احمد صاحب ... ممبر گورنمنٹ آف انڈیا

شمیم عشرت

یعنی

مکمل دیوان جناب سید احمد علی عشرت مغفور رئیس شہر گیا

وسط مارچ سن رواں تک مشتاقین کو مل سکیگا

چونکہ اس کی خرید و فروخت مد نظر نہیں ہے۔ لہذا کتب خانوں اور شعرائے کرام کو نذر و ہدیہ ہوگا۔ محفوظ پہونچنے کی خاطر اخراجات ڈاک و رجسٹری کے لئے موازی آٹھ آنہ بھیج کر جلدیں محفوظ کرائی جا سکتی ہیں۔
غیر مشتاق حضرات زحمت نہ فرمائیں۔

مینیجر
دفتر ندیم۔ گیا
(صوبہ بہار)

نظرات

آج فروری کی ۱۰ر ہے۔ امین الدولہ پارک لکھنؤ کے سنٹرل ہوٹل میں رات کے دس بجے نظرات کے لئے یہ سطریں لکھنے بیٹھا ہوں، درانحالیکہ کوئی سامان ایسا موجود نہیں جو ممد و معاون ہوسکے۔ ۸ر فروری کو مولانا سید ریاست علی صاحب ندوی سے ندیم کے متعلق باتیں اس شرط پر طے ہوئیں کہ طباعت میں دقتیں اگر نہیں ہوئیں تو ندیم کی خدمت کرسکتا ہوں۔ ۹ر کو قاضی سید امیر الحسن صاحب پھلواروی مالک برقی مشین پریس گیا تشریف لائے تو طباعت کی منزل سر ہوئی۔ دسمبر کا ندیم چھپنے کو دیا گیا۔ کوشش تھی کہ ڈکلریشن داخل ہوتے تو پوسٹ ماسٹر جنرل بہار کو درخواست دیکر رجسٹرڈ نمبر حاصل کیا جائے۔ چنانچہ ابتدائی مراحل طے کرکے ۱۲ر فروری کو ڈکلریشن کے لئے نئے پبلشر کا پورا دن کچہری میں خراب ہوجانے کے بعد معلوم ہوا کہ حاکم ضلع تشریف نہیں لائے اور ان کے سوا کوئی ماتحت افسر مجاز نہ تھا۔ مجھے لکھنؤ کا سفر درپیش تھا۔ لہذا اب واپسی تک ان سب مراحل کو طے کیا جانا ملتوی کرنا پڑا۔ ۱۴ر کو جنوری کے ندیم کے لئے بھی مضامین نظم و نثر مطبع کے حوالہ کردئے گئے۔ انشاء اللہ تعالیٰ فروری، مارچ کی اشاعت "اردو مجلس دہلی" نمبر کے نام سے ہوگی جس میں دہلی کی اس قابل قدر ادبی مجلس کے اراکین کے چیدہ چیدہ مضامین شریک اشاعت ہونگے۔ اس طرح اس نمبر میں جناب خواجہ حسن نظامی، خواجہ عبد المجید دہلوی، خواجہ محمد شفیع دہلوی وغیرہ جیسے مشاہیر کے رشحات قلم سے ناظرین کی ضیافت طبع کا سامان کیا گیا ہے۔ حتی الوسع "اردو مجلس دہلی نمبر" بھی مارچ ہی میں شائع کردیا جائیگا۔ تاکہ اپریل سے رسالہ کی اشاعت وقت پر آجائے اور ادھر دو تین مہینوں کے غیر متوقع التواء کی تلافی ہوجائے۔ التواء جن وجوہ سے بھی پیش آیا ہو اس پر افسوس کا اظہار ناگزیر ہے۔ بحمد للہ اب ندیم کے وسائل مستحکم ہیں۔ مہینوں کے لئے کاغذ فراہم کرلیا گیا ہے، اگر انسانی اختیار سے باہر موانع پیش نہ آئے، تو امید پوری ہے کہ آئندہ ندیم وقت پر شائع ہوا کریگا۔ واللہ المستعان وعلیہ التکلان۔

مولانا سید ریاست علی صاحب ندوی نے ندیم کی جیسی خدمت کی ہے وہ ناظرین سے مخفی نہیں ہے، اس کا اعتراف نہ کرنا ظلم ہے۔ دار المصنفین کی دعوت پر لبیک کہہ کر مولانا نے سعادت حاصل کی جس کے لئے وہ مستحق تحسین ضرور ہیں مگر افسوس اس بات کا ہے کہ اب ہمارے صوبہ کے لئے ان کی خدمات سے فائدہ اٹھانے کا موقع باقی نہیں رہا۔ انہوں نے اپنی روانگی سے پہلے ندیم کے لئے بعض انتظامات کئے تھے۔ مگر ان کے چلے جانے کے بعد بعض ایسی صورتیں پیش آئیں کہ ڈر تھا کہ مولانا کی علیحدگی سے ندیم کی زندگی خطرے میں نہ پڑ جائے۔ بایں وجوہ وہ فروری کے پہلے ہفتہ میں گیا واپس آئے اور ندیم کے بار کو انہوں نے موجودہ ادارہ کے سپرد کیا۔ موجودہ ادارہ اتنی بڑی ذمہ داری لینے کے لئے ہرگز تیار نہ ہوتا اگر ناظرین ندیم کی ہمت افزائی پر کامل اعتماد نہ ہوتا۔ امید ہے کہ

کہ جملہ حالات کو مدنظر رکھتے ہوئے ناظرین بھی ادارہ کے ساتھ ہمدردی علیٰ حالہٖ قائم رکھیں گے۔ اور مستقبل کے متعلق اپنا اچھی طرح اطمینان کر لینے کے بعد ایثار، توجہ و کرم دریغ نہ ہوگا۔ ع بر کریماں کارہا دشوار نیست

تاہم ع ہر کہ آمد عمارتِ نو ساخت! کے مصداق ندیم میں بھی آئندہ بعض تبدیلیوں کا پیش آنا ممکن ہے جس میں سے کچھ تو اسی اشاعت میں نظر آجائیں گی اگر امعان نظر سے کام لیا جائیگا۔ لیکن بہت کچھ ابھی اٹھا رکھی جاتی ہیں، اور ناظرین ندیم کو دعوت دی جاتی ہے کہ اس کے متعلق ادارہ کو اپنے زریں خیالات سے آگاہ فرمائیں کہ ندیم میں وہ کیا کیا تبدیلیاں چاہتے ہیں۔ اپریل کی اشاعت تک تو ناظرین کی آراء پر عمل درآمد ممکن نہ ہو سکے گا۔ مگر اس وقت تک کی موصولہ آراء پر غور و خوض کے بعد مئی میں ان تبدیلیوں کا اعلان کر دیا جائیگا جن کا مطالبہ ناظرین کی بڑی تعداد کی طرف سے ہوگا اور کوشش بلیغ کی جائیگی کہ جہاں تک ممکن ہو سکے ندیم ناظرین کی توقعات کو پورا کرتا رہے۔ وما توفیقی الا باللہ!

افسوس ہے کہ اردو کے لائق ادیبوں کا اس وقت اٹھ جانا ہمارے لئے موجب حرمان ہو رہا ہے۔ فانی مرحوم کی مفارقت کا داغ تازہ ہی تھا کہ ع یک داغ نیک ناشدہ داغِ دگر نہاد۔ حیدرآباد ہی میں حکیم آزاد انصاری کو بھی اٹل پیام پہنچ ہی گیا۔ انا للہ وانا الیہ راجعون۔ اگر اس دور کے جواں سال شعراء اور نثر نگار حضرات نے ہم کو مطمئن نہ کر دیا ہوتا تو اساتذہ کی اس یکے بعد دیگرے موت سے ہمارے حوصلے ہی پست ہو جاتے۔ خدا مرحومین کو جوار رحمت میں جگہ دے اور جوانوں کو حیات طویل ارزانی فرمائے کہ ادب کا گلشن ہمیشہ پُربہار رہے!

ادارے کو اس کا احساس ہے کہ ناظرین ندیم میں مُردہ جذبات اور محض علمی مذاق رکھنے والے ہی نہیں ہیں بلکہ ع ساقیا مرحج ازمن عالم جوانیہا ست، پکارنے والے سب سے بڑی تعداد میں ہیں۔ علاوہ بریں ادب لطیف (لائٹ لٹریچر) کا مطالبہ اس لئے بالکل جائز ہے کہ بالغ نظر حضرات بھی اپنے اپنے فرائض منصبی کی ادائی کے بعد کسل دماغ کو دفع کرنے کے متمنی ہوتے ہیں جس کے لئے "افسانہ" سب سے زیادہ موزوں ہوا کرتا ہے۔ زیرنظر اشاعت میں اس کی کمی ہے۔ لیکن یہ نادانستہ نہیں ہے، اس کی تلافی کی نیت کرنے کے بعد یہ جسارت کی گئی ہے۔ نئے ادارہ کو وقت ہی کہاں ملا کہ کوئی کام بھی پورے تعمق نظر کے ساتھ کر سکے؟ جنوری کے پرچہ کو جلد شائع کر دینے ہی کی ضرورت تھی۔ یہی وجہ ہے کہ زیرنظر شمارہ میں ادارہ ہی کے مضامین زیادہ ہیں، اس سے یہ نہ سمجھ لیا جائے کہ ہمیشہ ایسا ہی ہوگا۔

"ستارۂ بدرخشید و ماہ مجلس شد"

بملکے کہ سلطاں وزیرے شود
منافع بخلقش کثیرے شود (المکاتبہ)

صوبۂ بہار کا سیر حاصل ضلع گیا ہے، جہاں کا لائق ترین فرزند ڈاکٹر سر سید سلطان احمد بیرسٹرایٹ لا سرکاری عہدوں میں سب سے بڑے اعزاز کے منصب پر فائز ہوا ع بریں مژدہ گر جاں فشانم رواست۔

لیگ اور کانگریس کی حمایتیں ہزار بار احترام کی مستحق سہی، مگر اس سے کم قابل لحاظ وہ خطرۂ قریبہ نہیں ہے جو دنیا کو عموماً اور ہندوستان کو خصوصاً درپیش ہے۔ ایسے موقع پر جب ملک و ملت کا تقاضا مجبور کرتا ہے کہ ہر لحاظ و خیال کو پس پشت ڈال کر مدافعت اور نظم مملکت کی دعوت عمل کو بطیب خاطر لبیک کہا جائے، ممکن ہے کہ اس خیال کے متعلق بحث کی گنجائش روا رکھی جائے اور اثبات و نفی کے پلے کبھی ادھر کبھی اُدھر جدھر کا ئے جاسکتے ہوں۔ بایں ہمہ اہل وطن کو مسرت و ابتہاج کا جو فطری حق حاصل ہے، اس سے بھی انکار نہیں کیا جا سکتا ؎ سر انصاف تو گردیم کہ بایں ہمہ حسن از دل ما طمع صبر و سکون داشتہ (عرفی)

گیا ضلع کے چار سب ڈویژنوں میں سے ایک سب ڈویژن جہان آباد بھی ہے جس کے مضافات میں سادات کرام کی ایک بستی پالی کے نام سے مشہور ہے۔ خان بہادر سید خیرات احمد مرحوم مغفور اسی بستی کے رہنے والے اور گیا کے نامی گرامی وکیلوں میں تھے۔ خان بہادر ممدوح کے دوسرے صاحبزادے سر سلطان ہیں، جن کے بڑے بھائی خان بہادر سید ہادی حسن بیرسٹرایٹ لا نے مرنجان مرنج زندگی بسر کرکے ۱۹۴۲ء میں انتقال فرمایا۔ باوجودیکہ برسہا برس آپ پبلک پروسیکیوٹر کی حیثیت سے کام کرتے رہے، مگر حکام و پبلک دونوں کو اپنے رویہ سے خوش رکھا۔ اس کو غیر معمولی کامیابی کہنا بیجا نہ ہوگا، کیونکہ سرکاری وکیل کے فرائض بسا اوقات پبلک رجحان کے خلاف کام کرنے پر مجبور کر دیتے ہیں، مگر یہ ہادی حسن صاحب کی ذاتی خوبی پر دال ہے کہ ایسے مواقع پر بھی پبلک کو آپ سے شکایت کا موقع نہ ہوا۔ سر سلطان کے والد ماجد حضرت مجیب علیہ الرحمۃ نے سال گذشتہ چھیانوے سال کی عمر میں پیر بانغ جہاں کی دعوت کو لبیک کہا۔ سر سلطان نے جس طرح خوشنودی والدین کو اپنا نصب العین بنائے رکھا وہ فرزندان وطن کے لئے قابل مطالعہ ہے۔ سر سلطان کی جملہ صلاحیتیں ایک طرف اور اس کے بالمقابل ان کی کامیاب ترین سعی حصول سعادت خدمت والدین کو رکھیے تو یہ فیصلہ مشکل ہو جاتا ہے کہ شفیق باپ کی مقبول دعاؤں کا کتنا بڑا حصہ سر سلطان کی کامرانی اور خوش نصیبی کے لئے موجب خیر ثابت ہوتا ہے۔ اس مادے میں سر سلطان کے عمل خیر پر رشک روا نہ ہو تو بھی غبطہ ناگزیر ہے ع ایں سعادت بزور بازو نیست!

سر سلطان ۱۸۸۰ء میں پیدا ہوئے۔ ۱۸۹۸ء میں انٹرنس پاس کرکے کلکتہ کے مشہور پریسیڈنسی کالج میں داخل ہوئے۔ بعض ناگزیر اسباب کی بنا پر سند فراغ لئے بغیر ۱۹۰۲ء میں انگلستان روانہ کر دئے گئے جہاں (Middle Temple) "گریز ان" نام کے شہرۂ آفاق

ادارہ میں شامل ہو کر لارڈ برکنہیڈ اور لارڈ ہیکن جیسے مشاہیر کے مکتب میں درس لیتے گئے۔ ۱۹۰۵ء میں کامیاب بیرسٹری کی حیثیت سے کلکتہ ہائی کورٹ میں پریکٹس شروع کی۔ اس وقت کلکتہ ہندوستان کا دارالسلطنت تھا منتخب روزگار وہاں مجتمع رہتے تھے۔ ایک سے ایک اعلیٰ قابلیت کے جوہر اپنی درخشانی اور تابانی سے نگاہ دل کو خیرہ کر رہے تھے۔ اس ماحول میں ایک کمسن اور نوآموز کا اپنے لئے راہ نکال لینے کی ہمت کر لینی بظاہر ایک جسارت معلوم ہوتی تھی جس کو امیدیں مشعل دکھانے کے بجائے خوفزدہ کر دینے پر اصرار کرتی نظر آتی تھیں، مگر مواقع کا فقدان، خطرات کی کثرت کبھی جوہر قابل کے لئے ہمت شکن ثابت نہیں ہوئی ہے۔ سلطان احمد صاحب نے "ہمت مردان مدد خدا" کے کبھی غلط ثابت نہ ہونے والے اصول پر کلکتہ کو دارالعمل قرار دینے میں مشیت کے اشاروں کو سمجھا اور دل افگندیم بسم اللہ مجریہا و مرسٰہا" کہہ کر دیکھ لیا کہ تائید غیبی اپنا کام کس کس طرح کرتی ہے۔ ہمارے جواں سال بیرسٹر نے قدم ہی جمانا شروع کیا تھا کہ ۱۹۰۶ء میں جسٹس شرف الدین مرحوم نے جج ہائی کورٹ کے عہدہ پر فائز ہو کر کلکتہ میں سکونت اختیار کی اس کے دو ہی ایک سال کے بعد سر علی امام مرحوم اسٹنڈنگ کاؤنسل (Standing Counsel) کی حیثیت سے پہونچے تو ان کی جوہر شناس نگاہوں نے سلطان احمد کی صلاحیتوں کا جائزہ لیا۔ توقعات کے لئے زمین مناسب پائی۔ جوہریوں نے دیکھا کہ سنگریزہ نہیں یہ تو لعل ہے۔ تھوڑی سی جلا دی گئی کہ شب چراغ بن گیا، آج جس کی جوت سے وطن روشن ہے۔ ؎

بر اوج برتری روشن چوں ماہی
(لکاتبہ)
درخشندہ چو نجم صبحگاہی

مواقع کا جہاں فقدان تھا وہاں اب کثرت ہی کثرت تھی مگر مواقع سے فائدہ اور وہ بھی خاطر خواہ فائدہ اٹھانا بجائے خود بہت بڑی صلاحیت کار کا طالب ہوتا ہے جس کا بدیہی اور وافر ثبوت سلطان احمد صاحب نے پیش کیا اور جس کو ارباب حل و عقد نے مان بھی لیا۔ چنانچہ صرف انتیس سال کی عمر تھی کہ ۱۹۱۱ء میں آپ اسسٹنٹ لیگل ریممبرنسر (Assistant Legal Remembranser) مقرر ہوئے اور جب ۱۹۱۲ء میں بہار کا صوبہ علیحدہ قائم ہوا تو شمول اڑیسہ اس کے مقدمات ہائی کورٹ کا چارج آپ ہی سے متعلق کر دیا گیا تھا۔ سب سے پہلی شہرت آپ کی جو ہوئی وہ ریلوے میں مسلمانوں کی حق تلفی کے خلاف شدید اور کامیاب سعی مشکور کے ذریعہ تھی۔ اس زمانہ میں سلطان صاحب مرحوم امام ہو رہے تھے خلاصہ یہ کہ گیارہ سالوں کے قیام کلکتہ میں آپ نے اپنی ذاتی صلاحیتوں اور لیاقت مندیوں کا علم بلند کر دیا جس کے اڑتے ہوئے پھریرے ہندوستان کے ہر گوشہ سے نظر آنے لگے تھے اور مبصروں کی توقعات جائز کو تسکین بخش جنبش نسیم اہتزاز کا مژدہ دے رہی تھیں ؎

خوش آں وقت و خوشا آں ساعت کہ آں زلفِ گرہ بندش
(حافظ)
بہ زد دیدے چناں دلہا کہ خصم اقرار می آورد

شہرۂ نیکنامی کے ساتھ بہار کا یہ عزیز گرامی جب ۱۹۱۶ء میں مراجعت فرمائے وطن ہوا تو "یوسف گم گشتہ باز آید بکنعاں غم مخور" کے جذبات سے اہل وطن کے دل بھر آئے۔ خوشی کے آنسوؤں سے آستین و دامن تر ہوئے۔ جب ہمہ شما کا یہ حال تھا تو "یعقوب ناز

رتیبوں کا اندازہ کون کرسکتا ہے؟ اب وطن بھی وہ وطن نہ تھا جس کو اپنے وسعت عمل کے لئے تنگ پاکر سلطان احمد نے غریب الوطن
نا قبول کیا تھا۔ ان کے پیشرو گرامی سر علی امام نے حیثیت تاج پوشی کے مراعات کے سلسلے میں بہار کے لئے علٰحدہ صوبہ کا اعزاز حاصل
لیا تھا۔ ہائی کورٹ کھل چکا تھا۔ لہذا اب سلطان احمد صاحب کو وطن سے دور رہنا شاق ہونا ہی تھا' اور ہوا لہذا آچراتہ دریے
زم دیار خود باشم" کہتے ہوئے پٹنہ میں آبراجے۔ آج کل انڈین نیشن جس کوٹھی سے شائع ہوتا ہے' اسی میں برسوں قیام رہا' تا آنکہ
سلطان پیلیس" کی تعمیر و تکمیل ہوئی۔ تجربہ دوسرا قصہ ہے۔ سنہ ۱۹۱۲ء سے بہار کے "اسسٹنٹ گورنمنٹ ایڈوکیٹ" کے فرائض کلکتہ
ئی کورٹ میں انجام دے ہی رہے تھے۔ اسی عہدہ پر اپنے صوبہ کے ہائی کورٹ میں کام کرنے لگے۔ مگر اس سے یہ نہ سمجھا جائے کہ صرف
رنمنٹ کی سرپرستی ہی سے کاربرآری جاری تھی۔ کلکتہ اور پٹنہ دونوں جگہوں میں فوجداری اور دیوانی دونوں شعبوں میں آپکی
لمیت کی پبلک میں بڑی قدر تھی' پبلک پریکٹس ابتدا میں کافی' درمیان میں مکتفی اور اس زمانہ میں قابل رشک حد تک
سیع رہی۔ چنانچہ یہ کھلا ہوا راز ہے کہ گورنمنٹ آف انڈیا کے عظیم المرتبت عہدہ پر جانے کے لئے سر سلطان بخوشی راضی نہیں
ھے۔ چونکہ اعزاز چاہے جتنا بڑھتا ہو مگر اقتصادی نقصان قابل لحاظ ہو رہا ہے۔ سے

درشاہراہ دولت سرمدیہ تخت بخت
با جام مے بکام دل دوستاں شدم (حافظ)

پٹنہ کے نامی وگرامی کونسلی مسٹر پی۔ سی۔ مانک اس زمانہ میں گورنمنٹ ایڈوکیٹ بہار تھے' انہوں نے اپنے اسسٹنٹ
سلطان احمد کی لیاقتوں اور صلاحیتوں کے متعلق اطمینان کر لینے کے بعد اواخر سنہ ۱۹۱۶ء ہی میں استعفا دیدیا اور ان کی توقع
ے عین مطابق سنہ ۱۹۱۷ء میں سلطان صاحب کو گورنمنٹ ایڈوکیٹ کی بڑی ذمہ داری حوالہ ہوئی جس کے دو ہی برس بعد سنہ ۱۹۱۹ء
ں پٹنہ ہائی کورٹ میں عارضی جج کی عزت سے سرفراز ہوئے اور ایک سال تک اسی عہدۂ جلیلہ کے فرائض انجام دیتے رہے' اگر
چاہتے تو مستقل کر دئے جا سکتے تھے۔ مگر اقتصادی نقصان ناقابل برداشت تھا۔ اس لئے اعزاز کے لئے اس عہدہ کو قبول تو
لیا مگر اول فرصت میں اس سے سبکدوشی حاصل کرکے "دگر بگوشم و مشغول کار خود باشم" کے ذوق کی پزیرائی کی بے موقع نہ ہوگا
ر آمد سخن یہاں پر ایک بات اور واضح کر دیجائے۔ بعض یاران طریقت اس وقت اس غلط فہمی کا شکار ہو رہے تھے کہ سرکار
ی طرف سے عدالتوں میں کام کرنے کی مشق بڑی ہوتی ہے جس سے فوجداری مقدمات کے صحیح فیصلے کی صلاحیت پر اثر پڑے
بغیر نہیں رہتا۔ لہذا سلطان صاحب جج کی حیثیت سے کامیاب شاید ہی ہوں۔ ان بزرگواروں نے سلطان صاحب کے جوہر
صلی کو نظر انداز کر دیا تھا۔ مگر جب سے جج کے فیصلے منظر عام پر آئے تو صرف یہی نہیں کہ قانونی حیثیت ان کی کافی بلند ثابت ہوئی
بلکہ اصابت اور آزادی رائے کے شواہد نے روشن کر دیا کہ غلط رائے رکھنے والے حضرات کس قدر تاریکی میں تھے۔ جیسے جیسے زمانہ
ذرتا گیا۔ سر سلطان کی قابلیت اور صلاحیت کا سکہ بیٹھتا ہی گیا' تا آنکہ اس وقت عزیشیہ میں سلطان صاحب کا نام چوٹی
کے مشاہیر میں احترام کے ساتھ لیا جاتا ہے۔ سے

گویند ذکر خیرش در خیلِ عشق بازاں
ہر جا کہ نام حافظؔ در انجمن برآید

قانونی قابلیت عام ازیں کہ کیسی ہی بڑھی چڑھی ثابت ہو اور اس سلسلہ میں سلطان صاحب کی جو کچھ ثنا و صفت کی جائے اس میں سے حصہ بٹوانے کو ان کے اساتذہ لندن کا ادارۂ تعلیم اور خود ممدوح الشان کی کدوکاوش پیش پیش ہیں۔ لہٰذا اب میں سلطان صاحب کی صلاحیت کے وہ پہلو سامنے لاتا ہوں جس کے لئے جو کچھ ثنا باشی دکھائے وہ "بلا شرکت الغیرے و بے مداخلت احدے" صرف ان کی ذات گرامی کے لئے "بحق خاص محفوظ" ہوگی۔

۱۹۲۳ء میں پٹنہ یونیورسٹی کے لئے وائس چانسلر سلطان صاحب منتخب ہوئے یکے بعد دیگرے اس سات سال تک اس عہدہ کے فرائض جس خوبی اور خوش اسلوبی کے ساتھ انہوں نے انجام دیا۔ اس کا کوئی ثبوت دیکھنا چاہے تو پٹنہ جا کر وہیلر سینٹ ہال میں سر سلطان احمد کی قد آدم روغنی تصویر کی زیارت کرے جو ازراہ قدر دانی و تشکر یونیورسٹی کے چانسلر نواب گورنر بہادر صوبۂ بہار نے خود اپنی طرف سے نذر کی ہے۔ ڈاکٹر سچتانند سنہا یا لقابہم موجودہ وائس چانسلر پٹنہ یونیورسٹی نے سرپلائٹ مورخہ ۲۲ر جولائی میں مزید شہادت ان الفاظ میں پیش کی ہے :۔

"پہلے نان آفیشیل (غیر سرکاری) وائس چانسلر کی حیثیت سے واقعی اور درحقیقت" انہوں نے جو بنیاد رکھی تھی اسی پر ان کے بعد ہونے والے وائس چانسلروں نے مستحکم عمارت کھڑی کی ہے۔"

۱۹۳۳ء میں صوبہ کی گورنمنٹ میں شامل ہوئے یعنی بہار و اڑیسہ کی ایگزیکیٹو کانسل کے ممبر نامزد ہوئے اور اپنی موجودگی محسوس کرا چھوڑا۔ چار ہی مہینہ اس عہدۂ جلیلہ پر رہے مگر منوا دیا کہ ع دیگراں ہم بکنند آنچہ مسیحا می کرد۔

۱۹۳۷ء میں گورنمنٹ آف انڈیا کی شمولیت کے لئے تجارت اور ریلوے ممبر کی حیثیت سے مدعو ہوئے یہاں بھی ع بہار ہو کے رہے ہم تو جس چمن میں رہے۔ کی شان قائم رہی۔ آیندہ ماہ و سال واضح کرنے والے ثابت ہونگے کہ گورنمنٹ آف انڈیا میں سر سلطان کی صلاحیتیں کس کس طرح اور کیا کیا خراج تحسین و آفریں لیکر رہتی ہیں!

راؤنڈ ٹیبل کانفرنس کی اول و دوم نشستیں جو ۱۹۳۱ء و ۱۹۳۲ء میں بمقام لندن ہوئی تھیں اس میں بھی سر سلطان کی شرکت ناگزیر سمجھی گئی تھی۔ چنانچہ "فیڈرل اسٹرکچرل کمیٹی" (Federal Structural committee) میں آپ کے مفید مشورے قدر کی نگاہ سے دیکھے گئے اور بڑی حد تک اس کمیٹی کی کامیابی آپ کی پیش پیش نظر آنے والی مساعی کی رہین منت ہے۔

خلاصہ یہ ہے کہ ع "دامانِ نگہہ تنگ و گل حسنِ تو بسیار" کا مضمون ہے۔ واقعہ یہ ہے کہ صلاحیت عجیب چیز ہے۔ خدا جس کو چاہے بخشدے ارجمندی اور فرخندہ فالی جس بلندی پر چاہے جھنڈے نصب کر سکتی ہے۔ ؎

ہر دم از روئے تو نقشے زندم راہِ خیال
با کہ گویم کہ دریں پردہ چہا می بینم (حافظ)

نجی طور پر سلطان احمد صاحب خوش باش اور خوش اوقات، نیک خو، مرنجاں مرنج قسم کے آدمی ہیں، موقع ملے تو مشرقیت کے دل دادہ، اور ضرورت ہو تو مغربیت میں کسی سے پیش پا افتادہ نہیں۔ اگلے شرفا کی سچی یادگار، اپنے دائرے کے اندر ملنسار، علما فضلا والیان ریاست، رئیسان گرامی قدر، ماہرین فنون لطیفہ سب سے ربط و ضبط، مگر نہ تو کسی پیشہ ور سے متنفر نہ کسی فن لطیف کا خبط۔ معقول و متین و سنجیدہ و فہمیدہ، اپنے بزرگوں کا بدل احترام کرنے کے عادی اور اعزا و احباب سے ملنے ملانے میں اخلاص و آزادی، سب سے جھک کے ملنا ان کا شعار ہے، مگر متمردوں اور خود بینوں سے مراسم بڑھانے میں عار ہے۔ ان کے حق میں دعا کرنے والوں میں بہت لوگوں کو جانتا ہوں، مگر کوئی اگر ان کو بددعا دیتا ہو تو اس کی مجھے واقفیت نہیں۔ یہ ہیں ڈاکٹر سر سید سلطان احمد صاحب نائیٹ بار ایٹ لا الحال ممبر گورنمنٹ آف انڈیا متعہد صیغہ قانون! ؎

ناگہاں چوں تو بدیں حسن خداداد آئی
ہمہ گویند کہ شاہ آمد و سلطان آمد　　(غالب)

ہر چند سلطان احمد صاحب اس سے بے نیاز سہی مگر ان کے اہل وطن اور نیاز مند اس موقع پر زبان دل سے کہے بغیر نہیں رہ سکتے کہ ؎　دیدۂ سعدی و دل ہمراہ تست　　تا نہ پنداری کہ تنہا می روی

مضمون تشنہ ہے، بہت کچھ لکھنے کے قابل باتیں رہ گئی ہیں، کچھ تو راقم آثم کی خستہ حالی اور کمی فرصت جوابدہ ہے اور کچھ رسالہ کی محدود گنجائش قلم کو روک رہی ہے۔ البتہ اطمینان ہے تو اس کا کہ ع سلطان نخواہد خراج از خراب ؎

در جہاں تا جا بود خالی مبادا جائے تو　　در دلت چندانکہ گنجد باد خالی جائے من　　(غالب)

جی چاہتا ہے کہ بہار کی عزت افزائی کی یادگار چند اشعار موزوں کے ذریعہ صحیفہ روزگار پر ثبت رہے۔ مندرجہ ذیل قطعہ تاریخ اسی جذبہ سے متاثر ہو کر ضبط تحریر میں آیا ہے :-

قطعہ تاریخ

کون ہے ماہر[1] قانون و وکالت کہیے　　کس نے کی سات برس علم کی خدمت کہیے
ڈاکٹر سید و سر سلطان احمد　　مخزن علم جنہیں معدن حکمت کہیے
ان کے اوصاف حمیدہ رہیں لوح دل پر　　ظرف محدود[2] سخن میں کہاں وسعت کہیے
للہ الحمد کہ فرزند گرامی بہار　　ہو گیا زینت کرسی وزارت کہیے
عدل و انصاف کی ضامن ہے لیاقت انکی　　کیسے ہاتھوں میں ہے قانون حکومت کہیے

خوب تاریخ حسن لکھی ہے ماشاء اللہ
نذر سلطان یہ قلمدان وزارت کہیے
۱۹۴۱ء

(ادارہ)

---

[1] مراد ایڈووکیسی　[2] اشارہ سہ ماہی وائس چانسلر شپ پٹنہ یونیورسٹی۔

رائٹ آنریبل سر اکبر حیدری

ابتدائی حالات

داستان پاستان کا مطالعہ بتلائیگا کہ کھمبایت بھی کسی وقت بمبئی ہی کی طرح ایک مشہور و معروف مقام تھا۔ نذر علی صاحب کی تجارت کی منڈیاں ان دونوں مقاموں میں تھیں۔ سوسائیٹی میں ان کا اعزاز اسی سے ظاہر ہوتا ہے کہ سابق بمبئی الاولون ہجاں ہائی کورٹ میں سے سربرآوردہ ترین ہبسٹس بدرالدین طیب جی کی خواہرزادی سے نذر علی صاحب کی شادی ہوئی۔ جن کے بطن مبارک سے ۱۸۶۹ء میں سر اکبر حیدری پیدا ہوئے تھے۔ پورا نام آپ کا "محمد اکبر نذر علی حیدری" تھا۔ والد بزرگوار شغل تجارت کی وجہ سے زیادہ تر سفر پیہم کرنے پر مجبور تھے۔ اس لئے تربیت گہوارۂ مادری سے نکلنے کے بعد بھی اسی خاتون معظمہ سے متعلق رہی۔ یہ بابرگ و بار شادر شجر علم و عمل جو آپ دیکھ رہے تھے وہ بننے والی عورت کے سوگھڑ ہاتھوں پروان چڑھا تھا!

تعلیم و ملازمت ناگپور و لاہور و کلکتہ

اکبر حیدری کی تربیت کتنی کامیاب ہوئی، اس کا اندازہ اسی سے کیا جاسکتا ہے کہ محض سترہ سال کی عمر میں سنٹ زیویر کالج (St. Xaviers College) بمبئی سے ۱۸۸۶ء تک بی۔ اے آنرز کے علاوہ ایل۔ ایل۔ بی کی ڈگری بھی حاصل کرکے رکھدی تھی۔ اس میں شک نہیں کہ اس حیرت انگیز ترقی میں سب سے بڑا حصہ خود سر اکبر کی جواں سالی ذکاوت و ذہانت کا تھا۔ مگر سچ پوچھیے تو اس ذکاوت و ذہانت کو سیدھے رستوں پر لگانے والا اور برسرکار لانے والا اسی شفقت مآب مادر مہربان کا ہاتھ نظر آتا ہے جس کی انگلیاں پکڑ کر عالم معصومیت میں اس ہونہار نے قدم نکالے تھے! وکالت پاس تو کرلی گئی مگر وکیل کی حیثیت سے کام کرکے قانونی قابلیت کے جوہر دکھانے کی نوبت بھی نہیں آئی تھی کہ ۱۸۸۸ء ناگپور میں صیغہ حساب (آڈٹ ڈپارٹمنٹ) میں ملازمت حاصل ہوگئی جہاں انجمن اسلام کے تحت مدرسہ قائم کرکے خود اپنی یادگار قائم کردی جس کے لائف پریسیڈنٹ یعنی مدت العمر کے لئے صدر آپ ہی تھے۔ ۱۸۸۹ء میں آپ کا تبادلہ تھوڑے دنوں کے لئے لاہور ہوگیا۔ ۱۸۹۰ء میں بہ سلسلہ ملازمت آپ کلکتہ بھی کچھ دنوں رہے تھے۔

اسسٹنٹ اکاونٹنٹ جنرل، شادی، قیام الہ آباد و بمبئی مدراس۔

کلکتہ سے آپ کا تبادلہ ترقی کے ساتھ الہ آباد کردیا گیا۔ جہاں آپ نے اسسٹنٹ اکاونٹنٹ جنرل کے عہدہ کا چارج لیا اور تقریباً چار سال وہاں مقیم رہے عین قیام الہ آباد ۱۸۹۳ء میں آپ کی شادی خانہ آبادی موجودہ لیڈی اکبر حیدری سے ہوئی جو اسی خاندان سے ہیں جس خاندان سے سر اکبر حیدری کی مادر مشفقہ تھیں۔ بلکہ یوں کہنا درست ہوگا کہ سر اکبر کی والدۂ محترمہ اور لیڈی صاحبہ سگی ممیری پھوپھیری بہنیں ہیں۔ وہ اس طرح سے کہ لیڈی صاحبہ جسٹس بدرالدین طیب جی مرحوم کی اپنی بھتیجی ہیں۔ بلکہ

صاحب مرحوم کے برادر عزیز نجم الدین طیب جی نے اپنی عمر کی چودہ برسیں عرب کی بادیہ گردی میں گذاری تھیں اور ایک معزز شیخ بادیہ کی دختر نیک اختر کو شریک زندگی بنایا تھا جنکی یادگار لیڈی اکبر حیدری ہیں۔ لیڈی صاحبہ کی صلاحیت گوناگوں کے بکثرت شواہد ہیں۔ جن میں سب سے زیادہ وقیع خود اُن کے سرتاج کی کامیاب زندگی اور اعلیٰ شخصیت تھی۔ جو بہت بڑی حد تک لیڈی صاحبہ کی سلیقہ شعاری ہمدردی اور محبت کی رہین منت تھی۔ اس کے بعد صاحبزادہ بلند اقبال مسٹر حیدری کی تربیت و تعلیم اور اعلیٰ صلاحیتیں گواہی دے رہی ہیں اور آیندہ مزید ثبوت پیش کرنے کی توقع دلاتی ہیں۔ انشاء اللہ تعالیٰ! لیڈی صاحبہ کے پہلو میں ہمدردی انسانی کے جذبات سے بھرا دل تھا چنانچہ حین قیام حیدرآباد موسیٰ ندی کی طغیانی کے موقع پر اس معزز خاتون نے لوگوں کی مصیبت چپ بیٹھ کر دیکھی نہ گئی اور بنفس نفیس مصائب کے کم کرنے میں معتدبہ حصہ لیکر واضح کردیا کہ عرب ماں کی بیٹی ایسی ہی ہونی چاہیئے۔ گورنمنٹ عالیہ نے بہ ثبوت خوشنودی قیصر ہند کا سلائی تمغہ عطا فرماکر قدردانی کا ثبوت دیا تھا۔

سنہ ۱۹۰۵ء میں سر اکبر کا تبادلہ بمبئی ہوگیا جہاں سنہ ۱۹۰۷ء تک برسرکار رہنے کے بعد چندے مدراس جاکر اپنے فرائض منصبی کی انجام دہی فرماتے رہے۔

مطالبہ سرکاری کی جانچ سنہ ۱۹۰۲ء میں مطالبہ کی جانچ پرتال اور اخراجات میں بچت کی راہیں نکالنے کے لئے آپ کی تعناتی بطور ماہر کار ہوئی تو اس سلسلہ میں تمام ہندوستان کے علاوہ لنکا کی بھی سیر و سیاحت سے معلومات کثیرہ حاصل کرنے کے بعد آپ نے رپورٹ تیار کی اور لاکھوں کی بچت نکالنے میں خاطر خواہ کامیاب ہوئے جس نے آپ کی صلاحیت پر مہر تصدیق ثبت کردی۔ واضح باد کہ آپ پہلے ہندوستانی تھے جو اس ذمہ دارانہ عہدہ سے اس وقت سرفراز کئے گئے تھے اور سرکاری اعتماد کے اہل ثابت ہوئے تھے!

حیدرآباد سے تعلق سنہ ۱۹۰۵ء میں آپ کی خدمات گورنمنٹ نظام دکن نے حاصل کی جہاں آپ نے صدر محاسب (اکاؤنٹنٹ جنرل) کی حیثیت سے ابتدا کی اور پھر فنانشیل سکریٹری ہوگئے۔

ٹرسٹی علیگڈھ کالج سنہ ۱۹۰۸ء میں آپ ایم۔ اے۔ او کالج علی گڈھ کے ٹرسٹی مقرر ہوئے۔

صدارت ایجوکیشنل کانفرنس سنہ ۱۹۱۷ء میں آل انڈیا محمڈن ایجوکیشنل کانفرنس کی صدارت فرمائی اور اپنے پُرمغز خطبہ میں مفید مطلب نکات تعلیم ارشاد فرمائے۔

اکاؤنٹنٹ جنرل سنہ ۱۹۲۰ء میں آپ بمبئی کے اکاؤنٹنٹ جنرل کے عہدہ پر فائز تھے کہ حیدرآباد سے پھر آپ کی خدمات طلب ہوئیں۔

حیدرآباد سے مستقل تعلق سنہ ۱۹۲۱ء میں سرکار نظام کی گورنمنٹ میں آپ نے اقتصادیات (فنانس) اور ریلوے ممبر کی حیثیت سے ایگزیکیوٹیو کانسل میں شریک ہوکر کام شروع کردیا۔ نواب مؤید الملک سر سید علی امام صاحب مرحوم کی صدر اعظمی کے

زمانہ میں اور اس کے بعد یمین السلطنت مہاراجہ سر کشن پرشاد شاد آنجہانی کے عین دوران آپ نے دو کام از حد نفع رساں کئے تھے۔ جن میں ایک تو کبھی بھلایا نہیں جا سکتا ہے یعنی عثمانیہ یونیورسٹی کی بنا اور اُردو ذریعہ تعلیم کی کامیاب اسکیم جس کے دور رس فوائد یوماً فیوماً ظاہر ہو رہے ہیں۔ دوسرا اہم کام آرکیولوجیکل ڈپارٹمنٹ archaeological کی نئی تنظیم و اصلاح جو سر اکبر کی خاص توجہ اور آپ کی غیر معمولی قابلیت کے بغیر امکان میں نہیں تھی۔

سنہ ۱۹۳۷ء میں یمین السلطنت

صدر اعظمی حیدرآباد

کی خانہ نشینی کے بعد حضور نظام سابع کی نظر انتخاب سر اکبر ہی پر پڑی۔ اور آپ "نواب اکبر نواز جنگ" کے خطاب سے سرفراز ہو کر "صدر اعظم" کے عہدہ جلیلہ کی زیب و زینت ہوئے۔ آپ کے برسرکار آنے کا پھل حیدرآباد کی دن دونی اور رات چوگنی ترقیوں کی صورت میں حاصل ہو رہا ہے اور ہوتا رہیگا۔ اس مختصر مضمون میں اس کی گنجائش نہیں ہے کہ ان سب شعبوں کا مجملاً بھی تذکرہ کیا جا سکے۔ جن کی اصلاح و جدید تنظیم سر اکبر کا روشن کارنامہ ہے۔ حیدرآباد میں آپ کی مساعی جمیلہ کس قدر مشکور ہوئیں اس کا بیان ایک علحدہ اور طویل و بسیط مضمون چاہتا ہے، جو کسی آیندہ فرصت کے لئے اٹھا رکھا جاتا ہے۔

واقعی سر اکبر کی ذات سے حیدرآباد کو کس قدر فوائد حاصل ہوئے اس کا اندازہ اس سے کیا جا سکتا ہے کہ بندگان عالی نے آپ کی خدمات کی توسیع منظور فرما کر اپنی قدردانی خسروانہ کا اظہار فرمایا۔ مگر گورنمنٹ آف انڈیا موجودہ پریشانی کے دور میں نہ ہوتی تو ظاہر ہے کہ سر اکبر کی خدمات سے حیدرآباد محروم ہونا پسند نہ کرتا۔ ہونا پسند نہ کرتا۔

راؤنڈ ٹیبل کانفرنس اور پریوی کانسل کی ممبری

راؤنڈ ٹیبل کانفرنس کی سنہ ۱۹۳۱ء و سنہ ۱۹۳۲ء میں اول و دوم نشستیں ہوئیں اور تیسری نشست سنہ ۱۹۳۳ء میں ہوئی۔ تینوں موقع پر حیدرآباد ڈیلیگیشن کی قیادت سر اکبر نے بنفس نفیس فرما کر اپنی سیاسی قابلیت اور کاربرآری کی مہارت کا سکہ بٹھا دیا تھا۔ جس کی شاباشی اور قدردانی کے لئے سرکار برطانیہ نے پریوی کانسل کا ممبر نامزد کیا یہی وجہ ہے کہ ہندوستان بھر کے چیدہ اور منتخب مشاہیر میں آپ کا شمار ہوتا تھا اور "رائٹ آنریبل" کے خطاب سے آپ مخاطب کئے جاتے ہیں۔

آپ کا سن شریف بہتر برس کے قریب تھا۔ موقع فطری ذہانت و ذکاوت کے ساتھ ساتھ متنوع اور کثیر تجربات امور سلطنت نے آپ کی درخشاں صلاحیتوں میں چار چاند لگا دئے تھے ایسے گرامی گوہر کا نورتن دربار میں شمول یقینی دکھا تھا کہ سرکار ہند نے ؎

چھانٹا وہ دل کہ جس کی ازل میں نمود تھی
پسلی پھڑک اٹھی نظر انتخاب کی

کس قدر حسرت و افسوس ہے کہ یہ متاع گرامی ہم سے عین وقت پر چھین لی گئی یعنی محض چند روز علیل رہ کر تاریخ ۸ جنوری سنہ رواں میں آپنے بمقام دہلی جام کل من علیہا فان نوش فرمایا۔ انا للہ و انا الیہ راجعون۔ مگر حیدرآباد سے اپنی محبت کا ثبوت اپنی وصیت کے ذریعہ دیا جسکے احترام میں آپ اسی فرخندہ بنیاد میں پیوند خاک ہوئے۔ ؎

مپندار اینکہ مہر تازدل عاشق رود ہرگز ✦ چوں از سر مبتلا میر چوں خیزد

نواب جلال الدین حسین خان تاثیر

آج میں عظیم آباد کی اس عظیم المرتبت ہستی سے ادیبان ملک کو روشناس کرانا چاہتا ہوں جس کا علم و کمال انیسویں صدی کے دورِ اولین میں صوبۂ بہار اور خاص کر عظیم آباد کے لئے سرچشمۂ حیات بنا ہوا تھا۔ حضرت خیالؔ مدظلہٗ نے کئی جگہ مرحوم نواب کا تذکرہ کیا ہے۔ مگر ابھی تک کسی نے بھی اُن کی مکمل سوانح حیات پیش کرنے کی کوشش نہیں ہے۔ جس طرح صوبۂ بہار نے اپنے ادیبوں کو گوشۂ گمنامی میں چھوڑ دیا ہے۔ بعینہٖ وہی حالت نواب جلال الدین حسین خاں مرحوم کی بھی ہے کہ ابتک ان کا نام منظرِ عام پر نہیں آیا ہے۔ حسن اتفاق سے چند ماہ پہلے جب میں جد امجد کے کتب خانے کی صفائی کرا رہا تھا ایک قلمی نسخہ فارسی اردو اور انگریزی خطوط کا دستیاب ہوا۔ بظاہر یہ خطوں کا مجموعہ ہے مگر درحقیقت یہ پرائیوٹ ڈائری نواب جلال الدین حسین خاں تاثیر کی ہے جس میں حضرت مرحوم نے کچھ اپنی فارسی اور اردو غزلیں لکھی ہیں۔ کچھ مکتوبات ہیں اور ایک خود نوشت نامکمل سوانح حیات انگریزی زبان میں ہے۔

میں چاہتا ہوں کہ مرحوم نواب کی چند غزلیں جو ۱۸۴۲ء کے پہلے لکھی گئی ہیں پیش کر دوں مگر قبل اس کے کہ ان کی غزلیں پیش کی جائیں اگر ان کی خود نوشت سوانح حیات کے اقتباسات کر دیئے جائیں تو بے محل نہ ہوگا۔ خیالؔ صاحب فرماتے تھے کہ یہ میرے خاندان کے وہ پہلے بزرگ ہیں جنہوں نے میرزا غالبؔ سے پہلے اردو زبان میں خط و کتابت شروع کر دی تھی۔ ان باتوں کی تصدیق اس ڈائری سے ہوتی ہے چنانچہ میں ان کے چند اردو خطوط کے بھی نمونے پیش کروں گا۔ سب سے پہلے نواب کی خود نوشت سوانح حیات سے چند اقتباسات پیش ناظرین کرتا ہوں:-

"My grand. Father had two brothers, Moinud da u la Diler Khan Bahadur and Izzat-ud-dola Sher Afyan Khan Safdar Jung. They were governors of Malwa, Kashmir, Multan and Thutta Bhakur. My great grand father named Enayat Khan Rasikh was Munshi and Parwana-nawis of Md Shah and Zukir ali Khan Bahadur was my grand father and was honoured with the tittle of Khan Bahadur under Shah Alam. My father is Nawab Mahdi

Ali Khan, now a member of the Municipal committee of Eastern division of Patna

"Pargana Giaspur was granted as jagir to Nawab Shumsud-daula and after its resumption 4000 dirhums were granted to Asfa Khanam my father's grand mother. The above rents were realised: for which I inclose Parwanas to show that I am related to that high personage whom I have described above. My grand mother Ghasiti Begum is still in possesion of the above jagir."

"The Commission of Revenue of Patna and Roshanree Lel amam and Hazi Tafazul Hosain (Sadar Amin) and Syed Azimuddin Khan, deputy collector orah, bear testimony to the respectability of my family.

یہ مختصر سی خاندانی حالات ۱۹ جولائی ۱۸۵۰ء میں لکھے گئے تھے جس وقت حضرت شاد کی عمر چار سال کی تھی۔

ظاہر ہے کہ نواب جلال الدین حسین خاں کا سلسلہ نسب نواب لطف اللہ خاں صادق وزیر محمد شاہ سے ملتا تھا جنکے متعلق مؤلف مآثر الامراء شاہ نواز خان یوں تحریر کرتے ہیں:-

" از شیخ زادہائے انصاری وطنش پانی پت۔ وقتیکہ محمد معزالدین پادشاہی آمد و رفت، بہ پایۂ عمدگی رسید و در عہد جہاندار شاہ بہ پایۂ عتاب آمدن تمامہ ضبط شد۔ از ہیں جہت با محمد فرخ سیر توسل جستہ پس ازانکہ شاہد سلطنت ہندوستان بہشت نشاں در آغوش او در آمد) بعد فتح یا قتل برجہاندار شاہ باتفاق سید عبداللہ خان بہ بندوبست دارالخلافہ تعین شد قطب الملک دیوانی خالصہ بنام او تجویز نمود و در عہد فردوس آرام گاہ بہ خطاب شمس الدولہ بہادر مشہور جنگ کامیاب گردید۔ در لقب او کہ لفظ صادق افزودہ شدہ وجہ آن بازد عوام است دلیر دل خان برادر اوست کہ ہمراہ امیر الامراء می بود و برادر سیوم او شیر افگن خان است کہ بہ فوجداری کڑا مضاف الہ آباد سرفراز شدہ۔ از پسرانش عنایت خان راسخ و شاکر خان ترقی کردند"

نواب لطف اللہ صادق کا سلسلہ نسب حضرت ابو ایوب انصاری سے ملتا ہے۔ ان لطف اللہ خان کے بڑے صاحبزادے عنایت خان راسخ تھے جنہوں نے علم موسیقی وفن عروض وقوافی میں کامل دستگاہ حاصل کی تھی جیسا کہ مصنف سیرۃ الانصار اپنی کتاب میں تحریر فرماتے ہیں۔ افسوس کہ اس وقت موجود نہیں ورنہ میں اس کی بھی چند سطریں عنایت اللہ خان راسخ کے متعلق پیش کرتا۔

یہ عجیب طائف الملوکی کا زمانہ تھا۔ دلی اجڑ چکی تھی۔ نادری حملے نے

لوگوں کے حواس باختہ کر دئیے تھے۔ امرا اپنے حفظ جان کیلئے لکھنؤ اور پھر عظیم آباد میں پناہ گزیں ہو رہے تھے۔ نواب عنایت اللہ خان راسخ نے بھی دلّی کو اپنی عمر کے آخری ایام میں خیرباد کہا اور عظیم آباد کو اپنا مسکن قرار دیا اور پانی پت کو کبھی نہ بھولے۔ چنانچہ اپنی وفات کے کچھ دن پہلے یہ وصیت کی کہ میری لاش پانی پت جائیگی۔ بموجب حکم آپ کی لاش کچھ دنوں کے لئے تکیۂ شاہ منصور کے نزدیک سپرد زمین کر دی گئی۔ بعد کو آپکی تدفین اپنے وطن پانی پت میں ہوئی۔ ان عنایت اللہ خان کے پرپوتے نواب مہدی علی خاں یعنی حضرت شاد کے نانا اور نواب جلال الدین حسین خان کے والد ماجد تھے۔ یہ بسبب انتظام جاگیر عظیم آباد ہی میں رہے اور آخر یہیں پیوند خاک ہو گئے۔

نواب جلال الدین حسین خان کا خاندان اپنی دولت ثروت اور علمی وقار کے باعث ہمیشہ مشہور رہا۔ اسی خاندان نے دستور الانشا جیسی نادر کتاب اور تاریخ مظفری جیسی گراں بہا تاریخ ملک کے آگے پیش کی ہے۔ نواب مرحوم نے اس وقت آنکھیں کھولیں جب ملک میں چاروں طرف بدامنی پھیلی ہوئی تھی۔ کمپنی کی حکومت اس وقت تک جادۂ استقلال پر نہ پہنچی تھی۔ اس پر ستم ظریفی یہ تھی کہ دوامی بندوبست کی خامیوں نے کتنوں کو مفلس اور کتنے مفلسوں کو امیر بنا دیا تھا۔ مرہٹوں کا اندیشہ اس وقت تک موجود تھا۔ شہنشاہ دلی بستر مرگ پر آخری سانسیں لے رہا تھا۔ ادھر کا بھی شیرازہ منتشر ہو رہا تھا۔ اس پر ستم یہ ہوا کہ خود نواب مہدی علی خان ہی کی زندگی میں تمام جاگیریں نیلام ہو گئیں۔ خاندان کا خاندان تباہ حال ہو گیا۔ نواب جلال الدین حسین خان کی زندگی پر اس کا بڑا گہرا اثر پڑا۔ بالخصوص جب اپنے خاندان کی بربادی دیکھی اور اپنے ہمعصر خانوادۂ صاحب سیر المتاخرین کو بھی مٹتا دیکھا تو یہاں سے چل کھڑے ہوئے۔ ایک محضر بل کمپنی بہادر کی خدمت میں پیش کیا۔ کمپنی نے فوراً ہی آپ کو ضلع پورنیہ کے بندوبست کے لئے ایک عالی عہدے پر سرفراز کیا اور آپ تا عمر یہیں اپنے فرائض انجام دیتے رہے۔

آپنے ایسے ماحول میں پرورش پائی تھی جہاں بجز علم و ہنر کے اور کوئی چیز چاہی نہ تھا۔ شعر و سخن آپ کے گھر کی خاص چیز تھی۔ اُس پر خانوادۂ صاحب سیر المتاخرین سے توصل (؟) ہو جانے کے باعث آپ کے ذاتی جوہر کو اور بھی چار چاند لگ گئے۔ پہلے فارسی میں شعر کہا کرتے تھے۔ پھر اردو میں کہنے لگے۔ قیام پورنیہ کے دوران میں اردو انشا پردازی کی سوجھی اور پھر تاعمر اُردو ہی میں خط و کتابت کرتے رہے۔ آپ نے اوائل عمر ہی میں انگریزی اپنے استاد (Zenaida Cooper) "زینیا کوپر" سے پڑھی تھی اور اس زبان پر کافی عبور حاصل کر لیا تھا۔ راقم الحروف کے پاس آپکے اور آپکے اکثر احباب کے خطوط انگریزی زبان میں موجود ہیں۔

اس ڈائری میں جس کا ذکر میں کر چکا ہوں سب سے پہلے جو غزل ملتی ہے وہ اُردو کی ہے:-

ہوا جوشِ خوشی محفل میں ایسا روئے دلبر سے
مئے گلگوں ابل کر بہہ چلی مینا و ساغر سے
بسا ہے بعد مرنے کے بھی دل عشق فسوں گر سے
کہ بوئے یار آتی ہے مرے پھولوں کی چادر سے
وہ سوتا دیکھ کر کنجِ لحد میں مجھ کو کہتے ہیں
تمہیں اللہ کیا راحت ملی مٹی کے بستر سے
وہ تصویر سخن کے حسن و خوبی کس طرح سمجھیں
نہیں جو فرق کر سکتے مُصَوِّر اور مُصَوَّر سے

اس غزل کا پہلا مطلع ملاحظہ کیا جائے اور پھر عم محترم حضرت

تہاں کی معرکۃ آلارا غزل کے مطلع پر بھی غور کیا جائے۔

بجھا دے یہ لہکتی آگ ساقی اپنے دامن سے
مئے سرجوش اُبل کر بہہ چلی شیشے کی گردن سے

ظاہر ہے کہ اس مرقع غزل کی پہلی کڑی کا سلسلہ کہاں سے ملتا ہے۔ ایک دوسری غزل کے بھی چند شعر پیش ناظرین ہیں۔

فلک پر جلوے کب ہیں ماہ اور خورشید تاباں کے
یہ دونوں ہیں فقط بس عکس اپنے داغِ ہجراں کے

ہزاروں سر بہ زیر تیغ ہیں اور عید قرباں ہے
ذرا جو ہر تو اب تو بھی دکھا شمشیر براں کے

پھر آیا اے جنوں موسم بہار لالہ و گل کا
اُڑیں گے پھر وہی وحشت میں پُرزے اپنے داماں کے

دکھاتا ہے جنوں بھی فصلِ گل میں اپنی تاثیریں
الگ ہو جاتے ہیں وحشت سے ہر تار اپنے داماں کے

مقابل کئے جاناں سے نہ ٹھہرا اپنی نظروں میں
تماشے ہم نے دیکھے جا کے جب تاثیر رضواں کے

پھر ایک دوسری غزل کے چند شعر اور بھی ہیں :۔

حرم ہے میکدہ میری نظر میں اے ساقی
میں آیا بزم میں تیری تو با وضو آیا

زمیں کی پوچھو جو اس سے تو آسماں کی کہے
عجب یہ آدمی بن کر فرشتہ تو آیا

غضب کہ آئی نہ کانوں تلک تیری آواز
ترا پیام بھی نزدِ رگِ گلو آیا

ذرا زبان کی صفائی لطافت اور پاکیزگی ملاحظہ کی جائے۔ یعنی عظیم آباد کی زبان ۱۸۳۰ء کے پہلے۔ مندرجہ بالا غزل ۱۸۳۰ء میں بمقام اعظم گڈھ کہی گئی تھی جیسا کہ خود نواب مرحوم کی تحریر سے ظاہر ہوتا ہے۔

میں انگریزی تحریر اور اُردو غزلوں کے نمونے تو پیش کر چکا۔ اب اُردو خطوط کے چند نمونے ملاحظہ ہوں۔

" گزٹ دہم ماہ جون ۱۸۵۳ء اشتہار

جناب عالی ! واضح ہو کہ ایکٹ نمبر ۱۶ ۱۸۴۵ء کے ترجمۂ اُردو میں بعض غلطیاں پائی گئی ہیں، اس لئے ایکٹ مذکورہ ترجمۂ صحیح بعد رفع ان اغلاط کے حسب ذیل خاص و عام کی اطلاع کے لئے مشتہر کیا جاتا ہے۔ مقام آگرہ ۲۸ مئی ۱۸۵۳ء متضمن چند قواعد در باب پھر منظور کرنے مقدمات اپیل کے جو ایکٹ نمبر ۲۹ ۱۸۴۱ء کے رُو سے خارج ہوئے ہوں۔ واضح ہو کہ ایکٹ نمبر ۲۹ ۱۸۴۱ء کے قواعد اپیل ایسے سخت ہیں کہ اُن کے باعث قیامت ہوئی ہے....."

ایک دوسرا خط بنام سید اظہار حسین خان پدر نوشاد بھی ملاحظہ ہو۔

۷۸۶

" عباس سلمۂ ! میں پورنیہ بخیریت تمام آپہنچا۔ تم لوگ اچھے ہو گے۔ محسن صاحب کو دعا کہدینا۔ الخ بھائی اب میری صحت چنداں خراب ہونے لگی ہے......"

مورخہ یکم جولائی ۱۸۴۴ء

دعاگو
تاثیر

(نقی احمد خاں ارشاد فاطمی بی۔ اے)

آثار علمیہ و ادبیہ

چند مکتوبات حضرت آثر عظیم آبادی

شمس العلماء نواب سید امداد امام صاحب آثر عظیم آبادی مرحوم کے خطوط ناچیز کو جناب پروفیسر محمد طاہر رضوی ایم۔ اے سے دستیاب ہوئے ہیں جو نواب آثر مرحوم نے پروفیسر صاحب ممدوح کے والد محترم سید محمد عسکری رضوی مرحوم ساکن جپلا حسین آباد کے نام تحریر فرمائے تھے۔ یقین ہے کہ حضرت آثر عظیم آبادی کے ان خطوط کو مع اس مختصر نوٹ کے ندیم کے اوراق پر آثار علمیہ ادبیہ کے تحت شائع فرمادیں گے۔ بندۂ آثم سید رضا قاسم مختار (پلاموں) پوسٹ جپلا۔

(۱)

آبگلہ معروضہ، فروری سنہ ۱۹۲۴ء

عزیز جانم سلمکم اللہ تعالیٰ۔ بعد دعائے خیر عرض ہے کہ بخیریت ہوں اور خیریت کا طالب۔

منو دو ہزار اور چار سو روپیہ کی ہنڈوی لیکر جاتے ہیں۔ منو سے آپ کو لاہ چھڑوانے میں پوری مدد ملیگی۔ لاہ چھڑانے کے زمانہ تک منو آپ کی خدمت میں حاضر رہیں گے۔ جبوجی کی نگرانی کا سامان جو مناسب ہو عمل میں لایا جائے۔ ضروری حالتوں سے بھی مطلع فرماتے رہیگا۔

عزیزم نواب سر علی امام صاحب ابر و باد و ناہمواری راہِ موٹر کے باعث ڈالٹین گنج نہیں جاسکے۔ مگر بابو مغل سنگھ زمین کے دیکھنے کے لئے جائیں گے۔ ایک خط ہم اُن کے نام کا بدست منو کے موصوف کے پاس روانگی ڈالٹین گنج کی نسبت روانہ کرتے ہیں۔ صبح تک منو اور موصوف آپ کی خدمت میں حاضر ہو جائیں گے انشاء اللہ تعالیٰ۔

کل یعنی ۸ فروری کو ہم دو پہر کی گاڑی سے بانکی پور جائیں گے۔ ۱۱ (گیارہویں) فروری کو علی امام سلمہٗ ولایت روانہ ہونے کو ہیں۔ بقرینۂ غالب ۱۲ (بارہویں) کو ہم انشاء اللہ تعالیٰ بانکی پور سے یہاں واپس آجائیں گے۔ تب عزیزم ڈاکٹر غلام امام صاحب گرافائیٹس کا نمونہ لیکر کلکتہ روانہ ہوں گے۔ آئندہ جو امور دریافت میں آئیں گے ان سے آپ کو مطلع کرتا رہوں گا۔

یہاں خفیف بارش آج ہوئی ہے۔ مگر ابر ہر طرف محیط ہے۔ فقط دعا گو

امداد امام عفی عنہ

---

[1] آپ نے ۳ فروری سنہ ۱۹۳۹ء جمعہ کے دن جپلا حسین آباد میں انتقال کیا اور وہیں مدفون ہوئے۔ رضا قاسم

آبگلہ۔ ڈاکخانہ بنیادگنج۔ ضلع گیا ——(۳)—— معروضہ ۹ ستمبر ۱۹۲۳ء

عزیز جانم سلمکم اللہ تعالیٰ۔ بعد دعائے خیر عرض ہے کہ بخیریت ہوں اور خیریت کا طالب۔

کل آپ کا تار وصول ہوا جس سے وثیقہ گرانایٹ کی تعمیل کی کیفیت دریافت میں آئی۔ آج میں نے ایک خط برادر نانک صاحب کو اس مضمون کا لکھا ہے کہ وہ لوگ آپ کوئی اپنا آدمی گرانایٹ کی کان کے ملاحظہ کے لئے ڈالٹین گنج روانہ کریں۔ جواب آنے پر مضمون جواب سے آپ کو مطلع کر دوں گا۔

آپ کے تار سے یہ بھی معلوم ہوا کہ اب بابو لال چند صاحب کام لگا دینے کی نظر سے سکرا جانے والے ہیں۔ جب آپ لکھیں تو ہم روپیہ انجام امور ضروری کے لئے آپ کے پاس بھیج دیں۔ اس وقت چھ ہزار روپیہ تک ہم ارسال کر سکتے ہیں۔ اس کے بعد اور بھی روپیہ کا سامان ہو جائیگا۔

افسوس ہے کہ اب تک بارون کا معاملہ نہیں طے پا سکا ہے۔ اب تک نہ طے پا جاتا۔ مگر بابو بشیر الحق صاحب کا بڑا لڑکا جو بانکی پور میں پڑھتا ہے میعادی بخار میں مبتلا ہو گیا ہے۔ دیکھیے کب تک بشیر بابو گیا کو واپس آتے ہیں۔ تعمیل وثیقہ کا مدار موصوف کے واپس آنے پر ہے۔ تنگدستی سے اندنوں بڑی پریشانی لاحق ہے۔ دیکھیے کیا ہوتا ہے۔

اس وقت تک گیا کی آب و ہوا اعتدال پر نہیں آئی ہے۔ ابھی تک آبگلہ اور رانچی پور محفوظ ہے۔ مگر تا فصل برسکال اطمینان حاصل نہیں ہو سکتا ہے۔

اپنی خیریت سے مطلع فرمائیے۔

علی امام[1] سلمہٗ بارہویں ستمبر رواں کو حیدر آباد روانہ ہو جائیں گے اور بقرینۂ غالب ایک مہینے تک حیدر آباد میں قیام پذیر رہیں گے۔ گلبرگہ علاقہ حیدر آباد میں ہندوؤں اور مسلمانوں کے درمیان ایک فساد عظیم برپا ہو گیا تھا۔ اس کی تحقیقات شروع ہو گئی ہے۔ سردست گورنمنٹ حیدر آباد کا ویسا اچھا انتظام نہیں ہے جیسا کہ اسے ہونا چاہیے۔ یہ فساد نہایت برے وقت میں ہوا ہے۔ مخالفان حضور نظام کو اچھی گرفت کا موقع مل گیا ہے عجب نہیں کہ اس کا اثر معاملۂ برار پر بھی پڑے۔ فقط

والتسلیم

دعاگو

امداد امام اثر عفی عنہ

---

[1] آپ کی پیدائش ۱۱ رویں فروری ۱۸۶۹ء کو ضلع پٹنہ کی مردم خیز بستی نیورا میں ہوئی۔ موصوف نے ۱۹۳۲ء میں صبح کے وقت رانچی میں انتقال کیا اور اپنی وصیت کے مطابق وہیں اپنی کوٹھی کے احاطہ میں دفن کئے گئے —— (رضا قاسم)

(۳)

آبگلہ۔ ڈاکخانہ بنیاد گنج۔ ضلع گیا۔ مورخہ ۲۱ نومبر ۱۹۲۲ء

عزیز جانم سلمکم اللہ تعالیٰ۔ بعد دعائے خیر عرض ہے کہ امر ضروری ذیل میں گذارش ہوتے ہیں۔

آج ہم ۵ بجے شام کی گاڑی سے ڈہری جانے والے ہیں۔ سامان سفر پوری طور پر درست ہے۔ انشاء اللہ تعالیٰ ۸ بجے شب تک ہم لوگ ڈہری پہنچ جائیں گے۔ مجوبابو سلمہٗ نے اسٹیشن ڈہری پر سامان سواری اور بار برداری کا درست کر رکھا ہے اور خود بھی اسٹیشن ڈہری پر موجود رہیںگے۔ ڈہری میں عزیز موصوف نے سہسرام کے سجادہ نشیں صاحب کی کوٹھی کرایہ کر لی ہے، وہ کوٹھی دو مہینے کے لئے کرایہ لی گئی ہے اور اس کا کرایہ اسی روپیہ ماہانہ قرار پایا ہے، وہ کوٹھی کچھ شک نہیں کہ بڑی ہے اور ایک وقت میں ہم اس کوٹھی میں رہ بھی چکے ہیں۔ لب سون واقع ہے۔ تبدیل آب و ہوا کے لئے بہت ہی مناسب ہے، علاوہ اس کے کہ سردست ہم کو اپنے یہاں کے مکان سے اُٹھ جانا ایک ضروری امر دکھائی دیتا ہے۔

میری صحت کچھ روزوں سے خراب ہو رہی ہے۔ شاید تقاضائے پیری سے میری یہ حالت ہو رہی ہے۔

عزیزم حسن امام سلمہٗ[1] کے خط سے اصل وجہ کھاد کے کام کے سردست بند کر دینے کی معلوم ہوئی ہے۔ یہ وجہ ایسی ہے کہ جب آپ اور بابو لال چند صاحب اس وجہ سے واقف ہو جائیں گے تو عزیز موصوف کی اس کارروائی کو آپ لوگ بہت پسند کریںگے۔

اگر فرصت ملے تو مجھے دیکھنے کے لیے ڈہری ضرور آئیےگا۔

ابھی تک میرے مکان میں چوہوں کے مرنے پر بھی خیریت ہے اور امید ہوتی ہے کہ یہاں سے چلے جانے کے بعد بھی خیریت قائم رہیگی۔ فقط والتسلیم۔ بابو لال چند صاحب کی خدمت میں میری تسلیم فرما دیجئے گا۔

دعا گو

امداد امام آثرؔ عفی عنہ

(۴)

ڈہری۔ لب ندی مورخہ ۱۳ دسمبر ۱۹۲۲ء

عزیز جانم سلمکم اللہ تعالیٰ۔ بعد دعائے خیر عرض ہے کہ بخیریت ہوں اور خیریت کا طالب۔

---

[1] آپ نے ۱۹ ویں اپریل ۱۹۳۳ء کو صبح کے وقت پٹنہ میں انتقال کیا اور اپنی وصیت کے مطابق اپنی زمینداری موضع دیورہا (ضلع پلاموں) میں چیلا حسین آباد سے تقریباً ڈیڑھ میل دور جپلا سیمنٹ فیکٹری کے قریب مدفون ہوئے جہاں آپ کے مزار کا گنبد دنیا کی بےثباتی کا مرثیہ اپنی زبان حال سے پڑھتا ہوا دور سے نظر آتا ہے۔ (رضا قاسم)

بابو لال چند صاحب کے خط سے معلوم ہوا کہ بہ نصیب اعدا طبیعت آپ کی ناساز ہو گئی ہے۔ موصوف کی تحریر سے ظاہر ہوا کہ آپ کو بخار آگیا ہے۔ حقیقت حال سے مطلع فرمائیں۔ نہیں معلوم کہ علاج کس سلسلہ سے کیا جاتا ہے۔ اپنی خیریت سے مطلع فرماتے رہئے کہ رفع تعلق ہوتا رہے۔

اب ہم بہت اچھے ہیں۔ ڈہری کی لطافت آب و ہوا کی بدولت میرے مزاج کی اصلاح بہت جلد ہو گئی۔ فقط والتسلیم

دعا گو　　امداد امام اثرؔ عفی عنہ

(۵)

آبگلہ۔　　معروضہ ۱۴ جولائی ۱۹۲۵ء

عزیز جانم سلمکم اللہ تعالیٰ۔　　بعد دعائے خیر عرض ہے کہ میری آنکھیں جوش کر آئی ہیں۔ بڑی مشکل سے یہ کارڈ مبارکباد کا آپ کو ہم لکھ رہے ہیں۔ یہی حال سب لڑکوں کا ہے جوش چشم سے سب کے سب بہت پریشان ہیں۔ بہر حال طاہر سلمہٗ کی کامیابی[1] سے عجیب فرحت دل کو نصیب ہوئی ہے۔ خدائے تعالیٰ عزیز موصوف کو یہ کامیابی مبارک فرمائے یہ کامیابی مبارک آپ کو بھی ہو اور ہم تمام لوگوں کو فقط والتسلیم

دعا گو　　امداد امام اثرؔ عفی عنہ

یہاں بارش کی صورت اچھی ہے فقط۔

(۶)

آبگلہ۔　　معروضہ بیسویں اگست ۱۹۲۵ء

عزیز جانم سلمکم اللہ تعالیٰ۔　　بعد دعائے خیر عرض ہے کہ ہم ان دنوں اپنی اور اپنے لڑکوں کی علالت سے نہایت پریشان رہے ہیں۔ ہم اب تک صحیح نہیں ہوئے ہیں۔ یہی حال حسین[2] امام سلمہٗ کے سوا اور لڑکوں کا بھی ہو رہا ہے۔ بالحمد للہ حسین امام سلمہٗ اب پورے طور پر صحیح ہیں۔ گیا اور اطراف گیا میں ہر طرح کے بخار کی کثرت دیکھی جاتی ہے۔ ہم جانے کا قصد رکھتے ہیں جس وقت ہم کو یہاں کے انتشارات سے فرصت ہو جائیگی جائیں گے۔

حسن امام سلمہٗ کو ان دنوں ہجوم مشاغل رہا ہے۔ کوئی تعجب کی بات نہیں ہے کہ موصوف نے جو ابھی تک آپ کے خ

---

[1] یعنی پروفیسر طاہر رضوی شعبہ فارسی پریسیڈنسی کالج کلکتہ کے بی۔ اے پاس کرنے کے سلسلہ میں نواب صاحب مرحوم نے مبارکباد کی تحریر بھیجا تھا۔ [2] اس لڑکے نے ساڑھے نو سال کی عمر میں حضرت اثرؔ کی زندگی ہی میں انتقال کیا۔ اتنی قلیل عمر میں ایسی بعید علمی زندگی حاصل خصوصاً علم فلکیات میں تو اتنی مہارت حاصل کر لی تھی کہ حضرت اثرؔ کے یورپین احباب "اسٹرانومر" کہا کرتے تھے۔ (رضا قاسم)

جواب نہیں دیا ہے۔ ممکن ہے کہ آپ کا دوسرا خط اثر پیدا کرے۔ بہتر ہوتا کہ آپ ایک یا دو دن کے لئے بانکی پور چلے جاتے۔

سرکار امینڈ کو کا انداز اچھا معلوم ہوتا ہے۔ ممکن ہے کہ معاملہ گرافائیٹ کا طے پا جائے۔

عزیزم طاہر سلمہٗ کی نسبت کچھ نہیں معلوم ہوا کہ کمشنر صاحب بہادر نے کیا کیا۔ سخت تعلق خاطر دامن گیر ہے۔ گرافائٹ بکے تو بہت کام چلے۔ فقط والتسلیم

دعاگو امداد امام اثر عفی عنہ

(۷)

بانکی پور۔ کوٹھی جعفر امام سلمہٗ — مورخہ ۲۷ر اگست ۱۹۲۶ء

عزیز جانم سلمکم اللہ تعالیٰ۔ بعد دعائے خیر عرض ہے کہ ہم اپنی ضرورتوں سے یہاں ٹھہرے ہوئے ہیں مگر امید ہوتی ہے کہ آج مجھے اپنے کاموں سے فرصت ہو جائے اور کل صبح کی گاڑی سے ہم آینگلہ کو واپس جا سکیں۔

نہیں معلوم کہ سرکار امینڈ کو نے کوئی خط اندنوں امید افزا آپ کو لکھا ہے یا نہیں۔ حقیقت حال سے مطلع فرمائیگا۔

گرافائیٹ کی فروخت میں پوری کوشش فرمائیے۔ ہم بھی اس کی فروخت میں کوشاں ہیں۔ اگر فروخت کا معاملہ طے پا گیا تو عزیزم طاہر سلمہٗ کے معاملات کے انجام میں کوئی تردد لاحق نہ ہوگا۔ سب کام کا انجام روپیہ کی موجودگی پر ہے۔ کچھ نہیں معلوم ہوا کہ کمشنر صاحب بہادر نے میرا خط پا کر کیا کارروائی اختیار فرمائی۔ ہمیں یہ بھی نہیں معلوم ہے کہ عزیز موصوف رانچی گئے یا نہیں۔ اگر گئے تو جو کیفیت گزری اس سے جلد مطلع فرمائیے۔

یہاں بہر صورت خیریت ہے۔ فقط والتسلیم

دعاگو امداد امام آثر عفی عنہ

(۸)

آینگلہ۔ ڈاکخانہ بنیاد گنج۔ ضلع گیا۔ — مورخہ ۱۹ر اکتوبر ۱۹۲۵ء

عزیز جانم سلمکم اللہ تعالیٰ۔ بعد دعائے خیر عرض ہے کہ بخیریت ہوں اور خیریت کا طالب۔ ورود محبت نامہ نے مسرت قلبی بخشی۔ میں امید کرتا ہوں کہ اب آپ تمام تر بفضلہ تعالیٰ صحیح ہونگے۔ زکام و بخار کی اس دیار میں بھی کثرت رہی ہے۔ اب بفضلہ تعالیٰ یہاں بھی سب کو صحت نصیب ہوتی گئی ہے جسٹس امام سلمہٗ بسلون سے واپس آگئے ہیں مگر امر معلوم کی نسبت ابھی تک مجھے دریافت حقیقت کی صورت پیدا نہیں ہو سکی ہے۔ عنقریب ہم بانکی پور جانیوالے ہیں وہاں جو امور ہم پر روشن ہونگے ان سے آپ کو اطلاع دیں گے۔ دلالان کلکتہ پر رحمت خدا کی۔ لاحول ثم لاحول۔

عزیزم طاہر سلمہٗ کی خیریت سے مطلع فرمائیگا۔ کہ اب موصوف کس شغل میں ہیں۔ یہاں بہر صورت خیریت ہے۔ میرے متعلقین سب کے سب بخیریت ہیں۔

امسال بارش کا سلسلہ بیجا نہیں رہا۔ مگر ہتھیا کے کم برسنے کے باعث اکثر مقامات میں پانی کی کمی محسوس ہورہی ہے۔ اندرون ضلع گیا کی آب و ہوا ابھی تک بوسراعتدال ہے۔

عزیزوں کو دعا۔ فقط والتسلیم	دعا گو	امداد امام آثر عفی عنہ

(سید رضا قاسم)

مثنوی کیفی بہاری کا بقیہ آخری حصّہ

اس مضمون کا خاتمہ مصنف توبہ و استغفار اور دعائیہ اشعار پر کرتے ہیں:۔

جو چھپے یا کھلے ہوئے ہیں گناہ	توبہ کرتے ہیں سب سے یا اللہ
عمداً ہو کہ سہواً انساں سے	توبہ ساری خطا و عصیاں سے
ہے ترے سامنے خداوندا	ہاتھ جوڑے کھڑا ترا بندا!
اے یگانہ خدائے کعبہ و دیر	مشکل آساں، خاتمہ ہو بخیر!

(عبدالوکیل عزیزی)

محبت

کون ہے جو محبت، اُلفت اور عشق کے الفاظ سے ناواقف ہے یا دل میں اس کی تمنا نہیں رکھتا۔ ہر شخص اپنی استعداد کے مطابق ایک خاص نظریہ اور تخیل رکھتا ہے، لیکن سچ پوچھئے تو جس نے چاہا، اور جو چاہا ہوبھی گیا ہو، ایسا خوش قسمت کم ملے گا۔ اس کی وجہ کیا ہے؟ لوگوں کو معلوم ہی نہیں کہ محبت کس کو کہتے ہیں، اور وہ کیسے کی جاتی ہے، وہ تو شاعروں، افسانہ نویسوں کے دام میں پھنسے ہوتے ہیں، جنہوں نے محبت کے متعلق اتنی جھوٹی جھوٹی باتیں کہہ دی ہیں کہ اچھا خاصا ہرا بھرا گھر محبت کے خودساختہ جال میں پھنس کر اپنی آسودہ زندگی کا گلا گھونٹ دیتا ہے۔

محبت کے متوالے اگر ایک دوسرے کو نہ سمجھ سکے، اُن کو ان کے اصلی رنگ و رُوپ میں نہ دیکھ سکے، ان کی کمزوریوں سے واقف نہ ہو سکے تو انہوں نے محبت کی ہی نہیں، وہ ایک دوسرے کو سونا سمجھ کر بڑھے تھے، لیکن قلعی کھل جانے کے بعد پیتل کی تاب نہ لا سکے۔ سرمستی و سرشاری میں آگے بڑھے تھے لیکن مایوسی اور نااُمیدی کے ساتھ سر پکڑ کر بیٹھ گئے۔

بات یہ ہے کہ زیادہ تر لیقین کم سن، ناتجربہ کار دُنیا سے ناواقف شاعروں، افسانہ نویسوں کے رُومانی اور اُن ہوتے نظریئے دماغ میں رکھ کر محبت کی ابتدا کر دیتے ہیں، لیکن جب حقیقت کی دُنیا میں وہ نہیں ہوتا جو اُن کے دماغوں میں ہوتا ہے تو مایوسی ان کے ارمانوں پر پانی پھیر دیتی ہے اور تمناؤں کا خون کر دیتی ہے۔ ایسی ایسی غلط فہمیاں آپس میں پڑ جاتی ہیں کہ زندگی ایک وبال ہو جاتی ہے۔ اور عمر کا عزیز ترین حصہ تلخیوں میں گذرتا ہے۔ آج نہ معلوم کتنے لڑکے اور لڑکیاں اس دُنیا میں موجود ہیں جو اپنے دل دوز، دردناک افسانہ محبت دل کے گوشہ میں چھپائے بیٹھے ہیں، اس کی وجہ یہ ہے کہ وہ ابتک سمجھے ہی نہیں کہ محبت کیا چیز ہے۔ سترہ اٹھارہ سال کی لڑکیاں یا بیس سال کے لڑکے جس کو محبت سمجھتے ہیں وہ ان کا فریب نظر ہے، محبت نہیں۔ مشہور ہے کہ جوانی میں محبت پہلی ہی نظر میں ہو جاتی ہے۔ اگر کسی کی نظر کسی حسین کمسن لڑکی پر پڑ گئی، بس سے "دل میں اک تیر ہے پیوست تری یاد نہیں"۔ زبان پر جاری ہے۔ دماغ میں ایسے ایسے دل کش نقشے کھینچتے ہیں جس میں وہ اور اُن کی محبوبہ ایک خوشنما باغ میں لطف اٹھا رہے ہیں، جہاں ہر چیز پر بہار اور ہر شئے میں حُسن ہوتا ہے گویا دُنیا ہی میں انہیں جنت مل گئی۔ وہ یہ سمجھتے ہیں کہ اس بہار کو کبھی خزاں نہیں آئیگی، ناداں یہ نہیں سمجھتے کہ یہ اُن کے حُسن کی متناطیسی کشش ہے، محبت نہیں، اکثر محبت کی ماری لڑکیاں اپنی کہانی سُناتی ہیں کہ اُن کا محبوب ان پر کتنا فدا تھا، اس کی باتوں میں کتنا رس تھا

ع "انگیٹھی کے کنارے صبح ہو جاتی تھی باتوں میں"۔ لیکن جانے اب کیا بات ہے کہ اب وہ نظر نہیں رہی، بات صرف اتنی کہ انسان کسی چیز سے ابتدا میں نہیں اُکتاتا۔ کتاب کا پہلا ورق، کالج کا پہلا دن، اور کسی دوشیزہ کا پہلا پیار، سب ہی دل کو

ہتے ہیں۔ لیکن شادی کے بعد ہی کونین کی تلخی شروع ہوجاتی ہے' اس قسم کی لڑکیاں اگر ذرا ڈوب کر دیکھیں تو انہیں معلوم ہوگا کہ ان کے محبوب کو اُن کی ذات سے محبت نہیں تھی' بلکہ ان کی جوانی' ان کا حسن' ان کے ناز و انداز اُسے گرویدہ کئے ہوئے تھے۔ اکثر کی محبت تو کچھ ہی دنوں بعد سیر ہوجاتی ہے' اور نئی دلچسپیوں کو ڈھونڈنے لگتی ہے۔ اور بعض جوانی اور حسن کا ساتھ دیتے ہیں لیکن رفیق زندگی' شریک حیات اور دکھ درد کے ساتھی مشکل ہی سے ملتے ہیں۔ اگر کسی خوش قسمت لڑکی کو کوئی ایسا ساتھی مل جاتا ہے تو وہ سمجھتی ہے کہ اس کی شادی بر بنائے محبت تھی' اسی لئے کامیاب رہی۔ لیکن زیادہ تر محبت ایک خواب کی طرح فنا ہوجاتی ہے اور کتنے دلوں کو توڑ دیتی ہے' عام انسان چمک پر دوڑتا ہے لیکن جوہر نہیں پہچانتا۔

اب سوال یہ ہوتا ہے کہ سچی اور دائمی محبت کسے کہتے ہیں؟ یوں تو شاعروں' افسانہ نویسوں اور ڈرامہ نویسوں نے بہت سی تعریفیں کی ہیں۔ لیکن عام انسان نہ شاعر ہے' نہ افسانہ نویس اور نہ ڈرامہ نویس۔ اس لئے اس کو اپنا نظریہ بنانا چاہیئے کہ وہ ایک عام انسان ہے کسی ڈرامہ کا ہیرو یا ہیروئن نہیں۔ محبت نام ہے اپنے محبوب کی خوبیوں پر ناز اور اس کی کمزوریوں سے ہمدردی کا۔ جس میں اس کی صلاحیت جتنی زیادہ ہے اتنا ہی وہ محبت کا اہل ہے۔ اگر سچی حقیقی اور دائمی محبت کی تلاش ہے تو محبوب کی دولت جوانی حسن سے قطع نظر کرکے اس کی خوبیوں اور کمزوریوں کا پتہ چلانا چاہیئے۔ شادی کے بغیر محبت ہو ہی نہیں سکتی' کیونکہ اس سے پہلے ایک تو زیادہ ملنے کا موقع ہی نہیں ملتا کہ ایک دوسرے کو جان سکیں اور اگر کسی کو مل جاتا ہے تو فریقین کبھی اپنے اصلی رنگ میں نہیں آتے۔ وہ ہمیشہ اپنے کو بہتر سے بہتر بنا کر پیش کرنے کی کوشش کرتے رہتے ہیں' اور یہ بالکل فطری ہے کہ محبوب کو حاصل کرنے کے لئے ریاکاری کرنی پڑتی ہے۔ اس لئے محبت کی ابتدا جو شادی کے بعد ہو' وہی دیرپا ہوگی۔ کبھی ایسا رویہ اختیار کیا جائے جس کو ساری زندگی نباہ نہ سکیں۔ اپنی کمزوریوں کا اظہار لازوال محبت کے لئے ازبس ضروری ہے اور اپنی اس ہمت پر فخر بجا ہے' اس سے زندگی بہشت نہیں تو دوزخ بھی نہیں بنے گی۔ اور وہ خوشی و مسرت نصیب ہوگی جو ایک قابل رشک ہوسکتی ہے۔ ایک دوسرے کو سمجھنے کی کوشش کرنی چاہیئے' لیکن کیسے سمجھنا چاہیئے۔ اس کے لئے ایک مفید طریقہ یہ ہے کہ دونوں اپنے محبوب کی پسندیدگی اور ناپسندیدگی پر غور کریں اور اسی کے مطابق اپنی طبیعت کو بنائیں اگر اس پر خیال نہ کیا گیا تو یہی چھوٹی چھوٹی رنجش کی جڑ ہو جائیں گی۔ .... "عقلمندوں کا قول ہے کہ محبت کرو کہ اسی میں خوشی کا راز ہے۔" لیکن عقلمندوں کی ہر بات میں ایک پیچ ہوتا ہے۔ وہ یہاں بھی موجود ہے کہ پہلے جان لو کہ کیسے محبت کی جاتی ہے' پھر حقیقی مسرت خود بخود تمہارا قدم چومے گی۔

(عاصم دسنوی)

بیزار

"موہنی کیا کوئی آس نہیں؟"۔ کنول نے گھبرا کر پوچھا۔

"نہیں کنول۔ کچھ نہیں کیا جا سکتا۔ منٹوں میں قصہ تمام ہوا چاہتا ہے۔ دیکھو تو اس غریب کے شوہر کو کوئی بلا کر لایا بھی یا نہیں؟ ہاں۔ اس کا نام رام دیال ہے"۔

ڈاکٹر موہن لال نے نرس سے کہا۔ جو فوراً آپریشن تھیٹر سے لپکتی ہوئی آفس کی طرف روانہ ہوئی۔ وہاں ایک خوش رو نوجوان نے داخل ہو کر اپنا نام "رام دیال" بتلایا۔ کنول نے جلدی سے اس کو ہمراہ چلنے کی دعوت دی۔ مگر اس کی حیرت کی انتہا نہ رہی جب رام دیال نے کسی رنج و غم کے جذبہ کا اظہار کئے بغیر قدرے اطمینان کے ساتھ کہا: "میرے جانے کی کوئی ضرورت نہیں۔ جب پھول وتی "مر جائے تو مجھے ٹیلیفون کر دینا۔ سب انتظام ہو جائیگا"۔ یہ کہتا ہوا وہ آفس سے نکل کر اپنی موٹر پر سوار ہوا اور چل دیا۔ کنول کو انسانی بیدردی کا یہ نظارہ سخت بیچین کر گیا۔ وہ کچھ دیر تو جہاں کی تہاں بھونچکا سی کھڑی کی کھڑی رہ گئی۔ اس کا دماغ کام کرنے سے جیسے رہ گیا تھا۔ نہ معلوم یہ حالت کب تک قائم رہتی۔ وہ تو کہئے خدا کا خیر کرتا تھا کہ آفس میں اس وقت کوئی نہ تھا اور ڈاکٹر موہن لال آ گیا۔ موہنی کو دیکھ کر کنول کے حواس بجا ہوئے۔

"کیا ہوا موہنی؟"

"وہی جو ہونا تھا! تم ادھر آئیں اور ادھر اس نے دم توڑ دیا۔ تعجب ہے کہ اس کا شوہر کہیں نہیں آیا ---- اور تم یہاں کیا کرنے لگی تھیں"؟

"ہم ---- ہم .... اگر اور تھوڑی دیر تم نہ آجاتے تو شاید پاگل ہو جاتی؟"

"یعنی؟"

"یعنی یہ کہ اس حسین مرنے والی کا شوہر ---- شوہر کیوں کہوں "وحشت" پاپی سنگدل۔ آیا تھا"۔

"ہیں! ہیں! آیا تھا تو تم اس کو وہاں لے کیوں نہ گئیں؟"

"اسے ستو گے بھی! میں آخر اس کو ان ناموں سے کیوں یاد کر رہی تھی؟ کسی کو اپنے پالتو جانور کا بھی افسوس ہوتا ہے مگر اس شخص کو اپنی ایسی حسین و جمیل بیوی کے اس طرح موٹر کے حادثہ سے مرنے کا مطلق احساس بھی نہیں تھا۔ رنج والم کیا .....؟"

"ہوگا بھی۔ تم اس کا اثر کیوں لیتی ہو؟ ہم تیمارداروں معالجوں کا ان باتوں کا اثر لیا کریں تو پھر ہو چکا علاج معالجہ! اے بھولی۔ دنیا اسی کا نام ہے۔ ع ہر کس بخیال خویش خبطے دارد۔ ہم کو اپنے فیس سے مطلب ہے نہ کہ لوگوں کے اخلاق کی اصلاح سے! تم نے سنا نہیں ع "تجھکو پرائی کیا پڑی اپنی نبیڑ تو" اچھے کام سے کام رکھو۔ نیکی کا مول باقی جھول"۔

"موہنی ایسا نہ کہو۔ ہم کو انسان ثابت ہونا چاہیئے"۔

"انسان! انسان۔ یہ شریف نام مدت ہوئی شرمندہ معنی نہ رہا۔ آجکل انسان وہی ہے جو پیٹ پر پتھر کی روٹی باندھے۔ اور سب کی جوتیاں کھانے کو سر جھکائے رکھے! جلنے بھی دو

ان باتوں کو۔ پھر کوئی اور آجائے گا۔ یہ بتاؤ تم کو آج کس وقت فرصت ہوگی ؟"

"فرصت تو سچ پوچھو ملتی ہی نہیں۔ مگر اتفاق سے آج ہم نے رات کو فرصت حاصل کرلی ہے۔ کیا کچھ کام ہے ؟"

"کام کی بھی ایک ہی کہی۔ پکچر پیلس میں ملنا۔ تماشہ تو دیکھے میری بلا۔ ہاں۔ ذرا گھومنے چلیں گے۔ اور ہاں یہ تو سنو۔ کس قدر بے احتیاطی سے اس وقت تک کام لیا ہے ہم تم دونوں نے۔ ڈاکٹر اور نرس کی یہ طرز گفتگو ! اگر جو کوئی سن پاتا تو ؟"

"سچ" کو ذرا کھینچتے ہوئے مسکرا کر کنول نے جواب دیا "واقعی کچھ دھیان ہی نہیں رہا۔ اچھا تو پکچر پیلس میں۔"

"کنول پیاری۔ کیا بتاؤں اپنا بس نہیں چلتا۔ ورنہ میں ڈاکٹری کی سند پھاڑ کر پھینک دیتا۔ اور تم کو لیکر کہیں بھاگ جاتا۔ کاش سماج مجبور نہ کرتا کہ دو محبت کرنے والے دل بھی اس کے واہیات خرافات قانون کی پابندی کو تسلیم کریں !"

"موہن۔ یہ کیا کہہ رہے ہو ؟ سماج کے پنجے سے کوئی نکل بھاگ کب سکتا ہے ! مگر آخر یہ بے صبری کاہے کی ؟ جہاں اتے (اتنے) دن کٹ گئے۔ تھوڑے اور کٹ جانے دو۔ پھر تو کام پر لگتے ہی۔ نقد القدر مہینہ کے کہیں جاتے ہیں ؟"

"اے ظالم۔ تجھے کیا خبر کسی کے دل پر کیا گزرتی ہے ؟ وہ تو میرا ہی دل جانتا ہے ! یہاں دن بھر کھپ کر بسر کیا۔ تھکے ہارے بستر پر دراز ہوئے تو کوئی غم غلط کرنے والا نہیں جس سے اپنا دو گھڑی دل بہلے۔"

"کہاں۔ آخر یہ دوست احباب کی تو آج ظفر موج کیا تنا بھی نہیں کر سکتی ؟"

"کنول۔ کہہ تو دیا کہ یہ سب اگلے زمانوں کی باتیں ہیں۔ دوست کہاں کے دوست ؟ کس کے دوست ؟ یہ برادران یوسف ! سب کے سب بھیڑئیے ہیں بھیڑئیے ! ع زیچ ہی ڈالیں جو یوسف سا برادر پائیں ! دنیا خود غرض ہے۔ سب مطلب کے یار ہیں۔ مجھے ہر اس شخص سے وحشت ہوتی ہے جو دوستی کا مدعی ہوتا ہے !"

"موہن پیارے۔ تمہاری باتیں بہت عجیب ہوا کرتی ہیں۔ پہلے تو میں سمجھا کرتی تھی کہ تم یونہی واہی تباہی مجھے ستانے کے لئے بکا کرتے ہو۔ مگر آج اس رام دیال کی حرکت نے میری آنکھیں کھول دیں۔ کیا واقعی اگلے لوگوں کی نصیحتیں سب بالکل غلط ہیں ؟ اگر انسان ہی انسان کا دکھ درد نہیں سمجھتا تو پھر کائنات کو کیا پڑی ہے ؟"

"رام دیال ؟ کون رام دیال ؟ اچھا وہی پھول وتی کا شوہر ؟ ..... مگر کچھ ضروری نہیں کہ اس کے بارے میں تمہارا خیال صحیح ہی ہو ! پھول وتی کی خوبصورتی۔ اس کی تکلیف وہ حالت 'اور حسرتناک موت' ان سب باتوں نے مل جلکر تمہارے دل میں اس کے لئے اتھاہ ہمدردی پیدا کردی ہے، جس کا نتیجہ ہے کہ تم رام دیال کی سُنے بغیر اس کے متعلق رائے قائم کرنے میں کوئی ہچکچاہٹ محسوس نہیں کرتیں۔ کیا معلوم بات دراصل کیا ہو ؟"

"جناب ڈاکٹر صاحب (شرارت سے) آپ کو رام دیال کی طرف سے وکالت کرنے کی کیا فیس ملی ہے ؟ مگر آپ تو وکیل بیرسٹر ہیں نہیں۔ وہ ہمارے ڈاکٹر کے ڈاکٹر !"

"کنول ! اگر تم نے اس طرح میری باتوں پر طنز کیا تو پھر سمجھ لو

اس کا جواب۔ ممکن ہے کہ تمہاری یہی چھیڑ کی بات مجھ سے ضبط کا سہارا لے لے اور میں ــــ محض داد دینے کے طور پر ــــ"

موہن اپنا جملہ ختم نہ کر پایا تھا کہ کنول نے اس کی طرف سے منہ پھیر کر خاص انداز سے مسکرا کر کہا کہ "مادِف اعضا چھری چلانے والے کا اتنا دل گردہ نہیں کہ تندرست جسم میں سوئی بھی چبھو سکے۔ چلو چلو رہنے دو اپنی دھمکیاں۔ کوئی ڈرتا تھوڑے ہی ہے"؟

موہن نے ہنستے ہوئے یوں اچانک موٹر کو بریک دیا تو موٹر نے زور سے ہچکولے کھائے اور ڈر کر کنول موہن سے لپٹ کر چیخ اٹھی۔ ڈاکٹر نے کولی بھر لی۔ اور خوب کھلکھلا کر ہنس پڑا۔ کنول خفیف ہو کر رہ گئی۔ اور ظاہراً غصہ کی شکل بنا کر بولی۔

"توبہ توبہ! کیسا ڈرا دیا! میں سمجھی ایکسیڈنٹ (حادثہ) ہوا کیا؟ چھوڑو گے بھی؟ مجھے ایسی باتیں اچھی نہیں لگتیں۔ کیا بے شرمی ہے۔ سرِ راہ بھی کوئی ایسا مذاق کرتا ہے؟ واہ واہ"۔

موہن نے گرفت ڈھیلی کی تو کنول ہاتھوں کے حلقے سے نکل کر ذرا دور کھسک گئی۔

"اوں! پھر وہی حرکت؟ سیدھی سے قریب جیسے بیٹھی تھی بیٹھی رہو۔ نہیں ابکے میں سچ مچ ایکسیڈنٹ کئے بغیر نہ رہوں گا! سُن لیا؟"

"موہن۔ ایسی باتیں نہیں کیا کرتے۔ ع فرقِ فال بد کا دردِ حال ہو! بعض وقت تمہاری باتوں سے مجھے خوف سا معلوم ہونے لگتا ہے۔ میں خدا سے دعا کرتی رہتی ہوں کہ خدا تمہارے دل کو نرم ہی رکھے اور دوسروں کے دکھ درد کے صحیح احساس سے محروم نہ کرے"۔

"بھئی واہ۔ ع لاکھ طوطے کو پڑھایا پر وہ حیوان ہی رہا! بار بار جھک مارنے کا یہی نتیجہ نکلا نا کہ پھر وہی پرانی طوطا کہانی تم نے شروع کر دی۔ نرم دلی یا دوسروں کے دکھ درد کا احساس کیسا اوقات بزدلی کا بدلا ہوا نام ہوا کرتا ہے۔ سُنو! میرے ابا جان خدا ان کی روح کو نہ شرمائے۔ وہ بھی ڈاکٹر تھے اور بڑے نیک نام۔ آدھے سے زیادہ مریضوں کی خدمت مفت ہی کیا کرتے تھے۔ رہ گئی آدھی تعداد مریضوں کی۔ ان سے جو کچھ وصولی ہوتا تھا اس میں سے بھی معقول حصہ غریب غربا کی نذر کر دیتے تھے۔ کہو گی کہ بڑے اچھے آدمی تھے! ۔ کیوں کہو گی نا؟"

"بیشک۔ ایسے دیالو اور ہمدردِ نوعِ انسان کے بھی اچھے ہونے میں کوئی کلام ہو سکتا ہے؟"

وہی تو ہم نے بھی کہا تھا۔ کہ تم کیا ہر وہ شخص جو سنی ہوئی کو بے سمجھے بوجھے نقل کر دینے کا عادی ہے یہی کہے گا۔ مگر سُنو مجھ سے۔ میں ابا جان کے اس فعل کو "بزدلی" اور "خود غرضی" پر منحصر سمجھتا ہوں........ ٹھہرو ٹھہرو۔ درمیان سے بات نہ کاٹو۔ پہلے پوری بات سن بھی تو لو۔ ابا جان تو سب کا شکریہ قبول فرماتے ہوئے اور اپنی شان میں قصائد سنتے ہوئے باطمینان تمام خوش و خرم بسر کرتے رہے۔ وہ تو والدہ غریب سے کوئی پوچھتا کہ وہ کس مصیبت سے گھر چلاتی تھیں۔ کن کن چیزوں کو وہ زندگی بھر ترستی ہی رہیں۔ اور جب ابا جان فرشتوں سے بھی اپنی ثنا صفت سُننے کی امید میں جنت کو سدھارے تو سوائے قرضوں کے کچھ اور بھی پلے میں چھوڑا؟ بھلا یہ بھی کوئی کامیاب زندگی ہوئی؟ تم کو معلوم ہم نے کس کس مصیبت سے تعلیم حاصل کی۔ یہی تو وجہ ہے کہ میں اس وقت بھی نیکی پر دل سے عمل کرنے کو تیار رہوں مگر اتنی ہمت نہیں پاتا کہ ع دل ناخدا ہیم

"بسم اللہ کہہ کر تمہارا ہاتھ پکڑوں اور نکل جاؤں اس طرف جدھر سینگ سمائے۔"

"تو کون کہتا ہے ایسا کرنے کو؟"

"یہی کمبخت دل، جس کو تمہاری ہنستی ہوئی آنکھیں اور رس بھرے ہونٹ ورغلاتے رہتے ہیں!"

"کالج کی تعلیم واقعی غلط نتائج پیدا کرتی ہے۔"

"این چہ شد؟ من چہ می سرایم و طنبورہ من چہ می سراید؟ یعنی چہ۔ یہ کالج کی تعلیم سے ہماری باتوں کو کیا واسطہ؟"

"کچھ بھی نہیں! بس یہی کہ جب تک کالج نہ تھے مرد ہی ورغلا کر عورت کو......" ایک دفعہ پھر جملہ ختم نہ ہونے پایا۔ اور موٹر ہچکولے کے ساتھ فل اسٹوپ! اکیلے کنول غافل نہ تھی۔ پھرتی سے دروازہ کھول کر سڑک پر۔ دوسری طرف سے موہن اتر کر موٹر کا طواف کر کے آنے لگا۔ کنول سڑک چھوڑ کر دیہاتی جگہ کے میدان میں دوڑ پڑی۔ موہن نے تھوڑی ہی دور پر اسے جالیا۔

"اب ہے شرط۔ کہ قرار واقعی گوشمالی دی جائے۔ نرس ہو کر ڈاکٹر سے بدگستاخی؟ کیوں"

"جائیے جائیے، آپ رپورٹ کرنے کے سوا اور کر ہی کیا سکتے ہیں؟ ہے ہمت تو کیجئے نا رپورٹ؟ نہیں۔ کہئے میں ہی رپورٹ کر دوں۔ کہ ہسپتال میں اپنی نرسوں کو ورغلانے والا اور دھمکیوں کے ذریعہ سے کام نکالنے والا ڈاکٹر اپنے کیفر کردار کو پہنچ رہے؟ ہے اجازت؟"

"میں دیکھتا ہوں۔ سیدھی طرح تم نہ مانو گی! اچھا۔ ذرا اس امیدواری کے دن خیر سے گذر جائیں۔ تو میں بھی بتلاؤں گا کہ ع

صبر تلخ است ولیکن بر شیریں دارد۔ لو۔ چھوڑے دیتا ہوں کہ تم بھی

"نہ کھوج کیوں مرے جاتے ہو دو دن کے لئے"

"چلئے چلئے۔ ورنہ موٹر کوئی لے بھاگے گا"

اسی طرح ہنسی خوشی موہن اور کنول کے دن کٹ رہے تھے آج پھر سینما کے بجائے سیر کی صلاح ٹھہری تھی کہ آپریشن تھیٹر میں موقع پا کر چپکے سے موہن نے کہا:۔

"آج کا پروگرام کینسل! کیپٹن داس نے رات کے کھانے پر مدعو کیا ہے۔ ان کی صاحبزادی تعلیم ختم کر کے تشریف لائی ہیں نا۔ مجھے جانا ضروری ہے۔"

"وہ کیوں"؟

"وہ اس لئے کہ کیپٹن داس اس کمیٹی کے پریسیڈنٹ ہیں جو امیدواروں کا انتخاب کرے گی۔ اور یہ حضور کا خادم ان کو ناراض کر کے اپنے دل کی ملکہ کو حاصل نہیں کر سکتا! سمجھیں؟"

"ہاں سمجھ گئی۔ مگر مس داس ہیں کیسی؟"

"الٰہی خیر۔ ابھی سے سوتیا ڈاہ شروع ہو گیا۔ میں ابھی زیارت سے مشرف نہیں ہوا ہوں۔ لیکن سرکار اطمینان رکھیں۔ رجسٹری شدہ دستاویز میں تغیر و تبدیل ممکن نہیں ع پھروں میں تجھ سے تو مجھ سے مرا خدا پھر جائے!"

دوسرے ہی دن کیپٹن مع اپنی صاحبزادی کے اس وارڈ میں گھومتے ہوئے پہنچے جہاں منجملہ دیگر ڈاکٹروں اور نرسوں کے موہن اور کنول بھی کام کر رہے تھے۔ سول سرجن انچارج کی آمد معلوم کر کے ایک سنسنی سی پھیل گئی تھی۔ اور سب لوگ اپنے اپنے فرائض منصبی میں منہمک تھے کہ "ہلو ڈاکٹر موہن لال" کی زنانی کومل ہوئی آواز سن کر کنول چونک پڑی۔ سر اٹھا کر دیکھا تو ایک شہزادیوں سا وقار و تمکنت والی پیکر جمیل ان کے موہن پر برقا

تبسم تھی۔ ادھر موہن کی بھی باچھیں کھلی ہوئی تھیں، اور وہ
پوری طرح اس کی پزیرائی میں مصروف تھا۔

مس داس:۔ "ڈاکٹر لال! ابا جان غریب کو مریضوں
سے فرصت ہی نہیں۔ کیا آپ بھی انہیں کی طرح
عدیم الفرصت بنتے ہیں؟"

موہن:۔ "نہیں تو۔ یہاں کے مقررہ اوقات کے بعد مجھے
فرصت ہی فرصت ہے۔ ہم جونیروں کی پریکٹس
تو کچھ ہوتی نہیں کہ عدیم الفرصتی کا رونا روئیں۔"

مس داس:۔ "مجھے یہاں کے مشہور مقامات کے دیکھنے کا بڑا
شوق ہے۔ کیا آپ اس کی زحمت گوارہ فرمائیں گے
کہ......"

کیپٹن داس:۔ "موہن بابو! واقعی مجھے فرصت نہیں، اور
سوشیلا جان کھائے ہوئے ہے۔ کسی دن آپ
اس کو دو چار جگہیں دکھلا لایئے تو مجھ پر احسان ہو۔"

موہن:۔ "مس داس کا حکم ہی کافی تھا۔ اب حضور نے عزت
افزائی فرمائی تو اور بھی میرا فرض ہو گیا۔ جب حکم ہو
بسر و چشم حاضر ہوں۔"

کیپٹن داس:۔ "آج آپ کس وقت فرصت پائیں گے؟"

موہن:۔ "دوپہر بعد میری ڈیوٹی نہیں ہے۔ کھانا کھا کر
حاضر ہو سکتا ہوں۔"

مس داس:۔ "اگر کوئی مضائقہ نہ ہو تو کھانا ہم لوگوں کا ساتھ
[illegible] رہا ہو۔ ابھی تو میں بھی اسپتال اچھی طرح دیکھوں گی،
اس کے بعد ابا جان جب جانے لگیں گے۔ تو آپ
بھی شامل ہی چلیے نا۔"

موہن:۔ "بہت مناسب۔ جیسی مرضی۔"

کنول کے ہاتھ سے اُدنار جھنکار کے ساتھ چھوٹ گرے۔ اُنکے
لئے یہ سین ناقابل برداشت ہو گیا تھا۔ سب کے سب یکبارگی چونک
پڑے۔ بے ساختگی میں موہن دوڑ پڑا۔ اور انتقال ذہنی سے
کام لیتے ہوئے اُس نے آنکھ ماری۔

"سسٹر میں صبح سے تم سے کہہ رہا ہوں کہ تمہاری طبیعت
اچھی نہیں۔ لاؤ سک رپورٹ (Sick Report) رپورٹ کر دو۔
مگر تم کو کام کرنے پر مصر پا کر مجبور رہا۔ اب ضد نہ کرو اور جاؤ آرام کرو۔"

کنول وہاں سے نکل بھاگی۔ کیپٹن اور مس داس کو رخصت
کرکے موہن نے اس کو غلام گردش (کاریڈور) میں جا لیا۔

"کنول اگر تم اپنے کو سنبھالو گی نہیں تو بنتا ہوا کام بگڑ جائیگا۔
ہزار بار تم سے کہہ دیا کہ کیپٹن داس کے ہاتھ میں ہے کہ ہم تینوں
امیدواروں میں سے جس کو چاہیں وہ نامزد کر دیں۔ پھر میں اُن
کو راضی نہ رکھوں تو کیا کروں؟ تمہیں بتاؤ؟"

"معاف کر دو۔ موہن۔ مجھے اپنی کمزوری کا بہت افسوس ہے
مگر کیا کروں۔ سوشیلا بلا کی حسین ہے اور میں ڈرتی ہوں۔ اچھا
جاؤ۔ خدا حافظ۔ خدا نگہبان!"

دوسرے دن میٹرن نے کہا کہ "آج ایک بہت ہی پیارا
بچہ [illegible] آیا ہے۔ اس کے ساتھ رات کی ڈیوٹی کیلئے
کنول کا انتخاب ہوا ہے۔ اس لئے کنول۔ تم جا کر اس وقت سے
سونے کی کوشش کرو اور کھانا کھا کر نو بجے شب سے آجاؤ۔"

"کس کا لڑکا ہے" کنول نے پوچھا۔۔ "مسٹر رام دیال سیٹھ
کا۔" میٹرن نے جواب دیا۔ رام دیال نام کنول کو سنا ہوا سا
معلوم ہوا۔ اور وہ اس کو سوچتی ہوئی اپنے کوارٹر کی طرف روانہ
ہو گئی۔ آخر اس کو وہ سب گذشتہ باتیں یاد آتی گئیں۔ پھولی [illegible]

کے نازک نازک خط و خال حسین و جمیل چہرہ مہرہ لیے لیسی کی موت، اور شوہر کی شقاوت قلبی۔ "رام دیال" کہیں وہی انسان نما درندہ تو نہیں؟ رام دیال کے بچے کی تیمارداری سے اس کی طبیعت ہٹ رہی تھی کہ "بھول وتی" کی صورت اس کی آنکھوں میں گھوم گئی۔ ایسا معلوم ہوا کہ اپنے بچے کے لیے وہ التجا کر رہی ہے۔ کنول نے ارادہ کر لیا کہ "بھول وتی" کے بچے کے لیے وہ ہر ممکن کوشش کرے گی۔ آیندہ اللہ کو اختیار ہے۔

بچہ گیس ٹنٹ Gas-Tent میں کئی دن رہا۔ اور کنول اس کی فکر میں دنیا و مافیہا کو بھولی ہوئی رات دن ایک کیے ہوئے تھی۔ تیمارداری کا قرار واقعی حق اس نے ادا کر دیا۔ جیسے جیسے دن گذرتے جاتے بچہ اپنی معصومیت اور بھولی باتوں سے کنول کے دل میں گھر کرتا چلا جاتا تھا۔ مگر ساتھ ساتھ رام دیال سے اس کی نفرت روز بروز بڑھتی ہی جاتی تھی۔ کیونکہ اس نے اپنے قبل و بعد والی نرسوں سے پوچھ کر دریافت کر لیا تھا کہ اپنے اس معصوم بچے کو کبھی وہ دیکھنے نہیں آیا تھا۔ کئی دن کے بعد رام دیال آیا اور بچے کے بہلائے ہوئے چہرے کو دیکھتا رہا۔

"اب کیا آئے بابو جی؟ گیس ٹنٹ سے ہم کو مس صاحبہ نے بڑی محنت کر کے نکالا!"

"بیٹا۔ میں آسام میں تھا۔ ابھی تو آ رہا ہوں۔"

باپ بیٹے کو بات کرتا چھوڑ کر آج کنول وارڈ میں اس امید کو لیے ہوئے پہنچی تھی کہ موہن سے موقع ہو تو وہ باتیں ہی کر لے وہاں نہ پا کر وہ آپریشن تھیٹر میں گئی۔ وہاں سے مایوس آفس میں آئی۔ تو ایک دوسری نا آشنا نرس نے انجام نہ جانتے ہوئے اس سے کہا۔

"کنول۔ تم نے سنا تم نے؟ کیپٹن داس کی صاحبزادی کی شادی ہو گئی!"

"کب؟ کس سے؟"

"آج ہی تو دولہا دولہن "ماہ عسل" منانے کشمیر گئے ہیں۔ پوچھو تو کس سے شادی ہوئی ہو گی؟"

"لو۔ میں کیا جانوں کس سے ہوئی؟"

"اسپتال کے سب سے خوبصورت ڈاکٹر سے اور کس سے! ڈاکٹر موہن لال سے۔"

"غیر ممکن! جھوٹ کیوں بولتی ہو"

"مجھے جھوٹ بولنے سے کیا غرض؟ جس سے چاہو پوچھ لو۔ اور میں پوچھتی ہوں کہ آخر غیر ممکن کیوں؟"

اس بات کا یقین آتے ہی کنول کے پاؤں کے نیچے سے زمین نکل گئی۔ اس کو ایسا معلوم ہوا کہ آسمان و زمین دونوں ٹکرا کر پاش پاش ہوئے جاتے ہیں۔ دل ایک دفعہ زور سے دھڑک اٹھا اور پھر ڈوبنے لگا۔ دماغ معطل ہوتے ہوتے ایکبارگی بجلیاں گرانے لگا۔ ان متضاد کیفیتوں میں اس نے پاگلوں کی طرح ہنسنا شروع کیا۔ ہنستے ہنستے رکتی تو بے سر و پا بکنے لگتی۔ پھر زور سے قہقہہ لگاتی۔ پھر غزل قافیہ شروع کر دیتی۔ پھر ٹھٹھے مارتی۔ اس کی ساتھی نرس تو گھبرا گئی تھی اور وہ یا تو مدد کے لیے چیخ اٹھتی یا وہاں سے بھاگ جاتی۔ کہ رام دیال نے بروقت پہنچ کر کنول کو پہلے تو دونوں بازو پکڑ کر زور سے جھنجھوڑا اس کے بعد صرف اتنا کہہ دیا کہ "شام تم کو ڈھونڈ رہا ہے۔" کنول کو جیسے ہوش آ گیا۔ اس نے اپنے کو سنبھالا اور بھاگتی ہوئی شام کے پاس پہنچی۔

رام دیال:۔ "میں چاہتا ہوں کہ بچے کو گھر لے جا کر رکھوں۔ بشرطیکہ آپ اس کے ساتھ چل کر کچھ دن اس کو سنبھال دیں۔

وعدہ کریں"۔

کنول تو خدا سے چاہتی تھی کہ اسپتال سے کسی طرح بھی چھٹکارا حاصل ہو۔ کیوں کہ یہاں گوشہ گوشہ میں اس کو اپنے دل پاش پاش کے صدہا ٹکڑے بکھرے نظر آتے تھے اور تکلیف دہ یادِ ماضی ان کو روندتی ہوئی گزر جانے پر بیدردی کے ساتھ مصر تھی۔ لہٰذا اس نے بلا حیلہ و حجت اس کو منظور کر لیا اور بچہ کے ساتھ اس کے گھر آ گئی۔

"کنول" مرجھائی ہوئی کلی کی طرح مجسمۂ اداسی ہو کر رہ گئی تھی۔ صرف بچہ سے وہ کسی قدر شگفتگی کے ساتھ پیش آتی تھی۔ قدرے ہنس بول لیا کرتی تھی۔ ورنہ تصویرِ حرمان و پیکرِ مایوسی بنی ہوئی۔ خدائی سے بیزار، اپنی سخت جانی سے عاجز۔ دن بدن گھلتی ہی چلی جاتی تھی۔ رام دیال نے ہزارہا جتن کئے۔ گھر کے کل لوگ کوشش میں تھک مرے۔ مگر کنول کے دل میں خوشی کی لہر دوڑانا تو رہا دور۔ اس کے سوکھے ہوئے ہونٹوں پر مسکراہٹ بھی تو کبھی نہ دوڑی۔ آخر سب نے عاجز ہو کر اس کو اس کے حال پر چھوڑ دیا۔ دنیا بہت دن غم والم کا ساتھ نہیں دیا کرتی۔

"لالہ جی۔ اب شام بالکل تندرست ہے۔ میں کل یہاں سے جانا چاہتی ہوں"۔

"نہیں۔ یہ کیسے ہو سکتا۔ شام آپ سے بہت مانوس ہو گیا ہے وہ اس کو برداشت نہیں کر سکے گا۔ ابھی اس کو آپ کی ضرورت ہے"۔

"شام مانوس ضرور ہے مگر آج نہیں کل مجھے جانا ہی ہوگا تو پھر کیوں نہیں ابھی؟ رہا ضرورت تو شام کو اب میری قطعی ضرورت نہیں ہے"

"شام کو آپ کی ضرورت نہ بھی ہو تو آپ کو شام کی ضرورت ہے!"

"آپ شاید سمجھ رہے ہیں کہ شام سے مجھے ایسی محبت ہو گئی ہے کہ اس کی جدائی میں پریشان ہوں گی؟ تو آپ غلط سمجھتے ہیں۔ مجھے دنیا میں کسی سے محبت ہو ہی نہیں سکتی ہے۔ نہ کسی کی جدائی مجھے پریشان کر سکتی ہے"۔

"کیوں؟ کیا آپ آدمی نہیں؟"

"جانے دیجیے بحث مباحثہ کو کہہ تو دیا کہ میرا کیا حال ہے۔ لہٰذا اب اصرار فضول ہے میں کل چلی جاؤں گی"۔

"اچھا آپ کی خوشی! میں آپ سے صرف اتنی التجا کرتا ہوں کہ دو مہینہ اور آپ قیام کرنا گوارا کر لیں۔ کیونکہ آپ دیکھتی ہیں مجھے کاروبار سے مطلق فرصت نہیں ملتی۔ اور سوائے آپ کے شام کا خبرگیراں کوئی نہیں۔ دو مہینے کے بعد میری بہن آنے والی ہے۔ وہ آ جائے تو پھر آپ جا سکتی ہیں"۔

"خیر دو مہینے کے لئے میں ٹھہر جاتی ہوں مگر اس کے بعد میں نہیں مانوں گی"

دوسرے دن دو آدمیوں کے بیٹھنے والی ایک نئی موٹر برسا[تی] میں کھڑی تھی۔ کنول کو خود چلانا آتا تھا۔ اسی پر شام کو صبح شام سیر کرایا کرتی تھی۔ ایک دن بادل گھرے ہوئے تھے سردی شروع ہو چکی تھی۔ معمولی سویٹر پہنائے ہوئے شام کو لیکر کنول شہر کے باہر دریا کنارے لے گئی۔ دریا سے پانی آ[کر] ایک گڑھے میں جمع تھا۔ اس پر جھکا ہوا شام کاغذ کی ناؤ بنا[کر] پانی میں ڈال رہا تھا ہونے والی بات دفعتاً اس کا پاؤں پھ[سلا] اور وہ پانی میں گر پڑا۔ کنول کی چیخ سن کر پاس کے دیہات

دھڑ کر نکالا۔ تو چوٹ ووٹ تو کچھ نہیں تھی، مگر شام سردی سے کانپ رہا تھا۔ اسی طرح شرابور اس کو لیکر کنول موٹر پر روانہ ہونے لگی تو لوگوں سے پوچھا کہ یہاں پر کوئی ڈاکٹر واکٹر ہے۔ شہر سے اُلٹی طرف قریب میں ایک ڈاکٹر کا پتہ معلوم کر کے وہ ادھر ہی چل پڑی۔ ڈاکٹر کے دروازہ پر نام جو دیکھا تو "ڈاکٹر رام لال" لکھا ہوا تھا۔ کنول کا ضمیر کہہ رہا تھا کہ شام کے لئے ضروری ہے کہ جلد سے جلد اس کے کپڑے اُتارے جائیں اس کو گرمایا جائے اور ڈاکٹر کی خدمات اس کے لئے حاصل کیجائیں۔ مگر کنول کا نسوانی غرور کسی تک ڈاکٹر رام لال تک اس کو جانے نہیں دیتا تھا۔ آخر غرور نفس ہی غالب آیا اور پلٹ پڑی۔ گھر تک اسی بھیگے کپڑے اور تیز ہوا کے جھونکے کھاتے ہوئے آنے کا جو نتیجہ ہو سکتا تھا وہی ہوا، یعنی بخار آیا جو نمونیہ کا پیش خیمہ ثابت ہوا۔ کنول اپنے نفس کو ہزار نفرین و لعنت کرتی ہوئی۔ تیمارداری میں اسی طرح مشغول ہو گئی۔ بارے اللہ نے فضل کیا۔ ڈاکٹر نے شام کو جس دن خطرے سے باہر پایا اس دن کنول اٹھ کر اپنے کمرے میں سونے کو گئی، وہاں اس کو آئینہ میں اپنی تھکی ہاری صورت نظر آئی تو اپنی ہی صورت سے مخاطب ہو کر کہنے لگی۔

"ابھاگن! تو نے اپنے ضمیر کی آواز کے خلاف ایک معصوم کی جان لینے میں کونسی کسر اٹھا رکھی تھی؟ وہ تو خدا نے فضل کیا ورنہ شام کے دشمنوں کا کیا کچھ نہ ہو گیا ہوتا۔ تو بزدل ہے۔ رام لال سے سامنا کرنے ڈری۔ اور محض اتنی سی بات کے لئے تو نے کیا کیا؟ سوچ تو کمبخت! تجھے کوئی حق حاصل ہے کہ اسکے بعد بھی اس گھر کا نمک کھائے!"

انہیں خیالات میں غلطاں پیچاں وہ لگی ایک اٹیچی میں اپنے کچھ کپڑے سمیٹنے۔ اس سے فرصت پا کر وہ بیٹھی انتظار کرنے لگی کہ سب لوگ سو سلا جائیں تو وہ چپکے سے نکل کر کہیں چل دے۔ جب سناٹا ہو گیا تو وہ بس سنبھال کر چلی۔ چونکہ بچے کی بیماری کی وجہ سے اکثر کمروں اور سائبانوں میں تمام شب بجلی جلتی ہی رہتی تھی اس لئے سیٹھ رام دیال کے آفس میں روشنی دیکھ کر اس کو گمان بھی نہ ہوا کہ سیٹھ جی بیٹھے ہونگے۔ جب وہ سامنے سے گزری تو سیٹھ جی نے پکار کر پوچھا۔

"کنول بائی! یہ بکس لیکر اس وقت کہاں چلیں؟"

"جہاں قسمت لے جائے۔ میں نے کوئی رائے نہیں قائم کی ہے کہ میں کہاں جاؤں گی۔ میری وجہ سے شام کی جان کے لالے پڑ گئے۔ اب مجھے کوئی حق یہاں ٹھہرنے کا نہیں ہے۔"

"اچھا آپ جانا چاہتی ہیں تو چلی جائیگا۔ مگر کوئی ہرج نہ ہو تو ذرا دیر کے لئے بیٹھ جائیے۔ مجھے کچھ اپنے متعلق آپ سے کہنا ہے"

"اپنے متعلق؟ مجھ سے؟ — کیا کہئے گا؟ کہئیے؟"

"پہلے یہ تبلائیے کہ آپ نے اس پر غور فرمایا کہ شام کے بارے میں آپ سے کیوں یہ غلطی ہوئی؟"

"غور کیوں نہیں کیا؟ سوائے بدنفسی کے اور کوئی سبب نہیں ہو سکتا۔"

"معاف کیجئے۔ مجھے آپ کی رائے سے اتفاق نہیں ہے کیوں اتفاق نہیں ہے۔ اس کو پھر بتاؤں گا' پہلے آپ مجھ سے میرا قصہ سن لیجئے۔ آپ کو معلوم ہے، میری بیوی خاصی خوبصورت تھی۔ شام کی ماں سے مجھے بہت محبت تھی......"

"کیوں جھوٹ بولتے ہیں سیٹھ جی! آپ کو خاک محبت اُس غریب سے نہیں تھی! ہاں پھول وتی کی خوبصورتی کے متعلق آپ کا بیان سچ ہے!"

"آپ کیا جانیں پھول وتی کو؟"

"واہ۔ میں بھلنے تو آپ کو اسپتال میں اس کی اطلاع دی تھی۔ مگر اس وقت تو آپ کی محبت ہوا کھانے گئی ہوئی تھی جس طرح بے رخی سے آپ پیش آئے تھے۔ میں تو کبھی نہیں بھول سکتی! توبہ!! توبہ!!"

"سنیئے تو آپ کو معلوم ہے نا وہ موٹر کے حادثہ سے مری؟ یہ بھی جانتی ہو کہ وہ اس دن موٹر پر میرے رقیب کے ساتھ بھاگ نکلی تھی۔ مجھ سے اس کا دل علٰحدہ ہو گیا تھا۔ دوسرا مرد اُسے پسند آیا تھا اس کی شکایت نہیں مگر شام تو معصوم تھا نا۔ اس سے ―― اپنی کوکھ کے بچے سے ―― اس نے بے رخی کی۔ خدا نے بدلا لے لیا!"

"دیکھیئے گا وہ خط جو وہ لکھ کر گئی تھی؟"

"نہیں اس کی ضرورت نہیں ―― اور بھی کچھ کہنا ہے آپ کو؟"

"بہت کچھ۔ ابھی تو تمہید ہی پر ہوں۔ اصلی مدعا تو آگے آتا ہے۔ تو خیر۔ اس واقعہ کا مجھے بہت صدمہ ہوا۔ بیوی کی نفرت کا نتیجہ یہ ہوا کہ مجھے "عالم بیزاری" کا مرض ہو گیا۔ اور اپنی ذات کے سوا کسی سے ہمدردی کرنا فعل عبث معلوم ہونے لگا۔ اور قریب تھا کہ میں کسی کام کا نہ رہوں کہ آپ کا واقعہ پیش آیا جس سے میری آنکھیں کھل گئیں۔"

"میرا واقعہ؟ میرا واقعہ کیسا؟"

"جس دن آپ کو اور شام کو ہم اسپتال سے یہاں لائے تھے اُسی دن آپ پر کچھ گزر رہا تھا؟ کہیئے ہاں! میں نے جو آپ کی حالت دیکھی اور آپ کی سہیلی نرس کی گفتگو سنی تو اُسی وقت میں سمجھ چکا تھا کہ ڈاکٹر رام لال اور آپ کا کیا معاملہ تھا اور کس طرح وہ آپ کے لئے تکلیف دہ ثابت ہوا۔ آپ نے بھی میری ہی طرح خود اپنی ہمدردی سے کام رکھا۔ اسی پر طبیعت کا زور صرف ہوا۔ اس لئے مظلومیت کے پردہ میں ظلم کے ناخن تیز ہوتے رہے۔ "عالم بیزاری" کی مشق اپنی ذات سے نفرت کے دھوکے میں بڑھتی چلی گئی۔ حالانکہ تم کی انتہا دوسروں کے ساتھ ہمدردی کی ابتدا ہوتی ہے۔ اگر آپ اس طرح اپنے سے بیزار ہونے کے دھوکے میں نہ ہوتیں تو ضمیر کی آواز صدا الصحرا ثابت نہ ہوتی۔ آپ اپنی خودداری کو پس پشت ڈال کر شام کی جان کو خطرہ میں ڈالنے کے بجائے۔ اگر ضرورت ہوتی تو ڈاکٹر رام لال کو معاف کر دیتیں! معاف کیجئے گا میری صاف گوئی کو۔ آپ کو جانے سے میں نہیں روکتا۔ مگر اتنا ضرور کہوں گا۔ کہ خود رائی آپ کو دھوکا دے چکی ہے۔ ایسا نہ ہو کہ اسی کے کہنے میں آکر پھر پچھتانا پڑے۔"

کنول کی آنکھوں سے گنگا جمنا جاری تھی۔ ہچکی بندھ گئی تھی۔ آخر جب قدرے سکون ہوا تو کہنے لگی:۔

"سیٹھ جی! میں آپ کا احسان مانتی ہوں آپ نے میرے دماغ کی تاریکی میں روشنی بخشی۔ میرے لئے راہ دل کی راہ کشادہ کی، اگر میری جان بھی آپ کے کام آئے تو مجھے انکار نہیں ہو سکتا۔ میں غلط روی کی عادی ہو کر ممکن ہے صحیح رستے پر نہیں چلی۔"

"یہی خطرہ مجھے بھی ہوا کرتا ہے۔ کیا اچھا ہو کہ ہم ایک دوسرے کی نگرانی ترتی سے منظور کریں۔ اور باخود ہا کی تنقید سے "بیزار نہ ہوا کریں۔"

"میں تو بیزار نہیں۔ آپ اپنے دل پر غور کیجئے۔"

"اگر بیزاری آپ کو نہیں رہی تو کیا آپ سمجھ سکتی ہیں کہ میں اندھا ہوں"؟

"یہ کیا کہتے ہیں آپ؟ آپ اندھے کیوں ہونے لگے"

"مگر آپ نے ابھی تک مجھے صاحب نظر ہونے کی بھی

پنج بیتی بطرزِ قاآنی

(ادارہ)

بہاریں سہو ہو چکیں، نہ شوق و ولولہ رہا — خزاں سہتے زندگی کی اب نہ دل میں حوصلہ رہا
دو نصفِ حالِ دہر تھا، تو میں بھی دو دلہ رہا — کبھی تو ایسا بھی ہوا کہ میرِ قافلہ رہا
قریبِ منزل آتے ہی مگر شکستہ پا رہا

رہین جورِ آسماں، یہ سب کا خاکِ پا رہا — خوشی و خرمی کجا، غموں میں مبتلا رہا
محرم اور عید میں، نہ فرق کچھ ذرا رہا — شبِ برات حلوے میں بھی زہر کا مزا رہا
ہنسی ہنسی میں پی گیا، میں تشنۂ غم بھی یا رہا

میں مردمِ سیاہِ فامِ چشمِ روزگار ہوں — رُخِ نکو پہ خال ہوں، سوادِ زلفِ یار ہوں
خمیدہ قد اگر ہوں میں تو ابروئے نگار ہوں — مژہ کسی حسین کی ہوں، اگر نحیف و زار ہوں
غلافِ کعبہ کی طرح، میں محترم سدا رہا

کسی شمار میں نہ تھا، جو میں تو کیا حسد نہ تھا — خدا ہی جانے کیا تھا میں، خدا سے جب جدا نہ تھا
ہدایتوں کے واسطے، کوئی رہِ ہدیٰ نہ تھا — کہ سار بانِ شوق کے بھی ذہن میں حُدیٰ نہ تھا
تو اپنی آپ نزہتوں سے میں ہی کھیلتا رہا

یہ کھیل بھی عجیب تھا، کہ ہار جیت کچھ نہیں — جو آئینہ میں تھا کوئی، وہ میرا میت کچھ نہیں
نظر سے جب نظر لڑی، تو چینہ جیت کچھ نہیں — انوکھی ریت دیکھیے، کہ تھی پریت کچھ نہیں
جو ٹوٹا دل کا آبلہ، تو بلبلا بنا رہا

جو باہمہ صفاتِ حمد، ہم میں خود ہی آگیا — پیامِ اِنّا اپنے دھن میں آپ ہی سنا گیا
نگاہِ امتیاز سے، دلوں میں بھی سما گیا — کسی کو کچھ خبر نہیں، کہ کس کو کیا بتا گیا
مرا کمال دیکھیے، میں اس کو جانتا رہا

یہ سب مگر بھلا دیا، مجھے حوادثات نے — عبادت و عبودیت کو، کھو یا سیئات نے
حقیقتوں کی لی جگہ، فقط توہمات نے — نظر سے تب گرا دیا، مجھے بھی کائنات نے

قناعت آفریں مگر یہ محبتِ نارسا رہا

تلاش نے پیس پیس کر کیا ہے سرمہ سا مجھے ۔۔۔ عجب نہیں کہ دیدہ ور سمجھ لیں توتیا مجھے
بجھا نہ دل کو ساقیا، دو آتشہ پلا مجھے ۔۔۔ قریبِ منزل آ گیا، دکھا نہ راستہ مجھے

بس ایک ہی دو گام پر وہ دشتِ کربلا رہا

ہزار العطش کہوں، نہ کہہ بنوش ساقیا ۔۔۔ حلال خونِ دل کو کر، دے حق نیوش ساقیا
فراقِ جان و تن میں بھی، نہ کھوؤں ہوش ساقیا ۔۔۔ اتاروں سر خوشی سے میں، وبالِ دوش ساقیا

کہ اس طرح کی زندگی میں اب نہ کچھ مزا رہا

بھلا دیا ہے ظالموں نے، بدر اور حنین کو ۔۔۔ شہیدِ ظلم کر دیا، نبی کے نورِ عین کو
نہ پاؤں ڈھونڈھتا پھروں، میں ایزدی کے چین کو ۔۔۔ جو یاد بھولے سے کروں علیؓ حسنؓ حسینؓ کو

کہ آمد و شدِ نفس میں ذکرِ لا فتیٰ رہا

جو قوم ایسا کر چکی، پھر اس سے کیا بعید ہے ۔۔۔ صلوٰۃ و صوم ترک ہے، محرم اس کی عید ہے
نہ وعدوں پر یقین ہے، نہ خطرۂ وعید ہے ۔۔۔ مناقشات باہمی سے، عبرتِ مزید ہے

بس ان کے حالِ زار کا بھی حافظ اب خدا رہا

وقار و جاہ کھو چکے، معتدروں کو رو چکے ۔۔۔ یہ جاگ کر کریں گے کیا، نصیب ان کے سو چکے
درو کا وقت آ گیا، جو بونا تھا سو بو چکے ۔۔۔ جو طفل زیرِ تربیت تھے، سب جوان ہو چکے

یہ ہوتے زندہ دل تو کیا کہ جی تو بیٹھتا رہا

یہ نوجوان سب کے سب، بزرگوں سے ہیں منحرف ۔۔۔ کہ حجت اُن کی تھتھری ہے، پاس سے لیکے تا الف
نصیحتوں کی سمت ہو، توجہ کیسے منعطف ۔۔۔ کہ پڑھنے میں پڑھاتے "بٹ" زیادہ پوچھئے تو "اِف"

IF ہے BUT

امید گاہِ قوم ہیں یہی تو کہیے کیا رہا؟

ہر ایک فردِ قوم کا، ہے بیکس و نزار حیف ۔۔۔ بہار ہو کہ گل کھلے، چمن میں ہم ہوں خار حیف
وطن کے بھائی برخلاف، اس پہ صد ہزار حیف ۔۔۔ پھر انتشارِ باہمی، کہ جس پہ بے شمار حیف

نہ آج کی امید ہے، نہ کل کا اعتبار رہا

بایں ہمہ قنوط کا، کبھی نہ لیں گے نام ہم ۔۔۔ جگر کے خون سے بھریں گے اپنے دل کا جام ہم
بدل کے ایک دن رہیں گے دہر کا نظام ہم ۔۔۔ بفیضِ ساقیِ ازل ہیں فائز المرام ہم

کہ ضامنِ نشاطِ دل وہ پیرِ میکدہ رہا

وہی ہے پیرِ میکدہ، وہی ہے پیرِ میکدہ اذان جس کے حکم سے بنی صفیرِ میکدہ
زلال جس کے فیض کا ہوا خمیرِ مے کدہ کہ جا کرِ کمینہ بھی ہے جس کا میرِ میکدہ
وہ شاہِ دوجہاں مگر بصورتِ گدا رہا

وہی ہے پیرِ میکدہ، جو شاہِ مرسلاں بھی ہو مزمل و مدثر و شفیعِ مذنباں بھی ہے
درود اور سلام کا وہ مستحق جہاں بھی ہے وہیں نزولِ رحمتِ خدائے دوجہاں بھی ہے
زمیں سے آسماں تک اسی کا غلغلہ رہا

جو رام کرکے وحشیوں کو آدمی بنا گیا ٹکوں کے جو غلام تھے انہیں سخی بنا گیا
غریقِ بحرِ معصیت کو متقی بنا گیا غریب و ناتواں کو بھی وہی قوی بنا گیا
کہ کامیاب دہر میں اسی کا ضابطہ رہا

عنانِ گسستہ قوم کو کہو وَلَا تَفَرَّقُوا شبانِ خستہ دل کو ہو صلائے تازہ تو
جہاں شکستہ حال ہو کوئی بیانِ چارسو وہاں یہ مژدۂ امید دیدے پیکِ آرزو
کہ کتنے رونے والوں کو خدا ہی اب ہنسا رہا

جو اتباعِ خیر ہو، جو شر سے اجتناب ہو تو پھر کوئی عجب نہیں جو قوم کامیاب ہو
جو تیرگی میں داغِ دل مثیلِ ماہتاب ہو تو ذوق و شوق رہنما مثالِ آفتاب ہو
حسن کا قوم کو یہی غرض کہ مشورہ رہا

(بقیہ مضمون افسانہ "بیزار")

نہیں دی"۔

"کیا مطلب آپ کا؟"

"مطلب یہ ہے کہ جبتک آپ کو اصرار رہیگا کہ دنیا میں رام لال ڈاکٹر کے سوا اور کسی کو نہیں سوجھتا تو یقین کیجیے میں بیزار ہی رہوں گا"۔

کنول کی آنکھوں نے خندہ کیا۔ دل گریہ کرنا چاہتا تھا کہ ہونٹوں کے کنول کچھ کھلے کچھ کھلے اور وہ اس سے زیادہ نہ کہہ سکی:-

" آپ کے دشمن "بیزار" ہوں"

سیٹھ جی کو بھی پرواہ نہیں - اب چاہے سارا عالم بیزار ہو۔

"بہاری"

جذباتِ مبارک

حضرت مبارک عظیم آبادی

نثار تیرے بتا تیغِ یار تو کیا ہے
روا ہے خونِ دو عالم مرا لہو کیا ہے

تمہیں خبر نہیں کیا رنگِ آرزو کیا ہے
ٹپک رہا ہے جو آنکھوں سے یہ لہو کیا ہے

مصوری مجھے آتی ہے خوش جمالوں کی
یہ مجھ سے پوچھو خط و خال خوبرو کیا ہے

گزاری عمر دلِ بدگماں کو سمجھاتے
کہ ہے وہ دوست تو اندیشۂ عدو کیا ہے

شہید ناز نہ ہو تو نیاز مند نہیں
رنگے نہ تیغِ ادا کو تو وہ لہو کیا ہے

ملو ملو نہ ملو اختیار ہے تم کو
اس آرزو کے سوا اور آرزو کیا ہے

وہ سب کے ہو گئے مجھ سے الگ گلے مل کر
تو اپنا حال بتا تو رگِ گلو کیا ہے

نہ پائیگی مجھے زاہد کی چشم ظاہر بیں
وہ جانے کیا مرا ساغر مرا سبو کیا ہے

[illegible] چاٹ لے قاتل ترے نمکداں کی
ہمارے زخم کو اب حاجتِ رفو کیا ہے

ہجومِ ناز میں پایا ہے کس نے دل کھو کر
مبارک آپ کو اب اس کی جستجو کیا ہے

حقائق و معارف

از مولانا سید افقر موہانی وارثی

سبھی کافر سبھی ایمان والے / ترے صدقے خدا کی شان والے
تمہارے مصحفِ رخ کو تو دیکھیں / پھر الجھیں ہم سے یہ قرآن والے
مرے ارمانِ دل کو سن کے بولے / یہی تو ایک ہیں ارمان والے
بہت نازاں ہیں اپنی وحشتوں پر / گریباں پھاڑ کر دامان والے
مجھے بندہ بنانا کیا ہے مشکل / کریں احسان تو احسان والے
نہ پہچانا مگر تجھ کو کسی نے / اور ایسے تو ہیں سب عرفان والے
نہ دیکھیں گے نہ دیکھیں گے کسی کو / تمہاری ہاں تمہاری آن والے
کہا میں نے فدا یہ جان تم پر / کہا آئے بڑے تم جان والے
مجھے دیکھیں مری حسرت کو سمجھیں / جو بنتے ہیں بڑی پہچان والے

خبر سن کر مرے مرنے کی بولے
وہی افقر وہی موہان والے

تجھے بھی خبر کچھ ہے درمان والے / بہت اب ہیں بیتاب ارمان والے
کمی ہے ابھی لذتِ دردِ دل میں / کوئی اور پیکان پیکان والے
فرشتوں کو کیا ابن آدم سے نسبت / سمجھتے ہیں انساں کو انسان والے
اٹھاتے تھے زنداں کو کل یک بیک جو سر پر / وہ ہیں آج خاموش زندان والے
نہ دیکھیں بہارِ گلستاں کی جانب / گریباں کو دیکھیں گریبان والے
وہ ہیں آج اسیرِ قفس والے قسمت / جو کہلاتے تھے کل گلستان والے
کہا دشمنِ دیں انہیں جب تو بولے / یہی تو ہیں بس ایک ایمان والے
ذرا یہ تو سوچو ذرا یہ تو سمجھو / تمہیں جان کہتے ہیں کیوں جان والے

مرے دل میں ہیں سو بیابان افقر
بڑے قیس آئے بیابان والے

فرمودۂ رسا

از پروفیسر رسا ہمدانی۔ گیاوی ٹرپل ایم۔ اے

یہ داغِ عشق ہیں لذّت ہے ان سے جینے میں
سدا بہارِ گلستاں ہو، میرے سینے میں
شراب ہے لبِ ساقی کی میرے مینے میں
میں کیا بتاؤں مزہ جو ہے جو ٹھی پینے میں
دکھائی دیتی ہے ساقی کی آنکھ مینے میں
نہ ٹپکے کس طرح مستی شراب پینے میں
جگر میں درد، کسک دل میں، داغ سینے میں
مگر جو پوچھو تو لذّت ہے ایسے جینے میں
وہ ہم شبیہ بنا کر چھپے ہیں سینے میں
اُنہیں کے رُوپ میں ہم ہیں مزا ہے جینے میں
بس اتنی شرط ہے دے اپنے ہاتھ سے ساقی
مجھے تو عُذر نہیں ہے شراب پینے میں

اندھیری راتوں میں اکثر یہ دیکھتا ہوں میں
کہ ایک چاند ہے بے داغ میرے سینے میں

وہ قدر کرتے ہیں، دلِ سے دلِ شکستہ کی
عجیب وصف ہے ٹوٹے ہوئے نگینے میں

مجھے تو خوف نہیں احتساب والوں سے
نظر نہ آئے گا جو کچھ ہے میرے سینے میں

غلامِ ساقیِ کوثر ہوں، ناز ہے مجھ کو
ہمیشہ بادۂ کوثر ہے میرے سینے میں

یہ ان کہی ہے زباں سے میں کہہ نہیں سکتا
رسا جو سینے میں ہے وہ کہاں سفینے میں

حشرِ جذبات

از سحر طراز ثاقبؔ کانپوری

تو نے اضافہ کر دیا میرے تحیرات میں — کون کریگا فرق اب تیری صفات و ذات میں
مل نہ سکا سکون بھی عالمِ ممکنات میں — ایک ہی رنگ ہے یہاں موت اور حیات میں
قبر میں اشک شرم سے کچھ تو سہارا مل گیا — ہے یہ متاعِ آخری مرحلۂ نجات میں
میری فسردگی کا رنگ بدلیگا کس طرح یہاں — ایک ہی سوز و ساز ہے نغمۂ کائنات میں
سارے جہاں کو ہیں نصیب دہر کی کامیابیاں — میری بھی آرزو کا حل کاش ہو ممکنات میں
آنکھ کھلی جو بعدِ مرگ کھل گئیں سب حقیقتیں — کتنے فریب تھے نہاں رنگِ تعینات میں
جانتا تھا مآلِ غمِ عشق کی انتہا کا میں — یعنی صدا بھی گم ہوئی شورشِ کائنات میں
کرتا میں سجدہ کس طرح تیری حریمِ ناز کو — فرصتِ غم نہ مل سکی کشمکشِ حیات میں
تیرا مقام تھا بلند محفلِ ہست و بود میں — تو ہی اسیر ہو گیا قیدِ تعینات میں

ثاقبِ محوِ بیخودی تیرا غرور تابکے
تو ہے فروغِ یک شرر عالمِ ممکنات میں

اپنے سرشکِ خوں کو مئے ارغواں بنا

(از جناب محمود یار خاں اثر ایم اے۔ جوناگڈھ)

اپنی حیاتِ پست کو رفعت نشاں بنا — یعنی علوئے عزم کے شایانِ شاں بنا

حاصل ہو کیف خمکدۂ شوق میں تجھے — اپنے سرشکِ خوں کو مئے ارغواں بنا

نظارۂ چمن سے جو ہونا ہے کامیاب — کچھ خوفِ برق و باد نہ کر آشیاں بنا

غم کو قیام ہے نہ خوشی کو ثبات ہے — تو دل کو بے نیازِ غمِ این و آں بنا

اے دل اگر ہے ذوق مسلسل کی آرزو — خود کو اسیرِ حلقۂ زلفِ بتاں بنا

گم ہو نہ تو طلسم فریبِ مجاز میں — ہستی کو آگہی سے حقیقت نشاں بنا

گذرے ہوؤں کی پیشروی کا خیال چھوڑ — منزل نئی نئی ہی نیا کارواں بنا

ناکام زندگی سے نہ دلگیر ہو اثر

تو سعیٔ مستقل سے اسے کامراں بنا

برہم ہے زلفِ پُرشکن دیوانہ بن دیوانہ بن

برہم ہے زلفِ پُرشکن، دیوانہ بن دیوانہ بن
روشن ہے شمعِ انجمن، پروانہ بن پروانہ بن

مہتاب ہے خورشید بن، عیش و نشاطِ عید بن
کر نذرِ ساقی جان و تن، پیمانہ بن پیمانہ بن

آراستہ ہو صف بہ صف، کس کر کمر ہو سر بکف
سینہ سپر لب پر ترن، مردانہ بن مردانہ بن

دیہیم و افسر ہونگے کیا؟ کر زن سے تجھکو واسطہ؟
اُٹھ باندھ لے سر سے کفن، جانانہ بن جانانہ بن

ہر بحر و بر میداں ترا، ساقی شہِ مرداں ترا
جب عزم ہو خیبر شکن، ترکانہ بن ترکانہ بن

دیکھ عقل بودا کر نہ دے، ہاں دُردِ صہبا پے بہ پے
پھر جوش میں ہو نعرہ زن، مستانہ بن مستانہ بن

پھر شورِ نائے و نوش ہو، پھر مے وہی سرجوش ہو
جاں دادۂ کیفِ کہن، میخانہ بن میخانہ بن

خوف و خطر ہرگز نہ کر، انجام رکھ پیشِ نظر
اے سبزۂ خاکِ چمن، بیگانہ بن بیگانہ بن

ظاہر ترا پژمردہ ہے، باطن میں تو افسردہ ہے
خاموش ہی بہتر حسن، رسوا نہ بن رسوا نہ بن

کیفی بہاری

(سلسلہ کے لئے ملاحظہ ہو ندیم ماہ نومبر سنہ ۱۹۴۱ء)

زندہ رہتا ہے یاں جو ہر جاندار　　اس کے جینے کا رزق پر ہے مدار
اب وہ جس کا بقائے نوع ہے نام　　دیکھو ایسی بقا کی شکل قیام!
خود فنا ہوں جو نوع کے افراد　　ان کی باقی رہا کرے اولاد!
متسلسل ہو دَور نسلوں کا!　　بعد نسلوں کے اور نسلوں کا
یہ ہے شکل بقائے انسانی!　　جو قیامت تلک نہ ہو فانی!
یوں بشر کے وجود کا ... ناپار　　رزق اور نسل پر ہے مدار!
ہیں یہی نسل و روزیٔ آدم　　کل امورِ عظیم سے اعظم!
پھر یہی رزق و نسل ہی ہیں مگر　　باعثِ کل ذنوب و اثم بشر
ایسے سارے گنہ صغیر و کبیر!　　ہوں جو ہر دیں میں جرم اور تقصیر!
ہیں محرّک جو ان سبھوں کے ضرور　　وہ یہی دو سرے اہم ہیں امور
ہوتی ہیں وجہ رزقِ باعثِ شر　　یا محرّک ہے وجہ نسل بشر!

موسم سرما کے ذکر میں کس قدر فطری تشبیہات و استعارات رقم فرماتے ہیں:-

ساقیا پوس کا مہینا ... ہے　　واجب ان روزوں مے کا پینا ہے
کیسے چلّے کے جاڑے پڑتے ہیں　　پاؤں کمّل تلے سکڑتے ... ہیں
خونِ تن منجمد ہے یخ کی مثال　　ساقیا دے وہ آتشِ سیّال
آگ راتوں کو اندنوں ہے عزیز　　ہم کو بھی ہے عزیز آگ سی چیز!
سب کی پیاری ہے اس سے روشن ہے　　آگ کا اندنوں میں بچپن ... ہے
ایسا بے قدر سرد پانی ... ہے　　پیرِ مفلس کی زندگانی ... ہے
یوں ہے بے لطف چاندنی بہار　　جیسے عہد جوانی .... نادار
بجنۃ و زرد و خشک فصلِ حریف　　کٹ گئی مثل عمر .... ضعیف

سردِ ملکوں کی ہے یہ فصلِ خزاں　　رہتی ہے برگ ریز بادِ وزاں
پھول رہتے نہیں وہاں شاداب　　میوے ہو جاتے ہیں بہت کمیاب
دیس کی اپنے گرم سیر زمیں!　　بے گل و میوہ اندنوں بھی نہیں!
جس کا کچھ اندنوں بھی دورا ہے　　وہ اسی دیس کا تھوڑا ہے
اندنوں بھی یہاں فراوانی!　　رکھتے ہیں میوۂ زمستانی!
لیکن اک میوہ کھائیے جسے خوب　　اندنوں میں جو سب کو ہے مرغوب
اور میسر بھی سب کو یکساں ہے　　دھوپ وہ میوۂ زمستاں ہے

تمدن، معاشرت، مذہب اور سیاست پر طبع آزمائی ہوتی ہے۔

پیش ازیں اہل دیں کا تھا یہ خیال　　ہیں جو نوعِ بشر کے کل افعال
نہ تو مذہب جدا ہے ان سب سے　　نہ تو وہ سب جدا ہیں مذہب سے
ہیں جو انساں کے دنیوی بھی امور　　سب تھے داخل امورِ دیں میں ضرور
اب وہ سمجھے گئے ہیں ارکاں چار　　جن پہ تہذیب قوم کا ہے مدار
نام اس کا جو رکنِ اول ... ہے　　انگریزی زباں میں مارل ... ہے
رکنِ ثانی کا ہے ریلیجس نام!　　اس میں داخل امورِ دیں ہیں تمام!
یہ دو ارکان مارل اور مذہب　　دونوں ہیں ایک جان دو قالب
رکنِ ثالث سوشل سے ہے موسوم　　اس سے وابستہ ہیں رواج و رسوم
چار رکن ہے اہم و اجل　　نام اس رکن کا ہے پالٹیکل!
ربط وہ رکھتے ہیں یہ آپس میں　　ہے جو مارل میں ریلیجس میں!
یوں ہیں مخلوط یہ دو رکن اہم　　جیسے شیر و شکر ملے ہوں بہم!
یہ وہی آخری ہیں ارکاں دو!　　ربط نوعِ بشر سے ہے جن کو!
متاثر ہیں ان سے سب انساں　　گبر و ترسا و مسلمیں یکساں!

مذہب اسلام اور اسلامی تہذیب و معاشرت کے متعلق تحریر ہوتا ہے۔

رہنے دے جو ولائتی ہے شراب　　آج ساقی عرب کی دے مئے ناب
طائفی کا بادۂ صاف　　ہم کریں پی کے تیرے گرد طواف
دل ہے صاف اپنا صاف مشرب ہے　　ٹھیٹھ اسلام اپنا مذہب ہے

مختصر صاف سیدھے سادے اصول جو ضروری سے کم ہوں کچھ نہ فضول!
مذہب اسلامیوں کا افضل ہے لاجرم افضل ان کا ماڈل ہے
ام ماڈل ہے پردۂ اسلام تحت ماڈل ہیں مسکرات حرام
ایک حد تک تو ہیں دونوں امور مایۂ ناز مومنین...... غیور
لیں اگر کوچے اور گلی کی..... راہ تو رہے بیچ مرد و زن کی نگاہ
جب ہو جاتا کسی کے گھر منظور طلب اذن اوّلاً ہو...... ضرور
ادب امّ دو الا د استاد!! سارے عالم سے ہے ہمیں ہیں زیاد

ہندوستان کے بیہودہ رسموں مثلاً دختر کشی، ستی، دخت نابالغہ کی شادی اور عقد بیوگان کی ممانعت پر کتنے لطیف پیرایہ میں پھبتی کہی ہے ملاحظہ ہو:-

ہند کے وحشیانہ سارے رسوم تو یہ توبہ ہیں کس قدر... مذموم
جیسے دختر کشی کے رسم و رواج ستی اور بیوگی کے رسم و رواج
عمر بھر بیوہ ہی رہے وہ حزیں!! کہیئے قومی یہ ظلم ہے کہ نہیں!!
عقد بیوہ کرا دو تم...... ثانی ہے یہ مردوں کو حکم...... قرآنی
دخت نابالغہ کے بیاہ کی، واہ کس قدر دھوم ہے معاذ اللہ!
دخت نابالغہ کو دینا بیاہ!! ایک گالی سا ہے معاذ اللہ
عقد دختر ہے واجب التسلیم دوش پر باپ ماں کے فرض عظیم!
قید وقت ادائے فرض ہے راز نہ ادا ہوگی قبل وقت نماز!
عقد اولاد کے زمانۂ سعد ہیں جوانی کے دن بلوغ کے بعد
بیاہ میں ان کے اس قدر دو ڈھیل کہ یہ تعلیم کی کریں...... تکمیل
باپ اچھے بنیں یہ طاقت..ہو اچھی ماں بننے کی لیاقت ہو!
جس کے شجرہ میں اس کا ہو پیوند ملے اس کو سعید اک فرزند
ماں وہ ڈھنگ اور وہ سلیقہ سکھائے کہ ہو نیکے اب جو بیٹی جائے
جس کے گھر سرنوشت لیجاوے ساتھ اپنے بہشت لیجاوے

اس کے بعد سہاگن کو دعا دیتے ہیں:-

ساقیا مے کشوں کی محفل میں آج اس مے کا دور ہو جس میں

رنگ ہو زیرۂ کسم کا سا ! بو مفرح ہو زعفران آسا
زعفران اور کسم ہیں دو بہنیں ایک ہی خاندان کی کہیے جنہیں
اس میں بو شوخ تو طریقت کی ہے اس میں خو بو زن شریف کی ہے
پھیلی ہے کیا کسم کی بو ہر سو بارک اللہ یہ ہے سہاگ کی بو
یہ کسم اس کا پھولتا.... تم کو ہند کی عورتو مبارک.... ہو
عطر کیا چیز ہے تمہارے لباس رکھیں پیری تلک کسم کی باس
جب کفن پوش سوئے مدفن جاؤ خلوت قبر میں سہاگن جاؤ

موسم سرما اور برشگال کے متعلق اشعار تو قارئین ملاحظہ فرما چکے اب چیت اور جیٹھ کے متعلق چند اشعار حاضر ہیں :-

چیت کے دوسرے مہینے میں ! آتی ہے اک امنگ سینے میں !
کھائیں ہندی ہوائے فصل ربیع سردی جانفزا ہے فصل ربیع
صبحدم چیت کی ہوا..... کھانا ہے مفرح کوئی دوا..... کھانا
وہ مزا اب ہے سرد پانی میں کہ جوانی کا زندگانی.... میں
چاندنی رات خوشگوار ہے اب اول شب عجب بہار ہے اب
جیٹھ اور جیٹھ کا بھی پچھلا.... پکھ ساتھیا اندنوں نہ پیاسا رکھ
خوب روہن کا تپتا ہے امسال ابھی برسات کی مبارک فال
یہ ہوا کا ہے دھوپ میں جلنا اس کا روہن کے شام تلک چلنا
آگ پوری ہے ان دنوں میں جواں کینہ ور، تشنگیں، دراز.... زباں
کیا مزیدار سرد پانی ..... ہے تندرستوں کی نوجوانی..... ہے
دن کو پانی سے پیاس بجھتی ہے کم ہاں غنیمت ہے رات کی شبنم
فصلی پھولوں کے باغ کا ہو بڑوس رات بھر چاندنی میں کھائیں اوس
جیٹھ کی چاندنی سخی کا ہے مال آئے مصرف میں جو تمام و کمال

اب آئیے ذرا ہولی بھی کھیلیں :-

رنگ لائی ہے راگ لائی ہے میکشو مژدہ ہولی آئی.... ہے
آج رنگیں ہو جامۂ تہذیب سرخ باندھیں عمامۂ تہذیب
بادہ کش مے کدہ میں کھیلیں پھاگ ہو ہنسی اور مذاق رنگ اور راگ

ساقیا شیشے میں وہ لال پری — اپنی دکھلا رہی ہے جلوہ گری
اپنے شیشہ سے اس پری کو نکال — اس کی باہیں مرے گلے میں ڈال
میں بھی ڈالوں کمر پر اس کے ہاتھ — تب اوڑا کر وہ مجھ کو اپنے ساتھ
راجہ اندر کی بزم میں لیجائے — ناچ پریوں کا واں مجھے دکھلائے
دن ہیں پھاگن کے ماہ کے یہ اخیر — ان میں سیلان خون کی ہے تاثیر
ہے ہوا کا اثر دلوں کی اُمنگ — مقتضئ وقت کا ہے راگ اور رنگ

ان اشعار کے بعد مصنف پھر اپنے اصل مقصد کی طرف رجوع کرتا ہے، ہولی اور بیاہ کے موقع پر ہندوستانی گھروں میں جو پھکڑ بازیاں ہوتی ہیں اس کی اس طرح اصلاح کرتا نظر آتا ہے:۔

جشن ہولی میں گر عبیر و کبیر — ڈالیں اک دوسرے پہ رنگ و عبیر
تنے مثل زمانہ روپ بنائیں — آسماں کی طرح سوانگ بھی لائیں
وقت کے مقتضیٰ سے ہے یہ معاف — نہیں تہذیب کے یہ باتیں خلاف
نہ بنے نامباح یہ تیوہار! — گالیوں کی اگر نہ ہو بھرمار
بس ہے تہذیب کے یہ باتیں خلاف — کہ بہت گالیاں بکیں اشراف
آئی جب گھر دولہن کے کوئی برات — پھر تو گالی ہی گالی ہے ہر بات
گالیاں دینا گالیاں کھانا! — گالیاں سُننا گالیاں گانا!
رہیں محدود طمطراق تلک — اور ہنسی دل لگی مذاق تلک!
گالیاں سُننے کی ہر اک شادی — شرفا کو بناتی ہے عادی!
گالیاں جو رسمی اسلاف! — سُن کے ہنس دیتے ہیں انہیں اشراف
یہ طومار گالیوں کا ..... ہے — اس کا مفہوم وما حصل کیا..... ہے
خبث باطن کا اپنی ہو اظہار — اپنی بے شرمیوں کا ہو اقرار
گالیاں جس میں اتنی ہوں وہ زباں — سادی دنیا میں کس جگہ اور کہاں
یہ کہے دیتی ہے زبان ..... وطن — نیم وحشی ہیں ساکنانِ وطن
غیر ملکوں کے لوگ کیوں بے باک — کہیں ہندی زبان ہے ناپاک

لگے ہاتھ ایک ساقی نامہ بھی سن لیجیے:۔

باغِ عالم میں چاہیئے ..... ساقی — پھول کی سی ہمیں تو شش اخلاقی

دلیس کی مشکبو گلابی .... لا
اس میں کچھ بھی ملا کے ...... لا

اچھے اخلاق نیک ز رخصال
دیتے ہیں ان کو بوئے گل سے مثال

فرش پر ہیں جو یہ گلاب کے پھول
چاہیئے ان کی تو بچھائیں بھول

گل پژمردہ اب نہیں شاداب
تن بے روح ہو گیا یہ گلاب

پتیاں خشک ہیں مگر ساقی
ان میں ہے بوئے گل ابھی باقی

میں کہوں ہاں پلا پلائے جا
ساقیا ہاں میں ہاں ملائے جا

ساقیا ساقیا ادھر ...... آنا
دیکھ وہ آرہے ہیں ..... مولانا

جلد اٹھائے کشتی کے سب سامان
راز کی طرح رکھ ابھی پنہاں

دیکھ شیشوں سے تیرے اے غافل
کہیں ٹوٹے نہ ان کا سنگیں دل

قول پیر مغاں ہے پن ہو کہ پاپ
ہے یہ بہتر کہ رکھیے چپ چاپ

مندرجہ بالا اشعار سے ناظرین پر یہ اچھی طرح واضح ہوگیا کہ مصنف کو ہر قسم کے مضامین کی بندش پر کیسی استادانہ قدرت حاصل ہے اور مثنوی نگاری کے فنی قواعد و ضوابط سے کس قدر واقفیت کاملہ رکھتے ہیں وہ صرف ایک بلند پایہ شاعری نہیں بلکہ ایک فنکار کی حیثیت سے بھی نظر آتے ہیں۔ دو ہزار اکسٹھ اشعار میں سے میں نے اپنی پسند کے مطابق چند شعر منتخب کرکے پیش کئے ہیں ہو سکتا ہے کہ میں اچھے اشعار منتخب کرنے سے قاصر رہا ہوں اور غالب کی طرح مجھے بھی اس انتخاب سے رسوائی ہو کیونکہ ۱۲۲ صفحات پر ایسے سینکڑا اشعار بکھرے پڑے ہیں جو شہ پارے اور دُر دانے کا حکم رکھتے ہیں۔ اسلئے ارباب ذوق سے میری درخواست ہے کہ وہ اس مثنوی کا مطالعہ ضرور فرمائیں۔ اب چند شعر لکھ کر اس تذکرہ کو ختم کرتا ہوں۔

ہمارے بہار شریف میں عموماً گوالنیں دودھ اور دہی مٹی کی چھوٹی چھوٹی مٹکیوں (جنہیں یہاں عام طور پر ٹہری کہا جاتا ہے) او پیتل کے لوٹوں میں بھر کر ایک سر پر اور دوسری مٹکی ہاتھ میں لئے بیچنے کو نکلتی ہیں۔ اس کی مصوری دو شعر میں کتنے لطیف طور پر کیا

اک سبو ہاتھ میں تو اک سر پر !
بی گوالن لیے پھریں گھر گھر

کو بکو نعرہ زن کہ اے لوگو !
مول لینا تمہیں ہو دودھ تو لو

چار شعر اور بھی سن لیجیے :-

مے کدہ کیا ہے راجد ھانی ہے
دخت رز مے کشوں کی رانی ہے

ہچکیاں لیں بصورت مینا
رو کے خالی کریں بھرا سینہ

مے سے مے خوار کو جدا نہ کرے
دخت رز بیوہ ہو خدا نہ کرے

سیکھیں مینا سے گریہ کا انداز
سرنگوں ہو کے رو ئیں آواز

(بقیہ صفحہ ۲۰ پر ملاحظہ ہو)

طوفان آمد آمدِ فصلِ بہار ہے

ندیم کی آئندہ اشاعت "اردو مجلس دہلی نمبر" کی کتابت شروع ہو چکی ہے

چند مضامین جو اس اشاعت کی زینت ہیں، ان کی فہرست آپ کو یقین دلائیگی کہ آئندہ نمبر واقعی کتنی گوناگوں دلچسپیوں کا مخزن اور کتنی وقیع معلومات کا خزینہ ہے :-

۱/ **"مغلوں کی قلعہ کشائی"** عالی جناب نواب عبدالمجید صاحب بی اے بالقابہ کا یہ مضمون عین وقت کی چیز ہے۔ جب جنگ جدل کو بلائے آسمانی نہیں بنایا گیا تھا اُس وقت فتح و نصرت کے کیا وسائل تھے۔ اور مدافعت کی سبیلیں کیا ہوتی تھیں۔ ان باتوں کو نواب صاحب قبلہ نے اپنے خاص پیرایہ بیان سے اتنا دلچسپ کر دیا ہے کہ مضمون شروع کرنے کے بعد آپ بغیر ختم کئے چھوڑ نہیں سکیں گے۔

۲/ **ویدوں کے بعد زمانہ میں عورت کا درجہ**:- ایم۔حامد علی صاحب ایم۔ اے کا یہ مضمون گہرے مطالعہ کا نتیجہ ہے اگر آپ کو اُس زمانہ کی سیر مقصود ہو جب عورت محض بعض ضرورتوں کو پورا کرنے کے سوا کوئی خاص اہمیت رکھنے والی نہیں بتائی جاتی ہے، مگر اُس پر بھی اپنی دماغی صلاحیتوں کا ثبوت دیتی ہے تو اس مضمون کو ضرور ملاحظہ فرمائے۔

۳/ **بہادر شاہ کا خواب**:- از خواجہ محمد شفیع بی۔اے دہلوی جن کا نام اس بات کی کافی ضمانت ہے کہ

ع مشک آنست کہ خود ببوید الخ

ان کے علاوہ دیگر مقالات بھی ہونگے، جن کے متعلق اعتماد کیا جاتا ہے کہ آپ سے تحسین وآفریں حاصل کریں گے۔

افسانوں میں مندرجہ ذیل ماہرین فن کی بدیعہ نگاری اپنی خوبیوں کی آپ ضامن ہے :-

۱- از احترام اللہ صاحب : "پہلے خواتین!"
۲- از مولانا سید ظہور احمد صاحب وحشی : "کمسن بی بی"
۳- از "پردہ در" : "آئینہ" : اس افسانہ کے مطالعہ سے بظاہر تکدر کا اظہار کرنے والے بھی اس کو بدل پسند فرمائیں گے۔ (متانت آفرینیوں پر اعتماد کرنے میں ادارہ جرأت سے کام لے رہا ہے!)
جناب "دیدہ ور" کا افسانہ بھی اپنی طرز کی خاص چیز ہوگا۔

منظومات و غزلیات کا حصہ جن سخن سنجوں کے جواہر افکار سے مالا مال ہوگا، ان کے اسمائے گرامی ملاحظہ ہوں :-
(۱) جناب نسیم سیفی بی۔اے۔ (۲) جناب اظہر قدوائی۔
(۳) قاضی محمد ریاض الدین انصاری ایم۔اے۔بی۔ٹی۔
(۴) جناب شمس زبیری۔ (۵) جناب عبدالمجید حیرت دہلوی۔
(۶) جناب ابوالکمال ماہر دہلوی۔ (۷) جناب اختر ہوشیارپوری بی۔اے۔ایل ایل بی
(۸) جناب آفاق بی۔اے دہلوی۔ (۹) جناب آغا سروش۔
(۱۰) جناب عالی لوہاروی۔ (۱۱) جناب شیدا خورجوی۔

THE "NADEEM" FEBRUARY-MARCH 194

"اردو مجلس دہلی نمبر"

ماہنامہ

ندیم

گیا

قطعۂ مسرت افزا

از علامہ … آزاد

میں نے دیکھا ندائم کا پرچہ
شکر، الحمد، مرحبا کہیے

دلنشیں کیوں نہ ہو جو دل سے ہو
دل ہو روشن تو آئینہ کہیے

وہ بھی ہو جو اچھے سے اچھا
اُس کو اچھا نہ پھر کیا کہیے

اس کو حاصل رہے بقائے دوام
گلِ گلدستۂ بقا کہیے

مظہرِ شانِ کبریائی ہے
مظہرِ شانِ کبریا کہیے

شمعِ وحدت کی ہے ضیا لاریب
شمعِ وحدت ہی کی ضیا کہیے

اب تو سلطانِ وقت شہ ہے آپ
نیک و بد صاف، برملا کہیے

میں نے جو کچھ کہا، اس کو
دل سے نکلی ہوئی صدا کہیے

یا رب آزاد کی دعا ہو قبول
پھولے پھلے، اور کیا کہیے

[illegible]

THE "NADEEM" FEBUARY-MARCH. 1942.

کالجوں اور اسکولوں کیلئے سنہ ۱۹۳۱ء سے منظور شدہ ماہنامہ

ندیم

قیمت سالانہ للعہ
قیمت فی پرچہ ۶/
قیمت ششماہی عہ

مرتبہ: سید حسن امام وارثی

جلد ۱۹ | بابت ماہ فروری و مارچ سنہ ۱۹۴۲ء | نمبر ۲ و ۳

فہرست مضامین حصہ نثر

نظرات

(ب)

فہرستِ مضامین حصۂ نظم

نظرات

زخمہ برتارِ رگِ جاں می زنم   کس چہ داند تا چہ دستاں می زنم
زخمہ برتارم پریشاں می رود   کایں نواہائے پریشاں می زنم

جنوری کے "نظرات" میں ناظرینِ ندیم سے وعدہ کیا گیا تھا کہ "مارچ میں" اردو مجلس دہلی نمبر" شائع کر دیا جائے گا۔ اس کی امکانی کوشش اٹھا نہیں رکھی گئی، مگر نتائج اختیاری ہی ہوتے تو پھر کیا تھا۔ یکم اپریل تک تصحیح سے فراغت ہوئی تو مسودات کتابت شدہ طباعت کے لئے روانہ کرنے کی نوبت آرہی ہے۔

بڑی بے انصافی ہوگی اگر اس اشاعت کی تمام تر کامیابی کے متعلق میں خواجہ محمد شفیع صاحب دہلوی کے خاص لطف و احسان کا شکریہ نہ ادا کروں۔ وہ اس سے مستغنی سہی، مگر میرا فرض تو مجھے مجبور کرتا ہے۔ اس اشاعت میں جو کچھ ہے اچھا ہو یا بُرا وہ صرف خواجہ محمد شفیع صاحب دہلوی کا احسان ہی احسان ہے۔ فجزاھم اللہ خیر الجزا۔

خواجہ حسن نظامی صاحب کی ذاتِ بابرکات اب مثلِ تبرک ہے، "عطائے خواجہ" بھی تبرک ہی سمجھا جائے۔ "ندیم اللہ" سے مراد چاہے جو کچھ بھی ہو، مگر ناظرین خدارا ندیم کو "خدا رسیدہ" سمجھ کر ہاتھ نہ اٹھالیں!

مولانا ظہور احمد وحشی شاہجہانپوری بھی مرحومین کی فہرست میں آگئے۔ اِنَّا لِلّٰہِ وَاِنَّا اِلَیْہِ رَاجِعُوْن۔ آپ کی تالیف و تصنیف کا زمانہ ربع صدی سے زیادہ مدت پر حاوی تھا۔ جس زمانہ میں آپ نے دہلی سے تجلی نامی رسالہ جاری کیا تھا، اس وقت سے میری خط و کتابت آپ سے تھی۔ کیا خبر تھی کہ جب میرے رسالہ کے لئے مولانا کا پہلا مضمون آئیگا تو اُن کو "مرحوم" لکھنا میرے لئے مقسوم ہوگا۔ فَاعْتَبِرُوْا یَا اُولِی الْاَبْصَار!

ندیم کے نئے دَور میں سب سے پہلا دست امداد جو بڑھا ہے وہ عظیم آباد کے جواں سال رئیس جناب اکبر حسین صاحب ٹیڑھی گھاٹ کی طرف سے، اور پہلا حوصلہ شکن مکتوب جو ملا ہے وہ سیّد امام رضا صاحب ڈپٹی کا تھا، دونوں اپنی اپنی شان میں یکتا ہیں !

موجودہ غیر مطمئن حالات کو دیکھتے ہوئے، واقعہ تو یہ ہے کہ نہ ہم کو ناظرین سے شکوہ کی گنجائش ہے نہ ناظرین کو مناسب ہے کہ نازک مزاجی سے کام لیں۔ طرفین سے نباہ کی ضرورت ہے۔ اگر اس کا لحاظ رکھا گیا تو کوئی وجہ نہیں کہ ندیم اس دَور سے گذر جانے کے بعد جیسے جیسے حالات بہتر ہوتے جائیں صوری اور معنوی دونوں حیثیت سے بہتر ہونے کی کوشش کرے۔

جنوری کے ندیم میں "نواب جلال الدین خاں تاثیر" کے عنوان سے جو مضمون شایع ہوا ہے، اس میں سنہ ۱۸۴۰ء کا اُردو مکتوب خصوصیت سے قابل توجہ ہے۔ کیا عجب ہے کہ اُردو میں خط لکھنے کی اوّلیت اسی مکتوب کے ذریعہ بہار کے حصہ میں آئے !

ناظرین ندیم کو عام دعوت دی جاتی ہے کہ ہر مضمون نثر و نظم کے متعلق اپنی پسند یا ناپسندیگی سے بے تکلف ادارہ کو مطلع فرمادیا کریں۔ صحیح اور بے خلاف تنقید ہی تو رسالہ کو کامیاب بنانے کا سب سے بہتر ذریعہ ہے۔ ادارہ کی پالیسی کو ناظرین کے مطالبہ کا احترام ناگزیر ہے۔ بشرطیکہ عام رجحان اسی کا طالب ہو۔

متعلمانِ مدارس و اسکول اور ہر نو مشق کو ادارہ صلاح دیتا ہے کہ "چھوٹتے ہی" افسانہ نویسی نہ شروع کردیں۔ "افسانہ نویسی" اور "قصہ خوانی" ایک ہی چیز نہیں ہے۔ افسانہ نویس کو اور کچھ نہیں تو نفسیات کا اتنا علم تو ہو کہ نتائج کا صحیح استخراج کرسکے، اور پلاٹ کو پریشان دماغ کی پیداوار نہ بنائے، ادارہ کا بڑا وقت اس قسم کے "افسانے" لے لیا کرتے ہیں !

ندیم

جلد ۱۹ — بابت ماہ فروری و مارچ ۱۹۴۲ء — نمبر ۲ و ۳

اردو مجلس

خواجہ محمد شفیع دہلوی

ایک روز کچھ ادبی ذکر اذکار ہو رہے تھے، بات میں سے بات نکل رہی۔ ایک کے منہ سے نکلا کیا اچھا ہو جو یہ نشستیں بالالتزام ہو جائیں۔ سب کے دل کو بھا گئی، محفل نے صاد کی۔ فیصلہ ہو گیا کہ اتوار کے اتوار میرے غریب خانہ پر کچھ لکھا لکھایا سنایا کریں گے باتیں بنایا کریں گے۔

نیتیں بخیر تھیں، بنیاد کچھ ایسی سبھ گھڑی پڑی کہ آج تین سال ہونے آئے اس کے کرم احباب کی عنایت اور خواجہ حسن نظامی صاحب کی توجہ سے یہ مجلس مسلسل ترقی کر رہی ہے۔

سچ یہ ہے کہ میں نے تو اس کا نام بھی نہیں رکھا خواجہ صاحب قبلہ منادی میں اردو مجلس کے نام سے یاد کرنے لگے، یہی زبان زد ہو گیا اور بحمداللہ راس آیا۔

روئداد پیش ہے، اس سے آپ کو قدرے اندازہ ہو جائیگا کہ اردو مجلس کیا ہے؟ اور وہاں اتوار کے اتوار کیا ہوتا ہے۔ ہاں اتنا خیال رہے کہ یہ روئداد مشتے از خروارے ہے، تمام جلسہ کی کارروائی نہیں صرف خاص خاص باتیں حافظہ سے قلم بند کر لی گئی ہیں۔

"اتوار کے اتوار مل جل کر بیٹھتے ہیں، کچھ سنتے ہیں، کچھ سناتے ہیں۔ باتیں بناتے ہیں، اپنے اپنے گھروں کو چلے جاتے ہیں، یعنی نشستند و گفتند و برخاستند کے مترادف، یہ ہے اردو مجلس کی کل کائنات۔

گزشتہ اتوار حسب دستور خواجہ شفیع نے آتا ہی پر

مجاور بن بیٹھا۔ ساڑھے چار کا عمل تھا کہ جناب خواجہ حسن نظامی صاحب تشریف لائے۔

اولاً وجیہہ آل پوری خاں صاحب نے چند اُن بزرگوں کے سوانح حیات سنائے جس کو زمانے نے بھلا دیا اور جو یاد رکھنے کے قابل تھے سچ ہے

ع خاک میں کیا صورتیں ہونگی کہ پنہاں ہوگئیں

بعدہٗ نازش صاحب نے جو شاید دو ماہ کی غیر حاضری کے بعد تشریف لائے تھے، عذر گناہ کے طور پر ایک مضمون پیش کیا جس کا پہلا لفظ تھا "ابا" ان کے منہ سے تو ابا نکلا اور خواجہ شفیع نے منکرا بھرا۔ محفل میں قہقہہ پڑا۔ نازش نے آداب عرض کیا۔ خواجہ نے کہا عمر دراز!

بعدہٗ خالق صاحب نے ایک مضمون پڑھا۔ عنوان تھا "یقین کرو یا نہ کرو" بھلا بتائیے ہماری شامت آئی ہے کہ "خالق" کا یقین نہ کریں۔ نعوذ باللہ من ذالک۔

حکیم ماہر صاحب نے کہ نبض شناسِ ادب و ماہرِ اصنافِ شاعری ہیں، عجیب رنگ سے دورنگی برسات کا منظر پیش کیا۔ گاہ خندۂ دنداں نما سے ژالہ باری کرائی، گاہ چشمِ فلک سے جھڑی لگوائی۔ سیفی صاحب توسیف آزمائی کرتے ہی ہیں۔ اس شعر پر بہت داد ملی۔ ؎

میں بھی تباہ حال ہوں تو بھی ہے بیقرار
آ پھر نکال لیں کوئی صورت نباہ کی

تشبیہ بزبان سرِیلی تو سلسلہ جنبانی کا عنوان

ہاتھ آیا، احباب نے اس شعر کو بار بار پڑھوایا۔ آنکھیں گنا ہگار ہیں، اتنا تو ہم نے بھی دیکھا کہ اکثر رنگ مال اہل بزم نے آنکھیں بچا بچا کر اس شعر کو نوٹ کیا۔

اتنے میں حیرت صاحب تشریف لائے۔

خواجہ نے کہا ؎

وہ جو آئے مجھ کو حیرت ہوگئی
انکی صورت میری صورت ہوگئی

ماہر صاحب نے فرمایا، خوب برجستہ کہا،

خواجہ نے عرض کی ؎

جمالِ ہمنشیں در من اثر کرد
وگرنہ من ہماں خاکم کہ ہستم

غرض کہ آدھی رات پچھلے پہر تک بزمِ ادب جاری رہی۔ اب اہل مجلس کسمسانے لگے۔ محفل برخاست ہوئی۔ یار زندہ صحبت باقی۔

دوسری مجلس

گردشِ لیل و نہار دائم و قائم۔ دیو ہفت پیکر ہفتہ ہفت روزہ وضع کا پابند۔ اتوار آنا مقدر۔ اتوار آیا، اُردو مجلس ہوئی، محترمی جناب خواجہ حسن نظامی صاحب تشریف لائے۔ ملا واحدی صاحب نے ایک مضمون "میونسپل کمشنرز کے اختیارات" کے عنوان سے پڑھا۔ گھر کے بھیدی تھے، اگولنکا ڈھائی نہیں تاہم بنیادیں ہلادیں۔ کیوں نہیں، واحدی صاحب ہیں یکہ تازِ عرصۂ ادب۔

بعدہٗ قاری عباس صاحب نے اپنے والد مرحوم

جناب قاری سرفراز کا ایک مضمون "انسان فرشتے کی نظر میں" پیش کیا۔ سلسلہ یوں تھا کہ متمکنانِ ملاءِ اعلیٰ نے خطۂ خاک کی اطلاعات فراہم کرنے کے لئے نمایندہ بھیجا۔ ان سے پہلے بھی جو تشریف لائے تھے، انکو چاہ میں پھنس کر کوئیں جھانکنے پڑے تھے۔ ان کا حشر گو پیش رفتگاں سے کچھ بہتر ہوا۔ تاہم گردشِ ایام میں یہ بھی آ گئے۔ اور "جمال اکیڈمی" کی حوریں انکے اطوار سے قدرے عرق آلود ہو گئیں۔

اس مضمون کے انجام پر یہ مسئلہ پیش ہوا کہ مرے ہوئے کے ساتھ "صاحب" لکھنا جائز ہے یا نہیں؟ خواجہ شفیع نے کہا کہ قاعدہ کی رُو سے غلط ہے۔ اسلئے کہ صاحب صرف اس کے لئے استعمال کیا جا سکتا ہے جس سے صحبت ممکن ہو، اور متوفیوں سے جان پر کھیلے بغیر یہ امر محال ہے۔

آج اُردو مجلس میں یوسف بخاری صاحب کے ۹ سالہ صاحبزادہ میاں یوسف جمال کا اضافہ ہوا۔ اب تک مجلس میں انکے دو ہم عمر تھے۔ ایک الائچی دانہ میاں۔ دوسرے میاں بتاشہ۔ جناب خواجہ حسن نظامی صاحب نے انکو تسبیح دانہ خطاب عطا فرمایا۔ حکایت یہ ہے کہ امام صاحب جامع مسجد کے بہت قریبی عزیز ہیں۔

نواب ضیا یار جنگ بہادر گاہ گاہ اپنا کلام معجز نظام عنایت فرماتے ہیں۔ بہ سواری رسال فرماتے ہیں۔ ہم سال خوردہ و کمر شکستہ ڈاکیہ کے انتظار میں چشم براہ، گوش بر آواز رہتے ہیں۔ پیامِ ضیاء مشعلِ بزمِ ادب کا حامل ہوتا ہے۔

خواجہ شفیع نے غزل پڑھکر سنائی۔ مندرجہ ذیل اشعار پر بہت داد ملی اور بار بار پڑھوائے گئے۔ ؎

شراب جلوہ فروزِ صفائے دل باشد
کہ مرغ خوش نظر آید زبال و پر شستن
شگفتہ سازِ گلِ آفتاب شبنم نیست
چہ حاصل است دل از گریۂ سحر شستن

اب سیفی صاحب نے غزل شروع کی۔ دُبلے پتلے، کتابی چہرہ۔ مصحفِ حسن و عشق کے حافظ۔ سیفِ زبان۔ سیفِ بیان۔ مطلع پر بہت داد ملی۔ ملاحظہ ہو ؎

بخشا کسی کو حسن کسی کو سکونِ دل
غم مجھ کو دے دیا مرے پروردگار نے

بعدہٗ اشعر میاں نے غزل شروع کی۔ گندمی رنگ اخراج جنت کا پیام۔ چشم آہو، دیدہ وروں کو چوکڑی بھلا دے۔ مینی دعوتِ بینائی دے۔ اس شعر پر بہت داد ملی ؎

مایوسیوں نے میری سفارش اجل سے کی
جب تھک گئی نگاہ ترے انتظار میں

اب خمار نے بزم کو مست بنایا۔ ع

زباں پہ بار خدایا یہ کس کا نام آیا

خامۂ سیہ مست وجد میں ہے۔ بس اتنا کہنا کافی ہے کہ ان کی آنکھیں کچھ ایسی مست و مخمور ہیں کہ بہ یک نگۂ غلط انداز زاہدِ صد سالہ کو متوالا بنا دیں۔ یا یوں سمجھئے کہ حافظ کے شعر کے دو مصرعے۔ یہ شعر بار بار پڑھوایا گیا ؎

گم ہو کے رہ گیا میں جیب انکی تلاش میں

تو وہ بذاتِ خود مجھے آئے پکارنے

اب حضرتِ انور نے بزم کو منور فرمایا۔ نو عمر نونہال ہیں، ابھی فتنہ ہیں، کوئی دن میں قیامت ہونگے۔ مطلع مطلعِ انوار کی خبر دیتا تھا۔ ؎

وہ گُل کھلائے دیدۂ خوننابہ بار نے
دامن پہ میرے کرلیا سجدہ بہار نے

اس شعر نے بیقرار کردیا۔ ؎

بیگانۂ قرار رہا ہے وہ عمر بھر
اک لمحہ جس کا ساتھ دیا ہے قرار نے

پھر کیف نے بزم کو پُرکیف بنایا۔ فرمایا ؎

یہ جانتے ہوئے کہ فنا در کنار ہوں
پھر بھی فریبِ عشقِ وفا کھا رہا ہوں میں

اب نونہالِ چمنِ سخن حضرت نہالؔ نے غزل فرمائی ؎

تم کام یوں ہی مشقِ تغافل سے لیے جاؤ
پوچھو نہ مرا حالِ پریشاں کوئی دن اور

بعدہٗ حضرت نقشؔ نے نقش جمایا۔ زلفِ ہندی کا متوالا بنایا۔ ایک ہندی گیت سنایا۔ ؎

جو بن بیتا جائے تم بن ساجن
بَن میں جس کا سنگھی چھوٹے۔ جس پاپن کا پیتم رُوٹھے
بن کے جس کی آشا ٹوٹے
اس کا کون سہائے۔ تم بن ساجن
بھری جوانی رس کی رتیاں۔ سونی سیج دھڑکے ہی چھتیاں
ہاتھ پیوں کے بھیجوں پتیاں
جو بن بیتا جائے تم بن ساجن

اُردو مجلس سے رخصت

آخری بار آپ کی مجلس میں آج آیا ہوں میں ۔۔۔ دل کا یہ عالم کہ بس اب آپ سے میں کیا کہوں!
ڈر ہے آنکھوں میں کہیں آنسو مچل کر آنہ جائیں ۔۔۔ ضبط جو مشکل سے ہاتھ آیا ہے اسکو کھو نہ دوں!
آپ لوگوں کی محبت نے مرا دل لے لیا! ۔۔۔ کون سے الفاظ میں میں عرضِ حالِ دل کروں،
اور اگر قسمت سے کچھ الفاظ مجھکو مل بھی جائیں ۔۔۔ دیکھیے جو اضطرابِ دل میں ہے کچھ کہہ سکوں،
ایک ایک کا ذکر کرنا ہو تو کر بھی لوں مگر ۔۔۔ ساری محفل دوستوں کی ہے تو کس کا نام لوں؟
شعر کی تعریف سنکر آپ نے ہمت بھی ۔۔۔ ورنہ خود معلوم ہے مجھکو کہ میں کیا چیز ہوں!

مجلسِ اردو کی دل میں یاد لے کر جاؤں گا ۔۔۔ اور اگر زندہ رہا تو لوٹ کر پھر آؤں گا!

ازہر قدوائی

ندیمِ اللہ

(از خواجہ حسن نظامی صاحب مدظلہ)

قرآن مجید میں ارشاد ہے کہ اللہ تعالیٰ نے ہر قوم کے لئے ایک ہادی بھیجا، اور یہ بھی ارشاد ہے
بعض پیغمبروں کے نام ہم نے تم کو بتا دئے ہیں اور بعض کے نہیں بتائے، اس بنا پر یہ کہا جا سکتا
ہے کہ ہندوستان جیسا بڑا بر اعظم پیغمبروں سے محروم نہیں کہا جا سکتا، ورنہ مذکورہ ارشادِ
خداوندی کیونکر درست مانا جائیگا کہ اس نے ہر قوم کے لئے ہادی بھیجے تھے۔

ہندوستان کی نسبت یہ کہنا کہ یہاں فلاں بزرگ پیغمبر تھے، بہت دشوار ہے کیونکہ نصِ قرآنی
میں اس کی تشریح موجود نہیں ہے۔ البتہ سری رامچندر جی اور سری کرشن جی اور سری گوتم بدھ
جی کی تعلیمات کے دیکھنے سے معلوم ہوتا ہے کہ وہ ایک حد تک آسمانی کتابوں کی تعلیمات سے مشابہ ہیں۔

میں نے ۱۹۰۱ء یا ۱۹۰۲ء میں ہندوستان کے مشہور تیرتھوں کی سیر کی تھی، اور دو سال
ان میں خرچ کئے تھے۔ متھرا بھی گیا تھا، جہاں کرشن جی پیدا ہوئے تھے۔ گوکل بھی گیا تھا، جہاں کرشن
جی نے پرورش پائی تھی۔ بندرابن بھی گیا تھا، جہاں کرشن جی کا ظہور ہوا تھا۔ دوارکا بھی گیا تھا
جہاں کرشن جی نے وفات پائی تھی۔ جگن ناتھ پوری بھی گیا تھا، جہاں کرشن جی کی لاش
سمندر سے نکالی گئی تھی۔

رام چندر جی کا جنم استھان اجودھیا میں دیکھا تھا۔ اور رامیشورم تک جانے کی کوشش بھی
کی تھی، مگر بیمار ہو جانے کے سبب قریب پہنچکر واپس آ گیا تھا۔

کرشن جی کی کتاب گیتا کی شرح کرشن منسری کے نام سے لکھی تھی، اور کرشن جی کی لائف بھی کرشن بیتی کے نام سے شایع کی تھی، سری رام چندر جی کی کتاب یا اُن کے اُستاد کی کتاب "یوگ واشسٹ" کا ترجمہ بھی "رام اپدیش" کے نام سے شایع کیا تھا۔ اور ہردوار میں جاکر ہر کی پیڑی کے درشن بھی کئے تھے اور رشی کیش پہاڑ میں سادھوؤں سے ملنے بھی گیا تھا، اور شیوپد کاشی یعنی بنارس میں بھی دریا کے گھاٹ پر کچھ دن بسر کئے تھے۔

اسی زمانے میں گیا جی بھی گیا تھا اور بودھ گیا کا وہ مقام دیکھا تھا، جہاں سری گوتم بدھ کو عرفان الٰہی حاصل ہوا تھا، جس کو وہ لوگ نروان کہتے ہیں۔ اسی سیر و سیاحت اور ہندو بزرگوں کے میل جول سے مجھے اندازہ ہوا کہ مذکورہ تینوں بزرگ یقیناً خدا رسیدہ تھے اور اللہ کے پیارے تھے، تاہم یہ کہنا میرے حوصلے اور بساط سے بڑھکر ہے کہ یہ تینوں پیغمبر تھے۔ پھر بھی جس طرح حضرت آدمؑ کو صفی اللہ اور حضرت ابراہیمؑ کو خلیل اللہ اور حضرت موسیٰؑ کو کلیم اللہ اور حضرت عیسےؑ کو روح اللہ کہا جاتا ہے، اور یہ القاب خدا کے فرمائے ہوئے نہیں ہیں بلکہ ذاتی صفات کا لحاظ کرکے ہم انسانوں نے یہ نام تجویز کئے ہیں کہ حضرت عیسےٰ اللہ کی رُوح تھے کیونکہ باپ کے بغیر پیدا ہوئے تھے، اور حضرت موسیٰ کلیم اللہ تھے کیونکہ وہ طور پر اللہ سے باتیں کرتے تھے۔ اور حضرت ابراہیمؑ اللہ کے خلیل تھے یعنی دوست تھے، اسی طرح سری گوتم بدھ کو اللہ کا ندیم یعنی دوست کہا جائے تو کسی اعتراض کی گنجایش نہیں ہوسکتی۔

میں جب گیا پہنچا تو میرے ساتھ مولانا شبلی مرحوم کا ایک تعارف نامہ گیا کے رئیس سید ظفر نواب صاحب کے نام کا تھا، اسی کے سہارے مجھے نواب صاحب مرحوم نے رہنے کی جگہ بھی دی اور دانہ پانی بھی دیا۔ اور بودھ گیا کے مندر تک پہنچنے اور وہاں کے مہنت کشن دیال جی سے ملنے اور پرانے فرمان دیکھنے کا موقعہ بھی دلوایا۔

پس اب جب میں نے یہ سُنا کہ سید ظفر نواب صاحب مرحوم کے بھانجے سید حسن امام صاحب نے ایک رسالہ کی ادارت قبول کی ہے اور اس رسالے کا نام ندیم ہے اور وہ "اُردو مجلس دہلی" کی خدمات کا اعتراف کرنے کے لئے ندیم کا ایک خاص نمبر شایع کرنا چاہتے ہیں، اور اس کے لئے میرا مضمون بھی ان کو درکار

ہی تو میرے اندر باوجود اندھا ہو جانے کے پُرانی یاد نے ایک جذبہ پیدا کر دیا۔ ایک طرف نواب خواجہ محمد شفیع صاحب بانیٔ "اُردو مجلس" کا تقاضہ تھا کہ ندیم کے لئے مضمون لکھئے، دوسری طرف آنریبل سید حسین امام کا اصرار تھا کہ میرے بڑے بھائی کی فرمائش پوری کیجئے، اور درگاہ شریف کی مسجد کے پیش امام سید سمیع الدین صاحب بھی کہہ رہے تھے کہ جس طرح بھی ممکن ہو ندیم کے لئے کچھ نہ کچھ لکھنا چاہیے اور دوسری طرف میری معذوریاں تھیں کہ نہ لکھ سکتا تھا نہ پڑھ سکتا تھا، پھر بھی میں نے اپنے منجھلے لڑکے علی سے یہ چند سطریں لکھوا دیں، لکھواتا جاتا ہوں اور یاد آتا جاتا ہے کہ چالیس سال پہلے کیا کیا دیکھا تھا۔ گیا کے قریب بیلا گنج اسٹیشن پر اُترنا، ننگے پاؤں شمس پور گاؤں تک جانا جہاں نگر جوبنی پہاڑ میں پتھر تراش کر شفاف مکان بنائے گئے ہیں۔ یاد آنے لگا، میں نے کہا سُنو بھی علی: تمہارے باپ بیلا گنج سے اتر کر شمس پور جانے لگے تو پہاڑ اتنی دور نظر آتا تھا کہ میں دس منٹ میں وہاں پہنچ جاؤنگا لیکن وہ جگہ تین چار میل سے کم نہ تھی، گرمی کا موسم تھا، پاؤں میں آبلے پڑ گئے، بارہ بجے چلا تھا، چار بجے شمس پور پہنچا اور ایک چھپر کی کچی دیوار سے سہارا لیکر بیٹھ گیا۔ اس چھپر کے اندر سے ایک مسلمان باہر آیا اور اس نے بھُنے ہوئے چنے مجھے دیئے اور میں نے وہ کھائے، اس نے پانی بھی پلایا۔ میں نے اس کا نام پوچھا اس نے شمس الدین نام بتایا میرا نام اور حال سُنکر وہ مجھے چھپر کے اندر لے گیا اور وہاں اس نے مجھ سے بیعت کی اور رات بھر مجھے وہاں رکھا، دال بھات کھلایا، پاؤں دبائے اور صبح مجھے چارپائی پر بٹھا کر چار آدمی پہاڑ پر لے گئے، روٹیاں اور پانی کا ایک ہنڈا ان کے ساتھ تھا۔ میں نے وہاں جو کچھ دیکھا اسکی کیفیت رسالہ زمانہ کانپور میں "مستانہ جوگی" کے عنوان سے لکھی جو اسمیں شائع ہوئی۔

بدھ گیا - گیا شہر کے قریب پھلگو دریا کے کنارے وہ پُرانا مقام واقع ہے، جہاں سری گوتم بدھ بارہ برس تک اس دنیا کی حقیقت اور اپنی حقیقت اور ان سب کے پیدا کرنے والے کی حقیقت معلوم کرنے کیلئے بیٹھے رہے تھے، اور وہیں اُن کو ایک دن یہ سب حقیقتیں معلوم ہوئی تھیں۔ ایسے پاک مقام سے جو رسالہ نکلا ہے اور اس نے اپنا نام ندیم رکھا ہے تو میں اس کو بھی آس پاس کے مولوی صاحبان کے کان بند کر کے **"کَلِیمُ اللہ"** کہہ سکتا ہوں۔ والسلام علیکم ورحمۃ اللہ وبرکاتہٗ ۔

حسن نظامی۔ دہلی

۲۴۔ مارچ سنہ ۱۹۴۲ء

مغلوں کی قلعہ کشائی

مولوی عتیق الحق صاحب کا بارہواں خطبہ

(از نواب خواجہ عبد المجید صاحب دہلوی)

برسات کے دن ہیں۔ شام کا وقت ہے۔ صبح کو مینہ برس کر کھلا ہے۔ ٹھنڈی ٹھنڈی ہوائیں چل رہی ہیں۔ مولوی عتیق الحق صاحب ہواخوری کو نکلے ہیں۔ اپنے خیالات میں مستغرق چلے جاتے ہیں۔ گھنٹہ گھر کے نیچے جا پہنچے، پٹڑی پٹڑی جا رہے ہیں۔ یہ دو سڑکوں کے بیچ میں ہیں۔ اس کے وسط میں نہر بہہ رہی ہے۔ دونوں طرف گھنے درختوں کا سایہ ہے۔ یہ دہلی شہر آج سے پچاس برس پہلے کا ہے۔ گھنٹہ گھر کے سامنے ٹاؤن ہال، اس کی دوسری منزل پر دہلی لائبریری۔ ایک کمرہ کتب خانہ کو دے دیا گیا ہے۔ آگے چوڑی چکلی چھت کھلی پڑی ہے۔ کتب خانہ کیا خاک ہے، جیسی دہلی اجاڑ ویسا یہ بھی اجاڑ۔ پانسو سات سو سے زیادہ کتابیں نہیں۔ وہ بھی کہنہ سال، شکستہ حال۔ یہ بھی جو کچھ ہے چند آدمیوں کے دم سے ہے۔ دہلی والوں کے پاس کھانے ہی کو نہیں۔ سب محنت مزدوری کر کے پیٹ پال رہے ہیں۔ کچھ پیٹ کی خاطر شہر بدر پڑے ہیں۔ کتب بینی کا شوق ہو تو کہاں سے ہو۔ یہ تو سب پیٹ بھروں کے دھندے ہیں۔ ساری لائبریری میں ایک Pioneer اخبار آتا ہے۔ اس کا چندہ پینتالیس روپیہ سال ہے۔ یہی دینا دشوار ہے۔ ممبر ہی ایسے کون لمبے چوڑے ہیں۔ ایک چپراسی نوکر وہی سب کام کرتا ہے۔ باقی اللہ اللہ خیر صلا۔ چار بجے لائبریری کھلی۔ مغرب کے بعد بند۔ یوں اکا دکا کبھی کبھار کوئی آ جاتا ہے۔ روز کے آنے والے تو منشی صاحب (منشی ذکاء اللہ) ڈپٹی صاحب (ڈاکٹر نذیر احمد) اور ماسٹر پیارے لال ہیں۔ سچ تو یہ ہے، ان تین کا یہ کلب گھر ہے۔ باقی ممبر نام گنانے کو ہیں۔ یہ تینوں روز سہ پہر کو آن بیٹھتے ہیں۔ اخبار پڑھتے ہیں، باتیں بناتے ہیں۔ مغرب ہوتے چلے جاتے ہیں۔ چلو چھٹی ہوئی۔ کتب خانہ بند۔

آج بھی یہی تینوں صاحب بیٹھے ہیں کہ ان کی نظر مولوی عتیق الحق صاحب پر پڑی کہ ٹک ٹک چلے جا رہے ہیں۔ اب تک تو ان کو کوئی شہر میں جانتا بھی نہ تھا۔ مگر اب جاننے لگے ہیں۔ ان کے خطبوں نے ان کی شہرت کر دی ہے۔ ڈپٹی صاحب نے چپراسی سے کہا۔ یہ صاحب جو جا رہے ہیں (مولوی عتیق الحق صاحب کی طرف اشارہ کر کے) ان سے جا کر کہو کہ ہم لوگ یہاں بیٹھے ہیں، آپ سے ملنا چاہتے ہیں۔ اگر آپ کو تکلیف نہ ہو۔ تو تھوڑی دیر

کے لئے تشریف لے آئے - پھر اسی نیچے اُترا اور مولوی صاحب کو پیغام دیا - مولوی صاحب خیالات میں غرق تھے پہلے تو چونک پڑے - پھر کہا کیا ابھی بلایا ہے، اچھا کہہ دو آتا ہوں - مولوی صاحب آپ کو معلوم ہے بڑے نازک مزاج ہیں - جھلا ان کو راستہ میں کوئی اس طرح ٹوکے اور یہ چپ ہو رہیں، ان کی تو عادت کے خلاف ہی - شاید اس وقت نیکی کی جون میں ہونگے جو ٹھیک سرے کا جواب دیدیا - دل میں سوچا ہوگا، پہلے تو شہر میں کوئی میرے نام سے بھی واقف نہ تھا - اب غنیمت ہے - رو دار آدمی بلانے تو لگے ہیں - سیدھے لائبریری کیطرف ہو لئے - جب اوپر پہنچے تو سب مولوی صاحب سے بہت تپاک سے ملے - اِدھر اُدھر کی باتیں ہونے لگیں - ماسٹر پیارے لال نے دبی زبان سے کہا - مولوی صاحب آپ کا خطبہ سُننے کو بہت جی چاہتا ہے - عربک اسکول میں آپ نے خطبہ دیا، میں حاضر نہ ہو سکا - کیا کہوں بیمار ہو گیا - دل لوٹتے کا لوٹتا رہا - ڈپٹی صاحب موقع شناس آدمی ہیں، بولے تو اب کیا گیا ہے - مولوی صاحب سے عرض کرو کسی دن یہاں آکر کوئی خطبہ سُنادیں - چھوٹا سا جلسہ ہو جائیگا - چند احباب کو جمع کر لیں گے، مولوی صاحب کا جو نام سُنے گا وہ دوڑا چلا آئیگا - دو چار گھنٹے لطف سے گذر جائیں گے - مولوی صاحب نے جو یہ سُنا تو دل باغ باغ ہو گیا اور باچھیں کھل گئیں - لو بھائی اب تو لوگ میرا نام سُنکر دوڑ کے آنے لگے، اور وہ بھی اور کہیں کے نہیں دہلی شہر کے - جو بڑی مشکل سے آدمی کی قدر کرتے ہیں، فرمانے لگے آپ صاحبوں کی صحبت میں آنے کو تو بہت دل چاہتا ہے، پر مشاغل اتنے ہیں کہ فرصت نہیں ملتی - نہیں تو میں روز حاضر ہو جایا کروں - منشی صاحب سیدھے سادھے آدمی ہیں - بولے اس کو تو جانے دو، یہ کہو کہ کب ہمکو خطبہ سُناؤگے؟ مولوی صاحب ان کی سادگی پر مُسکرا دئے - بولے جو حکم حاضر ہوں - جب فرمائے خطبہ عرض کروں - منشی صاحب اچھا تو پھر خطبہ کا مضمون کیا ہو - مولوی صاحب آپ صاحبوں کو آج کل جس مضمون سے دلچسپی ہو وہ عنوان بتائیے ماسٹر پیارے لال نے کہا - دلچسپی وِلچسپی کا ذکر نہیں - سُنا ہے آپ نے عربک اسکول کے خطبہ میں فرمایا تھا کہ پھر کسی موقع پر مغلوں کی قلعہ کشائی کا تذکرہ کرونگا - ہمارے ہی سامنے اس کا تذکرہ فرما دیجئے - مولوی صاحب نے قبول کر لیا - اتوار کا دن اس کام کے واسطے تجویز ہوا - دعوت نامے جاری ہو گئے - دعوتِ ناموں کا ذکر کیا اور چھپے ہوئے بلاوے کیسے - یہ آج کل کا زمانہ تھوڑی ہے کہ ذرا سی بات ہوئی اور اشتہار لگ گئے - یا تو لوگوں کے پاس اب روپیہ فضول ہے یا چھپائی اور کاغذ سستا ہو گیا ہے - اُس زمانہ میں تو فہرست جاری ہو جاتی تھی اور ایسا ہی ہوا - اس فہرست میں نام بھی زیادہ نہ تھے، یہی بیس پچیس آدمی ہو گئے - شہر ہی کون تھا جسکو بلاتے - خیر مقررہ دن آگیا - مولوی صاحب تشریف لائے آدمی بھی بُلاوں سے کچھ زیادہ ہی جمع ہو گئے - منشی صاحب صدر منتخب ہوئے اور جلسہ شروع ہوا - مولوی صاحب بڑے ٹھسّے سے کھڑے ہوئے اور یوں فرمانے لگے -:-

خطبہ

میرے سامنے جو لوگ اس وقت جمع ہیں، ان میں ہر ایک اپنے فن میں فرد۔ خصوصاً منشی صاحب (منشی ذکاء اللہ) تو تاریخ دانی میں اپنا نظیر نہیں رکھتے۔ ان کی موجودگی میں ایک تاریخی مضمون پر زبان کھولنی سخت جسارت ہے۔ منشی صاحب کی خدمت میں میرا یہ التماس ہے، اگر میں کوئی غلطی کروں تو وہ فوراً مجھے لقمہ دیں، میں بہت ممنون ہونگا۔

اب آپ نفس مطلب ملاحظہ فرمائیں۔ ہندوستان میں قلعہ تین قسم کے ہیں۔ ایک تو وہ جو شہروں کے کنارے پر واقع ہیں۔ اکثر یہ قلعہ لبِ دریا ہیں۔ مسلمانوں کے بھی بنائے ہوئے ہیں اور ہندوؤں کے بھی۔ ہندوؤں کے کم مسلمانوں کے زیادہ۔ ان میں جنگی قلعہ بھی ہیں اور سکنی بھی۔ زیادہ تر یہ سکنی قلعہ ہی لبِ دریا ہوتے ہیں۔ اس میں بڑے بڑے فائدے ہیں۔ خندق میں پانی وافر موجود رہتا ہے۔ قلعہ کے اندر محاصرہ کی حالت میں پانی کا کبھی توڑا نہیں ہوتا۔ دریا کی طرف سے قلعہ حملہ آور سے محفوظ ہو جاتا ہے شکست کی صورت میں دریا کی جانب سے قلعہ بہ آسانی خالی کیا جا سکتا ہے اور جان سلامت لیکر فرار ہو سکتے ہیں۔ آپ فرمائیں گے قلعہ سکنی کیسے یہ تو جنگی ہی ہوتے ہیں۔ حضور یہ بات نہیں ہے۔ سکنی بھی ہوتے ہیں۔ یہ در اصل محصور محل ہیں جو اکثر بادشاہ نشین اور صوبہ دار نشین مقامات پر تعمیر ہوتے ہیں۔ ان کی جنگی اہمیت ضرور ہے۔ مگر یہ جنگی قلعہ نہیں ہیں۔ ان کی تعمیر بہت کچھ جنگی قلعوں کی سی ہوتی ہیں پھر بھی جنگی نہیں ہوتے۔ آگے چل کر اس کا فرق آپ پر ظاہر ہو جائیگا۔ سکنی قلعہ کا اصلی مقصد یہ ہے کہ ان میں بادشاہ یا صوبہ دار اندرونی فتنہ و فساد کی حالت میں محفوظ رہ سکے۔ اور اُس وقت تک مقاومت کر سکے جب تک باہر سے کمک آ جائے۔

اور فتنہ فرو ہو جائے۔ اسی قسم کا دہلی کا لال قلعہ اور آگرہ کا قلعہ ہے۔ ان کے اندر محلات ہوتے ہیں۔ "دیوان خاص" اور "دیوان عام" ہوتا ہے۔ "بازار ہوتے ہیں"۔ جھروکہ درشن" ہوتے ہیں۔ کارخانجات ہوتے ہیں کارخانجات آپ نہیں سمجھ سکتے اور یہاں اس کے سمجھانے کا موقع بھی نہیں۔ یہ جنگی قلعوں میں کہاں۔ ان قلعوں میں محصور ہو جانے کے بعد دیر تک قیام نہیں ہو سکتا۔ آذوقہ کی کمی پریشان کر دیتی ہے۔ وہ تو جنگی قلعہ ہی ہیں جو محاصرہ کی سختیاں برسوں جھیل سکتے ہیں۔ انکے لوازمات مختلف ہوتے ہیں۔ سکنی قلعہ کے ساتھ محصور یا غیر محصور شہر کی آبادی بھی ہوتی ہے۔ اکثر یہ بڑی آبادی ہوتی ہے۔ قلعہ کے ذمہ آبادی کی حفاظت ہوتی ہے حملہ آور غنیم سے نہیں بلکہ فتنہ و فساد اور ڈاکہ زنی سے۔

اب جنگی قلعوں کا حال سُنئے، یہ بشیتر میدانوں میں واقع ہیں۔ یا بر سرِ کوہ۔ جہاں ایسا قلعہ میدان

میں بنایا جاتا - تو ایسا مقام تجویز کیا جاتا جہاں پہاڑ ہو - اور اس کے گرد و پیش بہت دُور تک اوّل تو کوئی پہاڑ ہو ہی نہیں، اور اگر ہو بھی تو اُس سے بلند نہ ہو - قلعہ کے گرد و نواح میل آدھ میل سے کم ہی سمجھے جاتے ہیں - کیونکہ اُس زمانہ کے آلات حرب اس سے زیادہ دُور سے قلعہ کو کوئی صدمہ نہیں پہنچا سکتے تھے - اگر کوئی بلندی قلعہ کے قرب و جوار میں ہوتی تو اسکو **سرکوب** قلعہ کہتے ہیں - اس کا ذکر آگے آئیگا - اور یہ اچھی چیز نہیں خیال کی جاتی - جنگی قلعہ میں ہمہ وقت بہت بڑا ذخیرہ آذوقہ کا فراہم رکھا جاتا تھا - اُن خورد و نوش کی چیزوں کا بیان کرنا طویل ہے کہ وہ کیا ہوتی تھیں - پختہ اور خام ہر قسم کی جنس موجود رہتی تھی - قلعہ کے اندر میدان اس قدر وسیع ہوتا تھا کہ اُسی کے اندر کھیتی باڑی کر کے مدّت تک گزر اوقات ہو سکتی تھی - پانی کا اعلیٰ انتظام ہوتا تھا - پہاڑی چشمہ جو ہمیشہ پانی سے لبریز رہتا اُنکے اندر ہوتے تھے - قلعہ کی خندق میں پانی ایسے طریقوں سے لایا جاتا تھا کہ غنیم اُس پر قابو پا کر پانی خشک کر سکے یہ آسان کام نہ تھے - بڑی ہنرمندی کے کام تھے - جہاں پانی کا انتظام خاطر خواہ نہیں ہو سکتا تھا وہاں قلعہ کے گرد خندق تعمیر ہی نہیں کی جاتی تھی - ایسے قلعوں کی بہترین مثالیں دولت آباد کا قلعہ گولکنڈہ کا قلعہ - بیدر کا قلعہ - دریائے اٹک کا قلعہ ہیں - ان میں کہیں خندق ہے اور کہیں نہیں - قلعہ کی تعمیر اس طرح ہوتی تھی، ایک پہلی فصیل جو بیحد مستحکم بنائی جاتی تھی - اسمیں برج اور دمدمہ ہوتے ہیں قلعہ کی فصیل پہلدار ہوتی ہے - اور ہر پہلو پر برج اور دمدمہ - ان کا فائدہ یہ ہے کہ اس کے درمیانی حصّہ پر گولہ باری، تیر باری اور گولیاں ماری جا سکیں تاکہ دشمن فصیل کے قریب تک نہ پھٹکنے پائے - دروازے زیادہ نہیں ہوتے - ایک یا حد سے حد دو - ان کے آگے گھونگٹ کے گرگج ہوتے ہیں - تاکہ گزار دشوار ہو جائے اور دروازہ کو صدمہ نہ پہنچ سکے - پہلی فصیل کے بعد دوسری فصیل ہوتی ہے - مگر یہ ہر قلعہ میں نہیں ہوتی - اگر ایسا ہوتا ہے تو دوسری فصیل پہلی سے قدرے بلند ہوتی ہے: تاکہ دونوں بہ یک وقت کارآمد ہو سکیں - ان دونوں میں زیادہ فاصلہ نہیں ہوتا - قلعہ کے دروازہ کے سامنے کھائی پر کاٹھ کا پل ہوتا ہے آہنی زنجیروں سے بندھا ہوا - یہ منٹوں میں لگا دیا جاتا اور منٹوں میں اندر گھسیٹ لیا جاتا - راستہ جاری اور مسدود چٹکی بھر میں ہو سکتا ہے - اب قلعہ کے اندر کا حال سُنئے - فصیل کے بعد بہت بڑا میدان ہوتا ہے - اس قدر وسیع کہ اس میں بخوبی زراعت ہو سکے - قلعہ کے اندر سکنی عمارتیں ہوتی ہیں - جہاں بادشاہ سلامت یا افسران فوج قیام کر سکیں - مگر یہ فنِ تعمیر کے اعلیٰ نمونہ نہیں ہوتے - اس کے بعد وہ بلندی ہوتی ہے جو اس محصور زمین کے وسط میں ہوتی ہے - اس کے گرد بھی فصیل بنائی جاتی ہے - اور جانے کے لئے دروازہ ہوتا ہے، بہت مستحکم - آگے چلکر راستہ قدم قدم پر دشوار گزار ہوتا جاتا ہے

کہیں کہیں تنگ و تاریک چھتوں میں سے گزرنا پڑتا ہے جو پہاڑ میں کھود کر بنائے جاتے ہیں۔ ان کے ... ڈھک سکتا ہے۔ اور اُس کے اوپر آگ روشن کی جاتی ہے۔ پھر یہ حصہ ناقابل گزار ہوجاتا ہے۔ سرِکوہ پر بھی عمارت ہوتی ہے۔ قلعہ کے اس حصہ کو بالا حصار کہتے ہیں۔ قلعہ کا بیرونی حصہ فتح ہوجانے کے بعد یہاں فوج آخری مقاومت کرتی ہے۔ اس بلندی پر جگہ جگہ توپیں چڑھی ہوئی ہوتی ہیں جن سے دشمن پر ہر حالت میں گولہ اندازی کی جاتی ہے۔ خواہ اُس کی فوجیں قلعہ کے باہر ہوں یا اندر گھس آئی ہوں۔ اب صرف ایک چیز قلعہ کی باقی رہ گئی جس کو شیر حاجی کہتے ہیں۔ بندہ نے یہ لفظ بار بار پڑھا۔ مگر مطلب سمجھنے سے قاصر رہا۔ شاید منشی صاحب اس کو سمجھا سکیں۔ اگر وہ ایسا کریں تو میں اُنکا بہت ممنون ہونگا۔ یہ کہہ کر مولوی صاحب کچھ دیر کو چپ ہو رہے۔ مگر منشی صاحب (منشی ذکاء اللہ) نے نیچے سے اوپر آنکھ ہی نہیں اٹھائی۔ جب مولوی صاحب نے یہ حالت دیکھی تو بیان جاری کر دیا۔

اب قلعوں کی ایک قسم باقی رہ گئی ہے۔ وہ گڑھیاں ہیں۔ یہ سارے ملک میں بکھری ہوئی ہیں۔ زیادہ جنگی اہمیت نہیں رکھتیں۔ زمینداروں اور جاگیرداروں کی ہوتی تھیں۔ ان کی وسعت بھی زیادہ نہیں ہوتی۔ ان لوگوں کے آپس کے مناقشوں میں کام آتی تھیں۔ بہتیری گڑھیاں راجپوتانہ کی ہیں۔ برسرِکوہ واقع ہیں۔ اور بہت خوبصورت ہیں۔ خصوصاً ایک آدھ گڑھی جو ریاست جے پور میں ہے بالکل اُسی نمونہ کی ہے جیسے انگلستان کے Baron's Castles۔ خدا جانے یہ کیا بات ہے، یہاں یورپ کے نمونے کیسے آ گئے۔ شاید ضرورت نے یہ نمونہ پیدا کئے ہوں۔

قلعوں کا حال تو آپ سُن چکے۔ اب قلعہ کشائی کا حال سُنئے:

... قلعہ کے سامنے پڑا ہے۔ قلعہ دار نے قلعہ بند کر لیا ہے۔ مدافعت کا سارا ساز و سامان درست ہے۔ ... قلعہ دار کے نام حکم نامہ تحریر کرتا ہے۔ اس میں ترغیب بھی ہے اور ترہیب بھی۔ ایک امیر حکم نامہ لیکر گھوڑے سوار پائین دیوار قلعہ آتا ہے۔ سفید جھنڈی دکھاتا ہے فصیل پر سے اس کی مزاحمت نہیں کیجاتی۔ اوپر سے رسی میں بندھی ہوئی ٹوکری اُترتی ہے۔ یہ نامہ کو اُس میں رکھ دیتا ہے۔ وہ اوپر کھینچ جاتی ہے۔ نامہ قلعہ دار کو دیا جاتا ہے۔ نہ ترغیب اوس پر اثر کرتی ہے نہ ترہیب۔ وہ مالک کا نمک حلال ہے۔ جواب باادب تحریر ہوتا ہے مگر انکار میں۔ جواب ملنے پر پہلے یہ تدبیر سوچی جاتی ہے کہ قلعہ والوں پر پانی بند کر دیا جائے تاکہ وہ بیتاب ہوکر قلعہ کے دروازہ کھول دیں۔ قلعہ کے اندر اور کھائی میں پانی نہر کے ذریعہ پہنچ رہا ہے۔ اس کو بند کر دینے کا خیال ہے۔ ماہرِ فن جمع ہوتے ہیں۔ وہاں کے باشندوں سے پرسش ہوتی ہے۔ ایک نہر کا منبع بتاتا ہے۔ وہاں کھدائی کیجاتی ہے مگر ناکام۔ نہر ایسے ڈول سے کاریگر نے بنائی ہے کہ وہ کہاں سے

آتی ہے اور کیونکر جاتی ہے، اس کا پتہ ہی نہیں چلتا۔ عاجز ہو کر سرکوب کی تلاش میں مصروف ہوتے ہیں۔

پہلے آپ یہ سمجھیں کہ سرکوب کیا چیز ہے۔ یہ کوئی بلند مقام قلعہ کے قرب و جوار میں ہونا چاہیئے۔ اگر قلعہ کے برابر بلند نہ ہو تو کچھ تو ہو۔ ایک ایسی پہاڑی مل جاتی ہے۔ یہاں آلاتِ قلعہ شکن نصب کئے جاتے ہیں۔ یہ بڑی توپیں ہیں اور منجنیق، توپوں سے گولے اور منجنیق سے پتھر برسائے جاتے ہیں۔ قلعہ کے اندر اور باہر گرتے ہیں۔ قلعہ کے اندر سے توپوں سے ان کی خبر لیجاتی ہے۔ گولے قلعہ کی فولادی دیواروں پر کچھ اثر نہیں کرتے۔ دونوں جانب کا زیادہ نقصان نہیں ہوتا۔ اب دوسری تدبیر کی طرف توجہ کیجاتی ہے۔ سرنگ لگا کر قلعہ کا کوئی بُرج اور فصیل کا حصّہ اڑا دیا جائے۔ کرناٹک کے دانایانِ فنِ نقب ساتھ ہیں۔ نقب کھودنی شروع کرتے ہیں۔ میل آدھ میل پرے سے یہ کام شروع ہوتا ہے۔ کمال یہ ہے کہ نقب کے اندر کسی طرح روشنی اور ہوا پہنچائی جاتی ہے۔ تاکہ مزدور کام کر سکیں۔ اور یہ بھی شرط ہے کہ قلعہ والوں کو یہ نہ معلوم ہونے پائے کہ کس طرف سے سرنگ آرہی ہے۔ وہ پتہ چلانے کی تلاش میں ہیں۔ لو پتہ چل گیا۔ انہوں نے مقابل سے سرنگ کھودنی شروع کر دی۔ یہاں کان و کان بھی خبر نہیں ہوتی، سرنگ تیار ہوگئی۔ اُس میں باروت کے تھیلے اُتار دئے گئے۔ شتابہ لگا دئے گئے۔ اُڑانے کا وقت مقرر ہوگیا۔ سردار فوجیں لئے تیار کھڑے ہیں۔ ادھر بُرج اور فصیل گرے اور ادھر وہ حملہ کردیں۔ سرنگ کو آگ دی جاتی ہے۔ مگر باروت آگ نہیں پکڑتی۔ معلوم ہوا کہ سرنگ کے اندر قلعہ والوں نے کھائی کا پانی چھوڑ دیا ہے۔ لیجئے کئی مہینوں کی محنت اکارت گئی۔

لشکر معطل نہیں پڑا ہے۔ وقت بے وقت قلعہ کے اندر سے فوج کے دستہ نکلتے ہیں اور چھاپہ مار جاتے ہیں۔ شاہی لشکر اُن کا تعاقب کرتا ہے۔ مگر وہ ایسے چالاک ہیں کہ انکے پہنچتے پہنچتے قلعہ کے اندر داخل ہو جاتے ہیں۔ اور دروازہ بند۔ یہ مُنہ دیکھتے کے دیکھتے رہ جاتے ہیں۔

اب ایک اور ماجرا سُنئے۔ قلعہ کی طرف کبوتر پرواز کرتے نظر آئے، ایک دو کو تیر مار کے گرا لیا۔ ان کے پروں میں نامہ ہے۔ یہ نامہ بر ہیں۔ قلعہ کے اندر نامہ پہنچانا چاہتے ہیں۔ کچھ مر کے گر پڑے، کچھ اندر داخل ہوگئے۔ نامہ پڑھا گیا، معلوم ہوا کہ کمک روانہ ہوگئی ہے۔ وہ قلعہ کی فوج کو تقویت دیگی۔ قلعہ والوں کو بھی اس کی اطلاع ہوگئی اور کچھ زیادہ ہوئی۔ باہر والوں کو تعداد اور وقت کی خبر نہیں ملی۔ اندر والوں کو اس کی خبر بھی ہوگئی۔ خوشیاں منائی جانے لگیں۔ انتظار دونوں طرف سے ہو رہا ہے۔ جاسوس روانہ ہوئے کہ کمک کی خبر لائیں۔ کوئی پکی خبر نہ لا سکا۔ چاروں طرف انتظام ہے کہ جدھر سے فوج نمودار ہو اس کا مقابلہ کیا جائے۔ وہ قلعہ کے اندر داخل نہ ہونے پائے۔ شاہزادہ کی طرف سے سخت تہدید ہے۔ دارالخلافہ سے برابر حکم آرہے ہیں کہ

قلعہ جلد فتح کیا جائے - ادھر سے مجبوری کا اظہار کیا جاتا ہے - اندھیری رات ہے - بارش ہو رہی ہے - کچھ آدمی قلعہ کے اندر اور کچھ باہر زمین پر کان لگائے پڑے ہیں - آپ سمجھے یہ کیا کرتے ہیں - ان کے کان سدھے ہوئے ہیں - دور سے فوج کے آنے کی آواز زمین کے ذریعہ سے ان کے کان میں آجاتی ہے - اور فوج کی قسم اور تعداد تک بتادیتے ہیں - لیجئے فوج آن پہنچی، معلوم ہوا کہ سوار فوج ہے - دو ہزار سے زیادہ نہیں جدھر سے آواز آرہی تھی، ادھر انتظام ہوگیا کہ فوج کو روکا جائے - دور سے روشنی نظر آئی - شاہی فوج مشعلیں روشن کئے ہوئے - مہتابیاں چھوڑتی ہوئی اُس طرف روانہ ہوئی - وہاں جاکر کیا دیکھتے ہیں کہ سیکڑوں بیل ہیں جن کے سینگوں پر فتیلہ باندھ کر سلگا دئے ہیں اور اندھیرے میں ادھر کو ہنکا دیا ہے - فوج راستہ کاٹ کے قلعہ کے اندر داخل ہوگئی - ساری امیدوں پر پانی پھر گیا - شاہزادہ کا افسروں پر عتاب ہوا - مگر بے سود، ان بیچاروں کی کیا خطا تھی، دھوکے میں آگئے -

اب پھر سرنگ پر بھروسہ کیا جارہا ہے - سخت قدغن ہے کہ نقب جلد تیار ہو - رات دن کام جاری ہے - سردار متعین ہیں - خبردار دشمن کو خبر نہ ہونے پائے - نہیں تو پہلے کی طرح ناکامی کا مُنہ دیکھنا ہوگا - لیجئے نقب تیار ہوگئی - بارُوت کے تھیلے رکھ دئے گئے - شتابہ لگ گئے - قلعہ والے بالکل بے خبر ہیں -

سرنگ کو اڑانے کا وقت آگیا - تمام سرداروں کے نام احکام جاری ہوگئے - کل سورج نکلتے ہی نقب کو آگ دکھائی جائیگی، رات بھر چپکے چپکے لشکر میں تیاری ہوتی رہی - اندھیرے تمام قسم کے قلعہ کو سر کرنے کے سامان لیکر فوج کے دستہ موقع پر موجود ہیں - لیجئے سرنگ اُڑ گئی اور قلعہ کا ایک برج اور کچھ حصہ فصیل کا آن رہا - غبار کا وہ عالم کہ پندرہ بیس منٹ تک آدھ آدھ میل کچھ نظر نہیں آتا - خدا کی قدرت ہوا ادھر کی ہے، ساری گرد ادھر ہی آرہی ہے - اتنے میں قلعہ والے ساز و سامان درست کر کے موقع پر آن موجود ہوئے - غبار کا فرو ہونا تھا کہ حملہ بول دیا گیا - آتش بازوں نے بان اور نالیں چھوڑنی شروع کیں، ادھر سے بھی ان کا جواب ملا - دونوں طرف بوق اور قرنا اور نقارے بج رہے ہیں - کان پڑی آواز نہیں آتی - نعوذ باللہ - محشر بپا ہے - آدمی مچھڑ اور مکھیوں کی طرح مر مر کر گر رہے ہیں - لو! وہ سیڑھیاں لگیں، کچھ بہادر رخنہ میں داخل ہونے کی کوشش کر رہے ہیں - اللہ اکبر کے نعرہ دونوں طرف سے بلند ہیں - دل ہلے جاتے ہیں - خندق ملبہ سے پٹ گئی، اب دیوار قلعہ تک پہنچنا دشوار نہیں - مگر فصیل پر سے تیروں کی بارش ہو رہی ہے - قرابیں اور بندوقوں کی بھرمار ہے - بھرمار کا محاورہ تو آپ نے بارہا سنا ہوگا - مگر یہ نہ سمجھے کہ یہ کیا چیز ہے - بندوقچی ایک خاص پیترے سے گردش کرتا ہے - اس عرصہ میں بندوق بھر لیتا ہے، پھر

بلا نشانہ تاکے مار دیتا ہے۔ تقریباً ایک منٹ میں ایک فیر ہو جاتا ہے۔ اس کو بھر مار کہتے ہیں جب غنیم کی فوج قریب آجاتی ہے اُس وقت یہ عمل کیا جاتا ہے۔ اس تشریح کو تو جانے دیجئے، مطلب پر آئیے۔ دیکھیئے وہ سیڑھی لگی۔ سپاہی قطار باندھے چڑھے چلے جا رہے ہیں۔ ہر ڈنڈے پر ایک آدمی نظر آتا ہے۔ پہلے نے کنگرے سے سر نکالا۔ تلوار کا وار ہوا۔ گردن بھٹا سی کٹ گئی وہ گرا۔ دوسرا اُس کی جگہ موجود۔ تلوار کا وار سپر پر روکا۔ اُچک کر ادھر جانا چاہتا تھا کہ ایک سپاہی نے کولی بھر لی، دونوں دھم سے نیچے آئے۔ جوان کا حشر ہوا خدا ہی جانتا ہے۔ مگر واہ رے بہادری۔ ایک کو چڑھنے نہ دیا۔ سب واپس ہوئے۔ ادھر سوار فوج کو حملہ کا حکم ملا۔ گھوڑے مارتے ہوئے آگے بڑھے۔ ادھر سے ایسی تیروں اور گولیوں کی بوچھاڑ پڑی کہ مُنہ پھر گئے۔ ناکام واپس ہوئے۔ ہاتھیوں کے ریل دینے کا فرمان ہوا۔ ہاتھی چلے، آتش باز آگے بڑھے۔ بان مارنے شروع کئے۔ ہاتھی چنگھاڑیں مارتے ہوئے واپس ہوگئے۔ واہ رے بہادروں اسی طرح لڑتے ہیں۔ شاہزادہ بھی فیل سوار ایک بلندی پر کھڑا حملہ کو دیکھ رہا ہے۔ اور مردانگی کی داد دے رہا ہے۔

حملے پے در پے ہو رہے ہیں، مگر قلعہ والے مرتے ہیں پر ہمّت نہیں ہارتے۔ شام ہونے آگئی، دونوں طرف خون کے دریا بہہ گئے۔ تاہم قلعہ کے اندر قدم رکھنا نصیب نہیں ہوا۔ اب واپسی کا حکم ہوگیا۔ مورچہ پائے دیوار جما لیا گیا۔ سارے سپہ سالار شاہزادہ کے روبرو طلب ہوئے۔ دوسرے دن کے واسطے کارروائی کے نقشہ بنے۔ ہر شخص یہی کہتا تھا کہ کل ضرور قلعہ فتح ہو جائیگا۔ صبح ہوتے ہوتے کیا دیکھتے ہیں کہ اندر کے رُخ ڈھے ہوئے حصّہ پر راتوں رات دمدمہ تعمیر ہو گیا۔ فصیل کے رخنہ بوریوں سے مضبوط کر دئے گئے۔ لیجئے اب وہی پہلی سی حالت قایم ہوگئی، حملہ موقوف رہا۔

اب یہ صلاح قرار پائی کہ اور سرنگ تیار کیجائے۔ دارالخلافہ سے حکم پر حکم آ رہے ہیں کہ قلعہ کیوں نہیں فتح ہوتا۔ یہاں مجبوری کا عالم ہے۔ کل کے سارے واقعات کی مفصل اطلاع دی گئی۔

دوسری سرنگ کی تیاری شروع ہوئی۔ مگر اس کے لئے پھر مہینہ پندرہ دن کی ضرورت ہے۔ خیر جو ہونا ہے ہوگا۔ کام تو اسی طرح ہوا کرتے ہیں۔ مگر اقبال سامنے تھا۔ فلک نقشہ ساز نے کیسی بازی کھیلی۔ ہوئی تبدیلی جس جگہ سرنگ اڑی تھی یہیں سے قلعہ کے اندر نہر جاتی تھی۔ اس میں ملبہ اٹ گیا۔ قلعہ میں پانی جانا بند ہوگیا۔ باؤلیاں اور کنوئیں تھے۔ مگر ان کا پانی کافی نہ تھا۔ پانی کا قحط پڑ گیا۔ انتظام کی خوبی دیکھیئے۔ باہر اس کی کسی کو خبر نہیں ہوئی۔

تیسرے دن قلعہ کے اندر سے کچھ سوار سفید جھنڈیاں لیکر نکلے۔ اور شاہزادہ کے حضور میں حاضر

ہونے کی اجازت چاہی، اجازت ہوگئی۔ قلعہ دار کی طرف سے نذر اور تحائف پیش کیے۔ اور جان بخشی کی التجا کی۔ یہاں بھی قلعہ کشائی سے عاجز آ گئے تھے، سارے التماس قبول کر لیے گئے۔ یہ قرار پایا کہ کل قلعہ شاہی فوج کے سپرد کر دیا جائے گا۔ شرط یہ ہے کہ قلعہ کی فوج کو بلا مزاحمت باہر نکل جانے دیا جائے۔ جس قدر سامان وہ اپنے ساتھ لیجا سکیں لے جائیں۔ شاہزادہ کی بارگاہ میں یہ معروضہ قبول ہوا۔ لیجئے قلعہ دوسرے دن سپرد کر دیا گیا۔ قلعہ کے اندر داخل ہونے کے بعد معلوم ہوا کہ پانی بند ہو گیا تھا۔ کفِ افسوس مل کر چپ ہو رہے۔ ظفر نامہ بادشاہ کی خدمت میں پیغام لیکر روانہ ہوا۔ شادیانہ بجنے شروع ہوئے۔ قلعہ کی مرمت کی گئی۔ قلعہ دار مقرر کیا گیا۔ ایک اچھی بڑی فوج قلعہ میں چھوڑی گئی۔ پھر شاہی لشکر آگے روانہ ہوا۔ لیجیے اب بندہ بھی رخصت۔ آداب عرض ہے"

مولوی صاحب اپنی جگہ پر آن بیٹھے۔ منشی صاحب کھڑے ہوئے۔ تحسین و آفرین کے نعرہ بلند تھے، سب کو چپ کیا اور مقرر صاحب کا شکریہ سارے سامعین کی طرف سے ادا کیا۔ ایک گوٹے کا ہار پہلے سے لا رکھا تھا۔ وہ انہوں نے مولوی صاحب کے گلے میں ڈالا۔ مولوی صاحب نے شکریہ کے ساتھ قبول کیا۔ جلسہ برخاست ہوا۔

خواجہ عبدالمجید۔ دہلوی

دنیائے تعلق سے کنارا کرتے — دل کا یہ تلوّن نہ گوارا کرتے
رہتے جو ذرا ہوش ٹھکانے اپنے — ہستی و عدم میں سر نہ مارا کرتے

ہر ذرّہ سے کسبِ نور کرتا ہوں میں — گردِ ظلمت کو دور کرتا ہوں میں
دل ہی کو بناتا ہوں مقامِ معراج — سینے ہی میں سیرِ طور کرتا ہوں میں

کثرت نے، نہ ہوش کی کمی نے مارا — ایسا نہ مجھے اور کسی نے مارا
میں ہی اس سے ہوں اے منوّرا آگاہ — جیسا مجھے دل کی بیکلی نے مارا

گھیرے نہ کبھی آہ! اندھیرا مجھکو — بہکا نہ سکے خیال میرا مجھکو
دے روشنی ایسی کہ یہ آنکھیں کھل جائیں — آجائے نظر وجود تیرا مجھکو

بشیشور پرشاد منوّر لکھنوی،

جامع مسجد دہلی

(از میرزا وجیہہ الدین خاں صاحب وجیہہ دہلوی چیف اڈیٹر ٹونک)

تمہید میرے عزیز دوست خواجہ محمد شفیع صاحب بی۔ اے رئیس دہلی نے مجھ سے خواہش کی تھی کہ جامع مسجد دہلی کے تاریخی حالات تحریر کروں۔ مگر بدقسمتی سے نہ میں مؤرخ ہوں اور نہ ادیب، اسلئے موضوع پر قلم اٹھانا میرے لئے دشوار ہے۔ مگر خواجہ صاحب ممدوح کی تعمیل ارشاد میں یہ چند سطور حوالۂ قلم کرتا ہوں۔ جامع مسجد کے متعلق اکثر حالات بزرگوں سے سُنے تھے جو میرے سینہ میں محفوظ تھے۔ میں اُن سب کی صحت کا ذمہ دار نہیں ہوں۔ مگر جو کچھ مجھ تک پہنچا ہے ناظرین کے سامنے پیش کرتا ہوں۔ چونکہ میں خود معمر ہوں اسلئے بعض روایات جو شاید نئی روشنی کے احباب کیواسطے زیادہ دلچسپ اور دلکش نہ ہوں مگر پرانی باتوں کے دلدادہ حضرات کے لئے یہ واقعات دلفریبی سے خالی نہ ہونگے۔

جامع مسجد کی تاریخ جامع مسجد دہلی جس کا اصلی نام **مسجد جہاں نما** ہے، حضرت صاحبقران **شہاب الدین محمد شاہجہاں بادشاہ ہندوستان** کے حکم سے تعمیر ہوئی تھی، ۱۰ شوال سنہ ۱۰۶۰ھ میں اس کی بنیاد رکھی گئی تھی، اور یوم عید الفطر سنہ ۱۰۶۶ھ میں پایۂ تکمیل کو پہنچی، اور شہنشاہ شاہجہاں نے اس میں نماز ادا کرکے اس کی افتتاح فرمائی اور عام مسلمانوں نے اُس سال عید الضحیٰ کی نماز اس میں پڑھی۔ مسجد کی تعمیر کا اہتمام **سعد اللہ خاں** وزیر سلطنت اور **فاضل خاں** خانساماں کے سپرد تھا (نوٹ:۔ خانساماں سلطنت مغلیہ میں ایک منصب جلیلہ تھا۔ نوعمر لوگ اس کو "بٹلر" کے معنی میں نہ لیں) اس مسجد کا نقشہ بڑے قابل مہندس (آرچی ٹیکٹ) نے بنایا تھا اور تعمیر کی نگرانی میں دو قابل انجنیر لگے ہوئے جن کا نام استاد حامد اور استاد ہیرا تھا، جن کے نام سے مسجد کے شمالی دروازہ سے کچھ فاصلہ پر دو محلّے اب تک آباد ہیں، پانچہزار کاریگر جن میں معمار، سنگتراش، بیلدار اور مزدور شامل تھے۔ اس مسجد کی تعمیر میں چھ سال تک مسلسل لگے رہے۔ دس لاکھ روپیہ صرف ہوا، جو اس زمانہ کے دس کروڑ کے برابر سمجھنا چاہیئے۔ اس کے علاوہ ریاستہائے جیپور، بھرتپور وغیرہ سے پتھر حاصل کیا گیا جس کے عوض میں ان ریاستوں کا خراج معاف کردیا گیا تھا، کاریگروں کی مزدوری دو پیسہ یومیہ تھی، جس میں ادنیٰ اور اعلیٰ کا امتیاز نہ تھا۔

شام کو تمام کاریگر صحن مسجد میں بیٹھ جاتے تھے، اور شاہی خزانچی سب کو دو دو پیسے دید یا کرتا تھا۔ شہر کے بعض غربا بھی کرنی بسولی ہاتھ میں لیکر اس جم غفیر میں جا بیٹھتے تھے، اور اُن کو بھی بغیر خدمت کے مزدوری مل جاتی تھی، شاہ گیتی پناہ کو جب اس کا علم ہوا تو اس سے چشم پوشی کی، اور بادشاہ کے دریائے سخاوت سے ایسے مساکین بھی فیض یاب ہوتے رہے - یہ مسجد بھی حضرت شاہ جہاں کی بڑی یادگاروں میں سے ایک ہے۔ مسجد کی ساری تعمیر اُس قیمتی سنگ سُرخ سے ہوئی کہ جواب نایاب ہے۔ البتہ صدر دالان کا فرش اور گنبد سنگ مرمر کے ہیں جن میں سنگ موسیٰ کی پچہ کاری نہایت دلاویز طور پر کی ہوئی ہے۔ یہ مسجد ایک پہاڑی پر بنائی گئی ہے جو نئی دہلی کی سکرٹریٹ بلڈنگ کی پہاڑی کی طرح عمارت میں ڈھک گئی ہے۔ مسجد کے تین گنبد ہیں جو ۲۰۰ گز محیط ہیں۔ صدر دالان میں سات محرابیں اندر کی طرف ہیں اور گیارہ باہر کی جانب، جن پر کتبہ درج ہے۔ جس میں مسجد کی تعمیر کی تاریخ وغیرہ لکھی ہوئی ہے۔ وسط صحن میں سنگ مرمر کا خوشنما حوض ہے جن میں ایک جگہ واقع جانب شمال مغرب رہٹ کے کنوئیں سے پانی آکر حوض میں بھرتا تھا - اب وہ انتظام نہیں رہا ہے، اور نل کے ذریعہ پانی مہیا کیا جاتا ہے - اس مسجد میں بہت سی صنعتی کاریگریاں دکھائی گئی ہیں۔ جن کو ماہرین فنِ تعمیر دیکھ کر عش عش کرتے ہیں۔ مثلاً چاد رہٹ مسجد کے صحن سے کسی قدر نیچے ہے۔ مگر عقل حیران ہے کہ وہاں سے اتنی بلندی پر پانی کیونکر چڑھا آتا تھا۔ گنبدوں میں سنگ سرخ کے نہایت وزنی شہتیر لگے ہوئے ہیں - یہ سمجھ میں نہیں آتا کہ وہ کون سے جرثقیل تھے کہ جن کی مدد سے ان کو اوپر چڑھا کر نصب کیا گیا - اسی طرح مسجد کے دو بلند مینار تعمیر کرنیکے وقت کیونکر مصالحہ پہنچایا جاتا تھا - کیونکہ اُس وقت مشینوں کی ایجاد نہیں ہوئی تھی، در اصل یہ اُس نیک نہاد اور پاک طینت بادشاہ کی نیک نیتی کا نتیجہ ہے کہ یہ عظیم الشان عمارت درجۂ تکمیل کو پہنچی اور بغیر کسی خاص انتظام مرمت کے چارسو سال سے قائم اور آباد ہے اور یہ معلوم ہوتا ہے کہ ابھی بن کر کھڑی ہوئی ہے۔

عمارت کی ترمیمات جو حضرت شاہجہاں کے بعد میں ہوئیں

حضرت شاہجہاں نے مسجد کے صدر دالان، مینارے صحن مسجد مع حوض اور تین وسیع دروازے مع سیڑھیوں کے تعمیر کرائے تھے۔ اور ہندوستان کی دیگر جامع مسجدوں کی طرح تین طرف خالی چھوڑ دی گئی تھیں، مگر حضرت عالمگیر اورنگ زیب نے اپنے عہد میں ان تینوں اطراف شمال مشرق اور جنوب میں سنگ سرخ کے دالان تعمیر کرائے۔ مسجد کے شمال مشرقی کونہ کے حجرہ میں آثار شریف حضرت رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے محفوظ ہیں - الماس علی خاں خواجہ سرا

نے شہنشاہ عالمگیر کے زمانہ میں ایک محجّر سنگ سُرخ کا ان تبرکات کی مزید حفاظت کے لئے تعمیر کرا دیا تھا جو سنہ ۱۸۴۲ء کے قریب ایک طوفان میں منہدم ہوگیا تھا، جس کو حضرت بہادر شاہ ثانی نے اپنے خرچ سے دوبارہ بنادیا تھا۔ سنہ ۱۱۸۰ھ میں محمد حسین خاں محلی نے حوض کے شمال مغربی گوشہ میں ایک چھوٹا سا کٹہرہ بنوایا تھا، اسلئے کہ بموجب ایک روایت کے ایک بزرگ نے حضرت رسول خدا صلعم کو اُس مقام پر بیٹھے ہوئے دیکھا تھا۔ بعد کے زمانہ میں بعض خوش عقیدہ امرا کی کوشش سے ایک جالی دار دیوار شمال مینارِ مسجد سے لگا کر اُس کے متوازی مشرقی دالان تک کھچوا دی تھی، اور مسجد کا یہ حصّہ آثار شریف سے مُتعلق کر دیا گیا تھا۔ انیسویں صدی کے شروع میں حضرت شاہ اسمٰعیل شہیدؒ نے اسے بدعت قرار دیا، کیونکہ اس کی وجہ سے صحنِ مسجد میں جب نماز کے واسطے صف بندی ہوتی تھی تو خلافِ شریعت دائیں جانب صف چھوٹی ہو جاتی تھی، پس شاہ صاحب ممدوح کی کوشش سے وہ دیوار ٹھنڈی کرا دی گئی۔ چونکہ کثرت سے لوگ آثار شریف کی زیارت کو آیا کرتے تھے، اسلئے بعض سودے والے اپنے خونچے صحنِ مسجد میں حوض کے پیچھے تک مشرق کی جانب لگا لیا کرتے تھے اور صحن میں کوڑا کرکٹ اور پتّے وغیرہ گر جایا کرتے تھے جس سے مسجد کی بے رونقی اور سوءِ ادبی ہوتی تھی۔ شاہ صاحب اور اُن کے قبیل کے دیگر علماء کے احتجاج پر صحن میں اس قسم کی دوکانوں کا لگنا بند ہو گیا، اور اس قسم کی دکانیں جنوبی دروازہ کی سیڑھیوں پر جو جانب بازار مٹیا محل واقع ہے لگنے لگیں، جن کے ساتھ ساتھ کبوتر اور مُرغ وغیرہ بھی فروخت ہونے کے لئے لائے جانے لگے اور وہ رنگ قایم ہوگیا کہ جو اب مسجد کے شرقی دروازہ پر قایم ہے۔ مگر غدر کے بعد سے یہ ہنگامہ اب شرقی دروازہ کی طرف مستقل ہو گیا، جہاں روزانہ چوک لگتا ہے۔

مسجد کی مرمّت

شاہانِ مغلیہ نے اپنے عہدِ حکومت میں مسجد کی صفائی اور مرمّت کی خدمت اپنے ذمّہ لے رکھی تھی، اور حتی الوسع اس کی خبر گیری کرتے تھے، حتیٰ کہ حضرت بہادر شاہ ثانی نے بھی اپنی قلیل آمدنی میں سے پچاس روپیہ سالانہ مسجد کی مرمت کیواسطے منظور فرما رکھا تھا اور یہ خدمت آغا فضل اللہ خاں صاحب داماد نواب مستقیم جنگ مولوی عطاء اللہ خان بہادر کے سپرد کر رکھی تھی۔ مسجد کے اخراجات کے واسطے چند مواضعات وقف تھے، مگر اب اُن کا پتہ نہیں۔ سنہ ۱۸۱۷ء کے قریب حضرت اکبر شاہ ثانیؒ کے عہد میں مسجد کے شمالی مینارہ پر بجلی گر پڑی تھی جس سے مینارہ کا ایک حصّہ منہدم ہو گیا تھا، اور صحن کا فرش بھی ٹوٹ گیا تھا۔ سرکار انگریزی نے مینار اور فرشِ صحن کی عمدگی کے ساتھ مرمت کرا دی تھی۔ سنہ ۱۸۹۴ء میں دوبارہ مسجد کے جنوبی مینار پر بجلی گری تھی، جس سے اوپر کی بُرجی شکستہ ہوگئی تھی۔ ہزہائی نس نواب کلب علی خاں بہادر مغفور والیِ ریاست رام پور نے

ایک لاکھ سے زاید روپیہ صرف کر کے سید زمان شاہ صاحب دہلوی کی زیر نگرانی اُسکی کما حقہٗ مرمت کرادی تھی۔

چڑھاوے اور مرمت

نواب بنگش نے جن کا کمرہ بازار چتلی قبر سے آگے ابتک موجود ہے، اپنے زمانہ میں مسجد کے صحن کے واسطے ایک چمڑے کا وسیع شامیانہ تیار کیا تھا تاکہ دھوپ اور بارش سے صحن میں نماز پڑھنے والے محفوظ رہیں، مگر جب اُس شامیانہ کو اس وسیع صحن کے اوپر لگایا گیا تو تھوڑے سے وقفہ میں ہوا کے جھونکوں سے اُس کے ٹکڑے اڑ گئے۔ اور وہ کوشش بیکار گئی۔ شامیانہ کے لگانے کے واسطے جو انتظام کیا گیا تھا اُس کے نشان اب تک باقی ہیں۔ شاہزادہ مرزا سلیم خلف الصدق حضرت اکبر بادشاہ ثانی نے مسجد کے صدر دالان کے وسط میں ایک خوشنما سنگ باسی کا مکبّر تعمیر کرایا تھا جس کی جگہ سرکار انگریزی نے ایک سنگ مرمر کا مکبّر بنوادیا ہے اور اُس مکبّر کو حوض کے مشرقی جانب منتقل کردیا ہے۔

امیر حبیب اللہ خاں والی کابل جب دہلی تشریف لائے تو اس مسجد میں عید کی نماز ادا فرمائی، اور واپسی پر سو امن وزنی چاندی کا ایک جھاڑ وسط دالان میں آویزاں کرا دیا تھا، مگر بدقسمتی سے وہ چوری گیا۔ باوجود پولیس کی سخت تفتیش کے اس کا آجتک پتہ نہ لگ سکا۔ سلطنت ٹرکی نے آج تک ہندوستان کے کسی قومی یا مذہبی ادارہ کی کوئی امداد نہیں کی، مگر جب جنگ بلقان کے سلسلہ میں امداد مجروحین ٹرکی کے واسطے ہندوستان سے ایک وفد ڈاکٹر مختار احمد صاحب انصاری کی سرکردگی میں قسطنطنیہ گیا تو اُس کی واپسی پر حکومت ٹرکی نے جامع مسجد دہلی کے واسطے ایک رومی قالین صدر دالان کے واسطے بھیجوایا تھا، گو وہ اس عظیم الشان مسجد کے ایک گوشہ ہی میں بمشکل بچھ سکتا ہے۔ تاہم غنیمت ہے، مالِ کا پان بھی بہت ہوتا ہے۔

مسجد کی امامت

حضرت شاہجہاں بادشاہ نے اس مسجد کی امامت کے واسطے ایک سید سندی کو بخارا سے طلب فرمایا تھا تاکہ اُن کی سیادت کی وجہ سے بادشاہوں کو اُن کے پیچھے نماز پڑھنے میں تامل نہ ہو۔ یہ امامت کا عہدہ اُس خاندان میں نسلاً بعد نسلاً چلا آرہا ہے۔ شمس العلماء مولوی سید احمد صاحب اور اُن کے صاحبزادے سید حمید صاحب موجودہ امام مسجد اُن ہی کی اولاد میں ہیں۔ شاہان مغلیہ نے ان اماموں کی تنخواہ مقرر کر رکھی تھی، غدر کے بعد سے ہندوستان کی تقریباً اسلامی ریاست نے امام مسجد کا وظیفہ حسب مقدور مقرر کر رکھا جس سے مسلمان رؤسا کی اس مسجد سے عقیدتمندی کا اظہار ہوتا ہے۔

مسجد کی غدر ۵۷ء میں ضبطی اور پھر واگذاشت

غدر ۵۷ء میں جب انگریزی فوج دہلی میں داخل ہوئی اور لال قلعہ کے

جمع ہوئی تو عصر کا وقت تھا۔ بعض جوشیلے مسلمانوں نے آواز لگائی کہ جن مسلمان نمازیوں کو جان پیاری ہے وہ جنوبی دروازہ سے اپنے اپنے گھر چلے جائیں اور جن کو جہاد اور شہادت کا شوق ہے وہ شمالی دروازہ سے نکل کر فوج انگریزی سے مڈبھیڑ کرے۔ چنانچہ بھوکے مسلمانوں کی ایک جماعت مقابلہ کے لئے انگریزی سپاہ کی طرف روانہ ہوئی۔ مگر سرکار انگریزی کی فوج کے ایک حملہ ہی میں تتر بتر ہو کر بھاگ آئی، اُس پر گورنمنٹ انگریزی نے جامع مسجد پر قبضہ کر لیا۔ اور اس مقدس عمارت میں فوجی ہسپتال قایم کر لیا۔ قریباً دو سال تک یہ صورت قایم رہی اور مسلمان فریضۂ نماز کی ادائگی سے محروم رہے جب بہادر شاہ کے مقدمہ کا اختتام ہو گیا اور وہ جلاوطن کر کے رنگون بھیجدیے گئے اور شہر میں امن جمی ہو گئی تو بعض امرار و رؤسائے شہر نے جن میں مرزا الٰہی بخش صاحب و مفتی صدرالدین خانصاحب صدرالدور خاص طور پر قابل ذکر ہیں مسجد کی واگذاشت کی کوشش کی۔ مرزا الٰہی بخش صاحب جو دہلی پر سرکار انگریزی کا قبضہ کرا دینے کے معاملہ میں بڑے ممد و معاون ثابت ہوئے تھے۔ اب اس خانۂ خدا کو سرکار کے تصرف سے چھڑانے میں کوشاں ہوئے۔

کی مرے قتل کے بعد اُس نے جفا سے توبہ ہائے اُس زود پشیماں کا پشیماں ہونا،

چنانچہ گورنمنٹ نے یہ مسجد مسلمانوں کے حوالہ کی، اور مسلمان اکابر شہر کی ایک مختصر سی جماعت کی انتظامیہ کمیٹی بناکر مسجد اُس کے تفویض کی۔ وہ انتظام اب تک قایم ہے۔ اُس منتظمہ جماعت میں مفتی صدرالدین خانصاحب، مولوی کرم اللہ خانصاحب عرف ننھے خانصاحب۔ خان بہادر ڈپٹی الٰہی بخش صاحب اور اُن کے بعد خان بہادر غلام محمد حسن خانصاحب اور شمس العلما سید احمد صاحب موجودہ سکریٹری سرگرمی سے حصہ لیتے رہے۔

لارڈ کرزن کی معاونت لارڈ کرزن وائسرائے ہند کے عہد میں جامع مسجد کے جنوب مغرب کی سمت میں وکٹوریہ زنانہ ہسپتال کی تعمیر شروع ہو گئی تھی مگر وائسرائے ممدوح جو ہندوستان کی قدیم عمارات کے بڑے قدردان تھے اور جنہوں نے اپنے زمانہ میں ایک محکمہ آثار قدیمہ کی نگہداشت کے واسطے قایم کیا تھا، جب موقعہ کا معائنہ فرمایا تو اس ہسپتال کی تعمیر یک قلم بند کر دی، اسلئے کہ اس سے مسجد کی شان میں فرق آتا تھا۔ غدر ۱۸۵۷ء سے لارڈ کرزن کے وقت تک یورپین حکام اور یورپین سیاح تک جب جامع مسجد کو دیکھنے آتے تھے تو بے تکلف انگریزی جوتی پہنے ہوئے مسجد میں داخل ہوتے تھے۔ لارڈ کرزن نے اس طریقہ کو مذموم قرار دیکر بند کرا دیا۔ اور یہ ہدایت جاری کرائی کہ جب کوئی یورپین مسجد کی سیر کے واسطے آئے تو اپنے جوتوں پر جراب چڑھالے۔ اور اس کی ابتدا

خود اپنی ذات سے کی، چنانچہ جب سے یہی دستور ہو گیا ہے اور مسجد میں اس مقصد کے لئے متعدد کپڑے کے جراب مسجد کے دربانوں کے پاس موجود رہتے ہیں۔

مسجد کا تعلق مسلم اکابر کے ساتھ

اس مسجد کی تعمیر کے بعد خود حضرت شاہجہاں بادشاہ اس میں اکثر نماز پڑھتے تھے اور اُن کے بعد اُنکی اولاد میں جس قدر بادشاہ گذرے ہیں وہ کم از کم عیدین کی نماز اس مسجد میں ادا کرتے رہے۔ شہنشاہ اورنگ زیب تو علاوہ عیدین کے اکثر جمعہ کی نماز پڑھنے کے واسطے بڑے تزک و احتشام کے ساتھ مسجد میں آتے تھے، جس کا ذکر ڈاکٹر برنیر وغیرہ نے اپنی تواریخ میں کیا ہے۔ حضرت عالمگیر کے عہد میں حضرت سرمد شہید اس مسجد کی سیڑھیوں پر شب کو بسر فرماتے تھے۔ خاندان مغلیہ کے آخری تاجدار حضرت بہادر شاہ نے بھی اس رسم کو قایم رکھا اور عید الضحےٰ کی نماز سے فارغ ہوتے ہی زیر مسجد جنوب مشرقی سموسہ پر جہاں اُن کی چھولداری لگی ہوتی تھی، خود نیزہ سے اونٹ کو نحر کرتے تھے۔ اور چابکدست رکابدار چند منٹ میں کلیجی تیار کرکے بادشاہ سلامت کو ان کی چھولداری میں پیش کر دیا کرتے تھے۔ جب شاہان دہلی اس مسجد میں نماز کے لیے حاضر ہوتے تھے تو انکے زمانہ کے امرا کبار ضرور شریک ہوتے ہونگے۔ اس طویل مدت میں خدا جانے کون کون علماء، فضلاء، اور اولیاء اللہ اسمیں نماز پڑھتے ہونگے۔ سرمد شہید جبتک زندہ رہے اس مسجد کی سیڑھیوں پر شب خوابی کرتے تھے، اور شہید ہوئے تو زیر مسجد سپرد خاک ہوئے۔ سلطنت مغلیہ کے آخر دور میں مولانا شاہ ولی اللہ رح کے خاندان کے تمام بزرگ یہاں ہی نماز جمعہ ادا کرتے تھے، مولانا شاہ عبد العزیز رح نے اکثر اس مسجد میں وعظ فرمایا ہے۔ مولانا شاہ اسمٰعیل شہید رح نے سرحد کیطرف جہاد پر جانے سے پیشتر موسم گرما میں اس مسجد کے جلتے ہوئے صحن پر ٹہل کر جنگ کی سختیوں کے اٹھانے کی مشق پیدا کی تھی، غدر ۱۸۵۷ء کے بعد مفتی صدر الدین خانصاحب اسمیں پنجگانہ ادا فرماتے تھے، شاہ ابو الخیر صاحب رح بعد نماز جمعہ اسمیں مراقبہ فرماتے، اور اپنے معتقدین پر توجہ ڈالا کرتے تھے شمس العلماء مولوی شبلی نعمانی کے ہاتھوں ایک مختصر سی لائبریری کی افتتاح اسی مسجد کے شرقی دروازہ کے اوپر کے حصہ میں ہوئی امیر کابل، نظام حیدرآباد و دیگر مسلمان والیان ریاست جب دہلی آئے تو اس مسجد میں ضرور نماز پڑھی، مولانا محمد علی صاحب نے خلافت کی حمایت میں اس مسجد کے منبر پر چڑھکر تقریریں فرمائیں، اور اب بھی اکثر جمعہ کی نماز کے بعد مسلمانوں کی مختلف جماعتوں کے جلسے اس میں منعقد ہوتے ہیں۔ جب سے مسجد کے گرد و پیش بازار لگنا شروع ہوا ہے، دوکانداروں سے تہ بازاری کی محصول آمدنی ہوگئی جس سے مسجد کے اردگرد جائداد خریدی گئی ہے، اور بہت سے قومی اداروں کی امداد ہوتی ہے۔ خدائے تعالیٰ سے دعا ہے کہ مسلمان شہنشاہ شاہجہاں کی یہ یادگار ارضی و سماوی آفات سے ہمیشہ محفوظ رہے۔

ع ایں دعا از من و از جملہ جہاں آمین باد

مرزا وجیہہ الدین خاں وجیہہ دہلوی

ویدوں کے بعد کے زمانہ میں عورت کا درجہ

(از ایم۔ حامد علی صاحب ایم۔ اے)

رگ وید کے زمانہ سے آگے چل کر برہمنی اور اُپنشدی تہذیب کا زمانہ آتا ہے۔ اس زمانہ کی برہمنا کا ایک خاص حصہ ہوتا تھا جسے ارآئینتے کہتے ہیں (یعنی کتاب وحشت) یہ حصہ گھنے جنگلوں ہی میں پڑھا جاتا تھا تاکہ اس کو کوئی دوسرا طالب علم نہ سُن سکے۔ کیونکہ ہندو دھرم خدا کی تمام مخلوق کے لئے نہیں، بلکہ اس کے چند مخصوص بندوں کے لئے تھا۔ اس زمانہ میں آریہ مشرق اور جنوب کی طرف بڑھ رہے تھے۔ اوران کی تہذیب کا مرکز دریائے سرسوتی اور دریائے درشداوتی کی وادی تھا۔ اس کا صدر مقام کرکشیتر تھا۔ یہ زمانہ مادی اور مذہبی اعتبار سے ترقی کا زمانہ کہا جاتا ہے۔ عورتیں اپنی آرائش اور زیبائش کیلئے سونے اور چاندی کے مرصع زیورات استعمال کرنے لگی تھیں۔ حکومت زیادہ مضبوط بنیادوں پر قائم ہو چکی تھی سماجی نظام بھی قریب قریب مکمل ہو چکا تھا۔ ذات پات کے اعتبار نے لوگوں کو مختلف پیشوں میں تقسیم کر دیا تھا جو موروثی حیثیت رکھتے تھے۔ اور جن کو آسانی سے خیرباد نہیں کہا جا سکتا تھا۔ مگر جو آزادی ہندو عورت کو رگ وید کے زمانہ میں حاصل تھی، وہ آہستہ آہستہ اس سے سلب کی جا رہی تھی، رسمی سماجی زنجیریں اس کے پیروں میں ڈالی جا رہی تھیں، اوراس کا درجہ کم کیا جا رہا تھا۔ عورت اور شودر میں کوئی فرق نہ رہا تھا۔ عورت اور شودر کا خون بہا ایک سا تھا۔ عورت کو نہ صرف ملکیت منقولہ وغیر منقولہ وراثت میں پانے کا حق نہ رہا تھا۔ بلکہ وہ خود نہ اس کو خرید سکتی تھی اور نہ اس کی مالک بن سکتی تھی۔ ملکیت منقولہ وغیر منقولہ کا مالک خاندان کا سردار ہوتا تھا جو عموماً باپ ہوتا تھا۔ وہ جس کو چاہے اور جس طرح چاہے تقسیم کر دے۔ البتہ باپ کے مرنے پر اسکی بیوی بھی تقسیم میں شمار کیجاتی تھی،

شادی کو ابھی تک عزت کی نگاہ سے دیکھا جاتا تھا، اور بیوی کو زندگی میں برابر کا شریک گنا جاتا تھا، اور ماں کو بچوں کی تعلیم و تربیت کا معلم اولین مانا جاتا تھا۔ عورتوں کو ناقص العقل خیال کیا جانے لگا جو کسی ضابطہ اور قانون کے ماتحت اپنی زندگی بسر نہیں کر سکتی تھیں، بلکہ ہمیشہ صراط مستقیم سے بھٹکتی پھرتی تھیں۔ عورتیں صرف مردوں کی نفسانی خواہشات کو پورا کرنے اور افزائش نسل کا تختہ مشق بن کر رہ گئی تھیں، چنانچہ اپنشدر میں مذکور ہے کہ ابتدائے آفرینش میں مرد اکیلا تھا اور زندگی کی لذتوں سے بے بہرہ تھا۔ اس نے ایک رفیق حیات کی تمنا کی جو اسے بیوی کی صورت میں عطا کی گئی۔"

شادی کے رسم و رواج گو ریگ وید کے زمانہ کی طرح سادے ہی رہے، رشتہ اور ناتہ بھی سوا باپ بیٹی اور بہن بھائی کے سب سے ہو سکتا تھا، مگر ذات پات کے قواعد و ضوابط شادی کے راستے میں حائل تھے۔ شادی صرف ایک ذات کے لوگوں سے ہی جائز تھی۔ اگر کوئی ان پابندیوں کو توڑ کر دوسری ذات کے لوگوں میں شادی کرنا چاہے تو وہ صرف اپنے سے نیچی ذات کے لوگوں میں کر سکتا تھا۔ کثرت ازدواج کی رسم شاہی درباروں، امرا اور وزرا کے محلوں سے نکل کر عوام میں بھی رائج ہو چلی تھی۔ اس زمانہ کی عورت کا اخلاقی معیار ریگ وید کے زمانہ کی عورت کے اخلاقی معیار سے پست ہو گیا تھا۔

ستی کی رسم اس زمانہ میں مفقود ہو چکی تھی، اتھر وید میں ایک بیوہ کے دوبارہ شادی کی مثال ملتی ہے، عقد بیوگان کو بری نظر سے نہیں دیکھا جاتا تھا۔ عورتیں موسیقی کی دلدادہ تھیں، اور وہ ان شوہروں کو ترجیح دیتی تھیں جو خوش گلو ہوتے تھے۔ عورتوں کو عام طور پر رقص و سرود کی تعلیم دی جاتی تھی۔

لڑکی کے پیدا ہونے کو ریگ وید کے زمانہ سے بھی زیادہ بری نظر سے دیکھا جانے لگا۔ لڑکی کی پیدائش کو مصیبتوں کا پیش خیمہ شمار کیا جاتا تھا اور لڑکوں کو عرش بریں کے نور سے تشبیہہ دی جاتی تھی۔ میکڈونل کی "سنسکرت ادب کی تاریخ" میں ایک دلچسپ قصہ اس کے متعلق درج ہے۔ اس زمانہ میں لڑکیوں کے پیدا ہوتے ہی تلف کر دیے جانے کے واقعات عام ہو گئے تھے، ایک مشہور مستشرق زمر نے اس زمانہ کی کتابوں کے مطالعہ سے یہ نتیجہ اخذ کیا ہے۔ اس زمانہ کی قانون کی کتابوں نے نہ صرف پیدا شدہ لڑکیوں کے تلف کر دینے کو بلکہ ضبط تولید کو بھی ایک جرم قرار دیا ہے۔ تعلیم حاصل کرنے یا مذہبی رسوم ادا کرنے میں عورتوں کو ابھی تک پوری پوری آزادی حاصل تھی، تعلیم سے مزین ہونے کیلئے ان کو ہر قسم کی سہولتیں بہم پہنچائی جاتی تھیں۔ وہ علمی اور مذہبی بحث و مباحثہ میں بھی حصہ لیتی تھیں، شاہی درباروں میں اکثر مذہبی، فلسفی اور مابعد الطبیعاتی بحثوں میں عورتیں بھی شریک ہوا کرتی تھیں، اور اپنی رائے سے دوسروں کو مستفید کرتی تھیں، انہیں ایک یگیناولکا کی بیوی میتریھ تھی۔ اسی طرح ایک دوسری فلسفی عورت گارگی کے متعلق یہ روایت مشہور ہے کہ اس نے ایک علمی مباحثہ میں جو ودیہا کے راجہ جنک کی زیر صدارت ہو رہا تھا یگیناولکا سے ایسے دقیق اور مشکل سوالات کئے کہ اس کے چھکے چھوٹ گئے۔

پروفیسر میکس مولر نے "قدیم سنسکرت ادب کی تاریخ" میں مندرجہ ذیل بحث کا ترجمہ کیا ہے جس میں روح کے غیر فانی ہونے پر بحث کی گئی ہے۔ بحث میں حصہ لینے والوں میں ایک عورت بھی ہے جس کا نام میتریھ ہے۔ یگیناولکا نے کہا "میں اپنے گھر سے جنگل کو جا رہا ہوں، اب مجھے چاہئے کہ اپنی دولت کو تجھ میں اور اپنی دوسری بیوی کاتیایانی میں تقسیم کر دوں۔" میتریھ نے جواب دیا "میرے آقا اگر دولت سے مالا مال یہ دنیا میرے ہاتھ آجائے تو کیا یہ مجھے لازوال بنا دیگی؟" "نہیں"، یگیناولکا نے کہا۔ "تیری زندگی معمول لوگوں کی طرح خوش و خرم ہوگی

مگر دولت سے لازوال زندگی حاصل نہیں کیجا سکتی۔" میتریھی نے پھر کہا " دولت میرے کس کام کی ہے جس میں لازوال زندگی حاصل نہ کرسکوں۔ پس میرے آقا کیلئے واجب ہے کہ وہ بات بتائے جس سے لازوال زندگی حاصل کیجائے۔"
یگنا ولکا نے کہا " تو حقیقتاً مجھے بڑی عزیز ہے۔ بیٹھ جا! میں تجھے بتاؤنگا، اور جو کچھ میں کہوں اسے غور سے سُن۔
" ایک شوہر سے محبت اسلئے نہیں کیجاتی کہ تم شوہر سے محبت کرتی ہو۔ بلکہ تم ایمان سے محبت کرتی ہو جو اُسمیں ہوتا ہے۔ ایک بیوی سے محبت کیجاتی ہے اسلئے نہیں کہ ہم بیوی سے محبت کرتے ہیں، بلکہ ہم اسمیں بھی آتما سے محبت کرتے ہیں۔ بچوں سے محبت کیجاتی ہے اسلئے نہیں کہ ہم ان سے محبت کرتے ہیں، بلکہ ہم آتما سے محبت کرتے ہیں۔ جب ہم دولت، ثروت، برہمن، چھتری اور اس دنیا سے محبت کرتے ہیں ——

—— اے عزیز بیوی! اس آتما کو دیکھا جائے، سُنا جائے، محسوس کیا جائے، اور اس پر غور کیا جائے۔
اسلئے میتریھی اگر ہم اس کو دیکھ لیں، سُن لیں، اور محسوس کرلیں تو ہم تمام دنیا کو جان جائیں گے ......
کیونکہ ہم ڈھول کی آواز نہیں پکڑ سکتے۔ لیکن ہم ڈھول کو پکڑ کر اس کی آواز کو پکڑ سکتے ہیں۔ ہم سنکھ کی آواز کو بذاتِ خود نہیں پکڑ سکتے، بلکہ ہم سنکھ کو پکڑ کر یا سنکھ کے بجانے والے کو پکڑ کر اس کی آواز پکڑ سکتے ہیں ہم بانسری کی آواز کو پکڑ نہیں سکتے لیکن بانسری یا بانسری بجانے والے کو پکڑ کر آواز پکڑ سکتے ہیں ......
جس طرح خشک ایندھن کو جلانے سے دھوئیں کا بادل اٹھتا ہے، اسی طرح تمام مقدس الفاظ آتما سے پھونک مار کر اڑائے گئے ہیں ...... جس طرح سب پانیوں کا مرکز سمندر ہے، اسی طرح تمام احساسات کا مرکز کھال ہے۔ زبان، ناک، آنکھ، کان، دماغ۔ تمام علم کا دل ساری حرکات کا ہاتھ اور مقدس کتابوں کا مرکز قوتِ گویائی ہے۔ آتما جب ہم میں داخل ہوتے ہیں تو ہماری کیفیت نمک کے تودے کی سی ہے جسے سمندر میں ڈالا گیا ہو۔ وہ اس میں حل ہو جاتا ہے اور پھر دوبارہ نہیں نکالا جاسکتا۔ لیکن جہاں تم پانی کو لیجاؤ اور چکھو تو یہ نمکین ہوتا ہے۔ پس یہ بڑی ابدی تمام ہستی علم کا بحرِ ذخار ہے۔ جس طرح سے پانی نمک بن جاتا ہے اور نمک پھر پانی بن جاتا ہے، اسی طرح یہ عناصر سے مل کر بنی، اور پھر عناصر میں غائب ہوگئی۔ جب ہم مرجاتے ہیں تو پھر ہمارا نام باقی نہیں رہتا۔" میتریھی نے کہا " میرے آقا! یہ کہہ کر کہ مرنے کے بعد کوئی نام باقی نہیں رہتا مجھے سخت پریشان کردیا۔" و یگنا ولکا نے جواب دیا " میری پیاری بیوی! میں نے جو کچھ کہا وہ پریشان کُن نہیں ہے، بلکہ عالمِ اعلےٰ کے لئے کافی ہے۔ کیونکہ اگر دو ہستیاں ہوں، ایک، پہلے کو دیکھے گی۔ دوسری پہلے کو سُنے گی، محسوس کرے گی اور جانے گی ...."

ایم۔ حامد علی ایم۔ اے۔

بہادر شاہ کا خواب

(از خواجہ محمد شفیع صاحب دہلوی)

زمانہ ہو گیا جب کی تھی باغِ حسن کی سیر
نہ جانے کیوں ہے نگاہ میں وہ بہار اب تک

ایک پیر نود سالہ پلنگ پر پڑا کروٹیں بدل رہا ہے۔
غلافی ڈبڈبائی ہوئی چشم نیم باز۔ بھیگی ہوئی خمار آلود راتوں کی غمازی کر رہی ہے۔
بگلا سے سفید۔ بالوں کے چکر سیلِ لیل و نہار کے گردابوں کی خبر دے رہے ہیں۔
دانتوں کے کھنڈر تراله باری روزگار سے آشنا کرتے ہوئے زبانِ حال سے کہہ رہے ہیں کہ ہماری مدت برو میں کبھی لعلِ لب رہے ہیں۔
جھلسا ہوا گلابی رنگ رنگی ہوئی محفلوں اور تلوّنِ روزگار کا پتہ دے رہا ہے۔
اور جھریایا ہوا چہرہ کتابِ عیش کے سلے ہوئے ورق اور سیجوں پر ملے ہوئے پھول کی طرح بستر پر پڑا ہے۔
یہ واقعہ شہر رنگون کا ہے۔ یہ گھر زندہ بہادر شاہ کا آخری مرقد اور یہ بوڑھا فراموش کردہ مرگ، ہندوستان کا آخری تاجدار صحیفہ زوالِ مغلیہ کا آخری باب ابو ظفر بہادر شاہ ہے۔
کلمہ پڑھ کر اٹھا اور یہ شعر پڑھا:۔ ؎

زمانہ ہوگیا جب کی تھی باغِ حسن کی سیر نہ جانے کیوں ہے نگاہ میں وہ بہار اب تک

اور اک آہ کی

اس ماں کی سی آہ جو سپردِ خاک اولاد کو خواب میں دیکھ کر اٹھے ــــــ صحرا میں مرتے ہوئے کی سی آہ جسے موت کا بازیگر دور سے جشم دکھا رہا ہو ــــــ کنجشک صحرائی کی سی آہ جس کے زخمی بچوں کو شکاری تھیلے میں ڈال کر لے جا رہا ہو ــــــ اس ہنس کی سی آہ جو اپنے جوڑے کی لاش پر سے اڑایا جا رہا ہو۔
اس ستم زدہ روزگار کے جسم کا رواں رواں رو رہا تھا۔ لیکن آنکھیں خشک تھیں۔ اس گلو سوختہ کا

ساتھ ان چشموں نے بھی چھوڑ دیا تھا۔

میں ستون سے لگا کھڑا یہ سب کچھ دیکھ رہا تھا۔

جب اس مجسمۂ غم کو سکوت و جمود کے ساتھ نہ دیکھ سکا تو میں دو قدم آگے بڑھا اور پوچھا نصیب دشمناں مزاج کیسا ہے ——— میری جانب نظر اٹھائی جیسے کنوئیں میں ڈوبتا ہوا آسمان کو دیکھے، او کہا ہاں! یہ خواب میرا پیچھا نہیں چھوڑتے ——— جس ماضی کا خیال بھی کرنا نہیں چاہتا وہ خواب بن بن کر آتی رہتی ہے۔ ——— ابھی ابھی جشن ماہتابی دیکھ رہا تھا ——— کہاں یہ تیرہ روزگار۔ کہاں وہ جگ مگ جگ مگ دنیا۔ قِرانُ الضدّین اسی کو کہتے ہیں۔

حضور شاہجہاں کی لال حویلی دلہن بنی ہے۔ درو دیوار، شجر و حجر پر بادلا بکھرا ہے۔ آسمان کے سینہ پہ ایک چاند ہے، لال قلعہ کی زمین پہ سینکڑوں پڑے چمک رہے ہیں۔ ہر نہال چمن تاروں بھرا ڈوپٹہ اوڑھے تاروں پر چشمک زنی کر رہا ہے۔

زمرد کی زمین پر الماس بکھرے ہیں، سیم ساق، انہیں روند رہے ہیں۔

قدم قدم پر بوٹے بادلا لپیٹے، چاندی کے پنجرہ میں ہیرامن طوطا معلوم ہو رہے ہیں۔

ماہرو چاند کو شرماتے چہلیں کرتے پھر رہے ہیں، چاندنی ان کے پیروں میں لوٹ رہی ہے۔ شب ماہ کے مزے۔ آب رواں کا لطف۔ نوخیز نوعمر نوعروس کی ہنسیاں ——— فضا پر خمار ہے۔ پتہ پتہ جھوم رہا ہے۔

سب سفید کپڑے پہنے ہیں۔ میرا جامہ زربفت کا ہے، کُرتہ تن زیب کا ——— اتنا کہا تھا کہ اپنے کپڑوں پر نظر پڑی۔ بے ساختہ زبان سے نکلا۔ ببیں تفاوت رہ از کجاست تا بہ کجا ——— سر پکڑ کر ہو بیٹھا اور تھوڑی دیر تک ٹوٹے ٹوٹے یہ بول سنائی دیتے رہے ———

——— نہ جانے کیوں ہے ننگ ہوں میں وہ بہار اب تک

خواجہ محمد شفیع دہلوی

"وفائے دلبراں ہے اتفاقی"

(از قلم دیدہ ور)

شام ہو رہی تھی، بانکے ترچھے جوان، رنگیلے رنگ رسیا۔ جوبن نکھار سر بازار چلے جا رہے تھے، میں چھت پر کھڑی تماشہ دیکھ رہی تھی۔ ایک کنکھیوں سے دیکھتا گذر جاتا تو دوسرا آنکھیں پھاڑ پھاڑ کر گھورتا جیسے گھول کر پی جائے گا۔ کوئی دُور سے دیکھتا آتا مگر قریب پہنچ کر آنکھیں نیچی کر لیتا جیسے دیکھا ہی نہیں اور کوشش کر کے اپنی چال ڈھال میں حتی الوسع دلبری پیدا کرتا۔ ——— مرد اپنے جال پھیلائے جعل سازی کے بازار میں آ رہے تھے۔ یہ ہم کو شکار کرنا چاہتے تھے، لیکن ان کا یہاں آنا اس کا ثبوت تھا کہ خود شکار ہو چکے ہیں اور بندھے چلے آ رہے ہیں۔ ——— یہ ان سوٹڈ بوٹڈ صاحب کا تیسرا چکر ہے۔ ساتویں پر اللہ نے چاہا تو پھنس جائیں گے۔ یہ پھیروں کا پھیر ہوتا بُرا ہے۔ میں انہیں دیکھ کر مُسکرا دی تھی۔ جب سے کاوے کاٹ رہے ہیں۔ اور لطف یہ کہ ہر دفعہ نئے سرے سے چال بدل لیتے ہیں۔ کبھی چندن چکور کی طرح آتے ہیں تو کبھی مور کی طرح۔ غرضکہ ہوس اپنی چال چل رہی ہے اور انسان کو جانور بنا رہی ہے۔

اتنے میں حضرت آہ سامنے سے گذرے۔ یہ بھی ایک رقم ہیں۔ کلام سُنانے کی انہیں بدہضمی ہے۔ موقع بے موقع اگلنا شروع کر دیتے ہیں اور ماشاء اللہ چھت توڑ دیوار پھاڑ آواز پائی ہے۔ ہم لوگ انہیں ہاتھی چنگھاڑ کہتے ہیں۔ آپ کی دعا سے شاعری کا ٹریڈ مارک ہیں۔ انجان بھی ایک نظر میں جان جائے کہ ہیں کوئی مفکر۔ بال بکھرے۔ گریباں چاک، اچکن کے بٹن کھُلے، مُنہ میں پان بھرا ہوا، اس دھج سے اکثر کوٹھوں پر بیٹھے یا چاوڑی میں چکر لگاتے نظر آتے ہیں۔ ایک دم بیٹھے بیٹھے غائب ہو جاتے ہیں، اب آپ بات کئے جائیے جواب ندارد۔ تھوڑی دیر بعد اس جسدِ بے جان سے صور کی سی آواز پیدا ہوتی ہے، اور کہتے ہیں بھئی ذرا پنسل دینا ——— یہ ان کی پیٹنٹ ادا ہے اور سارا بازار اس سے واقف۔ ہر کوٹھے پر دس بیس، سو پچاس مرتبہ یہ کیفیات ان پر طاری ہو چکی ہیں۔ میلوں۔ تماشوں میں ضرور جاتے ہیں۔ لیکن سب سے الگ ٹہلتے نظر آتے ہیں۔ اگر کوئی کہے جناب آہ صاحب ذرا ادھر تشریف لائیے، الگ الگ کیوں پھر رہے ہیں تو جواب ملتا ہے ذرا فکر کر رہا ہوں ——— خیر سے جنگل بیابان ہُو حق میدان اکیلے کہیں میں کبھی نہیں ملتے۔ جاتے بھیڑ بھڑکا ہی میں ہیں۔ رہتے ہیں ذرا الگ الگ، یہ بھی ایک ادا ہے

ـــــــ ہم طوائفوں کو ان سے یہ فائدہ ہے کہ کوئی تقریب ہو یہ اُلٹے سیدھے شعر کہہ کر لا دیں گے۔ کسی کے گھر بچہ ہو یہ بن کہے تاریخی نام نکال لاتے ہیں، کسی کے گھر شادی ہو، ایک چھوڑ دس دس سہرے موجود اور پھر مزا یہ سارے کنبہ کے نام شعروں میں دیکھ لیجیے مع رشتہ کے۔ کسی کی اماں خالہ چچی تائی مرے، مرثیہ تیار، اور پھر ایسے بسور بسور کر پڑھتے ہیں کہ ان ہوئے کو ہنسی آجائے ــــــ ایک دن تو مجھے مروا ہی دیا ہوتا۔ اختر کی نانی مر گئیں، میں بھی تعزیت کو گئی اور بھی بہت سی جمع تھیں کہ اتنے میں حضرت آدھان پہنچے۔ ہیں خیر سے بونگے، بطور ہمدردی فرمانے لگے بھئی اختر پرسوں ایک مولوی صاحب وعظ میں فرما رہے تھے کہ مرنے والے کے جتنے گناہ ہوں اتنے نفل اگر پڑھوا دیے جائیں تو بخشش ہو جاتی ہے۔ سو مرحومہ کے گناہ تو تم کو کیا یاد ہو سکتے ہیں، خیر جتنے بھی پڑھوا سکو پڑھوا دو۔ دو چار لاکھ بھی ہو جائیں تو غنیمت ہے۔ کچھ تو بوجھ کم ہو ہی جائیگا۔ ان کا تو یہ کہنا اور میرے پیٹ میں بل پڑنا۔ اب لاکھ روکتی ہوں پر رہ رہ کر دل میں گدگدیاں اٹھتی ہیں۔ اور شاعر صاحب ہیں کہ اشاروں ہی اشاروں میں روک رہے ہیں۔ اور اشارہ بھی اُس کی عنایت سے الفاظ سے واضح تر۔ اور کچھ ایسے بونگے، بے سُرے جنہیں دیکھ کر اور ہنسی آئے آخر جب کچھ بن نہ پڑی تو جھلا کر بولے "مخنذی[1]! بس کچھ نہ پوچھو۔ ان کا تیور بدل کر ایرانی لہجہ میں یہ کہنا تھا اور میرے ہاتھ سے دامانِ ضبط کا چھُوٹنا۔ ــــــ میں سمجھ تو گئی کہ فارسی میں متنبہ فرما رہے ہیں پر میں بھی اس وقت ایسی انجان بنی کہ مزا ہی آگیا، اور اختر نے الٹا شاعر صاحب کو آڑے ہاتھوں لے لیا۔ بگڑ کر بولی کچھ باؤلے تو نہیں ہوئے ہیں آپ۔ یا کہیں بوٹی پی لی ہے۔ غضب خدا کا گالیاں دینے پر اتر آئے، وہ بھی سٹ پٹا گئے، بولے کیا کہہ رہی ہو۔ میں نے کہا اے ہاں "خنذی خنذی" کہے جاتے ہو شرم نہیں آتی۔ جو موتی کا گھر نہ ہوتا تو ابھی مزاج درست کر دیتی۔ میری جانب سخت مایوسانہ انداز سے دیکھا اور کہا۔ اُف! اندھے کے آگے روئے اور اپنے ہی نین کھوئے۔ بی جان! غلطی میری ہی تھی، بھلا آپ فارسی کیا جانیں۔ خیر میں معافی چاہتا ہوں۔ اتنا کہہ اختر کی طرف مخاطب ہوئے۔ اور فرمایا۔ لو بی تم مرثیہ سُنو۔ رات بھر میں لکھا ہے، کل چوکٹے میں لگوا لاؤں گا ــــــ غرضکہ یہ اس قماش کے ہیں۔

سڑک کے ایک کنارہ کیلے والا چھبا لئے بیٹھا ہے، بازار کے کچھ شہدے بدمعاش گرد جمع، کھاتے جاتے ہیں اور چھلکے بیچ سڑک پر ڈالتے جاتے ہیں۔ لوگ پھسل رہے ہیں، یہ ہنس

---

[1] شاعر صاحب کو فارسی واجبی ہی واجبی آتی ہے۔

رہے ہیں۔ مزا اسی میں ہے کہ دوسرا بے مزا ہو۔ کیلے والے کے بھی گھیرے ہیں۔ گویہ سستے خرید رہے رہیں پر بکری تو ہو رہی ہے۔ اور حچاپس مفت میں۔ ایک موٹے سے شیخ جی جو اپنے دھیان میں گذرے، پیر چھلکے پر پڑا، بھد سے آن پڑے۔ تین من کی لاش (نعش) کیلے غریب کی کیا بساط، یہ تو دیگ پر گریں تو پچک جائے۔ سارے کیلے ختم ہو گئے۔ کچھ ان کے گرنے میں اور کچھ ان کے اٹھنے میں۔ میرے منہ سے بیساختہ نکلا ع کیا خوب سودا نقد ہے اس ہاتھ دے اس ہاتھ لے

یہ تماشہ دیکھ رہی تھی کہ مڈیر پھلانگ میری پڑوسن گوہر آن پہنچی اور کہنے لگی۔

دیوار پھاندنے میں دیکھو گی کام میرا جب دھم سے آکھونگی صاحب سلام میرا

میں بولی بیگم جو یونہی دیواریں پھاندتی رہیں تو ایک نہ ایک دن کوتوالی چبوترہ دیکھنا پڑے گا۔ بولی دیکھا جائے گا ــــــــ میں نے کہا تیری خطا نہیں، یہ تیرے نام کا قصور ہے۔ آب گوہر ساز سوبج سے ساز باز کر آغوش قلزم چھوڑ بادلوں میں جا پہنچتا ہے۔ پھر ابر نیساں کے جوڑے میں سے ٹپک سیپی کے سینہ میں جگہ کرتا ہے۔ لیکن وہاں بھی قرار سے نہیں رہتا۔ کچھ دن گذرا اس کا گھر اجاڑ، جادہ آب چاک کر بازار میں جا پہنچا ہے ــــــــ لیکن ہر فرعونے را موسےٰ ۔ انسان اس کا سینہ برما ریشم کے ڈورہ میں پرو کھونڈا بنا لیتا ہے ــــــــ ابر و آب کے جوف شق کرکے نکل آنے والا اس قادر کے روبرو مجبور ہو جاتا ہے۔ پر جیتر نار تو انسان کے بس میں کبھی نہ آئی۔ موتی تو خانۂ صدف سے نکلتا ہے، تو ایسی گوہر ہے جو انسان کے گھر تک سے نکل آئی۔ سچ ہے "رنڈی اور ماتا نکلے پر نکلے"۔

گوہر خاموش ہو گئی۔ چار کوٹھوں پر سے لڑکے کنستر بجا رہے غل مچا رہے تھے۔ قصہ یہ تھا کہ برابر کے درخت پر کبوتر بسیرا لینے جا رہے تھے، اور یہ شیطان کے چیلے انہیں اڑا رہے تھے ــــــــ کبوتر منڈلا منڈلا کر جاتے، جب نشیمن کے قریب آتے تو یہ غل مچا دیتے۔ گوہر نے ایک کنکری کھینچ کر ماری، اور لڑکوں کو للکاری کہ خبردار جو کبوتروں کو ستایا ہو گا۔

بچے جاننے والیوں کے تھے رعب میں آگئے۔ میں بولی دیوانی! بچوں کے منہ لگتی ہے۔ اس نے کچھ جواب نہ دیا۔ میرا ماتھا ٹھنکا کہ کہیں میرے کہے کا برا تو نہیں مان گئی۔ چہرہ کے اتار چڑھاؤ بتا رہے تھے کہ سینہ میں تلاطم بپا ہے۔

میں دل ہی دل میں اپنے کو لعنت ملامت کرنے لگی کہ دوست کی دکھتی رگ کیوں دبائی۔ یہ سچ ہے کہ گوہر ایک کے گھر جا بیٹھی تھی، اور یہ بھی سچ ہے کہ ٹکی نہیں، پر مجھے کہنے کی کیا پڑی تھی ــــــــ میں نے کہا کیا خفا ہو گئی۔ بولی باؤلی تجھ سے خفا ہونگی؟ تو نہیں جانتی یہ مثل مردوں

کی بنائی ہوئی ہے۔ کاش کوئی بندۂ خدا طوالف سے بھی پوچھتا کہ وہ کیوں نہیں ٹکتی، تو معلوم ہو جاتا کہ وہ کم نصیب خان وماں برباد تو اپنی سی سب کچھ کر لیتی ہے اسے ٹکنے دیتے نہیں۔

تو جانتی ہے میں اپنی پسند والے کے ساتھ گئی تھی، اور عورت کو جو مرد پسند آ جائے اس کیلئے ساری کڑیاں جھیل لیتی ہے، لیکن ہمارے سماج میں ایک شریر لڑکوں کا گروہ ہے، جنہوں نے مجھے بسیرا نہیں لینے دیا۔ کنستر پیٹے۔ غل مچایا۔ درخت کو پکڑ کر جھنجھوڑ ڈالا، اور شاخ آشیاں پر ٹکنے نہ دیا جب مجھے شاخ ہی ٹوٹتی نظر آئی تو وہاں سے اُڑ آئی کہ شاخ تو رہ جائے کسی اور ہی کے کام آئیگی۔

اچھا خدا حافظ اب ہم جاتے ہیں، میں نے کہا پوری بات تو سُنا جا۔ بولی کبھی فرصت میں سُن لینا۔" بڑی ہے داستاں دل کی"

"دیدہ ور"

بقیہ مضمون عنوان "آئینہ"

(صفحہ ۳۵ کے بعد کا)

سارنگی بجتی رہی۔ بارہ بجے کے قریب الطاف میاں نے انگریزی میں کہا کہ پیسے ختم ہو گئے۔ سب نے چلنے کا ارادہ کیا۔ مہ پارہ نے اجازت نہ دی۔ الطاف نے انگریزی میں کہا آج کسر نہ کرو۔ ایسا ہی ہے تو کچھ دن فاقہ کر لیں گے۔ مہ پارہ کی آنکھیں سیّد سے کچھ التجا کر رہی تھیں، اس نے اپنا سگرٹ کیس کھول الطاف میاں کے سامنے کر دیا، اس میں سَو کا نوٹ رکھا تھا اور کہا باقی رات میری طرف سے۔

"پردہ در"

آئینہ

(از پردہ در)

(نوٹ) یہ بازارِ حسن کی ایک جھلک ہے، ممکن ہے اس میں بعض اصحاب اپنے چہرے دیکھ سکیں، اور کچھ ماضی کی پرچھائیاں بھی -

آج سیّد 999 پی رہا ہے - ہماری مالی حالت کا اندازہ ہمارے سگرٹس کی کوالٹی سے لگایا جا سکتا ہے - عام طور پر شروع مہینہ میں ایک کم ہزار کا زور رہتا ہے، اور پھر بتدریج گھٹتے گھٹتے پیسہ کی بیس والی بیڑیوں پر اُتر آتے ہیں لیکن انہیں سرِ بازار مُنہ نہیں لگاتے، چھپ چھپا کر سلگھا لیتے طلب بجھا لیتے ہیں نیز حالاتِ بالا میں گلے کی شکایت وبائی کیفیت اختیار کر لیتی ہے - بس سگرٹس کا پرہیز لازمی - لیکن یہ عذر اتنی مرتبہ کیا جا چکا کہ عذرِ لنگ ہو گیا - اور اب چلتا نہیں تاہم ہم وضع کے پابند ہیں اور یہ تاریخ ہر مہینہ کی آخری تاریخوں میں اپنے کو دوہرا دیتی ہے -

سیّد کالج گراؤنڈز میں ٹینس کورٹس کے قریب بیٹھا ہے - گولف کیپ الٹی کر کے لگا رکھی ہے - داڑھی خوب گھٹی ہوئی ہے - سگرٹ کیس مسلسل گردش میں آرہا ہے - اتنے میں الطاف میاں آن پہنچے - یہ کالج میں پڑھتے نہیں، پر ہیں ہمارے سنگ سنگاتیوں میں - آدمی بڑے کام کے ہیں - بازار کے اِس نکڑ سے اُس نکڑ تک کی ان کو خبر ہے - جہاں کوئی نئی آئی اور یہ جا دھمکے - ادھر اُدھر کی باتیں کیں، رنگ جمایا اور یاروں کو لے پہنچے ------ ساری طوائفوں سے ان کا ناتا ہے - کسی کے بھائی ہیں کسی کے خالو - یہ پہلے جا کر بڑھیا پر سکہ جماتے ہیں - ان کا قول ہے کہ جڑ پکڑ لو کر ملائے کر چوٹی کا میوہ آئے - باتیں بنانے میں کمال ہے - نائکہ کو چٹکی بجاتے شیشہ میں اتار لیتے ہیں اور پھر نرے خشک ہی نہیں، ان کی آمدنی بھی کرواتے ہیں - اسامیاں پھانس کرلے جاتے ہیں - اس کے علاوہ شہر میں سب سے ان کا رسوخ ہے - بیچاریوں کے دس کام آجاتے ہیں - حکیموں کو یہ جانیں، ڈاکٹروں سے یہ واقف - پولس میں ان کا اثر کچہری عدالت میں پہنچ، اور پھر آدمی عزت دار، ہر وقت آڑے آنے کو تیار - دو چار غنڈوں سے بھی یاد اللہ - غرضکہ رنڈیوں کے بہت کام کے ہیں - اور اُن سے ان کی خوب نبھتی ہے ------

ہم کو ان سے یہ فائدہ ہے کہ پہلے سے میدان تیار کر لیتے ہیں، اور جو بات نئی جگہ سینکڑوں خرچ کر کے مہینوں میں پیدا ہو ان کی بدولت پہلے ہی دن ہو جاتی ہے - یہ پہلے سے جا ذکر اذکار کر روغن قاز مل لیتی

بٹوں میں گھُس ہماری ہوا باندھ دیتے ہیں۔ جب ہم جاتے ہیں تو انوا لو نئے نئے نہیں محسوس
۔ طوائف بے تکلف ہوتی ہے۔ بجائے گزوں دُور بیٹھنے کے قریب آجاتی، اور ہنس بول لیتی ہے۔
کیا چاہیے دو آنکھیں، ہمیں تو جنت مل گئی۔ الطاف میاں کا احسان مانتے ہیں۔ وہ بھی ہمارے ساتھ
ہتے ہیں۔ تھوڑی بہت پی بھی لیتے ہیں۔

اُن کی ذات سے ہمیں ایک اور بڑا فائدہ ہے۔ ان کا اپنا گھر ہے، وہاں ہم اکثر رات گذار دیتے ہیں
وں سمجھئے بن کرایہ کا ہوٹل ہے۔ ان کی بیوی ہمیں بھائی کہتی ہیں اور بچّے چچا۔ جب ہوٹل کے قابل
کے پاس پیسہ نہیں ہوتے تو یہاں اکثر دَور رہتا ہے۔ بھابی گوشت بھون دیتی ہیں۔ بچّے سوڈا برف
تے ہیں۔ چچا بھتیجوں کے سامنے کچھ بوتلوں میں سے الٹ الٹ کر پیتے اور پھر بہکی بہکی دیوانوں کی سی
کرنے لگتے ہیں۔ چچاؤں کے ساتھ اکثر عورتیں بھی آتی ہیں۔ بچّے شاید ان کو ان کی بیویاں سمجھتے
۔ لیکن چچی کہتے ہیں۔—— بھابی کے ہاتھ کا پکا ہوا گوشت جلیٹھ اور دیور شراب کے ساتھ نوش
ہیں۔ اور رنڈیوں کو بھی کھلاتے ہیں۔ سوڈا برف اور نقل کے پیسہ لینے سے الطاف میاں کو سخت
ہے۔ لیکن وقت بے وقت ہم دس پانچ روپیہ سے ان کی مدد کرتے رہتے ہیں۔—— بے تکلف صحبتوں
ں کی مخمور مخلتی بالطبع حرکات کا ان بچوں پر کیا اثر ہوتا ہوگا، یہ سوچنے کی ہمیں فرصت نہیں، اور
ف میاں پروا نہیں کرتے۔

غرضکہ الطاف میاں کے آتے ہی یہ چنڈال چوکڑی گراونڈز میں ایک طرف کو ٹہلنے لگی اور بازار کے ذکر اذکار
ہے۔ ہم سب مل جائیں اور پھر تفریح کو نہ جائیں۔ ایسا آج تک تو ہوا نہیں۔ اور پھر الطاف میاں ٹھیرے گرداں
بن گانا سُنے کھانا ہضم نہیں ہوتا۔ ظالم غضب کا دھتّی ہے۔ آندھی جائے۔ مینہ جائے پر جاوڑی چکّر
نہ جائے۔ آج یہ صلاح ٹھیری کہ ہوٹل نہ چلیں، بوتل لے لیں اور مہ پارہ کے کوٹھے پر رنگ رہے۔ سیّد بولا
تراض نہ ہو۔ الطاف میاں مسکرائے اور کہنے لگے آج ہی تو کسنا ہی اگر نانکر کر گئی تو دو ٹوک نہیں تو پالا مار لیا
آج صاحب کا معاملہ ہے، سب نے دس دس روپے نکال کر رکھ دئے۔ الطاف میاں نے اٹھائے اور
ہم انتظام کرینگے۔ دیکھتے رہو کشمیری گیٹ سے تانگے پکڑے۔ ایک بوتل وہیٹ 69، اور ایک بلیک اینڈ وائٹ
سیدھے مہ پارہ کے ہاں جا وارد ہوئے۔—— الطاف نے سیّد کو سب کے پیچھے کر دیا۔ مہ پارہ کی
زینہ کی طرف تھیں اور وہ کسی کی تلاش میں ایک ایک کو دیکھ رہی تھی، جب سیّد نظر پڑا چہرہ پر رنگ
۔ ابھی تک یہاں اور کوئی نہیں آیا تھا۔ میدان صاف ملا۔ بی نائکہ برآمدہ میں تشریف فرما کپڑے کی
) تیاری صاف کر رہی تھیں۔ مہ پارہ تو ہمیں دیکھ کر نہال نہال ہوگئی۔ پر بڑھیا نے رُخ نہ دیا۔

منہ پھلائے کانٹا نکلی مینا کی طرح بیٹھی رہی۔ الطاف میاں نے مہ پارہ سے کہا یہ آج تمہاری اماں جان کیوں اکھیری بیٹھی ہیں۔ وہ بولی بالکل بھی نہیں۔ الطاف نے غور سے دیکھتے ہوئے کہا نہیں صاحب کوئی نہ کوئی تو بات ضرور ہے۔ آج ان کے تیور بدلے ہوئے ہیں۔ پھر سید سے کہنے لگا۔ یار تم جاؤ۔ بس تمہارے آنے سے بڑی بی کا مزاج برہم ہوگیا۔ آپ مہربانی فرمائیے، یہاں سے سواری بڑھائیے اور رادھا کے کنڈ پر مرلی بجائیے۔ یہاں اتنی چکوریں کافی ہیں۔ تم ہمارا بھی کام بگڑواؤ گے۔ دیکھتے نہیں بڑھیا تمہیں کیسے نیلے پیلے دیدوں سے گھور رہی ہے۔ سید نے جواب دیا صاحب میں نے ان کا کیا بگاڑا ہے۔ الطاف بولے۔ کچھ بگاڑا ہی نہیں۔ اس رات کی ساری باتیں استادوں نے آکر یہاں جڑ دیں، بڑھیا کو رتی رائی پتہ ہے۔ دو دن تک صاحبزادی گانے سے دست بردار رہیں۔ گلا دکھتا رہا۔ سکائی ہوتی رہی۔ پھر سید بولا۔ صاحب گلا ان کا خراب گلا مجھ سے۔ پھر مہ پارہ سے خطاب کرکے بولا کیا سچ مچ طبیعت خراب ہوگئی تھی، ایک خاص ادا سے جواب ملا۔ آپ کی بلا سے۔ الطاف بولا کیوں صاحب ہم نہ کہتے تھے۔ آنکھیں جھپتی ہی نہیں یاری کی۔ اس کے علاوہ جب بھی یہاں آئے۔ یہ جناب ہی کا ذکر کرتی رہیں، اور ایک مرتبہ تو یہ شعر بھی پڑھا تھا ؎

کافی ہے تیرا نام بھی تسکین قلب کو گر تو نہ بزم میں ہو تری گفتگو رہے

مہ پارہ تنک کر بولی، خدا سے ڈریئے کہیں آسمان نہ گر پڑے۔ جواب دیا گرنے دیجئے۔ یہ گرے تو شاید کوئی مہ پارہ ہمارے حصہ میں بھی آئے۔ وہ بولی پہلے تو آفتاب کی کرن جھلس دے گی۔ الطاف نے کوٹ کی جیب میں سے بوتل نکالتے ہوئے کہا ہم آتش خور ہے تو اسے تمہاری پاپوش کی کرن سمجھیں گے، سید بولا واہ الطاف کیا کہنے ؎

جوبات کی خدا کی قسم لاجواب کی، پاپوش میں لگائی کرن آفتاب کی

اب الطاف نے مہ پارہ کو بوتل دکھاتے ہوئے کہا کیوں بیگم! اجازت ہے۔ وہ ایسی اچھوتی انجان بن کر بولی اس میں ہے کیا۔ سید نے کہا آپ نہیں جانتیں۔ وہ بولی مجھے کیا خبر آپ نے اس نگوڑی میں کیا بھر رکھا ہے۔ وہ بولا اس میں دن رات بند ہیں، اس کا نام ہے بلیک اینڈ وائٹ۔ حضرت انسان نے ابلق گھوڑے کو اس میں بند کرکے سربمہر کر دیا ہے۔ یا یوں سمجھئے۔ اس میں آگ بند ہے جس کو آدم کی اولاد نے پانی کرکے بہا دیا ہے۔ اگر اجازت ہو تو حضور کے دولت کدہ پر ہم اس میں سے دو دو گھونٹ پی لیں۔ سید اتنا کہنے پایا تھا کہ الطاف بول اٹھا اچھا تو پھر دیر نہ کرو۔ ذرا لپک کر نوکر کو آواز دو، ہم کو سوڈا اور گلاس لادے۔ مہ پارہ نے دبی زبان سے کہا اماں نہ خفا ہوں، الطاف بولا آپ سوچ لیں۔ ہم شرابی لوگ ہمارے دس ٹھکانے۔ یہاں نہیں کہیں اور جا کر پی لیں گے۔ کیوں بھئی پرکاش! کیا خیال ہے۔ سید میاں کو اس دن ادھر یاد بھی کر رہی تھی۔ باقی دل یہ چاہتا ہے کہ آج یہیں جاؤ رہے، آگے ان کی خوشی۔ مہ پارہ سے کہا اچھا تو مولا

کو بلائیے نہ۔ وہ بولی آپ کا گھر ہے، پر مجھے ذرا اماں کا ڈر ہے کہیں خفا نہ ہوں۔ الطاف بولا تم کسی کو آواز تو دو۔ اماں سے ہم نمٹ لیں گے۔ مولسری کو آواز دی گئی۔ الطاف نے ایک روپیہ دیتے ہوئے کہا، دیکھو چھ بوتلیں سوڈے کی اور گلاس ذرا جلدی سے۔ سوڈے کا نام سن کر ذرا بڑھیا چونکتا سی ہوئی اور بولی کیوں صاحب کیسی طبیعت ہے سوڈا کیوں منگایا جا رہا ہے۔ ہم سب تو چپ رہے، الطاف بولا اماں جان ذرا دوائیں پی گئے بڑھیا ایک گھاگ زمانہ بھری آنکھیں دیکھے ہوئے۔ فوراً بولی دو ر یار سب کے سب ہی بیمار ہو گئے۔ الطاف بھی کچھ کم نہ تھا۔ جواب دیا جی ہاں وہ بیماری ذرا ایسی ہی ہے اور آپ جانیں ہم سب ٹھیرے دوست، جو کام کرتے ہیں اکٹھا کرتے ہیں، آپ فکر نہ کریں۔ نائکہ نے تیور بدل کر کہا الطاف میاں مجھے چراتے ہو، دوا پیو گے یا دارو۔ وہ بولا آپ جو سمجھیں۔ بڑھیا بولی ویسے تو آپ کا گھر ہے، اٹھیے بیٹھیے ہنسیے بولیے گانا سنیے تفریح کیجیے۔ یہ نگوڑے استاد کہاں مر گئے، اب تک نہیں آئے۔ پر اس کام سے تو ہم معافی مانگیں گے۔

سید نے یاروں کی طرف اشارہ کیا کہ چلو کہیں اور رنگ رہے۔ مہ پارہ نے آنکھ کے اشارہ سے روکا اور خود برآمدہ میں بڑھیا پاس جا پہنچی۔ سامنے کے کواڑ بند کر دیئے گئے اور ماں بیٹیوں میں کھسر پسر ہونے لگی۔ ادھر ہم برداشتہ خاطر ہوئے، ارادہ کیا کہ کہیں اور اٹھ چلیں۔ ملک خدا تنگ نیست۔ الطاف نے روکا۔ بولا ذرا دم لو وہ سمجھانے گئی ہے۔ اوّل تو چھوکری ہی بڑھیا کو راضی کرے گی، نہیں تو ماید ولت آڑے آئیں گے۔ ویسے لوگ اچھے ہیں، معشوق اپنے پلے پڑے ہے، ذرا سی بات پر اکھڑ جانا اچھا نہیں۔ کچھ ادھر سے آوازیں آنی شروع ہوئیں۔ الطاف بولا سن لیا، بڑھیا بہت بگڑی ہوئی ہے اسے سارا حال معلوم ہے، جانتی ہے لڑکی کا دل آ گیا ہے۔ یہ سب سید کے کئے کرتوت ہیں۔ ظالم نے غضب کا جال ڈالا ہے۔ تم ذرا دم لو میں بڑھیا کو ابھی دم دلاسا دیتا ہوں۔ اتنا کہہ دروازے سے لگ کر کھڑا ہو گیا۔ ذرا سی دیر کن سوئیاں لیں۔ پھر سے کہا کیوں صاحب ہم بھی آ سکتے ہیں۔ یہ ماں بیٹیوں کی کیا سازشیں ہو رہی ہیں۔

اب یہ تینوں باتیں کرنے لگے۔ بڑھیا کی ایک آدھ مرتبہ آواز بلند ہوئی۔ کہتی تھی چھوکری تو تو دل کے ہاتھوں اندھی ہو رہی ہے۔ جو وہ کہیں سو کئے جا۔ موا دل نہ ہوا مصیبت ہو گیا۔ بڑے آئے سید کہیں کے۔ میں کل ہی پیر جی سے تعویذ لاؤں گی۔ یہاں کچھ الطاف چڑکے تو بڑھیا ان پر پیچ پڑی۔ بولی بس رہنے دیجئے، یہاں لڑکی ہاتھوں سے جا رہی ہے، آپ کو دوست داری کی پڑی ہے۔ غرضکہ دس پانچ منٹ بعد مہ پارہ برآمدہ سے برآمد ہوئیں۔ آنکھیں سرخ تھیں لیکن سرمہ قائم نہ رخساروں کی سرخی چھوٹی تھی، نہ پاؤڈر پر کوئی نشان پایا جاتا تھا۔ یہ ڈرامہ کچھ ریہرسل ہوا سا معلوم ہوتا تھا۔ گو اداکار کامل فن تھے، ولے حقیقت کی کمی تھی۔

سوڈا آ گیا۔ دور چلنے لگا، کواڑ بند کروا دیئے گئے۔ الطاف میاں نوٹ سرکاتے رہے۔ بوتلیں آتی رہیں،...

پہلے خواتین

(از احترام اللہ صاحب دہلوی)

افراد :-

کامل
بلقیس ——— کامل کی بیوی
کامل کا بڑا بھائی
کامل کی بھابھی
ایک ملازم

کامل - آج لطف رہیگا۔ بیوی ذرا دیکھنا! مشرق سے کیسی گھنگھور گھٹا اٹھی ہے۔

اس بوٹ کے ساتھ کے موزے کہاں ہیں؟

بلقیس (کھوئے ہوئے انداز میں) ہائیں؟

کامل - کس سوچ میں ہو؟ میں پوچھ رہا ہوں اس بوٹ کے ساتھ کے موزے کہاں ہیں؟

بلقیس - الماری ہی میں ہونگے۔

کامل - یہ پڑھنے کا کیا وقت ہے؟ بھائی جان اور بھابھی جان بالکل تیار ہیں، اور ہمارا انتظار کر رہے ہیں۔

بلقیس - میں بھی تیار ہوں۔

کامل - تو اُنکے پاس جاؤ۔ میں بھی ابھی آتا ہوں۔

بلقیس - یہ مضمون ختم کرلوں۔ بس آدھا صفحہ رہ گیا ہے۔

کامل - بہت دلچسپ ہے کیا؟

بلقیس - جی ہاں! بہت دلچسپ! اتنا دلچسپ کہ پڑھتے پڑھتے میرا خون کھولنے لگا۔

کامل - خدا خیر کرے! عنوان کیا ہے؟

بلقیس - "بدعتیں" ——— ہونہہ! بدعتیں!

کامل - اچھا، وہ مضمون پڑھ رہی تھیں تم؟

بلقیس - تم نے بھی پڑھا ہے؟

کامل - ہاں۔ مگر میرے خیال میں تو اس میں کوئی بات قابلِ اعتراض نہیں۔

بلقیس - تم تو یہی کہو گے۔ لکھنے والا ایک مرد ہے نا۔

کامل - ٹائی کہاں گئی ہے ——— یہ رہی۔

بلقیس - میرا جی چاہتا ہے کہ اس مضمون کا جواب لکھوں۔

کامل - ضرور۔ ضرور۔

بلقیس - اور اسی رسالہ میں شایع کراؤں؟

کامل۔ ہاں ہاں! میں تو خود تمہیں مشورہ دینے والا تھا کہ تم مضمون نگاری شروع کر دو۔
بلقیس۔ کیوں؟
کامل۔ بات یہ ہے کہ میں تمہارے زورِ تقریر کا تو قائل ہوں ہی، زورِ تحریر بھی دیکھنا چاہتا تھا۔
بلقیس۔ تو گویا میں منہ زور ہوں؟
کامل۔ ہیں! رومال کہاں گیا؟ ——— یہ رہا۔
بلقیس۔ یہ تم نے اچھی ترکیب نکالی ہے کہ خود تو جو کچھ کہنا ہوتا ہے کہہ لیتے ہو، اور جب میں جواب دیتی ہوں تو غائب ہو جاتے ہو۔
کامل۔ اور فاؤنٹین پن؟ ——— کہاں گیا فاؤنٹین پن؟ ——— یہ رہا۔
بھائی۔ (دُور) ارماں کامل! تم تیار ہوئے یا نہیں؟
کامل۔ آئے بھائی جان!
بھائی۔ (قریب) کیا دیر دا رہے؟
کامل۔ بس کچھ دیر نہیں۔
بھائی۔ ارماں کامل! تم بھی کمال کرتے ہو۔ اس ٹھاٹھ کی بھلا کیا ضرورت تھی؟ پکنک پر جا رہے ہو یا بَر دکھاوے کے لئے؟ ——— اور یہ بلقیس کیوں چپ چپ بیٹھی ہیں؟ ——— آئیں؟
کامل۔ کچھ نہیں۔ کوئی خاص بات نہیں۔
بھائی۔ معلوم ہوتا ہے تم دونوں میاں بیوی بھڑ گئے ہو۔
کامل۔ بھلا میری مجال! انہیں ہی ذرا اس رسالہ کے ایک مضمون پر غصّہ آگیا۔ مضمون نگار پر تو بس چلا نہیں مجھ غریب پر غصّہ اتارنا چاہتی تھیں۔

بھائی۔ یہ بات ہے! کیوں بی بلقیس؟
بھابھی (آتے ہوئے) یا اللہ۔ اس کمرے میں کیا گوند لگا ہوا ہے۔ تم بھی آئے تو چپک کر رہ گئے۔
بھائی۔ لئے بی سنو! کامل اور بلقیس میں کسی رسالے کے مضمون پر بحث ہو رہی تھی کہ میں آگیا ——— ہاں بھئی! کیا لکھا ہے اُس میں؟
بھابھی۔ ہاں ذرا میں بھی تو سنوں۔
بلقیس۔ دیکھنا آپا! ایک بزرگوار نے جو عورتوں سے بہت جلے ہوئے معلوم ہوتے ہیں یہ مضمون لکھا ہے:۔ چند سطریں سُناتی ہوں۔ انہیں سے آپ کو اندازہ ہو جائے گا۔
بھابھی۔ ہاں سُناؤ۔
بلقیس۔ فرماتے ہیں "اُن بدعتوں میں سے جو مغرب سے ہمارے ملک میں درآمد کی گئی ہیں، ایک عورتوں کی حد سے زیادہ عزّت کرنے کا خبط بھی ہے۔" ——— سُنا آپ نے؟ عورتوں کی حد سے زیادہ عزّت کرنے کا خبط!
بھابھی۔ آگے پڑھو۔
بلقیس۔ لکھا ہے "اور اس کا سب سے زیادہ مظاہرہ غالباً Ladies first یعنی "پہلے خواتین" کی صورت میں ہوتا ہے۔ مگر کوئی خدا کا بندہ یہ نہیں سوچتا کہ آخر خواتین پہلے کیوں؟ مرد ہر طرح عورت سے برتر ہے۔ خدا نے مرد کو حاکم بنایا ہے اور عورت کو محکوم۔ اور ———"
بھابھی (غصّہ ضبط کرتے ہوئے) بس! بس!
بھائی۔ تم پڑھے جاؤ بلقیس! میں نے بالکل نہیں سُنا۔

کامل۔ اور نہ میں نے۔
بھابھی۔ اُف! ان مردوں کا بس چلے تو عورتوں کو زندہ نہ رہنے دیں۔
بھائی۔ ایمان کی بات تو یہ ہے کہ تمہیں اس غریب مضمون نگار پر خواہ مخواہ غصّہ آرہا ہے۔ اُس نے کچھ جھوٹ نہیں لکھا۔
بھابھی۔ ماشاءاللہ! آپ کا بھی یہی خیال ہے کہ مرد حاکم ہے اور عورت محکوم؟
بھائی۔ یہ تو خیر کاتب کی غلطی معلوم ہوتی ہے مگر مجھے اس رائے سے اتفاق ہے کہ کوئی خدا کا بندہ یہ نہیں سوچتا کہ آخر خواتین پہلے کیوں۔ یعنی جس وقت میں موٹر کا دروازہ کھول کر پہلے تمہیں بٹھاتا ہوں اور بعد میں خود بیٹھتا ہوں، تو کبھی یہ غور نہیں کرتا کہ میں ایسا کیوں کرتا ہوں۔
کامل۔ بھائی جان! میں خود بیوی کو یہی مثال دینے والا تھا۔
بھابھی۔ اچھا تو اب غور کرلو۔
بھائی۔ میرا خیال ہے کہ تجربہ بہترین کسوٹی ہے۔ آج ہم لوگ ہر بات میں "پہلے خواتین" پر عمل کرینگے اور پھر دیکھیں گے اس کا کیا نتیجہ نکلتا ہے۔
کامل۔ بل۔کل۔ٹھیک!
بھائی۔ بولو۔ منظور ہے، بیوی؟
بھابھی۔ ہاں۔
بلقیس۔ مجھے بھی۔
بھائی۔ تو پھر چلو۔ اس ہفتے میں پکنک کو بھول ہی گئے تھے۔
کامل۔ آئیے۔
بھائی۔ ارماں! ابھی سے بھول گئے؟ پہلے خواتین باہر جائیں گی۔۔۔ چلئے بیگم صاحبہ!
کامل۔ اوہ، ٹھیک ہے۔۔۔ چلئے محترمہ!
بھابھی۔ آؤ بی بلقیس! کم از کم آج تو ہم عورتوں کی حکومت ہے۔
کامل۔ گویا پہلے مردوں کی تھی!
بلقیس۔ کیا کہا تم نے؟
کامل۔ بھائی جان، موٹر نکلوائی ہے؟
بھائی۔ ہاں۔ سامان بھی رکھوا دیا ہے۔۔۔ اسے نذیر!
ملازم۔ جی ہاں۔
بھائی۔ تمہیں آج کی چھٹی۔ جاؤ سیر کرو۔
ملازم۔ خدا خوش رکھے میاں۔
کامل۔ بھائی جان! اسے تو ساتھ لیتے چلئے۔
بھائی۔ ارماں! تم کیا جانو پکنک ہے کس چڑیا کا نام! اس میں لطف تو یہی ہے کہ ہر کام خود کیا جائے۔
کامل۔ ہاں۔ یہ تو ٹھیک ہے۔
بھائی۔ ٹنکی میں پٹرول کافی ہے نا؟
کامل۔ جی ہاں۔ کل ہی ڈلوایا تھا۔
بھائی۔ تو پھر بیٹھو۔۔۔ ہائیں! یہ تم دونوں پچھلی سیٹ پر کیوں بیٹھ رہی ہو؟ موٹر کون چلائیگا؟
بھابھی۔ تم۔ اور کون؟
بھائی۔ اوں ہونہہ! "پہلے خواتین"۔
کامل۔ بالکل ٹھیک۔ پہلے آپ دونوں میں سے کوئی

چلائے - اور جب موٹر شہر کی بھیڑ بھڑکا سے نکل کر
صاف سڑک پر پہنچے تو پھر میں یا بھائی جان چلائینگے۔
بلقیس - آپا! مجھے تو بالکل چلانی نہیں آتی۔
بھابی - ارے بی! تم پروا نہ کرو - تمہیں نہیں آتی
تو کیا ہوا - مجھے تو آتی ہے - بری باولی ہی سہی ——
آؤ - تم میرے پاس بیٹھ جاؤ۔
کامل - نہیں آپ کے پاس میں بیٹھونگا - کچھ گڑبڑ
ہوگئی تو سنبھال لونگا۔
بھائی - تم نہیں بیٹھ سکتے۔
بلقیس - تو پھر آپ بیٹھیے بھائی جان - میں جانتی
ہوں، آپا کو یونہی سی چلانی آتی ہے - کہیں لینے کے
دینے نہ پڑ جائیں۔
بھائی - کوئی ہرج نہیں - تجربات نے بہتروں کی
جان لی ہے - مگر اُن کی قربانیاں رائگاں نہیں گئیں۔
[موٹر کا شور]
بلقیس - آپا! میرے کان پھٹے۔
بھابی - چپ بیٹھو بی! اب جس طرح اسٹارٹ ہوتی
ہے اُسی طرح تو کرونگی۔
بلقیس - تو اب اسے چلائیے تو سہی۔
بھابی - ذرا تو دم لو - انجن تو گرم ہو جائے ——
ہونہہ - یہ مرد سمجھتے ہیں کہ ان کے بغیر کوئی کام ہو ہی
نہیں سکتا۔ —— ارے یہ لو —— ارے! ارے!
بلقیس - آپا خدا کے لئے! یہ تو اُلٹی چل رہی ہے۔
کامل - بھابی جان! گیئر بدلیے۔
[سر ٹکرانے کی آواز]

بھابی - آہ میرا سر! (ایک ساتھ)
بلقیس - اوئی میرا سر!
[دونوں بھائی ہنستے ہیں]
بھابی - واہ بی! یہ تم نے ٹکر کیوں ماری میرے؟
بلقیس - کیا کرتی آپا جھٹکا ہی اس زور کا تھا کہ سر لڑ گیا
[موٹر چلنے کی آواز]
بھابھی - چلو خیر۔
کامل - ہوشیاری سے بھابی جان! ابھی آپ نے
پٹڑی پر چڑھا دی ہوتی موٹر۔
بھائی - ارماں! تم چپ نہیں بیٹھوگے۔
بلقیس (چلا کر) بائیں کو! اُف بچ گیا بیچارہ۔
آپا ابھی تم نے خون کیا ہوتا۔
بھائی - دیکھو بیوی! یہ ٹھیک نہیں - کچلنا ہے تو پہلے
کسی عورت کو کچلو۔
کامل - ان پہلے خواتین!
بلقیس - اچھا - اب تو صاف سڑک آگئی - اب آپ
چلائے بھائی جان!
بھابی - ارے بی! جب میں شہر میں سے لائی تو یہاں پھر
کیا ڈر ہے؟ بیٹھی بھی رہو۔
بھابی - ارماں کامل!
کامل - جی بھائی جان؟
بھائی - ارماں! تم نے موٹر کی ٹنکی میں کیا ڈلوایا تھا؟
کامل - پیٹرول، بھائی جان - اور کیا؟
بھائی - میرا تو خیال ہے کہ پمپ والے نے غلطی سے
شراب ڈال دی ہے - دیکھتے نہیں آج ہماری موٹر کیسی

لہراتی ہوئی چل رہی ہے۔

[دونوں قہقہہ لگاتے ہیں]

کامل۔ بھابی جان! ذرا خیال رکھنا باغ کا دروازہ بہت تنگ ہے۔

بھابی۔ ارے! یہ اسٹیرنگ کو کیا ہوگیا! — ہائیں! — ہائیں! —

لا الہ الا اللہ!

بلقیس۔ آپا! بریک!

[موٹر کے ٹکرانے کی آواز]

بھائی۔ ارے بھئی! سب سلامت ہیں نا؟

کامل۔ دیکھئے بھابی جان! میں نہ کہتا تھا۔

بھابی۔ خدا جانے یہ دروازہ اتنا تنگ کیوں بنایا ہے، میں دنیا بھر میں موٹر چلا لیتی ہوں۔ مگر ان دروازوں کو دیکھ کر ہاتھ پاؤں پھول جاتے ہیں۔

کامل۔ خیریت ہوئی، صرف مڈگارڈ کو ضرب خفیف آئی ہے۔

بھائی۔ چلو خیر۔ منزل پر پہنچکر اونٹ لنگڑا ہوا ہے۔

بھابی۔ ارے بی بلقیس! تمہارا دل بڑا کمزور ہے۔ ذرا سے حادثے سے ایسی سہم کر رہ گئیں۔ چلو اترو۔

بلقیس۔ آپا! آج تو خدا ہی نے بچایا۔

بھائی۔ کہاں چلیں؟ یہ سامان کون اٹھائیگا؟

بھابی۔ آدھا ہم دونوں۔ آدھا تم دونوں۔

بھائی۔ آدھا وادھا تو میں جانتا نہیں۔ پہلے تم دونوں پر لادا جائیگا، جتنا بھی لادا جا سکے۔

کامل۔ بلکہ اس سے بھی زیادہ۔

بھائی۔ اور پھر بھی کچھ بچ رہا تو ہم دونوں لیتے آئینگے۔

یہ لو — اور یہ — اور یہ — بیوی! تم تو ماشاءاللہ خوب مضبوط ہو — شاباش! لو یہ دری سر پر رکھ لو — یہ بات! دیکھو ذرا ہوشیاری سے چلنا

کامل۔ لو بیوی! یہ خالی پتیلی سر پر ٹوپی کی طرح اوڑھ لو

بلقیس۔ اے ہے، بڑے بے درد ہو۔

کامل۔ وہ بھائی جان — میں تو چھوٹا بے درد ہوں۔

[دونوں بھائی ہنستے ہیں]

بھائی۔ لو اب تم چلو۔ ہم ابھی آتے ہیں۔

کامل۔ اب کیا کیا رہ گیا؟

بھائی۔ صرف ایک چیز۔ مگر وہ میں نے جان کر چھوڑ دی ہے

کامل۔ کیوں؟

بھائی۔ دیکھو — (پکار کر) تم دونوں بارہ دری میں بیٹھو۔ ہم ابھی آتے ہیں

کامل۔ اب اس موٹر کا کیا کیا جائے؟

بھائی۔ یہیں ایک کنارے کھڑا کر دیتے ہیں — لو ذرا ہاتھ تو لگاؤ — بس یہاں راستہ بھی نہیں رکیگا

کامل۔ ذرا اسٹارٹ کر کے تو دیکھئے۔ چلنے کے قابل بھی رہی ہے یا نہیں؟

بھائی۔ ارماں! اسوقت تو مارے بھوک کے بری حالت ہو رہی ہے۔

[چلنے کی آواز]

کامل۔ میں نے بھی صبح کو ناشتہ نہیں کیا ہے آج

بھائی۔ بس تو پہلے کھانا کھائیں گے۔ اور پھر سیر ویر بعد میں ہوگی۔

کامل۔ آپ نے میرے دل کی بات کہہ دی۔

بھابی۔ آج تمہاری بھابی نے وہ وہ مال پکائے
ہیں کہ بس کچھ نہ پوچھو۔
کامل۔ اور بھوک بھی آج ایسی لگی ہے کہ شاید ہی
کبھی ایسی لگی ہو۔
بھائی۔ یہ کھلی ہوا کا اثر ہے ——— ارے ان
دونوں نے تو کھانا شروع بھی کر دیا۔ معلوم ہوتا
ہے یہ بھی بھوک پر ادھار کھائے ہوئی ہیں۔
کامل۔ بھائی جان! کھلی ہوا نے ان پر بھی تو اثر کیا ہے
بھائی۔ سچ کہتے ہو —— لاؤ بیوی کھانا ——
بس۔ جھٹ پٹ!
بھابی۔ چپ چاپ بیٹھے رہو۔
بلقیس۔ اور تم بھی منہ پھیر کر بیٹھو۔ نظر لگتی ہے۔
کامل۔ یعنی؟
بھابی۔ "پہلے خواتین"
بلقیس۔ پہلے ہم کھائیں گے۔
بھائی۔ مگر تم دونوں نے پہلے شروع تو کر دیا۔
بھابی۔ مگر کھا تو نہیں چکے۔ ——— بلقیس!
یہ نان پاؤ کے ٹکڑے کیا مزا دے رہے ہیں۔
بلقیس۔ کیا کہنے ہیں —— اور یہ انڈوں کا حلوہ؟
کامل۔ بھائی جان! میں باز آیا اس تجربہ سے۔
بلقیس۔ چیں بولو۔
بھابی۔ کہو۔ "پہلے خواتین"
بھائی۔ ارماں! صبر کرو۔ تم تو بالکل بچے بنے
جا رہے ہو۔
کامل۔ بھائی جان! ناک میں کھانے کی خوشبو
جو آ رہی ہے تو بس روح تڑپے جا رہی ہے۔
بھائی۔ پھر کوشش کرو۔ یہ شعر نہیں بنا۔
بلقیس۔ سکتہ پڑتا ہے۔
بھابی۔ مگر کوشش کرو گے تو ضرور بن جائیگا۔
پیٹ خالی ہو تو شاعری خوب ہوتی ہے۔
بلقیس۔ بلکہ یوں کہیئے کہ ہوتی ہی جب ہے، جب
پیٹ خالی ہو۔
کامل۔ بیوی! اب ختم بھی کرو کھانا۔
بلقیس۔ ابھی تو شروع کیا ہے۔
کامل۔ اُف، یہ خوشبو قیامت برپا کر رہی ہے۔
بھائی۔ ناک بند کر لو۔
بلقیس۔ آپا! کمال کر دیا، یہ شامی تو غضب ڈھا
رہے ہیں۔
کامل۔ یہ تعریفیں میری جان لیکر چھوڑینگی۔
بھائی۔ کان بند کر لو۔
بلقیس۔ آپا! مجھے تو ایسی بھوک لگ رہی ہے کہ
اس سارے کھانے میں سے کچھ بچتا نظر نہیں آتا۔
بھابی۔ بوجھ اٹھایا تھا نا۔ دیکھتی نہیں، پہلوان
بوجھ اٹھاتے ہیں تو انکی بھوک کیسی بڑھ جاتی ہے۔
بھائی۔ دیکھنا کہیں بھوک میں کچھ گڑ بڑ نہ ہو جائے
پیٹ میں درد ورد ہو گیا تو میں ڈاکٹر کے پاس بھی
نہیں لے جا سکونگا۔
کامل۔ ہاں موٹر بالکل بے کار ہو گئی ہے۔
بھابی۔ بلقیس! اب ان دونوں کو بھی دیدینا چاہیے۔
بلقیس۔ آپ کی مرضی۔

بھابی۔ لو کھاؤ۔
کامل۔ بھوی! حد کر دی تم نے ـــــ کھایا تو کھایا کھانے کی صورت ایسی بگاڑ دی کہ رغبت نہیں آتی۔
بھابی۔ اب نخرے نہ کرو۔ کھا لو۔ اس بیچاری نے بھی تمہارا جوٹھا شربت پیا تھا۔
بھائی۔ ہاں بھئی! اسکی تو میں بھی گواہی دونگا۔
[بارش کی آواز]
اوہو، بارش تو اخیر نوٹس کے آ گئی۔ میاں اٹھاؤ سارا سامان۔ بوچھاڑ آ رہی ہے۔
کامل۔ دیکھیے وہ قورمے کی پتیلی رہ گئی۔
بھائی۔ میں لاتا ہوں ابھی۔ اُفوہ! بارش بھی اچھے وقت شروع ہوئی۔
بلقیس۔ آپا! یہ تو بُرا ہوا۔ اب سارا وقت یہیں بیٹھ کر گزارنا ہوگا۔
بھابھی۔ ہاں یہ بارش شام سے پہلے رکتی نظر نہیں آتی۔
بھائی۔ اَرماں کامل!
کامل۔ جی ہاں بھائی جان!
بھائی۔ یہ قورمہ تو بالکل ٹھنڈا ہے۔
کامل۔ یہی میں دیکھ رہا ہوں۔
بھائی۔ اَرماں دیکھ کیا رہے ہو! جھٹ سے گرم کر ڈالو نا اسے۔
کامل۔ اچھا ـــــ اسٹوو کہاں ہے؟
بلقیس۔ اُفوہ! بارش تو غضب کا زور باندھ رہی ہے
بھائی۔ سٹوو! ارماں سٹوو تو موٹر ہی میں رہ گیا۔
کامل۔ واقعی؟
بھائی۔ ہاں ہاں۔
کامل۔ میں لاتا ہوں ابھی۔
بھائی۔ بیٹھو! پہلے خواتین ـــــ بیوی اسٹوو لاؤ۔
بھابی۔ اس بارش میں؟
بھائی۔ اس بارش اور اُس بارش کو میں جانتا نہیں۔ سٹوو کو لانا پڑیگا۔
کامل۔ اور آپ نہ لائیں گی تو پھر یہ لائیں گی۔
بلقیس۔ میں تو مر بھی جاؤں تو اس بارش میں باہر نہ نکلوں۔
کامل۔ تو پھر بولو جیں۔
بھائی۔ کہو "پہلے مرد"
بھابی۔ بلقیس! ہمت کرو۔
بلقیس۔ آپا! بارش کو تو دیکھو۔
بھابی۔ پرواہ نہ کرو۔ چلی جاؤ۔ نہیں تو عورتوں کی ناک نیچی ہوگی۔ شاباش! دیکھوں کیسی پانی میں چھم چھم کرتی جاتی ہو۔
کامل۔ چھم چھم چھما چھم!
بھائی۔ اور دیکھیں کیچڑ میں کیسی دھم سے گرتی ہو۔
کامل۔ اب جلدی جاؤ۔
بلقیس۔ میرا کیا ہے۔ ساڑھی خراب ہو گئی تو تمہیں کو نئی لا کر دینی پڑے گی۔
کامل۔ کوئی پروا نہیں۔
بلقیس۔ لو میں چلی۔
بھائی۔ ایک دو، تین!

کامل۔ بلکہ نو۔دو۔گیارہ!
بھابی۔ اے ہے! ابھی گرتی بے چاری!
بھائی۔ میاں اتنی دیر میں کوئی اچھا سا ریکارڈ ہی
بجا ڈالا ہوتا۔
کامل۔ اچھا بھائی جان!
[آرکسٹرا کا ایک ریکارڈ بجتا ہے]
بھائی جان! یہ شامی کباب نہیں کھائے آپ نے؟
بھائی۔ لاؤ! کمال ہے ہر کباب کا کونہ کتر لیا ہے۔
کامل۔ اور پراٹھوں کیساتھ بھی یہی سلوک کیا ہے۔
بھائی۔ دم نہ مارو شکر گزارو۔
کامل۔ (ہنستے ہوئے) بھائی جان!
بھائی۔ ارے بی بلقیس! کیا حال ہے؟
[دونوں بھائی ہنستے ہیں]
کامل۔ آؤ، بیوی! ہمارے ساتھ شریک ہو جاؤ۔
پانی میں بھیگنے سے بھی خوب بھوک لگتی ہے۔
بلقیس۔ (جھرجھری لیکر) اُف! لو سنبھالو سٹوو
کامل۔ بڑے بڑے کھانے پر چھینٹیں آتی ہیں۔
بھائی۔ لو میاں! جلا ڈالو سٹوو۔
کامل۔ اچھا۔ کیوں بیوی! مضمون پڑھ کر خون کھولنے
لگا تھا۔ ٹھنڈا ہو گیا ہو گا اب تو۔
بھابی۔ ارماں کامل! ایک الگنی باندھ کر اپنی بیوی کو
اُس پر ٹانگ دو۔ جانے کے وقت تک خشک ہو جائیگی۔
[پھر دونوں ہنستے ہیں]
بھابی۔ یہ کون ہنسا؟
بھائی۔ یہ ہم ہنسے۔

بھابی۔ خبردار! تم نہیں ہنس سکتے۔
کامل۔ ٹھیک ہے بھائی جان! "پہلے خواتین"
بھائی۔ ہاں۔ ہم تو آخر میں ہنسیں گے۔
بلقیس۔ اوہ! بارش!
کامل۔ کہتی ہے آج پڑ کر پھر نہ پڑونگی۔
بھائی۔ آج اس کی بھی حکومت ہے۔
کامل۔ آخر یہ بھی تو عورت ہے۔؟
[ریکارڈ بند ہو جاتا ہے]
بھابی۔ ارے پاندان کہاں گیا؟
بلقیس۔ آیا! موٹر میں ہے۔
کامل۔ تو پھر لیتی کیوں نہ آئیں؟
بلقیس۔ مجھے کیا ضرورت تھی۔
بھابی۔ سنتے ہو! پاندان لے کر آؤ۔
بھائی۔ میں!
بھابی۔ ہاں تم!
بلقیس۔ اور اگر آپ نہیں لاتے تو انہیں لانا پڑیگا۔
بھائی۔ بات تو قاعدے کی ہے۔ اب کے ہم مردوں
کی باری ہے۔
کامل۔ تو پھر جانا ہی پڑیگا؟
بھائی۔ ہم دونوں میں سے ایک کو۔
کامل۔ تو میں جاتا ہوں۔ کاش یہ بارش صرف ایک
منٹ کے لئے تھم جائے۔
بھائی۔ یہ تم پر رحم نہیں کرے گی۔
کامل۔ آخر عورت ہے۔
بھائی۔ ارماں وہ تھم رہی ہے!

کامل - بھائی جان! وہ تھم ہی گئی -

[بارش کی آواز بند ہوجاتی ہے]

بھابی - بس تو بیکو -

کامل - یہ لیجیے -

بلقیس - ہائے افسوس!

بھابی - ایسی رک گئی جیسے صرف حکم کا انتظار کر رہی تھی

بلقیس - معلوم ہوتا ہے کہ اللہ میاں کے ہاں بھی سارا انتظام مردوں ہی کے ہاتھ میں ہے -

بھابی - اور کیا - سارے فرشتے مرد ہی تو ہیں -

بھابی - (پکار کر) ارماں جلدی آؤ کہیں پھر پڑنے لگے

بلقیس - کاش اب بھی شروع ہوجائے -

کامل - لیجیے بھابی جان یہ حاضر ہے آپ کا پاندان -

بھابی - ارماں کامل! بھیگے تو نہیں؟

کامل - صرف جوتوں کے تلے -

بھابی - لو! تو سر بھی گرم ہوگیا -

کامل - بھابی جان میرا تو پیٹ بھر گیا -

بھابی - بس تو میں بھی کھا چکا - چلو اب ذرا سیر کریں

کامل - ایسے میں بارش بھی رکی ہوئی ہے -

بلقیس - کھانا نہیں تھا تو سٹوو منگانے کی کیا ضرورت تھی؟

کامل - سٹوو لائی تھیں تو پاندان چھوڑ کر آنے کی کیا ضرورت تھی؟

بھابی - بوا صبر کرو -

بلقیس - آپا! سردی لگ رہی ہے -

بھابی - پھر کیا کیا جائے -؟

کامل - دری اوڑھ لو -

بھابی - اے بی! تم ایک ساڑی لائی تو تھیں؟

بھابی - میں کس لیے لاتی؟ ہاں اگر معلوم ہوتا کہ یہاں آکر بارش میں نہانا پڑے گا تو تین چار لیتی آتی -

بھابی - میں اس ساڑی کے متعلق کہہ رہا ہوں جس میں پتیلیاں بندھ کر آئی تھیں -

کامل - ہاں ہاں! اسے باندھ لو بوی! بالکل ٹھیک رہے گی -

بھابی - لاؤ ذرا دیکھیں تو سہی -

کامل - دیکھیے! میرے خیال میں تو خاصی اچھی ہے - صرف دو تین جگہ پتیلیوں کی سیاہی لگ گئی ہے - مگر غور سے دیکھا جائے تو اس میں بھی ایک حسن ہے -

بھابی - غیرت تو آتی نہیں، بوی کو یہ ساڑھی باندھتے ہوئے -

بلقیس - آپا! بھیگی ہوئی ساڑھی سے تو بہتر ہے یہ -

بھابی - لو بوا تمہاری مرضی - ذرا جلدی ہی آؤ پھر سیر بھی کرنی ہے

[ذرا سی دیر تک ایک ریکارڈ بجتا ہے، اسکے بعد]

کامل - خوش قسمتی ہے اس بارہ دری میں ایک کمرہ بھی ہے

بھابی - واقعی قسمت ہی کی بات ہے - ورنہ بنانے والا بارہ دری بنا کر چھوڑ دیتا تو کون گلہ کرتا -

کامل - اور یہ وہ کمرہ ہے جسمیں کبھی شہزادیاں لباس تبدیل کرتی تھیں -

بھابی - وہ آرہی ہیں شہزادی صاحبہ!

کامل - ہنسئے گا نہیں -

بھابی - ہم تو آخر میں ہنسیں گے -

بھابی - (آہستہ سے ہنستے ہوئے) واہ بی بلقیس! اس وقت ہنسنے کو جی تو نہیں چاہتا - مگر تمہاری یہ حالت دیکھ کر ہنسی ضبط بھی نہیں ہوتی -

بلقیس - کیا حرج ہے آپا! عورتوں کی ناک اونچی رکھنے

کے لئے یہ بھی سہی۔

بھائی۔ اچھا اب چلو۔

کامل۔ بھائی جان! چل تو رہے ہیں مگر اس سامان کی نگرانی کون کریگا؟

بھائی۔ ارماں! سامنے جھیل تک ہی تو جانا ہے، وہاں سے دیکھتے رہیں گے۔

کامل۔ اچھا۔

[چلنے کی آواز]

بھابی۔ بلقیس! میرا رومال رہ گیا، جانا ذرا لا دینا۔

بلقیس۔ اچھا آپا!

بھائی۔ بیچاری نے ایک میلی ساڑھی کیا باندھی کہ تم نے تو اُسے اپنی خادمہ ہی تصور کر لیا۔

کامل۔ بھائی جان آج تو کشتی میں سیر کرنی چاہیئے۔

بھائی۔ ارماں! ہم تو ہر دفعہ کہتے ہیں۔ مگر تمہاری بھابی نہ خود کشتی میں بیٹھتی ہیں نہ ہمیں بیٹھنے دیتی ہیں۔

بھابی۔ کشتی میں بیٹھنا کیا ضرور ہے۔ بس یہیں کنارے پر بیٹھ جاؤ اور تصور کر لو کہ تم کشتی میں بیٹھے ہو۔

بھائی۔ یہ بات! اگر بیوی یہ خیال تمہیں بہت دیر میں آیا۔ ورنہ ہم چاروں گھر پر بیٹھ کر ہی یہ تصور کر لیتے کہ ہم پکنک پر گئے ہوئے ہیں۔

بلقیس۔ لیجئے آپا اپنا رومال۔

بھابی۔ لاؤ بُوا! خدا تمہارا بھلا کرے ——

ارے! ارے! ارے میں گری!

بلقیس۔ اے ہے آپا!

کامل۔ بھائی جان ہاتھ پکڑ لیجئے!

بھابی۔ ہائے!

[پانی میں گرنے کی آواز]

بلقیس۔ غضب ہو گیا!

بھائی۔ ٹھیرو کامل!

بھابی۔ (ذرا دور) بچاؤ! ارے کوئی بچاؤ!

بھائی۔ چلو بلقیس! بچاؤ۔ "پہلے خواتین"

کامل۔ جلدی کودو!

بلقیس۔ اے ہے مجھے تیرنا نہیں آتا۔ ارے خدا کے لئے!

بھابی (دور) ہائے میں مری! ارے دوڑو! بچاؤ!

بھائی۔ بتاؤ۔ پہلے کون!

بھابی۔ پہلے مرد! پہلے مرد!

بلقیس۔ پہلے مرد! پہلے مرد!

بھائی۔ یہ بات ہے! میں ابھی آیا۔

[پانی میں کودنے کی آواز]

(منشور از نشرگاہ دہلی) احترام اللہ دہلوی

مرنا ہے مجھے

اس زیست کی بستی سے گزرنا ہے مجھے
طے منزلِ اُخرا ابھی کرنا ہے مجھے

ہو دل میں تو کچھ اور زباں پر کچھ اور
میں حق کو چھپا تا نہیں مرنا ہے مجھے

آغا۔ سروش

کمسن بیوی

(از جناب مولانا سیّد ظہور احمد[1] صاحب وحشی)

اشخاص:-

مرزا صاحب ۔ مرزا صاحب کی کمسن بیوی ۔ مرزا صاحب کے ایک دوست

—۔(۱)۔—

مرزا جی مکان کے مردانہ حصّہ میں حُقّہ پی رہے ہیں۔ ایک دوست آتا ہے۔

دوست - "مرزا جی! آداب عرض، کہیے آج دفتر نہیں گئے"

مرزا جی - "میاں یوسف! آج ذرا خضاب لگا لیا تھا۔ اب ہاتھ مُنہ دھو کر جاتا ہوں"

یوسف - "نئی شادی کے بعد خضاب کی جلد جلد ضرورت ہوتی ہے"

مرزا جی - "بھئی یوسف: مَیں تو شادی کر کے کچھ خوش نہیں"

یوسف - "کیوں، کیا بیوی حسین نہیں؟"

مرزا جی - "حُسن تو لاجواب ہے"

یوسف - "پھر کیا بدمزاج ہیں؟"

مرزا جی - "یہ بھی نہیں کہا جا سکتا"

یوسف - "اچھا تو میں سمجھ گیا ۔ فضول خرچ ہونگی اور آپ جیسے کفایت شعار"

مرزا جی - "یہ بات بھی نہیں"

یوسف - "پھر کیا بات ہے؟"

مرزا جی - "ذرا عمر کا معاملہ ہے"

یوسف - "اوہو ۔ عمر زیادہ ہے"

مرزا جی - "نہیں جی، ذرا کمسن ہیں"

یوسف - "کیا عمر ہوگی؟"

مرزا جی - "یہی کوئی بارہ سال"

یوسف - "یہ کہیے! بالکل بچّہ ہیں"

مرزا جی - "اس بچپن سے بڑی بے لطفی ہو رہی ہے گھر میں ماما کے سوا کوئی ہے نہیں۔ گھرداری کی مشکل نہ ہوتی تو"

یوسف "اجی گھرداری نہ سہی: بڑھاپے میں جوانی کا مزہ تو آ رہا ہے۔ اچھا اب بندہ اجازت چاہتا ہے"

مرزا جی "میں بھی دفتر جانے کی تیاری کرتا ہوں"

—۔(۲)۔—

وقفہ ——— مرزا جی زنانہ میں جا کر بیوی سے بات چیت کرتے ہیں۔

مرزا جی - "بیگم! کیا ہو رہا ہے؟"

[1] نہایت افسوس کیساتھ اطلاع دی جاتی ہے کہ مولانا سید ظہور احمد صاحب وحشی [illegible] انا للہ وانا الیہ راجعون

بیوی۔ "ہم نے تم سے کہدیا ہے کہ ہمیں بیگم نہ کہا کرو۔ بیگم تو ہماری اماں جان کو کہتے ہیں۔ ہر وقت بیگم بیگم۔"

مرزا جی۔ "پھر کیا کہا کریں؟"

بیوی۔ ابا جان مجھے "ننھی" کہتے ہیں۔ یہی تم کہا کرو"

مرزا جی۔ "اچھا بی ننھی! میرے کپڑے نکال لئے"

بیوی۔ "کپڑے کس طرح نکالتی۔ قفل کھول رہی تھی کنجی پھنس کر ٹوٹ گئی"

مرزا جی۔ "یہ کیا غضب ہوا۔ خیر کھانا تو لاؤ، دفتر کو دیر ہو رہی ہے"

بیوی۔ "کھانا ابھی کہاں پکا۔ صبح سے تو ماما گئی ہوئی ہے"

مرزا جی۔ "کہاں گئی ہے؟"

بیوی۔ "لو، انہیں خبر ہی نہیں۔ آج شام کو میری گڑیا کی برات ہے۔ میں نے اُسے آپا جمیلہ کے پاس بھیجا ہے۔"

مرزا جی۔ "اب میں دفتر کیونکر جاؤں؟"

بیوی۔ "روز تو جاتے ہو۔ آج نہ جاؤ"

مرزا جی۔ "کیسے نہ جاؤں، نوکری نہ جاتی رہیگی؟"

(کلاک کی آواز آتی ہے)

مرزا جی۔ "لو دس بج گئے (کاغذات کا بستہ سنبھالتے ہوئے) یہ بستہ کس نے کھولا۔ یہ کاغذ کس نے الٹ پلٹ کئے؟"

بیوی۔ "بستہ میں نے کھولا تھا۔ مجھے گڈے کی ٹوپی کے لئے کاغذ چاہیے تھا"

مرزا جی۔ "ہائے ہائے۔ تم نے یہ کیا غضب کیا۔ ارے مسل کا کاغذ لے لیا۔ صاحب کے ہاتھ کا لکھا ہوا فیصلہ۔ یا اللہ ۔۔۔ اب میں کیا کروں ۔۔۔ بس اب نوکری گئی ۔۔۔"

بیوی۔ "اجی ذرا سا کاغذ لے لینے پر اتنا بگڑتے کیوں ہو۔ تم تو کہتے ہو میں یہ لادونگا۔ میں وہ لادونگا"

مرزا جی۔ (چلا کر) "تمہیں کچھ خبر ہے۔ تم نے کیا غضب کیا۔ مجھے تباہ کر دیا"

بیوی۔ "ان کا ذرا سا کاغذ لے لیا تو یہ تباہ ہو گئے میں نے تو ٹوپی میں لگا دیا، نہیں ابھی اٹھا کر پھینک دیتی"

مرزا جی۔ (جھلا کر) "بے وقوف، تجھے کیا معلوم، یہ کاغذ کتنا قیمتی تھا"

بیوی۔ "ایسے ان کے کاغذ میں موتی ٹکے تھے۔ (بھرائی آواز میں) تم ہر وقت مجھے دھمکاتے ہو۔ میں نہیں رہتی تمہارے گھر میں۔ مجھے اماں کے پاس پہنچا دو (رونے کی آواز میں) ارے میری اماں ۔۔۔ ارے میری اماں ۔۔۔ ارے میری اماں۔

(روتی ہے)

مرزا جی۔ "کس مصیبت میں جان ہے۔ ادھر نوکری کے لالے پڑے ہیں۔ اُدھر بیوی جاتی ہے۔ (بیوی سے) چلو جانے دو۔ اب میں کچھ نہیں کہونگا"

کب ہے تمہاری گڑیا کا بیاہ ۔۔۔ بھئی ہم قاضی بنیں گے"

بیوی۔ (ہچکیاں لیتے ہوئے) نہیں مجھے گھر پہنچا دو"

مرزا جی - (چمکارتے ہوئے) بس اب وُہ نہیں
انہیں باجا سُنائیں - کون سا ریکارڈ سُنو گی؟"
بیوی - "(آواز صاف کرتے ہوئے) وہی - ریکارڈ بجاؤ
بالا جوبنوا" ــــ میں بجاؤنگی - مجھے دو"
مرزا جی - "تم سے باجا بگڑ جائیگا - میں بجاتا ہوں"
بیوی "تو میں نہیں سُنتی"
مرزا جی - "خفا نہ ہو - لو تم ہی بجاؤ"
(آدھا ریکارڈ بجکر کمانی ٹوٹ جاتی ہے)
مرزا جی - "باجا ٹوٹ گیا نا؟"
بیوی - "میں تو الگ بیٹھی ہوں"
مرزا جی - "پھر کیا میں نے توڑ دیا"
بیوی - "میں بتاؤں - یہ عورت جو باجے میں گا رہی ہے، یہ اس کی شرارت ہے"
مرزا جی - (خوب ہنسکر) خوب کہی - اچھا ماما تو اب تک نہیں آئی - کھانا تو پکاؤ"
بیوی - "کھانا پکانا تو میں جانتی نہیں - کہو تو پوریاں تل دوں"
مرزا جی - "پوریاں ہی سہی"
بیوی - "تم کڑھائی مانجھ کے اور آگ جلا کے مجھے آواز دے لینا - جب تک میں گڑیا کو زیور پہناتی ہوں"
مرزا جی چند قدم چلتے ہیں یعنی باورچیخانے میں جاتے ہیں - پھر آگ پھونکتے ہیں -
مرزا جی - (آگ پھونکتے ہوئے) آگ جلانا بھی بڑا مشکل کام ہے - مٹی کا تیل چھڑک کر جلاؤں"

ــــ(۳)ــــ

دستک ــــ مرزا جی ــــ مرزا جی صاحب
مرزا جی - "کون ہے بھائی - آتا ہوں"
وقفہ ــــ
مرزا جی - "تم ہو، میاں یوسف! خیر تو ہے - کیسے آئے"
یوسف - "میں تو دفتر گیا تھا، معلوم ہوا آج آپ گھر سے نکلے ہی نہیں"
مرزا جی - "ہاں میں نے آج چھٹی لے لی ہے"
یوسف - "نئی شادی کے یہی مزے ہیں" (چونک کر) ارے یہ آپ کی داڑھی کو کیا ہوا - آدھی رہ گئی"
مرزا جی - (ٹھنڈا سانس لیکر) کیا پوچھتے ہو - ماما تو جا کر مر رہی - بیگم صاحب کو آگ جلانی نہیں آتی - چولہا پھونک رہا تھا - شعلہ بھڑکا - مُنہ جُھلس گیا - کچھ داڑھی بھی جل گئی"
یوسف - چلو اچھا ہوا - دس سال عمر کم ہو گئی"
مرزا جی - میاں یوسف! بوڑھوں کو جوان بنانے والی دواؤں کے تو بہت اشتہار دیکھے - کوئی ایسی دوا بھی ہے کہ بچے جلدی سے جوان ہو جائیں"
یوسف - "دوا ہو گی ضرور - کسی ڈاکٹر سے پوچھنا چاہیے - بھلانوے کا تیل مل کر دھوپ دینے سے بھی بہت فائدہ ہوتا ہے"
مرزا جی - "بھئی! میں تو پریشان ہو گیا - دیکھو اب تک کھانا نصیب نہیں ہوا"
یوسف - "میرے خیال میں تو آپ دس برس کیلئے انہیں میکے بھیج دیں - جب خوب جوان ہو جائیں بُلا لیں"
مرزا جی - "اچھی صلاح دی - اور دس برس میں میرا کیا حال ہو گا"؟
یوسف - "اچھا میں اسلئے آیا تھا کہ آج شام کو سینما

ضرور چلنا ہے۔ آپ تیار رہیں "

مرزاجی۔" آج تو مشکل ہے "

یوسف۔" مشکل وشکل کچھ نہیں۔ بس تیار رہنا"

مرزاجی۔" خیر تم آنا! ہو سکا تو چلونگا"

یوسف۔" بہتر ہے۔ آداب عرض"

——(۴)——

وقفہ——مرزاجی زنانہ میں آتے ہیں۔

مرزاجی۔" اچھا۔ تم کیواڑ کی آڑ میں کھڑی تھیں؟"

بیوی۔" میں بھی سنیما چلونگی "

مرزاجی۔" کون جاتا ہے؟"

بیوی۔" کوئی جائے یا نہ جائے۔ میں جاؤنگی "

مرزاجی۔" بری بات ہے۔ بے پردگی ہوگی۔ لوگ ہنسیں گے"

بیوی۔" میں نہیں جانتی۔ میں تمہارے ساتھ چلونگی"

مرزاجی۔" لوگ میرا مذاق اڑائیں گے"

بیوی۔" مذاق کی کیا بات ہے؟"

مرزاجی۔" کہیں گے، لو صاحب۔ بیوی کو بازار میں لئے پھرتے ہیں"

بیوی۔" تو بیوی بتانا ہی کیوں، کہدینا میری بیٹی ہے"

مرزاجی۔ (ہنسکر) اچھی تدبیر بتائی۔ اچھا اب تم پوریاں تلو۔ میں ذرا نہا لوں"

بیوی۔" اچھی بات ہے۔ دیکھو سنیما ضرور چلنا"

مرزاجی۔" ہاں ہاں چلنا"

وقفہ——

بیوی کی آواز—— ارے میں مری —— میں چلی۔ اماں —— میری اماں —— اباجان۔ —— چلنا —— ارے جلدی آنا۔

مرزا صاحب (غسل خانہ سے نکل کر) کیا ہوا۔ —— ارے آگ لگ گئی ——

مدد —— مدد —— بجھاؤ —— بجھاؤ ——

سید ظہور احمد وحشی

گہوارۂ فطرت

تدبیر سے کچھ کام نہیں چلتا ہے،
تقدیر کے سانچے میں عمل ڈھلتا ہے
رونے کی جزا کہیں ہے ہنسنے کی سزا
گہوارۂ فطرت میں بشر پلتا ہے

چشم و گوش

نافہموں کو عقل و ہوش تو دیتا ہے
افسردہ دلوں میں جوش تو دیتا ہے،
چشم بینا و گوش شنوا مل جاتے
یارب مرے چشم و گوش تو دیتا ہے

آغا سروش

جوشیلا ریفارمر

(از مرزا احمد عسکری صاحب بی - اے)

سید نظام الدین احمد لکھنؤ یونیورسٹی کے ایم - اے - مولوی سید فریدالدین احمد ریٹائرڈ جج کے اکلوتے بیٹے تھے - ایم - اے فلاسفی میں پاس کیا تھا - نہایت تغیر پسند - ضدّی اور جھکّی آدمی تھے، ضد باپ سے اور جھک ماں سے ورثے میں پائی تھی، اور غصّہ اپنی ذاتی ملکیت تھا - فلسفہ اور معاشیات کے علاوہ ان کو معاشرتی اصلاحوں کی دھن تھی، وہ اس میں دن رات منہمک رہتے تھے۔ مسلم لیگی تھے - لیکن عمل کے قائل تھے - اُن کا قول تھا العمل العمل - آج کل کے نام نہاد لیڈروں پر جو صرف شرکتِ جلسہ اور اسپیچ بازی کو مقصد اصلی سمجھتے ہیں - وہ کبھی ہنستے کبھی غصّہ میں صلواتیں سُناتے - معاشرتی اصلاحوں میں اُنہوں نے اتحاد جنسی یعنی ازدواج کو اپنا خاص دائرۂ عمل منتخب کر لیا تھا - جس میں عورت کی اصلاح اور سدھار کے متعلق جو کچھ ہو سکتا ہے اور کیا جا سکتا ہے، وہ سب اُن کے پیشِ نظر بلکہ اُن کے پروگرام میں داخل تھا - مثلاً عورتوں کی اعلیٰ تعلیم، اُن کی آزادی، پردے سے ان کی رہائی - اُن کی جائداد کی حفاظت اُن کا عقد ثانی بحالت بیوگی - شادی بیاہ کی فضول رسموں کی اصلاح وغیرہ - مگر جس چیز کو اُنہوں نے خاص طور پر چنا تھا وہ بڑھاپے کی شادی (یعنی بڈھے اور کمسن عورت کا جوڑ بنا بیمن) تھی - اس کو وہ کبھی نہیں برداشت کر سکتے - جب کبھی وہ اس قسم کا واقعہ کسی اخبار میں دیکھتے، اُن کی بھوک پیاس جاتی رہتی، اُس دن وہ فاقہ کرتے۔ بات چیت ترک کر دیتے - غصّے میں چپکے چپکے بڑبڑاتے، دانت پیستے اور آخر جب غصّہ کا اتار ہوتا اور اُنکے حواس درست ہوتے تو جھٹ کسی اخبار یا رسالے کے واسطے ایک مضمون لکھ ڈالتے - خواہ انگریزی میں یا اردو یا ہندی میں، کیونکہ اس معاملے میں اُن کے نزدیک ہندو مسلمان سب یکساں تھے اور سب کو وہ ایک نظر سے دیکھتے تھے -

اس قسم کے مضامین پہلے تو بڑی قدر کی نگاہ سے دیکھے گئے - اخبار اور رسالے والوں نے اُن کو ہاتھوں ہاتھ لیا - اور خوشی خوشی چھاپا - مگر جب مضامین کی تیزی حد سے بڑھ گئی اور گالی گلوج کی نوبت پہنچی تو ایسے مضامین شکریہ کے ساتھ واپس کر دیے جاتے، جس پر وہ سخت برہم ہوتے - ایڈیٹروں کو بکجگ (؟) سُناتے اور کہتے کہ واللہ انہیں لوگوں کے دل و دماغ پر خدا نے پردہ ڈالا ہے - اور انہیں کی آنکھوں اور کانوں میں

ڈھیٹیاں لگا دی ہیں۔ کیونکہ ان کمبختوں کو خود لکھنا تو درکنار اتنی بھی توفیق اور ہمت نہیں ہوتی کہ سچی باتیں اپنے اخبار میں درج کریں۔ لعنت ہے ایسے اخباروں پر۔

معاشرتی اصلاحات اور مضمون نگاری کے علاوہ نظام کو فلسفۂ مذاہب کے مطالع سے بھی شوق تھا۔ علی الخصوص فلسفۂ اسلام سے۔ مولوی اکرام علی فیض آبادی جو عربی کے طالبعلم اور صوم وصلوٰۃ کے بڑے پابند تھے۔ نظام کے دلی بے تکلف دوست تھے، مگر ان دونوں میں کبھی بنتی نہ تھی۔ کیونکہ اکرام ارکان اسلام کے دلدادہ تھے۔ اور نظام فلسفۂ اسلام کے شیدا۔ اکرام پنج وقتہ نماز کے عادی، اور نظام نماز کو بیکار کی اٹھا بیٹھی سمجھتے تھے۔ اکرام نظام کو فرد ملحد کہتے، اور وہ ان کو جاہل و مفسد۔ وہ ان کو مخاطب کرکے کہتے

حالِ دُنیا سے بے خبر ہیں آپ چاہِ زمزم کے آپ مینڈک ہیں

اور یہ جواب دیتے۔

ہے تمہاری نمود بس اتنی، جس طرح ہو پڑی پہ لید،

غرضکہ اس قسم کی نوکھا جھونکی ان دونوں میں چلی جاتی۔ مگر دوستی پر کچھ اثر نہ پڑتا۔

ایک مرتبہ یہ دونوں دوست فیض آباد سے ریل پر ساتھ آ رہے تھے۔ راستے میں اسی قسم کی پُرمذاق جلی کٹی باتیں ہوتی جاتی تھیں۔ دوسرے مسافر ہنستے تھے، اور بعض نظام کی بے دھڑک گفتگو سے کان کھڑے کرتے تھے کہ بارہ بنکی کا اسٹیشن آ پہنچا۔ سوائے ان دونوں کے اور سب لوگ وہیں اتر گئے، اور سکنڈ کلاس کا ڈبہ خالی ہو گیا۔ اکرام نے نظام سے ہنس کر کہا کہ خدا کا شکر تمہاری ملحدانہ باتوں سے تھوڑی دیر کے لئے تو نجات ملی۔ کیونکہ تمہاری یہ فضول باتیں تو صرف لوگوں کو ہنسانے اور تعجب میں ڈالنے اور آخر میں اُن سے خراج تحسین حاصل کرنے کے لئے ہوتی ہیں۔ اب تمہارا کوئی داد دینے والا تو رہا نہیں۔ لہٰذا سوائے خاموشی کے اور کیا کرو گے۔ اتنے میں آخری گھنٹی بجی، خیال ہوا کہ اب کوئی نہیں آنے کا۔ مگر فوراً دروازہ زور سے کھلا اور ایک معزز آدمی بوڑھے سفید داڑھی میں شکاری کپڑے پہنے داخل ہوئے۔ دو قلیوں نے دو بڑے بڑے قیمتی بکس اور بچھونے اور تین چار ہرن کی کھالیں اور بہت سی مُرغابیاں قرینے سے ڈبے میں رکھ دیں۔ آخر میں ایک حسین کمسن لڑکی عمر تخمیناً سولہ سال انگریزی فراک اور ہندوستانی دوپٹہ پہنے اندر آئی۔ ان بزرگ نے اُس سے پُوچھا کہ سب چیزیں آ گئیں۔ لڑکی نے جواب دیا۔ جی ہاں۔ قلی باہر گئے اور اپنی مزدوری لیکر رخصت ہوئے۔ ریل روانہ ہوئی۔

اکرام ان نوواردوں کو ذرا غور سے دیکھنے لگے۔ مگر نظام کچھ ایسے افسردہ اور پریشان ہو گئے کہ بنچ پر لمبے لمبے لیٹ گئے اور ایک اخبار سے منہ چھپا لیا۔ تھوڑے عرصے تک خاموشی رہی۔ بالآخر نظام نے اسی طرح

لیٹے لیٹے اور اخبار میں مُنہ چھپائے یہ خبر چلّا کر سُنائی گویا اخبار سے دیکھ کے پڑھ رہے ہیں:۔

"اعظم گڈھ میں سنسنی خیز واقعہ"

بڑھاپے کی شادی کا بُرا نتیجہ

"ایک بڈھا زمیندار عمر تخمیناً ستر سال اپنی قوم کی ایک کمسن حسین لڑکی سے شادی کرنے پر آمادہ ہوا۔ لڑکی کے باپ کو کچھ دے دلا کے راضی کیا۔ جب برات لے کے بیاہنے گیا۔ تو لڑکی کی ماں نے اُس کو دیکھا اور اپنے عزیزوں سے بلا کے کہا کہ اس کھوسٹ سے کہو کہ ابھی ہمارے گھر سے چلا جائے۔ براتی یہ سُن کر بہت بگڑے، لڑائی پر آمادہ ہوئے۔ دو چار کے سر پھٹے، آخر پولیس نے آکر بیچ بچاؤ کیا اور معاملہ رفع دفع ہوا"

یہ خبر سُنا کر نظام جو اب تک مٹ پٹے تھے، جلدی سے اُٹھ بیٹھے اور کھڑکی کے باہر کئی دفعہ زور زور سے تھوکا۔ پھر اکرام سے مخاطب ہو کر بولے "دیکھتے ہو یہ کانگریسی اور لیگی لیڈر کیا کان میں تیل ڈالے بیٹھے ہیں یہ شرمناک واقعات دن دھاڑے ہوتے رہتے ہیں اور ان کے کانوں پر جُوں تک نہیں رینگتی۔ اب مجھکو اس سیاسی اکھاڑے میں اُترنے دو، تب میں ان سب کو مزا چکھاؤنگا" یہ کہہ کر بوڑھے آدمی کی طرف جھکے اور کہا "کیوں جناب آپ کے گوشِ مبارک میں یہ فرحتناک خبر پہنچی یا نہیں۔

(پھر لاحول ولاقوۃ کہہ کے چپکے سے کہا میں یہ کس سے آپ آپ کر رہا ہوں،)

"ارے بڑے میاں! تم نے بھی کچھ سُنا یا نہیں؟ تم کیا سنوگے، تمہارے کانوں میں تو شیطانی ٹھیٹیاں گھسی ہوئی ہیں۔ تم سب رنگے سیار ہو۔ تم سب پر خدائی مار ہے۔ تم ہو یا وہ مردود زمیندار یا ہندوستان کی چالیس کروڑ آبادی میں تمہارا ایسا کوئی نابکار۔ یہ سب بے حیائی کی ایک کشتی پر سوار ہیں۔ خدا کرے تمہاری کشتی بیچ منجدھار میں ڈوب جائے، اور تم سب اُسی دریا میں غرق ہو جاؤ۔ غارت ہو جاؤ۔ تمہارا ستیاناس جائے۔ تب میرا دل ٹھنڈا ہو۔ ارے بڈھو! کمسن عورتوں کے پھسلانے والو۔ اپنے روپے کے بل پر ان بیچاریوں کی عصمت و عزت کے لُوٹنے والو! تم کو خدا کا بھی کچھ ڈر ہے؟ تم کو اپنی عقبیٰ یا دوسرے جنم کا بھی کچھ خیال ہے۔ تم کو اس کا بھی کچھ خیال ہے کہ دنیا تھوڑے دن کی ہے۔ آخر مرنا ہے۔ جب مروگے اور جہنم کے آخری طبقے میں پہنچوگے تو تمہاری مصیبت زدہ جوان بیوی کیا کرے گی۔ اُس کا کیا حشر ہوگا۔ سوچو تو وہ تم کو کوستی، بددعائیں دیتی ہوگی۔ جس طرح تم نے اپنی ہوسناکی سے اُس کی زندگی خراب کی، خدا تم کو بھی

خراب کرے، یہ تمہاری داڑھی ہے کہ شکار کی ٹٹی، اس کی آڑ میں تم اپنے شیطانی شکار کھیلتے رہتے ہو۔ بیٹھو بچہ مجھکو کونسل میں ذرا آنے دو، اور انشاء اللہ جلد آتا ہوں۔ پھر تم کو کیسا مزا چکھاتا ہوں۔ میرا سب سے پہلا ریزولیوشن یہ ہوگا کہ " تم سب ایسے بڈھے جو جوان عورتوں کو ملیا میل کرتے ہیں جزیرہ نمبر بھیج دیئے جائیں یا سمندر میں ڈبو دیئے جائیں۔ یا ہٹلر کے پاس ایک بڑے پنجڑے میں بند کر کے روانہ کئے جائیں، جس پر بڑے بڑے حرفوں میں لکھا ہو کہ یہ سب واجب القتل ہیں۔ اگر بادشاہی کا زمانہ ہوتا تو سب کی کھال کھنچوائی جاتی، یا جلتے تیل میں اُبلے جاتے یا ــــــــ"

یہ تقریر ہو رہی تھی، نظام کے مُنہ سے غصّے کے مارے کف جاری تھا کہ لکھنؤ اسٹیشن آپہنچا۔ ریل کی رفتار کم ہوئی۔ بڑے میاں نے لڑکی سے کہا کہ اسباب ٹھیک کرو، اور نظام سے ہنس کے کہا "جناب کا اسم شریف کیا ہے اس سے تو مطلع کیجیے۔" نظام نے اُسی لہجہ میں کہا میرا نام نظام الدین احمد اور اگر ضرورت ہو تو میرے باپ کا نام خواجہ سید فریدالدین احمد ہے۔ اگر کوئی نوٹس وغیرہ دینے کا ارادہ ہو تو غریب خانہ رکاب گنج میں ہے۔ بسم اللہ ضرور ازالہ حیثیت عرفی کا دعویٰ دائر کیجیے۔ اتنے میں اسٹیشن آگیا، قلی قلی کی آوازیں آنے لگیں۔ بڑے میاں اور لڑکی پہلے اُترے، پھر اکرام و نظام اپنا اسباب ایک قلی کو دے کر گاڑی کے باہر آئے اور تھوڑی دیر میں نظروں سے غائب ہوگئے۔

ایک ہفتہ بعد نظام کو ایک خط مونوگرام دار بڑے لفافہ میں ملا، جس کا یہ مضمون تھا:-

ریڈیچی روڈ۔ لکھنؤ

" مائی ڈیر نظام صاحب! میں ممنون ہونگا اگر آپ کل ٹھیک چار بجے سہ پہر کو میرے ساتھ غریب خانہ پر چائے پیجیے۔ مجھکو آپ سے بڑھاپے کی شادی کی خرابیوں کے متعلق کچھ ضروری باتیں دریافت کرنی ہیں، اس کی انسداد کا ایک بِل کاؤنسل میں پیش کرنے والا ہوں۔ والسلام۔"

آپ کا مخلص

محمد کفایت اللہ بیرسٹر ایٹ لا۔ ایم۔ ایل۔ اے

اس خط نے نظام پر عجب اثر کیا۔ خوشی کے مارے باچھیں کھل گئیں۔ دل میں کہنے لگے، خدا کا شکر ہے میری محنت ٹھکانے لگی۔ میرے دن پھرے، اب کاؤنسل کی ممبری کہاں گئی ہے، اب لوگوں کو میری لیاقت کی قدر ہوئی وغیرہ۔

[illegible]

اُن کو پُرتکلف ڈرائنگ روم میں بٹھایا۔ تھوڑے وقفے کے بعد ایک دروازے سے بیرسٹر صاحب تشریف لائے۔ نظام کیا دیکھتے ہیں کہ یہ تو وہی ہیں جن سے ریل پر ملاقات ہوئی تھی، غصّے کے مارے تھرتھرانے لگے، اُٹھ کھڑے ہوئے اور کہا کہ "یہاں بھی اپنی منحوس صورت دکھلائی۔ اور فریب سے مجھے بلایا، آپ سب فریبی ہو، میں تمہارے فریب میں کب آتا ہوں"۔ یہ کہہ کر فوراً چل کھڑے ہوئے۔ زینے پر اُتر رہے تھے کہ آواز آئی "نظام الدین ٹھیرو"۔ یہ کب پرواہ کرتے ہیں، پھر آواز آئی "ارے نظام ٹھیر میری ایک بات سُن"۔ نظام ٹھیر گئے، دیکھتے کیا ہیں کہ اُن کے والد بزرگوار خواجہ صاحب آ رہے ہیں، اور جلدی جلدی آ رہے ہیں۔ نظام اپنے والد کا بہت ادب کرتے تھے۔ جھک کر سلام کر کے بولے حضور یہاں کہاں، انہوں نے جواب دیا "ارے بھئی بیرسٹر صاحب میرے پرانے دوست ہیں، انہوں نے مجھکو کل خط لکھ کر بلایا کہ چلے آؤ۔ میں نے نظام کو بھی چائے پر بلایا ہے۔ غرض یہ ہے کہ میں اپنی بیٹی آمنہ سلطان کی اُس سے شادی کرنا چاہتا ہوں، وہ اُس کو میرے ساتھ ریل پر دیکھ چکا ہے، بلکہ ہم دونوں شکار سے واپس ہو کر بارہ بنکی سے لکھنو آ رہے تھے۔ تو نظام سے مجھ سے راہ میں بڑی مزے کی باتیں رہیں، میں بہت خوش ہوا۔ جوشیلا جوان ہے، شادی سے انشاء اللہ سُدھر جائیگا۔"

نظام اب کیا جواب دیتے، چپ رہے۔ حیرت اور شرمندگی کی مجسّم تصویر تھے۔ خواجہ صاحب نے کہا "لڑکی میری دیکھی ہوئی ہے، بہت قبول صورت سعید اور تمہاری مرضی کے مطابق آزاد خیال ہے، تمہارا اُس کا جوڑ ہے، کہو راضی ہونا؟ میں اُن کو کیا جواب دوں"؟ نظام نے مختصر کہا "میں ہر طرح تابع فرمان ہوں"۔ یہ کہہ کر اپنا پیچھا چھڑایا۔ اور باپ سے رخصت ہوئے۔ راستے میں پسینے پسینے تھے، اور چپکے چپکے لاحول و استغفار پڑھتے جاتے تھے۔

پورے آٹھ دن بعد سیّد نظام الدین احمد ایم اے۔ سابق حقوق نسوان اور مس آمنہ سلطانہ کی شادی خانہ آبادی بڑی دھوم دھام سے ہوئی۔ دعوتِ ولیمہ میں شہر کے سب بڑے بڑے لوگ جمع تھے اور مبارکبادیں دیتے تھے۔

مولوی اکرام علی فیض آبادی، نظام کے دوست بہت اچھلے کودتے پھرتے اور قدرتِ خدا کے اس نمونے کو عجب حیرت اور مسرت کی نگاہ سے دیکھتے تھے،

اب نظام میں حقوقِ نسوان کی حمایت کا وہ جوش و خروش بہت کم ہو گیا۔

مرزا محمد عسکری بی۔ اے

لمحۂ سرشاری

(از حضرت فیض جھنجھانوی)

بنیادِ ازل تاسیسِ ابد آغازِ قدح خواری ہے مرا
اے خضر! تری عمرِ باقی اک "لمحۂ سرشاری" ہے مرا

وہ لمحۂ سرشاری جس میں یوں تکملۂ دل ہوتا ہے
ساقیِ فطرت، صہبا جلوے، ساغر مۂ کامل ہوتا ہے

سرِ حق باطل بھی جس پر بنیادِ حقیقت رکھتی ہے
گم گشتۂ منزل بھی جس میں خضرِ رہِ منزل ہوتا ہے

ہر شورشِ رستاخیز سکوں آموزِ حوادث ہوتی ہے
گرداب سے کشتی بنتی ہے، طوفان میں ساحل ہوتا ہے

اک نازسی انگڑائی لیکر دوشیزۂ فطرت اٹھتی ہے
ہر دیدۂ نرگس حیرت سے آئینۂ محفل ہوتا ہے

ہر نجمِ سحر آئینۂ گل، ہر عارضِ گل قندیلِ چمن
ہر رشحۂ شبنم بارش ہے، ہر قطرۂ مے دل ہوتا ہے

دامانِ خرد پر پڑتی ہے لہرا کے نگاہِ دستِ جنوں
وہ دستِ جنوں جسکی زد میں ہر پردۂ محمل ہوتا ہے

خمخانۂ ہستی کو جس نے مجبورِ تنگ ظرفی پایا
اک "جامِ سفال" اس بادۂ سرکش کا متحمل ہوتا ہے

اک جرعۂ مے رنگیں جسکو موجِ نگہِ غم ہوتی ہے
اک گردِ رہِ مستی جس میں فرقِ حق و باطل ہوتا ہے

اک سازِ فراموشی جس پر روحِ مہ و انجم گاتی ہے
اک نغمۂ مدہوشی جو دلِ کونین پہ نازل ہوتا ہے

ٹوٹا نہ طلسمِ عقل و خرد، سرچشمۂ ہشیاری نہ ملا
وہ عمر ہی عمرِ خشک جسے اک لمحۂ سرشاری نہ ملا

وہ لمحۂ سرشاری جس میں ہر ذرہ حسیں ہو جاتا ہے
اسرارِ مشیت کھلتے ہیں ہر وہم یقیں ہو جاتا ہے

ہر شاخِ گلستاں پر نازل پھولوں کے صحیفے ہوتے ہیں
ہر غنچۂ دل افروز جوابِ خلدِ بریں ہو جاتا ہے

ہر لمحہ ربابِ مستی پر گاتا ہے سرودِ صبحِ ازل
ہر ذرہ نہا کر جلووں میں خورشید جبیں ہو جاتا ہے

ہر دیدہ سرخوش ہوتا ہے سرگرم تقاضائے ارنی
ہر جلوہ رقصاں جز و نگاہِ طور نشیں ہو جاتا ہے

داغِ جگر ہر سوختہ جاں بنتا ہے چراغِ دیر و حرم
تیرِ نگہۂ دل دوز شعاعِ ماہِ مبیں ہو جاتا ہے

ہر آئینۂ دل ہوتا ہے تصویر کشِ تسلیم و رضا
ہر جلوہ دور افتادہ رگِ جاں سے قریں ہو جاتا ہے

ہر نالۂ حسرت ہوتا ہے آوازِ شگفتِ غنچۂ دل
ہر ناوکِ خوں آشام سکونِ قلبِ حزیں ہو جاتا ہے

صبح آئینۂ شبنم لیکر جب آتی ہے پئے تزئینِ چمن
لبریزِ شرابِ لالہ و گل مینائے زمیں ہو جاتا ہے

میزانِ خودی میں تلتا ہے سو رنگ سے اک دل کا موتی
معمورۂ ہستی ایک نظر میں زیرِ نگیں ہو جاتا ہے

تکمیلِ نظر معراجِ خودی، توفیق گنہگاری کیلئے
سجدے میں ہے روحِ کون و مکاں اک لمحۂ سرشاری کیلئے

وہ لمحۂ سرشاری جو شہیدِ غمزۂ رسمِ عام نہیں،
محتاجِ سبو، شرمندۂ مینا، سجدہ گزارِ جام نہیں

وہ منظرِ رومانی جس پر اٹھتی ہے بنائے حسن و جمال
وہ لہجۂ حیرانی جس میں اثبات ہے استفہام نہیں

وہ میکدۂ رنگیں جس کا ہر دورِ گردش پیمانۂ دل
مخمورِ شرابِ خاص تو ہے محرومِ صلائے عام نہیں

وہ جذبۂ آزادی جو فضائے میکدۂ رنگ و بو میں
صیادِ مہ و انجم تو ہے لیکن طائرِ زیرِ دام نہیں

وہ سجدۂ روحانی جس کا نقشِ نظر افروزِ دو جہاں
محدودِ جبینِ دیر و حرم پابستۂ صبح و شام نہیں

وہ حاصلِ کون و مکاں جسکو از روئے حدیثِ پیرِ مغاں
پیکانِ شعاعِ برقِ اجل بیش از نگہۂ ناکام نہیں

وہ دورِ مئے رنگیں جس کا از صبحِ ازل تا شامِ ابد
بالفرض اگر آغاز ہے بالتحقیق کوئی انجام نہیں

وہ جلوہ گہِ تقصیر جہاں عمامۂ حضرتِ شیخ تو کیا
سو دامنِ یوسف بھی ہوں تو ہرگز قیمتِ یک الزام نہیں

وہ منزلِ مختاری جس میں ہر ذرہ گردِ راہِ خودی
نورِ نگہِ تقدیر تو ہے پامالِ غمِ ایام نہیں

کیوں ملتجی خوابِ ابدی ہوں عشرتِ بیداری کے عوض
میں مر کے بھی عمرِ خضر نہ لوں اک لمحۂ سرشاری کے عوض

فیضؔ جھنجھانوی

مسجدِ جامع دہلی

(از حضرت ادیب نوگانوی)

یہ وہ مسجد ہے رفعت کا کمال آغاز ہے جس کا
یہی تعمیر ہے وہ، دلنشیں انداز ہے جس کا

نظیرِ بیت کعبہ درسگاہِ پاک قرآں کی
شبیہ مسجدِ اقصیٰ امانتدار ایماں کی

یہی مسجد ہے رہ سکتی ہیں ایمان جس کی بُنیادیں
ہوئی ہیں اُٹھتی رفعت پہ قائم اسکی بُنیادیں

یہ سنگِ احمرِ گلرنگ کی رنگیں منار اس کے
یہ سنگِ مرمرِ ابیض کے گنبدِ آبدار اس کے

گماں یہ ہو رہا ہے دیکھ کر اُونچے مناروں کو
کہ گویا حورِ جنّت ہاتھ اُٹھائے ہیں دعاؤں کو

کہ اس صورت کا سنگِ سُرخ سے تعمیر کا منظر
شفق کی رہ گئی ہوں سُرخیاں جس طرح پتھرا کر

کلیمِ طورِ سینا دیکھ جائے نُور کے جلوے
کہ ہر ذرّہ میں ہیں اس سرزمیں کی طور کے جلوے

یہ وہ گھر ہے جہاں لاتقنطوا کے باب کھُلتے ہیں
گناہوں کے غبار آلود رُخ اشکوں سی دُھلتے ہیں

گذر پاتا ہی اس عتبہ پہ جب شاہنشہِ خاور
جُھکا دیتا ہے سر اپنا زبہرِ سجدۂ داور

شہنشاہوں کی سر جُھکتے ہیں اس سرکار کے آگے
یہیں جُھکتے ہیں آکر قہرماں قہّار کے آگے۔

اُٹھاتے ہیں یہیں سی حق کے بندے پاک تکبیریں
یہیں آکر ہلاتے ہیں الُوہیت کی زنجیریں

ہوا کرتی ہے نبضِ سرکشی بے کیف اسی در پر
یہیں معبُود کے آگے جُھکا کرتے ہیں لاکھوں سر

شہنشاہی یہیں ہم رُتبۂ مزدُور ہوتی ہے
کھڑے ہونے کو ساتھ افلاس کی مجبُور ہوتی ہے

بجز کعبہ کوئی گھر اس سی برتر ہو نہیں سکتا
خدا کا گھر زمیں پر اس سی بہتر ہو نہیں سکتا

سہیں گو اس نے لاکھوں گردشاتِ روزگار اب تک
مگر تھی جیسے پہلے ہی یونہی عالی وقار اب تک

بجا ہے کہیے گر شاہجہاں کی یادگار اس کو
روا ہے مانئے یزدانیت کا اک حصار اس کو

اگر مجبُورِ گردش ہم کبھی دہلی سی جائیں گے
کہیں اور اے ادیب اس شان کی مسجد نہ پائیں گے

ادیب نوگانوی

اعلانِ محبت

(از حضرت ازہر قدوائی)

"مجھے تم سے محبت ہو گئی ہے"

قسم کھاتا ہوں میں ان ابروؤں کی — تمہارے کالے کالے گیسوؤں کی
قسم نظروں کی جو مجھ تک نہ آئیں — نہ آئیں اور مرے دل میں سمائیں
تبسم کی، جو ہونٹھوں پر مچل جائے — نگہ کی، جو گھڑی بھر میں بدل جائے
قسم دل کی جو اشکوں میں بہایا — قسم اس مدعا کی جو نہ پایا
قسم کھاتا ہوں اس دردِ جگر کی — قسم کھاتا ہوں آہِ بے اثر کی
قسم اس آہ کی جو دل سے نکلے — تمنا کی بھری محفل سے نکلے
قسم ترسے ہوئے ذوقِ نظر کی — قسم حسرت بھری اس چشمِ تر کی
قسم وعدوں کی جو تم توڑ ڈالو — کروں شکوہ تو بس گردن جھکا لو
قسم ہے جب تمہاری یاد آئے — مرا دل شوق پر قابو نہ پائے
قسم ان ڈبڈبائے آنسوؤں کی — کہ حسرت خون ہو کر جن میں آئی
قسم ان کی جو دل کی تہ سے ابھریں — امیدیں میری جو رہ رہ کے ابھریں
قسم اس مے کی جس سے جی گیا ہوں — جو توبہ توڑ کر میں پی گیا ہوں
یقیں تم کو میں پھر کیسے دلاؤں — تمہاری ہی قسم، چاہو تو کھاؤں

"مجھے تم سے محبت ہو گئی ہے"

ازہر قدوائی

مری گود میں ماہتاب آرہا ہے

(از حضرت نسیم سیفی بی۔اے)

مری گود میں ماہتاب آرہا ہے

تبسم کناں ہے جنوں خیز موسم — ہر اک شے پہ طاری ہے کیفیت و عالم
مرا دل ہے گرویدہ رقصِ پیہم — سکونِ تمنا لٹا جا رہا ہے

مری گود میں ماہتاب آرہا ہے

محبت کی نظروں میں مخمور جلوے — شبابی تجمل سے بھرپور جلوے
ستاروں کی گیتوں سے معمور جلوے — جوانی کی رعنائیاں لا رہا ہے

مری گود میں ماہتاب آرہا ہے

چمن کا نکھار اس کے ہونٹوں پہ قرباں — ارم کی بہار اس کے ہونٹوں پہ قرباں
دلِ شرمسار اس کے ہونٹوں پہ قرباں — شرارے تبسم کے برسا رہا ہے

مری گود میں ماہتاب آرہا ہے

وہ الھڑ ادائیں وہ معصوم شوخی وہ فردوس پرور حسیں کم نگاہی
وہ عصمت کا پیکر ریا کی تباہی زمانے کی گردش کو ٹھکرا رہا ہے

مری گود میں ماہتاب آرہا ہے

وہ گدرائے شانوں پہ زلفوں کی ناگن وہ سینے پہ رومان زا شوخ جوبن (۹)
وہ سیمیں کلائی پہ پھبتا سا کنگن ہر انداز سے کیف ٹپکا رہا ہے

مری گود میں ماہتاب آرہا ہے

نقابِ حیا شوخ نظروں پہ ڈالے سرکتا ہوا اپنا آنچل سنبھالے
جلو میں لئے کیف پرور اجالے ہر اک گام پر لغزشیں کھا رہا ہے

مری گود میں ماہتاب آرہا ہے

نسیم سیفی۔ بی۔ اے

وہ محفل تو ہے، رنگِ محفل نہیں ہے

(از قاضی محمد ریاض الدین صاحب انصاری ایم۔ اے بی ٹی (علیگ)

نہیں تمکو منظور ملنا ہی مجھ سے تو کچھ ان بہانوں سے حاصل نہیں ہے
سمجھتے ہو مشکل تو مشکل ہے ورنہ جو مشکل نہ سمجھو تو مشکل نہیں ہے

مرے پاس کہنے کو یوں جان بھی ہے مرے پاس ہونیکو کیا دل نہیں ہے
مگر یہ ہے ناشاد، وہ ہے پریشاں، غرض آپکے کوئی قابل نہیں ہے

محبت کو سب جانتے ہیں کہ اسکا بجز رنج و غم کوئی حاصل نہیں ہے
مگر پھر بھی اس سے زمانے میں خالی، کوئی سر نہیں ہے کوئی دل نہیں ہے

یہ کیا زندگی ہے کہ میں جی رہا ہوں، مگر لطف جینے کا حاصل نہیں ہے
یہ لطفِ طبیعت، یہ تسکین خاطر، یہ فرحت، یہ جمعیتِ دل نہیں ہے

یہ دَورِ مے و جام بے کیف ہے سب کہ پہلو میں وہ راحتِ دل نہیں ہے
وہ ہم تو ہیں لیکن نہیں وہ طبیعت، وہ محفل تو ہے رنگِ محفل نہیں ہے

ہزار اُسپہ تھا خوں کا مجکو دعویٰ، مگر اس محبت کو اپنی کروں کیا؟
میرے مُنہ سے روزِ جزا وقت پرسش یہ نکلا کہ یہ میرا قاتل نہیں ہے

یہ کج بحثیاں ہوں تو کیا بات سُلجھے، کوئی اُنسے جیتے تو کسطرح جیتے؟
کیا میں نے شکوہ جفا کا تو بولے "جفا بے وفائی میں شامل نہیں ہے"

جو تھے ولولے یاس نے سب مٹائے، جو تھے حوصلے خاک میں سب ملائے
کبھی تھا کبھی میرا دل میرا دل تھا، مگر اب مرا دل مرا دل نہیں ہے

ریاض اس میں لاکھوں نے غوطے لگائے، کچھ اس طرح ڈوبے اُبھرنے نہ پائے
محبت وہ بے تھاہ ہے اک سمندر کہ جس کا کہیں کوئی ساحل نہیں ہے

قاضی محمد ریاض الدین انصاری ایم اے۔ بی۔ ٹی

توبہ توبہ ترے پردے کا قرینہ ساقی!

بھول سکتی نہیں وہ بزم شبینہ ساقی
ہمکو جب آیا ہے پینے کا قرینہ ساقی

زندگی تلخ مصائب کا رواں دریا تھی
دل مرحوم تھا نازک سا سفینہ ساقی

تیرے رندوں نے سفینے جو بڑھائے ہنسکر
پھٹ گیا وحشت گرداب کا سینہ ساقی

سر جھکانے ہی یہاں کھلتے ہیں اسرار وجود
در میخانہ ہے یا عرش کا زینہ ساقی

ذرہ ذرہ نگہ شوق کی رہ میں حائل
توبہ توبہ ترے پردے کا قرینہ ساقی

ہم نشینی پہ اضافہ ہے ترا لطف نظر
رند رکھ سکتا ہے کب بے ندی کینہ ساقی

تیرے ساغر سے جو ٹکرا گیا ساغر میرا
ہنس پڑی گویا کوئی شوخ حسینہ ساقی

بے نیازی سے تری سب کو شکایت ہی رہی
تجھ کو آیا نہ مروت کا قرینہ ساقی

شوق نظارۂ فطرت ہی نہایت بیتاب
اشک خونیں ہیں نگاہوں کا پسینہ ساقی

ملک عبدالعزیز فطرت

لسانِ سروش

رحمت کا سمندر کیا اُبلے اور ابرِ کرم کیا ناز کرے
جب چشمِ ندامت سے گر کر اک اشک کا قطرا ناز کرے

جو قطرہ جُدا رہنے پر بھی دریا کی خودی کا حامل ہو
اُس قطرہ کی ہر ہر کروٹ پر کس طرح نہ دریا ناز کرے

منجدھار میں غوطے دے دے کر مجھکو تو ڈبو ہی کر چھوڑا
مُردوں کو کنارے پہونچا کر موجوں کا تھپیڑا ناز کرے

سرتاب جبیں کے سجدے سے انسان کی رفعت گھٹ جاتی
ابلیس کی نافرمانی پر آدم کا پُتلا ناز کرے

مجنوں کی لحد کی زینت کو وحشت کا چمن سرسبز رہے
جو پھول بگولہ بن کے کھلے خود دامنِ صحرا ناز کرے

اک اشک چمکتا دستِ دعا کا ساری فضا پر چھا جائے
جب بامِ فلک پر آنکھ اُٹھا کر صبح کا تارا ناز کرے

اک بار اگر سر جھک جاتے تقدیر بدل ہی کر آتے
ایسا تو بنائے نقشِ جبیں جس نقش پہ سجدا ناز کرے

اس حرص و ہوا کی کشتی میں اس پار جہاں سے جانا ہے
اس طرح بچا دامن کو کھوئے عالمِ بالا ناز کرے

خوشبو کی طرح عالم سے گذر رفتار سُبک ہو روح سُبک
بے لاگ رہے ایسا تو عمل ہر اپنا پرایا ناز کرے

ہر بزم کی رونق اس سے ہر رنگ اسی پر کھلتا ہے
وہ سیر چمن کو آنکلے تو بوٹا بوٹا ناز کرے

آتا بھی ہے جو کچھ تجھکو سروش اگلوں کا تصدق اسکو سمجھ
تو اپنے ہنر پر فخر نہ کر، چاہے تو زمانہ ناز کرے

آغا سروش

چار دن کی زندگی میں بارہا مرنا پڑا

عشق میں مرکر جئے ہم جی کے پھر مرنا پڑا
جادۂ الفت بڑی مشکل سے طے کرنا پڑا

سخت جانی کو مری تسلیم ہی کرنا پڑا
چلتے چلتے خنجرِ قاتل کو دم بھرنا پڑا

اُنکو دل دیکر ہمیں پھر جان بھی کھونی پڑی
عشق کرنے کا یہ خمیازہ ہمیں بھرنا پڑا

اپنا ہمسر دیکھ کر وہ پانی پانی ہو گئے
آئینہ کو دیکھ کر پانی انہیں بھرنا پڑا

سہو جس دم ہو گیا ہم سے نمازِ عشق میں،
اور ایک سجدہ درِ محبوب پر کرنا پڑا

دیں دعائیں جب دہانِ زخم نے جی کھول کر
پھر انہیں دل کھولکر اُسمیں نمک بھرنا پڑا

یہ وفورِ ناتوانی نے کیا اب حالِ زار
جس جگہ بیٹھے لیا دم، اُس جگہ مرنا پڑا

یہ بھی تھا حکمِ خدا ہم اور اس کو کیا کہیں؟
سر بتوں کے آستانِ ناز پر دھرنا پڑا

شعلہ ہم کو نازنینوں کی ادائیں دیکھکر
چار دن کی زندگی میں بارہا مرنا پڑا

شعلہ دہلوی

ارشاداتِ عالیہ

نتیجۂ فکر:- خیّام الہند حضرت حیدر دہلوی مدظلہ

ہر جگہ حقِ اشکِ بے زری کا ادا کرتا ہوں میں — مرتسم ہر ذرّے پہ پھر نقشِ وفا کرتا ہوں میں
دل مجسّم عشق ہے عشق آئینہ دارِ جمال — آؤ ہمکو آج تم سے آشنا کرتا ہوں میں
میری بیتابی بدل دیتی ہے نظمِ کائنات — اب زمانے کیطرح کروٹ لیا کرتا ہوں میں
منتہائے زعم پر میں نے تجھے پہنچا دیا — قدر تیرے حسن کی تجھ سے سوا کرتا ہوں میں
میری بربادی تو ناحق ہے سبب ناحق نہیں — انکی فطرت کے خلاف اُن سے وفا کرتا ہوں میں
میری نظروں میں ہے رنگا رنگ بزمِ ممکنات — اپنے ہی دامن سے وابستہ رہا کرتا ہوں میں
سچ کہا میری خطاؤں کا نہیں کوئی شمار — ایک یہ بھی جرم ہے تم سے وفا کرتا ہوں میں
اب کھلے اُن پر دلِ آزاری کے کچھ عیب و صواب — شرم آتی ہے انہیں شکرِ جفا کرتا ہوں میں

تختِ شاہی سے نہیں کم گوشۂ عزلت مجھے
مست اپنے حال میں حیدر رہا کرتا ہوں میں

مجھے فرصت ملے تو آہ کروں

ختم کیونکر شب سیاہ کروں — مجھے فرصت ملے تو آہ کروں
میں وفا دوست وہ جفا پیشہ — کیا کروں کس طرح نباہ کروں
رحمتیں جو صلے بڑھاتی ہیں — کیوں نہ دل کھول کر گناہ کروں
تیرا نقشِ قدم بھی کھو بیٹھا — اب کسے صرفِ سجدہ گاہ کروں
کیوں لڑا دوں تری نظر سے نظر — دل کی دنیا کو کیوں تباہ کروں
جانتا ہوں مآلِ عزت وجاہ — کیا تمنائے عزّ و جاہ کروں
مختصر عمر حسن لامحدود — کس طرح سیرِ جلوہ گاہ کروں
کرم گاہ گاہ ہو تو ضرور — شکوۂ جور گاہ گاہ کروں
بند ہیں ارتباط کے رستے — اُن سے کیا قصدِ رسم و راہ کروں
ہائے یہ شامِ غم یہ تنہائی — اپنے غم کا کسے گواہ کروں
فرصت اُن کے جمال ہی سے نہیں — کیا تماشائے مہر و ماہ کروں
اللہ اللہ یہ بے پناہی حسن — ہوش جائیں جو اِک نگاہ کروں
اے تقاضائے عشرتِ توبہ — چاہتا ہوں کہ پھر گناہ کروں

پہلے خود کو فنا کروں ماہر
اور پھر وردِ لا الٰہ کروں

ابوالکمال ماہر دہلوی

فضائے عشق اپنی چاند اپنا چاندنی اپنی

نہ اٹھے گی ترے در سے جبینِ عاشقی اپنی
گذارونگا ترے قدموں میں یہ زندگی اپنی

کہیں جنبش نہ کھائیگی متاعِ زندگی اپنی
تمہاری ہر خوشی پر منحصر ہے اب خوشی اپنی

جو اب ہے ایسی حالت تو کبھی پہلے نہ تھی اپنی
خدا معلوم تجھ سے ہو گئی کیوں دوستی اپنی

ہوئی کیوں اک وفا دشمن سے یارب دوستی اپنی
مرقع بیکسی کا بن گئی ہے زندگی اپنی

فرازِ طور سے جبتک نہ اٹھونگا نہ اٹھونگا
کہ جبتک لو نہ دے اٹھیگی شمعِ زندگی اپنی

ترا جلوہ سلامت تو سلامت جانِ نظارہ
فضائے عشق اپنی چاند اپنا، چاندنی اپنی

جنونِ شوق بے حد کس قدر معصوم فطرت ہے
سمجھ بیٹھا تمہاری غمزدہی کو دلدہی اپنی

کرم کیسا ستم بھی اب نہیں ہے انکے امکاں میں
خدا کا شکر ہے محنت ٹھکانے لگ گئی اپنی

صابر دہلوی

ستارے ٹوٹتے ہیں چشم تر سے

ترا رند اور اک قطرے کو ترسے — پلا دے ساقیا دل کو نظر سے
ملائیں کاش وہ مجھ سے نگاہیں — مجھے کہنا ہی کچھ اُنکی نظر سے
یہ کیسی ہوک سی اُٹھتی ہے دل میں — یہ کیا کہتا ہے دل دردِ جگر سے
ابھی تک مستیاں بھری ہوئی ہیں — جوانی! آہ! ان گذرا ہے ادھر سے
نہیں یہ اشکِ فرقت اے غمِ عشق — ستارے ٹوٹتے ہیں چشمِ تر سے
مجھے یوں مست نظروں سے نہ دیکھو — گرے جاتے ہیں دو عالم نظر سے
کوئی تو خالقِ دردِ جگر ہے — کوئی مجبور ہے دردِ جگر سے
خوشا قسمت مجھے پھر دیکھتی ہے — جوانی اور محبت کی نظر سے

محبّت اور اطمینان اختر
یہاں پانی گذر جاتا ہے سر سے

اختر ہوشیارپوری
بی۔ اے۔ ایل ایل۔ بی

دل کی ہدایتوں پہ عمل کر رہا ہوں میں

دستور کے خلاف عمل کر رہا ہوں میں
قسمت سے اپنی جنگ و جدل کر رہا ہوں میں

روح ابد گداز ہے میرے کلام میں
تقلیدِ اوستادِ ازل کر رہا ہوں میں

خونِ جگر مرا ہی کہ ہے رنگِ رُخ ترا
کیا چیز آنسوؤں پہ حل کر رہا ہوں میں

ہی قابضِ حیات کا رُخ دوسروں کی سمت
حالانکہ آرزوئے اجل کر رہا ہوں میں

میری نظر میں اور کوئی راہبر نہیں
دل کی ہدایتوں پہ عمل کر رہا ہوں میں

دیکھے تو کوئی میرے تخیّل کی رفعتیں
تعمیر آسماں پہ محل کر رہا ہوں میں

آنکھوں میں اُنکی دیکھ کے آنسو بھرے ہوئے
شکووں میں اپنے ردّ و بدل کر رہا ہوں میں

باقی نہیں حیات میں اُمید اب کوئی
تنگ آ کے آرزوئے اجل کر رہا ہوں میں

آفاق اب خمار کا نکھریگا رنگ خوب
رُوحِ خودی شراب میں حل کر رہا ہوں میں

آفاق حسین آفاق - بی - اے دہلوی

وہی جب چارہ سازِ دل نہیں ہے

ہلاکِ غمزۂ باطل نہیں ہے — میرے سینے میں ایسا دل نہیں ہے
نہیں ہے اک سکونِ دل نہیں ہے — وگرنہ کیا مجھے حاصل نہیں ہے
زمانے کی مسیحائی سے حاصل — وہی جب چارہ سازِ دل نہیں ہے
جگر بھی مبتلائے سوزِ غم ہے — پریشاں ایک دل ہی دل نہیں ہے
یہی کہتا ہوں دل سے ہر قدم پر — ارے ظالم یہی منزل نہیں ہے
وہ ایسا کون سا آنسو ہے جس میں — مرا خونِ جگر شامل نہیں ہے
محبّت سے کوئی دیکھے تو دیکھے — کہ دل ہے کاسۂ سائل نہیں ہے

رہینِ غم سہی، حیرتؔ، مگر دل
چراغِ کُشتۂ محفل نہیں ہے

عبدالمجید حیرتؔ دہلوی

نالۂ کامیاب کیا کہنا

(از حضرت اعجاز کاظمی، وکیل)

وحشت و اضطراب کیا کہنا
دلِ خانہ خراب کیا کہنا

نگہۂ بے حجاب کیا کہنا
او سرورِ شراب کیا کہنا

اک تو بیمارِ غم کا آخر سانس
اُس پہ تیرا جواب کیا کہنا

تڑپ اُٹھے حریمِ ناز میں وہ
نالۂ کامیاب کیا کہنا

نیچی رہتی ہیں رات دن نظریں
پردۂ بے نقاب کیا کہنا

ہو گیا بابِ التجا مسدود
عرض ناکامیاب کیا کہنا

زندگی نذر کر رہا ہوں میں
اُف رے تیرا شباب کیا کہنا

اُنہیں دھونے پڑے مرے آنسو
واہ چشمِ پُرآب کیا کہنا

درو دیوار آج ہیں مبہوت
صورتِ لاجواب کیا کہنا

تجھے اعجاز سے محبت ہے
اے ترا انتخاب کیا کہنا

اعجاز کاظمی وکیل

کہاں جاکر بنایا ہی تمہارا آستاں ہم نے

اُسی کو خیر سی پھر کر دیا وقفِ خزاں ہم نے
بنایا بھی نہ تھا اچھی طرح جو آشیاں ہم نے

بھرا ہو جیسے ہر ہر لفظ میں دردِ نہاں ہم نے
مرتب کی ہی کچھ اسطرح اپنی داستاں ہم نے

چمکتی دیکھی اکثر وہیں برقِ تپاں ہم نے
چھپا کر بھی جہاں رکھی بنا کے آشیاں ہم نے

ہوئی جاتی ہی نادم تیری جلووں کی فراوانی
کچھ اسدرجہ بڑھا دی وسعتِ کون و مکاں ہم نے

کیا کرتے ہیں سجدے عرش کی حد سے بھی کچھ بڑھکر
کہاں جاکر بنایا ہی تمہارا آستاں ہم نے

بچھڑ جانیکو اپنے یاد کرکے رو دیئے اکثر
کبھی اڑتی ہوئی دیکھی جو گردِ کارواں ہم نے

تمہاری یاد میں فکرِ دو عالم سے جدا ہو کر
بڑی مشکل سی حاصل کی ہیں یہ تنہائیاں ہم نے

اگر آجائیں ہم ضد پر تو کیا روکیگا تو ہم کو
ارے جا سینکڑوں دیکھے ہیں تجھ سی پاسباں ہم نے

ہمیشہ سی زبان و لب ہیں ازدل سے بیگانہ
خود اپنوں سی چھپا رکھی ہی اپنی داستاں ہم نے

خدا رکھے تجھے ای عہدِ الفت تیری ہاتھوں سے
بجز یاس و الم کیا پا لیا ہو کر جواں ہم نے

کوئی سو بار پوچھے حالِ دل ہم چپ ہی رہتے ہیں
کہ شیدا اب یہی سیکھا ہے اندازِ بیاں ہم نے

شیدا خورجوی

فراہم پھر مری وحشت کے ساماں ہوتے جاتے ہیں

حسیں اپنی جفاؤں پر پشیماں ہوتے جاتے ہیں
بحمداللہ یہ کافر مسلماں ہوتے جاتے ہیں

ہم آخر واقفِ اسرارِ پنہاں ہوتے جاتے ہیں
کہ جلوے اُنکے نزدیکِ رگِ جاں ہوتے جاتے ہیں

اثر ہونے لگا شاید اسیروں کی خموشی کا
کہ بوسیدہ در و دیوارِ زنداں ہوتے جاتے ہیں

شکایت تھی مرے ذوقِ نظر کو اُنکے جلووں سے
نمایاں آج وہ تا حدِّ امکاں ہوتے جاتے ہیں

وہی آنسو جنہیں میں حاصلِ اُلفت سمجھتا تھا
قیامت ہے کہ جذبِ چاکِ داماں ہوتے جاتے ہیں

مرا ذوقِ نظر چھپنے نہیں دیتا کہیں اُن کو
وہ جتنے چھپتے جاتے ہیں نمایاں ہوتے جاتے ہیں

اُدھر گُل رفتہ رفتہ شمعِ محفل ہوتی جاتی ہے
اِدھر رخصت مریضِ شامِ ہجراں ہوتے جاتے ہیں

گھٹا اٹھی، بہار آئی، کھلیں کلیاں، ہنسے غنچے
فراہم پھر مری وحشت کے ساماں ہوتے جاتے ہیں

جنہیں ضد تھی کبھی میرے تصوّر میں بھی آنے سے
وہ جلوے رفتہ رفتہ دل میں پنہاں ہوتے جاتے ہیں

تری نظریں مرے دل کی محافظ بنتی جاتی ہیں
مرے سجدے ترے در کے نگہباں ہوتے جاتے ہیں

سنبھل بیٹھے فلک، ہشیار اہلِ حسن ہو جائیں
مرے نالے شریکِ سوزِ پنہاں ہوتے جاتے ہیں

محیطِ بزمِ حسن و عشق ہے قانون فطرت کا
پریشاں کرنے والے بھی پریشاں ہوتے جاتے ہیں

بتوں کو چھوڑ کر اب حضرتِ شمسِ زبیری بھی
بیادِ ساقیٔ کوثر غزلخواں ہوتے جاتے ہیں

شمس الاسلام شمس زبیری، مرادآبادی

بربطِ دل جو بجے رقص میں دُنیا ہو جائے

عشق میں جذبۂ دل اتنا تو پیدا ہو جائے
جس پہ بیمار نظر ڈالے مسیحا ہو جائے

ہر طرف کیف ہو ہر ذرّہ رسیلا ہو جائے
جی میں آتی ہے کہ دُنیا مرا نغمہ ہو جائے

جسکی تابش کا سبب عشق کا نالہ ہو جائے
پھر وہ جلوہ تو بڑا قیمتی جلوہ ہو جائے

اِسطرح درد عطا کر کہ تڑپ بھی نہ سکوں!
اسطرح رنج دے مشکل مرا جینا ہو جائے

تم جو آؤ تو خزاں میں ہو بہارِ فردوس
تم نہ آؤ تو گلستاں میں اندھیرا ہو جائے

لیچل اس در کیطرف ہاں مگر اے ذوقِ سجود
رہ میں جو ذرّہ نظر آئے وہ کعبہ ہو جائے

مضمحل شام فضاؤں میں اُداسی ہے مگر
تم جو آؤ تو یہی وقت سُہانا ہو جائے

چھیڑ دوں نغمۂ اُلفت تو جہاں جھوم اُٹھے
بربطِ دل جو بجے رقص میں دُنیا ہو جائے

صرف الفاظ میں اظہارِ دُعا کیا معنی؟
لطف تو جب ہے کہ ہر سانس تمنّا ہو جائے

دامنِ ضبط نہ چھُٹ جائے شبِ ہجر عالی
شام سے سوچ رہا ہوں کہ سویرا ہو جائے

جمیل الدین احمد عالی۔ لوہاروی

کوئی مسجد نہ بنے خانۂ خمّار کے پاس

چلی دل کی لگی اُس بُتِ عیّار کے پاس
موت کھینچے لئے جاتی ہے ستمگار کے پاس

بجز یاس نہیں کوئی دلِ زار کے پاس
آنا باقی ہے قضا کا ترے بیمار کے پاس

ترچھی نظر اُس پہ قیامت ابرو
طرفہ خنجر بھی لگا رکھا ہے تلوار کے پاس

کھیں تو سہی اپنے مریض غم کو
آپ آئیں تو سہی عشق کے بیمار کے پاس

رہتی ہے قیامت بھی تری ٹھوکر سے
حشر آتا نہیں ظالم تری رفتار کے پاس

آتا ہے کہ وہ آئے مِرے پھولوں میں
اور پھر بیٹھ گئے میرے عزادار کے پاس

شوق لے اسے خلد کی حسرت نہ رہے
دفن ہو جائے جو مر کر تری دیوار کے پاس

یخانہ میں آئے نہ سمجھ کر مسجد
کوئی مسجد نہ بنے خانۂ خمّار کے پاس

داورِ حشر سے کہدونگا میں جا کر عاصی
اور عصیاں کے سوا کیا ہے گنہگار کے پاس

عبدالمالک۔ عاصی

تضمین بر غزل حکیم مومن مرحوم

(از جناب مسعود حسن صاحب شہاب دہلوی، اڈیٹر رسالہ "الہام" دہلی)

غصے سے دیکھنا کہ بصد ناز دیکھنا   مجھکو بھی اک نظر بہر انداز دیکھنا
محفل میں ہیں بلا کے نگہ باز دیکھنا   غیروں پہ کھل نہ جائے کہیں راز دیکھنا
میری طرف بھی غمزۂ غماز دیکھنا

ہر چند مجھ سے دور تھا وہ جانِ گلستاں   میری نگاہِ شوق میں اندھیر تھا جہاں
اُس گل کو دیکھتے ہی یہاں آگئی خزاں   اُڑتے ہی رنگِ رُخ مرا نظروں سے تھا نہاں
اس مرغِ پر شکستہ کی پرواز دیکھنا

وہ سوئے اتفاق سے برہم کہاں نہیں   لیکن فسردہ قلب میں آشفتہ جاں نہیں
یہ مجھکو حسنِ ظن کہ ذرا بدگماں نہیں   دشنامِ یار طبعِ حزیں پر گراں نہیں
اے ہم نفس نزاکتِ آواز دیکھنا



"شمع" قیمت ڈھائی روپیہ

ملنے کا پتہ :- جلال منزل - کوچۂ پنڈت - دہلی

اے - آر - خاتون صاحبہ دہلی کا لکھا ہوا یہ ضخیم قصّہ بہت ہی دلچسپ ہے۔ اگر اس میں کوئی خرابی ہے تو صرف یہی کہ شروع کرنے کے بعد ممکن ہے آپ بعض ضروری کاموں کو بھلا بیٹھیں۔ دوستوں سے وعدے کر کے جھوٹے بنیں۔ کیونکہ حتی الوسع آپ کا جی تو نہیں چاہیگا کہ کتاب کو بغیر ختم کئے چھوڑیئے۔ اس کی ضخامت بجائے خود اس معنی کر مفید ہے کہ بیک نشست ختم کرنا ممکن نہ پاکر آپ اپنے ضروری کاموں سے بھی دلچسپی لیں گے اور اپنے وعدوں کا بھی خیال رکھیں گے۔ اس کتاب کا دوسرا کمال یہ ہے کہ ٹریجڈی (المیہ) ہوتے ہوتے، اس کا خاتمہ کمیڈی (سرور افزا) بن جاتا ہے۔ البتہ حلیمہ بیگم اور قمرالحسن کے کیرکٹر کشی میں بہت زیادہ مبالغہ سے کام لیا گیا ہے، اس کے باوجود خاتون صاحبہ کی پہلی کوشش کی حیثیت سے یہ انکی ایک کامیاب تصنیف شمار کیجائے گی۔

"مُصنّف" سالانہ قیمت چار روپیہ

ملنے کا پتہ :- مجلس مصنّفین علی گڈھ

"مجلس مصنّفین" کے نام سے علی گڑھ میں ایک ادارہ اگست [illegible]ء سے کام کر رہا ہے، جس کا سہ ماہی رسالہ "مصنّف" زیر نظر ہے۔ چھ مہینے کے اندر جو کچھ ہوا ہے وہ اس رسالہ میں درج ہے۔ "شادیِ مرگ" کا چاہے موقعہ نہ ہو، لیکن اس میں کسی شبہ کی گنجایش نہیں کہ سیّد الطاف علی صاحب بریلوی مرتبِ رسالہ نے وقت کی ایک اہم ضرورت کو پہچانا اور بڑی خوشی کی بات یہ ہے کہ "وعدوں کی لمبی فہرست" کے بجائے نہایت مختصر پیمانے پر مفید کام کا اجرا کر دیا۔ ارتقار کے لئے فطرت کا اصول زریں اختیار کیا۔ بہترین صلاحیت رکھنے والوں کی جماعت اس کام میں ان کی شریک ہے۔ ملک کا اس مفید کام کی طرف توجہ نہ کرنا غیر ممکن ہے۔ ایسی

تضمین برغزل حکیم مومن مرحوم

(از جناب مسعود حسن صاحب شہاب دہلوی، اڈیٹر رسالہ "الہام" دہلی)

[illegible]

سید محسن امام

جلد [illegible]

فہرست مضامین ماہ اپریل

ساغر ... فصل ... دو ... نذرانِ ...

مدیر کے ماہ مئی سنہ ۱۹۳۲ء کے پرچہ کے مضامین نثر و نظم کی مختصر فہرست

حصۂ نثر

• علامہ شبلی نعمانی"۔ (از جناب شیخ محمد صاحب ... ایم اے ...) حضرت ... کی کتاب پر ... [illegible]

• کوئی کو چھیڑے ہی جاتی چلی"۔ (از ... حضرت ...) صاحب ... [illegible] ... شہر ... کی ... ۔

[illegible] ... کے متعلق ... ذوق ادب رکھنے والوں تک پہنچانا ... تھا۔

(از مولانا سید ... صاحب ...) ... کی جانب توجہ ہوگا۔

• ... عشق"۔

• ... الحسن ... پوری"۔ از سید فخر الحسن صاحب ایم اے

• ... وکیل صاحب"۔ از حضرت ... جس کے ... تھا۔

حصۂ نظم

• ... : ... حضرت ... صاحب ... [illegible] ۔

• ... : ... صاحب ... ۔

• ... : از جناب ... اختر ... شی

• ... : از حضرت ... صاحب ...

• ... : از حضرت ... [illegible] ۔

[illegible] ۔

نظرات

من از حیرت تو از تمکین ایں آئینہ تقریرے
بداں ماند کہ ہم بزم است تصویرے بہ تصویرے

زمانہ برق کی سرعت سے بدلتا جارہا ہے۔ دنیا کی کایا پلٹ جاری ہے، مگر یاران طریقت کا جمود و سکون علی حالہ ہے۔ سوائے منصف عنایت الرحمان صاحب کے کسی نے "نظرات" کے معروضات پر توجہ نہیں کی، اس سے ہم کیا سمجھیں؟ کاش یہی بتانے کی زحمت گوارا کیجائے!

اپریل کی ۲۱ تاریخ ملت کا "اقبال" ابدی راحت کے گہوارے میں آسودہ ہوا تھا۔ صوفیا نے اعراس کا جو طریقہ نکالا تھا، اگر اس کی پابندی کی جاتی تو قوم کے دلوں میں کچھ تو جذبہ زندہ رہ سکتا! مگر ع یہاں ہے وحی ولایت کی ڈاک کے تھیلا - لیڈر ہیں تو "میڈ ان انگلینڈ" اور نوجوان ہیں تو "مغرب زدہ" لہذا ع کہیے! اس فریاد سے حاصل جسکو سنتا کوئی نہیں!

شاہ محمد سلیمان مرحوم اگر ہم میں سے نہ ہوتے تو آپ دیکھتے کہ ان کا ماتم کس کس طرح اور کب تک ہوتا مگر ع ناخلف باشم اگر من بہ جوے نفروشم - پر "چاکہا ایثار حبیب و پیرہن" کرنے والی قوم کو حس بھی نہیں۔ حالانکہ ع ایں نہ مورے بود می گوئی "سلیمانے" شکست!

ایسے ماحول میں ہم اپنے عم بزرگوار حضرت قاضی سید شاہ مظاہر امام صاحب منعمی ابوالعلائی کے ساختہ ارتحال پر قلم ہی کے آنسو کو غنیمت سمجھتے ہیں۔

۱۰ ربیع الثانی ۱۳۶۱ھ مطابق ۲۲ / ۲۳ اپریل ۱۹۴۱ء کے درمیان شب کو ساڑھے نو بجے

حضرت نے وصال فرمایا - اِنَّا لِلّٰہِ وَاِنَّا اِلَیْہِ رَاجِعُوْنَ ہ - علاوہ اس کے کہ اگلے بزرگوں کی یادگار تیرہ کم سو برس کی عمر کے قابل زیارت صاحب اجازۃ "پیر طریقت" تھے - آپ ایک کہنہ مشق سخنگو بھی تھے - "سید" اور "مظاہر" دونوں تخلص سے نظم فرماتے تھے - رقعات منظوم لکھنے کی خاص مشق تھی، مولانا فصیح احمد صاحب خستہ (پھلواروی) سے تلمذ تھا - نمونۂ کلام انشاء اللہ آئندہ پیش ہوگا - آپ کے فرزند رشید مولانا مقبول امام صاحب مقبولؔ آپ کے سچے جانشین ہونے کی صلاحیت رکھتے ہیں، دوسرے فرزند آپ کی قاضی سید وارث امام صاحب ہیں، اور تیسرے صاحبزادہ سید جلیل امام سلمہٗ ندیم کے پرنٹر پبلشر اور منیجر ہیں آپ کے بڑے داماد مولانا شاہ صبیح الحق صاحب خانقاہ عمادیہ منگل تالاب پٹنہ سٹی ہیں - دوسرے داماد حضرت شاہ حسین الدین احمد علیہ الرحمۃ سجادہ نشین خانقاہ منعمیہ رام ساگر شہر گیا تھے - تیسرے داماد مولانا عبدالمنان صاحب مدرس مدرسہ محمدی جان پٹنہ سٹی، اور چوتھے داماد شاہ فیاض احمد صاحب سجادہ نشین مانپور مضافات گیا ہیں - خدا بزرگ محترم کی روح پرفتوح پر بارشِ رحمت فرمائے اور پسماندگان کو توفیق رفیق صبر جمیل سے نوازے - آمین!

ماہ اپریل کی پیشگی فہرست کی پابندی نہ ہوسکی - ع 'گلچین بہار تو زداماں گلہ دارد' کا مضمون ہے - گرچہ حضرت بلیغ والا مضمون صرف اس وجہ سے نہیں روکا گیا، بلکہ اس کے متعلق کچھ اور معلومات حاصل کرنے کی کوشش کی گئی ہے جس کا نتیجہ ابھی برآمد نہیں ہوا ہے - مئی میں تلافی مافات کی پوری کوشش ہوگی!

بہت ضروری

۱۴ اپریل کو مبلغ پانچ روپیہ کا ایک منی آرڈر آیا تھا جسکے فرستندہ کا نام وصول کنندہ نے اس مغالطہ میں درج نہیں کیا کہ "کوپن" میں ہوگا، کوپن بخط انگریزی ہے - اسمیں کچھ پتہ نشان نہیں ہے - لہذا جن صاحب نے بھیجا ہو فوراً مطلع فرمادیں - رسید ڈاکخانہ کی بھیجدیں تو اور بھی بہتر ہو!

افسوس ہے کہ عدم گنجائش کی وجہ سے اس دفعہ رسائل وکتب پر تبصرہ بالکل ممکن نہیں ہے - آئندہ اسکی تلافی کردی جائیگی -

---

لہ سرچ لائٹ مورخہ ۲۴ / اپریل ۱۹۴۲ء میں مسلم اسٹوڈنٹ یونین کے یوم اقبال منانے کی خبر نے آنسو پونچھے - خدا نونہالوں کو اجرِ خیر دے -

ندیم

جلد ۱۹ بابت ماہ اپریل سنہ ۱۹۴۲ء نمبر ۴

خدمتِ زبان و ادب

(از حضرت خواجہ عبدالرؤف عشرت مرحوم مغفور)

ناسخ کے خاندان میں کیسے امرا، روسا، والیانِ ملک ناسخ کے شاگرد تھے جن کا سلسلہ اب تک چلا آتا ہے اور اس دلکش شوق سے کیسے کیسے فائدے ملک کو پہنچے، اور زبان اردو کو کیا کیا ترقی نصیب ہوئی۔ میر اوسط علی رشک نے لغت جمع کیا۔ برق نے نازک خیالی کی چمک دمک دکھلائی۔ راجہ مقیم الدولہ نے کثیر الفاظ کا مصرف بتایا۔ راجہ امیر حسن خاں نے حسنِ بندش کے نمونے دکھلائے۔ سحر نے محاورے لکھے۔ نور نے اس کو نورانی کیا۔ امیر علی خاں ہلال نے اس کو چار چاند لگا دیئے۔ خواجہ وزیر نے الفاظ کے دریا بہا دیئے۔ بادشاہ سخن کہلائے۔ ہلال نے زباندانی کی کرسی۔ منیر نے استعاروں کو چمکایا۔ شیخ امانعلی سحر نے گلکاری کی۔ مقبول الدولہ قبول نے بڑے بڑے مشاعرے کرکے زبان کو رونق دی۔ ڈپٹی کلب حسین نادر نے اس کو شہروں شہروں رائج کیا۔ انعام نے تحقیق کا دروازہ کھول دیا۔

ہزارہا شاگرد ناسخ سے مستفیض ہوئے۔ اب ان کے شاگردوں کا تمام ہندوستان میں فیض جاری ہے۔ اور لکھنؤ میں اب بھی ہزاروں شاعر ہیں جن کی تہذیب اور شرافت مشہور عام ہے۔ مگر وہ زمانہ کی بدتہذیبی کو دیکھ کر کچھ شہرت عام سے ایسے بیزار ہیں کہ کسی مشاعرے میں نہیں

جاتے - اور اُن کو آجکل کی نغمہ سرائی پسند نہیں آتی - جس میں زبان کا گلا گھونٹا جاتا ہے - اب شاعر کی یہی پہچان رہ گئی ہے کہ مشاعرے میں ناچے، گائے، مٹکے، دادِ سخن لے - شرابیں اڑائے صاحبِ خانہ کی تہذیب بگاڑے اور مشاعرے کی بے عزتی کرے - اور کچھ خرچ سفر مانگ کر مشاعرے میں شریک ہو گنوار یہ سُن کر کہیں کہ خوب چہچہاتا ہے -

اسی طرح آتش کا خاندان بھی مہذب ہے - ان لوگوں نے زبان کی خدمت بہت کچھ کی - **خلیل** نے اس آتشکدہ کو گلزار بنا دیا - **اسیر** نے دہلی کے قیود سے آزاد کیا - **آغا حید ر افسوں** نے اپنا کمال دکھایا - **رند** نے اس شراب کو دو آتشہ کیا - **شناور** نے دریائے سخن میں پیراکی سکھائی - **صبا** نے گُل کھلائے - اور اب بھی اس چمن کی آبیاری آتش کے خاندان کے دم سے ہی - ہزاروں نے ان کے خاندان کے دم سے فنِ شعر کو خلعت پہنا دیے - اور زبان کو صحیح کر رہے ہیں - لکھنؤ کی بادِ مخالف کو دُور کر رہے ہیں، گنواروں کو سدھار رہے ہیں - کون ہے جو ان کا مقابلہ کرے - یہ گنوار دیہقانی خود ساختہ شاعر اور غیر شاعر جو فکرِ سخن میں عاری ہیں، انھیں کے مضامین کو اُلٹ پھیر کر کے خلاف اردوئے معلّےٰ راگ گاتے ہیں - اور شاعری کے جھوٹے دعویدار ہوتے ہیں - نااہلِ زبان سے داد طلب کرتے ہیں اور خوش ہوتے ہیں اور چند روزہ شاعری کر کے اپنی حماقت پر روتے ہیں کہ ہم نے کیوں اس فن کو بغیر علم کے نادانستہ خراب کیا -

ناسخ اور آتش کا خاندان اتنا وسیع ہے کہ ہمیشہ اردو کا محافظ رہیگا، اور بیہودہ سرایانِ سخن پشیمان ہونگے، اس لئے کہ تیلی کا کام تنبولی نہیں کر سکتا، اس لئے کہ اگر زبان کی تحقیق کا کوئی مسئلہ پیش آئیگا تو کوئی عقلمند بے وقوفوں سے نہیں پوچھے گا، بلکہ اسے دہلی اور لکھنؤ کی طرف رجوع کریگا - جس میں ہزاروں شاعرانِ مستند موجود ہیں - اگر تم کو صحیح معنوں میں زبان کی ترقی کرنا ہے تو پہلے اپنے ملک کی زبان مستند بناؤ - اس میں انجمنیں قائم کرو تاکہ تم کو معلوم ہو کہ زبان کا کون موجد ہے - لکھنؤ اس زمانے سے زبان کے بارہ میں اعتبار کے قابل ہے، جب سے خواجہ حیدر علی آتش اور شیخ امام بخش ناسخ نے اردو کو صاف کر کے اعتبار کے قابل بنا دیا تھا، اور دہلی کی تقلید سے آزادی نصیب ہو گئی تھی، ورنہ ظاہر ہے کہ ہم سب لوگ زبان دہلی کے مقلد تھے اور اسی کی پیروی کرتے تھے - جو اس کے خلاف قدم اٹھاتا تھا بیرونی اہل زبان سمجھا جاتا تھا - یہ دولت ہم کو زبانی جمع خرچ سے نہیں، بلکہ ہمارے بادشاہوں نے اپنا روپیہ اپنی دولت، اپنا وقت صرف کر کے دہلی کے محاورے، دہلی کی اصلاحیں حاصل کیں - دہلی کے تمام مشہور شعراء **نواب آصف الدولہ** کے دسترخوانِ دولت پر مدعو کئے گئے - بلکہ **میر تقی میر**

مرزا رفیع سودا ۔ میر محمدی سوز ۔ میر حسن ۔ مصحفی ۔ میر انشاء اللہ خاں وغیرہ اور دہلی کے شہزادے جہاندار شاہ ۔ مرزا سلیمان شکوہ وغیرہ دہلی کے رکابدار دہلی کے تمام صنّاع اپنے ساتھ دہلی کا تمدن، دہلی کا طرز معاشرت لیکر ہمارے ملک میں آئے اور تاحیات ہمارے مہمان رہے۔ ہمارے بادشاہوں نے ان کی بیش بہا تنخواہیں کیں، اُن کے ناز اٹھائے ۔ اُنکی بیجا حرکتوں پر خاک ڈالی اور اُن کی خاطر ومدارات میں کوئی کسر اٹھا نہ رکھی، اور سب سے پہلے بادشاہان اودھ نے اپنی صحبت میں شعراء اور شہزادوں کو جگہ دی اور خود بھی شاعری کو آغاز کیا۔

نواب آصف الدولہ خود بھی شاعر تھے، نواب وزیر علی خاں خود شاعر تھے۔ نواب سعادت علی خاں خود شاعر تھے۔ بادشاہ غازی الدین حیدر خود شاعر تھے۔ اور اُن کا کلام فارسی اُردو ملتا ہے۔ ان کی صحبتوں میں بھی تمام اہل زبان اور شعراء موجود رہتے تھے، اسی طرح ان کے زمانے میں مضافات لکھنؤ کے تمام راجہ مہاراجہ شاعری اور زباندانی کا شوق رکھتے تھے اور دادِ سخن دیتے تھے، درباری لوگوں میں انشاء مرزا قتیل، نواب طالب علی خاں عیشی وغیرہ تھے۔ اس شوق نے تمام رعیت کے دل میں شاعری اور زباندانی کا شوق پیدا کر دیا ۔ اور یہی آتش سخن سب کے دلوں میں لگی ہوئی تھی، اور سب زبان کی خدمت کو اپنی عزت کا باعث سمجھتے تھے، اور اسی پر ان کی ترقی کا دارومدار تھا، اس شبانہ روز کے انہماک نے اودھ کو زبانِ اُردو کا مرکز بنا دیا تھا، اور وہ دہلی کے اتباع سے آزاد ہو گیا۔

ہم بہت خوش ہیں کہ اس وقت ہر طرف سے آواز آرہی ہے کہ سب سے پہلے پنجاب زبان اُردو کا مرکز ہے۔ حیدرآباد زبان اُردو کا مرکز ہے اور سب سے پہلا مرکز ہے۔ اور آگرہ زبانِ اُردو کا خاص مرکز ہے۔ اور چاہتے ہیں کہ ہر طرف سے یہی آواز آئے کہ ہمارا صوبہ، ہمارا شہر زبان اُردو کا مرکز ہے۔ اس سے زبان اُردو کی وقعت اور اس کی مرکزیت تو معلوم ہوگی، لیکن اس کے ساتھ اہل ملک کو زبانِ اُردو کی ترقی کے وسائل بھی پیدا کرنے کی ضرورت ہے۔ اگر مدعیانِ زبانِ اُردو چاہیں تو کچھ مشکل نہیں۔ یہ زمانہ ترقی کا ہے۔ ہر طرف ریل اور ہوائی جہاز جاری ہیں۔ ایک صوبہ کی زبان دوسرے صوبہ میں ہوا کی طرح جا سکتی ہے۔ آپ لوگ اپنے اپنے صوبہ میں دہلی اور لکھنؤ کے اہل زبان کو جمع کریں، اور زبان اُردو کی تحصیل کا عام مذاق پیدا کریں تو آج آپ سب لوگ اُردو کو ترقی دے سکتے ہیں، اپنے اپنے ملک میں اُردو کے اسکول، مدرسے، کالج جاری کریں، اُردو میں تصنیف و تالیف کا سلسلہ جاری کریں۔ تو ہر ایک صوبہ دہلی اور لکھنؤ بن سکتا ہے۔ کچھ لکھنؤ اور دہلی میں لعل نہیں لگے ہیں۔ سب نے زبان کی خدمت

سے یہ شرف اور بزرگی حاصل کی ہے۔ دہلی اور لکھنؤ سے بڑھ کر ہر صوبہ اُردو کا خاص مرکز بن سکتا ہے۔

ع　ہر کہ خدمت کرد اُو مخدوم شد

اگر نوجوانانِ ملک اپنے ارادے کے استحکام کے لیئے کوشش کر سکتے ہیں تو انہیں زبان اُردو کے مرکز کا شرف مِل سکتا ہے۔ اور محض زبان سے کہدینے سے کہ ہمارا صوبہ زبان کا مرکز ہے کچھ نہیں ہوسکتا ہے۔ زبان کا مرکز بنانا چاہتے ہو تو قدم آگے بڑھاؤ۔ اُردو کی قدر کرو۔ خود ہی لوگ تمہارے قائل ہوجایئں گے اور تمہاری تقلید کو اپنا شرف سمجھیں گے۔ لکھنؤ میں اس کے لیئے کیا کیا کوششیں ہوئیں، اس کا ذکر تم سُن چکے۔ اب اس کے مضافات کا ایک تاریخی واقعہ بھی سُن لو۔ جناب ناسخ مرحوم کی شاعری کا چرچا ہوا، اور لوگوں کو یہ معلوم ہوگیا کہ ناسخ بیچارے ایک غریب آدمی ہیں، کوئی دولت مند نہیں، کوئی زمیندار نہیں، کوئی راجہ نہیں، لیکن **معتمد الدولہ آغا میر وزیر اودھ** کے پہلو بہ پہلو بیٹھنے کا اسے شرف حاصل ہے۔ اور خود وزیر صاحب ان کے شاگرد ہیں اور **بادشاہ غازی الدین حیدر** کے مشاعرے میں ان کی بہت عزت کیجاتی ہے، اور تمام رؤسا اور امراء وشہزادے ان کے شاگرد ہیں، اور ان کی وقعت صرف اُردو کی بدولت ہے، تو **مقیم الدولہ راجہ نواب علیخاں بہادر خیام جنگ والی محمود آباد** نے بھی شاعری کا شوق کیا، اور **شیخ امام بخش ناسخ** کے شاگرد ہوئے اور سحر تخلص اختیار کیا۔ بڑے زود گو اور پُرگو شاعر تھے اور اس فن کے ذریعہ سے ان کی رسائی تمام شہزادوں تک ہوئی۔ اُس وقت میں زمینداروں کی کوئی وقعت نہ تھی، مگر اسی اُردو کی اور شاعری کے شوق، اور **ناسخ** کے تلمیذ ہونے کے خیال سے **معتمد الدولہ آغا میر وزیر** نے ان کو اپنا رفیق بنایا، اور شاہزادوں کے دربار میں ان کی عزت ہونے لگی۔ ناسخ کے ہزاروں شاگرد ان کی دوستی کا دم بھرنے لگے۔

ان کا ایک کُلیات **بیاضِ سحر** کے نام سے چھپ چکا ہے جو آجکل کمیاب ہے۔ چنانچہ اسی شاعری کے مدائج کا ذکر کرتے ہوئے ایک مطلع میں فرماتے ہیں۔

جب در سلطان عالم پر گذارا ہوگیا　　اوج پر اقبال کا اپنے ستارا ہوگیا
کیا رگ گُل سے ہے حیرت رشتۂ تن کا تار پود　　جب بہار آئی گریباں پارا پارا ہوگیا
اپنی رسوائی کا باعث ہوگئے اطفالِ اشک　　چشم نم سے رازِ اُلفت آشکارا ہوگیا

اسی طرح اور بھی اشعار ہیں جو انکی علمیت اور مرکزیت کو ظاہر کرتے ہیں۔

غیر ممکن ہے نظارا مری تصویر کا، لن ترانی ترجمہ ہے یار کی تقریر کا
راست بازوں کو تواضع ہی کجوں کی جا نگزا، واسطے انساں کے جھکنا قہر ہے شمشیر کا
کیوں نہ ہو پیری کی صحبت سے جوانوں کو گریز، رم نہیں پوشیدہ آغوشِ کماں سے تیر کا

طائرِ رنگِ چمن پرواز پر تیار ہے، تو جو آیا سوئے گلشن یہ ہوا ہو جائیگا
سلطنت پر ہے عبث ان تاجداروں کو غرور، قصرِ عشرت ایک دن ماتم سرا ہو جائیگا

مزا جاہ کا دل اٹھانے لگا، کنوئیں عشق ہم کو جھکانے لگا
تصوّر جو ساقی کا آیا مجھے، تہی جام آنکھیں دکھانے لگا

خدا کی شان دیکھو کہ اس دیوان کے چھپنے سے راجہ صاحب کے خاندان میں شاعری کا شوق پیدا ہو گیا۔ اگرچہ اب نہ وہ سلطنت ہے، نہ وہ قدردانِ سخن شاہانِ اودھ، مگر راجہ صاحب کی وفات کے بعد ان کے جانشین فرزند سر نصیر الملت والدین ملک الشعراء دی آنریبل امیر الدولہ سعید الملک سر راجہ محمد امیر حسن خاں صاحب بہادر ممتاز جنگ کے۔سی۔آئی۔ای۔سی۔یو والیِ ریاست محمود آباد نے شوق شاعری کو انتہا پر پہنچا دیا۔ وہی شاعری جس پر راجہ مقیم الدولہ کو فخر تھا۔

آج خود شاعری سر راجہ محمد امیر حسن خاں کے نام پر نازاں ہے کہ ایسے ذی مرتبہ عالی خاندان اس کو عزت دے رہے ہیں۔ راجہ صاحب کا تخلص سحر ہے۔ آپ اپنے عہد میں بڑے بلند پایہ شاعر مانے جاتے تھے۔ لیکن آپ کو اس کی پروا نہ تھی، بلکہ شاعری خود آپکے نام سے نازاں تھی، اور پھر اس خاندان میں خدا کے فضل سے سب شاعر ہوئے، جن کا ذکر پھر کسی مضمون میں ہم کریں گے۔
راجہ محمد امیر حسن خاں اودھ کے نامور اور با اثر رئیس تھے، انہیں کی ذات سے صوبۂ اودھ کا نام روشن تھا، ان کا علاقہ ہندوستان کے مسلمانوں کا مرکز۔ ریاست کے اہم کاموں سے آپکو منٹ بھر کی چھٹی نہ ملتی تھی، مگر خدا جانے آپنے ایک بڑا کلیات کب کہہ لیا، جو آپ کی احسن قابلیت کی دلیل ہے۔ عموماً والیانِ ملک و ریاست کے کلام بے مزہ ہوتے ہیں۔ اور انہیں کچھ درد نہیں ہوتا کیونکہ ان کی زندگی نہایت عیش و آرام سے کٹتی ہے۔ پھر ایسے رئیسوں کے کلام میں سوا عیش و عشرت کے سوز و درد کہاں سے آئے۔ جسے سن کر دل بے چین ہو جائے، مگر راجہ صاحب قومی درد رکھتے تھے

اور وہ تعصبِ مذہبی سے آزاد تھے، ان کے دل میں سارے جہان کا درد تھا- اس لئے ان کے کلام میں ہر قسم کا سوز و گداز موجود تھا- آپ کا کلیات سنہ ۱۹۰۳ء میں آپ کی وفات کے بعد آپ کے فرزند اور جانشین **مہاراجہ سر علی محمد خاں ساحر** مرحوم نے اپنی ریاست میں بہ تصرفِ زرِ کثیر چھپوایا تھا نو سو صفحہ کا تقطیع کلاں پر ہے، کاغذ گندہ اور بعد طبع کے تمام جلدیں دوست احباب اعزا والیانِ ریاست اور شعراء کو تقسیم کر دیں-

اس بیان سے ہماری غرض یہ ہے کہ ابھی چوبیس برس ہوئے، اودھ کے والیانِ ریاست کو اردو زبان کے رائج کرنے کا کس قدر خیال تھا- وہ اپنا عزیز ترین وقت اور کثیر دولت اردو کی خدمت میں صرف کرتے تھے، اور اس کی تبلیغ میں مصروف رہتے تھے- اور اسی زرپاشی اور محنت سے اردو زبان معراج ترقی پر پہنچی، اسی طرح تمام والیان ریاست اردو کے سنوارنے میں مصروف تھے، کوئی ایسا نہ تھا جس کے یہاں دس پانچ شاعر نہ ہوں- مہذب اور ثقات ملازم نہ ہوں - راجہ صاحب کو مرثیہ گویوں میں **خاندانِ انیس** کا نہایت خیال تھا- اور اب تک انہیں کے خاندان کے لوگ ریاست سے تعلق رکھتے ہیں- محمود آباد میں دس پانچ شاعر کا توسل ریاست سے ہمیشہ رہا کیا- یہی شوق اودھ کے ہر غریب اور امیر کو تھا- اگر امراء کو شوق نہ ہوتا اور وہ قدر دانی نہ کرتے تو شعراء اردو کی خدمت نہ کر سکتے اور اردو تمام ہندوستان میں نہ پھیل سکتی- اب اودھ میں برائے نام چند ایسے ہیں جو اردو اور اہلِ اردو کی خدمت کو مقدم سمجھتے ہیں، باقی ہر طرف سناٹا ہے-

ہم ذکر کر رہے تھے کہ راجہ **مقیم الدولہ** نے اس کی کیا کیا خدمت کی، اور ان کے خاندان میں کتنا گہرا اثر آج تک موجود ہے- ابھی ہم راجہ صاحب محمود آباد راجہ **امیر حسن خاں صاحب** خلف **مقیم الدولہ** بہادر کا ذکر کر رہے تھے، لہذا ہم ان کے کلیات سے چند شعر درج کرتے ہیں:-

تم آئینہ میں کس کو دیکھتے ہو ۔۔۔ کوئی بیٹھا ہے صورت آشنا کیا

فراق ہی یارِ نازنیں کا، عجب ہی عالم دلِ حزیں کا ۔۔۔ اڑی گریباں کی دھجیاں ہیں، پتا نہیں جیب و آستیں کا

پھر بہار آئے جنوں اور ہو ساماں اپنا ۔۔۔ گلِ صد برگ بنے مجھکے گریباں اپنا

وارث ہے تو ہی دعوتِ خوانِ خلیل کا ۔۔۔ فارق ہے ایک نقطہ خلیل و جلیل کا

جمع اضداد کا حاصل دیکھو　　　بُت پرستی سے خدا یاد آیا

بیدلی سے حالِ دل تم نے سُنا　　　اس کہانی کا مزہ جاتا رہا

اُٹھتے جاتے ہیں گنہ سے برکاتِ عالم　　　ہے دُعا کو سحر و شام اثر کا رونا

ہم نے مانا خدا کا خوف نہ تھا　　　تم نے دُنیا کا بھی خطر نہ کیا

مبدءِ فیاض کا فیضِ مناسب دیکھئے　　　پھُول تو بخشے سپر کو پھل دیا تلوار کو

ہم دیکھتے ہیں کہ **پنجاب** کے تمام لوگ اُردو کی خدمت میں ہمہ تن مصروف ہیں، لیکن وہاں کی ریاستیں خاموش ہیں۔ کسی **امیر کبیر**، کسی **راجہ مہاراجہ**، کسی **نواب** کو اسکی خدمت کا شوق نہیں، اور وہاں اب تک عموماً کچّی زبان بولی جاتی ہے، اور ایک فرقہ ہے جو اُردو کے مٹانے کے درپے ہے۔ وہ اپنا روپیہ، اپنا عزیز وقت اس میں صرف کرتا ہے کہ زبان اُردو ہندوستان سے نابید ہو جائے، اس کے محاورے مٹ جائیں، اس کی تذکیر و تانیث تباہ ہو جائے۔ اس کے حرفوں کے اصولِ خطاطی مٹا دیئے جائیں، اور اس کے بدلے ناگری حروف جاری کئے جائیں، اسمیں بھی ہمیں غیر دانشمندانہ فعل دکھائی دیتے ہیں۔ لیکن ہمیں امید ہے کہ اگر **پنجاب** کے امرا و والیانِ ریاست توجہ سے کام لیں تو اُردو کو کوئی بگاڑ نہیں سکتا۔ اس ضمن میں **ریاستِ دکن** کی طرف ہماری نظر جاتی ہے، تو ہم دیکھتے ہیں کہ وہاں کے **عالی مرتبت بادشاہ** نے اردو کی خدمت میں اپنے خزانہ کا مُنہ کھول دیا ہے، اور خود بھی صحیح مذاق اُردو کا رکھتے ہیں، چھ سات دیوان تصنیف فرما چکے ہیں۔ اور الفاظ و محاورات کا بہت خیال ہے، اُردو کے مدارس کثرت سے اپنی عملداری میں کھول دیئے ہیں۔ مگر وہاں کے اکابرین کو مطلق اس کا خیال نہیں ہے۔ وہ سمجھتے ہیں جتنی اُردو ہم بول لیتے ہیں وہی ہمارے ملک کو کافی ہے۔ حالانکہ ان کی زبان میں پچاس فیصدی تلنگی اور مدراسی الفاظ ملے ہوتے ہیں اور ان کا سمجھنا اہلِ اُردو کے لئے محال ہے، اسلئے امرا کا فرض ہے کہ وہ اپنے

و پیش اہل زبان کا مجمع رکھیں تاکہ ان کی اردو زبان صحیح ایک مرکز پر بولی جائے، تاکہ ہندوستان میں
ہی اردو قایم ہو جائے، اور دکن کو یہ کہنے کا شرف حاصل ہو کہ ہماری اردو مستند ہے اور یہی پایۂ تخت
وکا مرکز ہے۔ ہم کو کسی کی تقلید کی ضرورت نہیں، اور یہ بات آسان ہے۔ کیونکہ دکن کی سلطنت
رو کی معاون ہے۔

آگرہ کا حال بھی اسی طرح کا ہے کہ وہ ہمیشہ زبان اردو کا گہوارہ بنا رہا، اور شاہان ہند کا
یۂ تخت تھا۔ سب سے پہلے اس کو یہ کہنے کا شرف حاصل ہے کہ اردو کا مرکز خاص آگرہ ہے۔ مگر وہاں ابھی
نی تعداد خادمان اردو کی نہیں ہے کہ شہر کے عام کی زبان صحیح اور فصیح ہو جائے۔ اگر تھوڑی بہت
ی وہاں کے والیان ملک کوشش کریں اور وہاں کے شعراء اور ادیب کی قدردانی کا دروازہ کھل
جائے تو آج وہاں کی اردو مستند ہو جائے اور ہم سب کو مان لینا پڑے کہ درحقیقت آگرہ صحیح معنوں
یں اردو کا مرکز ہے۔

رہا **مدراس**، وہ اگرچہ زبان اردو کا مرکز نہیں ہے، مگر وہاں کے لوگ اپنی حیثیت سے
یادہ اردو کا شوق و ذوق رکھتے ہیں۔ زبان کی خدمت کے دوسرے وسائل بھی انہیں اختیار کرنا چاہیے،
ور وہاں ایک **انجمن اردو** ہونا چاہیے جو مدراس کی تصانیف اردو کی قدر و منزلت کر کے
سے شائع کرے، تاکہ عوام کے دلوں میں اردو کی خدمت کی آگ بھڑک اٹھے۔ **بنگال** جو کچھ
کر رہا ہے، اگر اس پر گورنمنٹ بھی اپنا ہاتھ رکھ دے تو بہت جلد اسے ترقی نصیب ہو جائے۔
اس میں اردو کا مذاق بھی قدیم سے موجود ہے۔ اور کبھی یہ صوبہ دہلی کا مرکز رہ چکا ہے، **کلکتہ یونیورسٹی**
نے اب تک اردو کی کوئی قابل قدر خدمت نہیں کی، حالانکہ وہاں اردو کی اشد ضرورت ہے۔
مگر یہ غلطی ہماری ہے، ہم لوگ اگر چاہیں تو بہترین خدمت اردو کی ہو سکتی ہے، وہاں **فورٹ ولیم
کالج** تھا، انگریزوں کے امتحان کے لئے اردو کی اعلیٰ کتابیں اس کی طرف سے رائج ہو چکی ہیں۔
فورٹ ولیم کی تصانیف مقبول عام ہے کہ وہ اصلی اردو کے مرکز کے موافق تصنیف کی گئی ہیں،
جو کبھی منسوخ نہیں ہو سکتیں۔ اب بھی اگر وہاں کے خداوندان دولت چاہیں تو **فورٹ ولیم**
کی طرح ایک دار التصانیف کھول سکتے ہیں، جو تمام بنگال کو فیض پہنچا سکتا ہے، اور گورنمنٹ
اس کی امداد پر مستعد ہو گی۔ **کلکتہ یونیورسٹی** میں جو اردو کی کمزوری ہو رہی ہے اس کے ذمہ دار ہم
لوگ ہیں۔ خود کردہ را علاجے نیست۔ اگر اب بھی بیدار ہو کر ہم لوگ عام طور پر کوشش
کریں، تو ترقی کا دروازہ کھل جائے۔ اور کامیابی دور سے دکھائی دیتی ہو۔

بہار کی کوشش قابلِ فخر ہے، یقین ہے کہ بہار اپنی محنت کا پھل بہت جلد کھائے گا۔ اور ہم سب کو اس کی ترقی پر ناز ہو گا۔ اکابرین قوم کی کوشش بہت جلد نتیجہ خیز ہو گی۔ صوبہ بمبئی اردو کی خدمت میں ابھی تک کوئی قابلِ تعریف کام نہیں کرتا۔ حالانکہ بہت تاجرانِ ذیوقار اور صاحبِ دولت و حشمت ہیں، اور اگر چاہیں تو اُردو کی انجمنیں قائم کر سکتے ہیں، اور اس کا مرکز بنا سکتے ہیں، کیونکہ بہت سے اسکول اُردو کے انہیں کی فیاضی سے کھلے ہیں، اگر یہاں کے عام لوگ یک دل ہو کر کوشش کریں تو اس کی یونیورسٹی نہایت کامیابی سے چل سکتی ہے، اور اس صوبہ کی اُردو کتابیں تصنیف ہو کر طلبا کو فائدہ پہنچا سکتی ہیں۔

ہم اپنے خیال سے کہاں سے کہاں جا رہے ہیں۔ ہمارا مدعا یہ تھا کہ جو لوگ اپنے اپنے صوبہ کو اُردو کا مرکز کہتے ہیں وہ ایسے مرکز بنانے کی کوشش کریں تو یہ معلوم کریں کہ صوبہ اودھ میں لوگوں نے کیا طریقہ اختیار کیا جو وہ اُردو کا مرکز بن گیا، وہی سب ہی خواہانِ زبان اُردو کو اختیار کرنا چاہیئے، تاکہ اُردو جلد ترقی کرے، اور یونیورسٹی میں وہی علمی زبان تسلیم کیجائے، اس کے واسطے ہمیں کون صورتیں اختیار کرنا چاہیئے۔

خواجہ عبدالرؤف عشرت لکھنوی

باغ میں جاتے ہی لُٹ جانیکا موسم آگیا

(از مولانا سوز ناروی)

حسنِ گُل پر غور فرمانے کا موسم آگیا
پھر چمن میں وجد آجانے کا موسم آگیا

اب گریباں چاک ہو جانے کا موسم آگیا
بیٹھے بیٹھے گھر میں گھبرانے کا موسم آگیا

پھُول پینے پھُول پلوانے کا موسم آگیا
ہر قدم پر لڑکھڑا جانے کا موسم آگیا

آگیا ہاں آگیا فیضانِ قدرت کا شباب
شاخِ گل کے پھول برسانے کا موسم آگیا

دمبدم بڑھتی ہی جاتی ہے پریشانیٔ دل
گیسوئے سنبل کے بل کھانے کا موسم آگیا

ہر طرف پھولوں کے تختے دل ربا فرحت اثر
باغ میں جاتے ہی لُٹ جانے کا موسم آگیا

روز اُٹھ کر صبح دم نظارۂ گل کے لئے،
سوزؔ خسرو باغ میں جانے کا موسم آگیا

سوز ناروی

مُغلوں کے حرمِ محترم

مولوی عتیق الحق صاحب کا خطبہ

(از نواب خواجہ عبدالمجید صاحب دہلوی)

تمہید

مدّت سے مولوی عتیق الحق صاحب ملک کے کسی اسٹیج پر نظر نہیں آئے، دریافت کیا تو معلوم ہوا، فرماتے ہیں علیل رہتا ہوں۔ نام کے ساتھ مولویت کا دُم چھلّا۔ بات پر اعتبار مشکل پھر مولوی بھی جھوٹے مُوٹے کے موروثی۔ عربی واجبی ہی سی جانتے ہیں، کہیں کی سند پاس نہیں بالا چھُونے کی غرض سے دلّی کے کسی دینیات کے مدرسہ میں تین چار مہینہ درس میں شریک ہوگئے تھے۔ علالت کی علّت دریافت کرو تو فرمادیں گے، مرض بھانت بھانت کے ہوتے ہیں۔ جسمانی، روحانی، خیالی، مالی خولیا ہوگیا ہو تو خبر نہیں۔ دیکھنے میں تو اچھّے خاصے ہٹّے کٹّے موٹے مسٹنڈے نظر آتے ہیں۔ بڈّھے بیشک ہو گئے ہیں۔ مگر بڑھاپے کے نام سے چڑتے ہیں۔ ذرا بڑھاپے کا نام تو لے دیکھو، ایسے ہاتھ دھوکر پیچھے پڑیں کہ پنڈ چھڑانا مشکل ہو جائے۔ خمیدہ پُشت تو ہو نہیں سکتے۔ میانہ قامت فربہ اندام۔ بال بیشک سفید ہیں۔ فرمادیں گے نزلہ سے سفید ہوگئے۔ دانتوں کا حال خدا کو معلوم۔ یہ گھوڑے تھوڑی ہیں کہ خریدار آئے تو پہلے دانت دیکھے۔ خوب بنے ٹھنے رہتے ہیں۔ چاہتے یہ ہیں مرتے مرجائیں مگر دنیا جوان پٹھا ہی سمجھا کرے۔ معلوم نہیں اس سے ان کا کیا مقصد ہے، شاید دوسرے نکاح کی جی میں ہوگی۔ اب باہر شہر بھی کم جاتے ہیں، مرید بلاتے ہیں تو تمارض کر دیتے ہیں۔ غالبًا پیٹ بھر گیا ہے، کیوں مارے مارے پڑے پھریں۔ دہلی والوں کی یہی عادت ہے۔ پیٹ کی خاطر دھکّے کھاتے پھرتے ہیں، ٹکڑا ملنے لگا تو دہلی سے نکلنے کا نام نہیں لیتے۔ یہ باتیں تو برسبیل تذکرہ تھیں، اب اصل مطلب سُنئے:-

ہندوستان میں زنانہ تعلیم تو کسی نہ کسی عنوان سے ہمیشہ سے کچھ نہ کچھ چلی آتی تھی، مگر زمانۂ قدیم میں

تعلیم کے ساتھ تربیت کا پہلو زیادہ نمایاں ہوتا۔ ہر محلّہ میں ایک دو کھاتے پیتے لوگوں کے گھر ہوتے۔ ان کی نشست و برخاست سب کو پسند۔ شرافت اور دیانت کا محلّہ مقر۔ نیک بختی اور نیک چلنی پر اعتبار۔ غریبوں کی بہو بیٹیاں ان کے گھروں میں تعلیم و تربیت پاتیں۔ تعلیم بھی کیا کلام اللہ کے چار حرف پڑھ لئے۔ نماز روزہ سیکھ لیا، چلو چھٹی ہوئی۔ جس محلہ میں کوئی امیر گھر ہوتا، وہاں استانی جی اور مغلانی جی نوکر ہوتیں۔ گھر کی بچیوں کو تعلیم دیتیں۔ ساتھ کے ساتھ محلّہ کی بچیاں بھی اکٹھی ہو جاتیں۔ خاصا مکتب جم جاتا۔ کلام اللہ تو لازمی تھا، کچھ اُردو میں بھی شُد بُد ہو جاتی، مگر پڑھنا ہی پڑھنا آتا لکھنا تو حرام تھا۔

مغلیہ سلطنت کا خاتمہ ہو گیا، آخری نام نہاد بادشاہ بھی شہر بدر ہوا۔ غدر پڑا کسی کے پاس کھانے کو بھی نہیں رہا۔ لڑکوں کی تعلیم کیلئے تو ٹکے پاس نہیں، لڑکیوں کو تعلیم کہاں دیتے۔ خدا ایسا بُرا وقت دشمن پر بھی نہ ڈالے۔ انگریزی عملداری کے کچھ لچھن ہی نرالے ہیں۔ پادری اور پادرنوں نے ہمارے افلاس سے فائدہ اُٹھانا چاہا۔ مشن کی عورتوں نے زنانہ تعلیم اپنے ہاتھوں میں لی۔ محلہ محلہ اور گھر گھر پڑھانا شروع کیا، ہم خرما و ہم ثواب۔ مذہب بھی پھیلائینگی۔ عملداری کی عظمت بھی دلوں میں بٹھائینگی۔ کوئی ہتّے چڑھ گئی تو کرسٹان بھی بنا لینگی۔ کچھ نہیں تو مذہب کی طرف سے دل تو اچاٹ ضرور کر دینگی اپنی طرف اور اپنی طرز زندگی کی طرف راغب کر دینگی۔ اس میں بڑا تجارتی فائدہ ہے، جس کے بیان کا یہاں موقع نہیں۔

یہ صورت حالات تھی کہ چند قوم کے بہی خواہوں نے ارادہ کیا، مشن کی عورتوں کا قدم درمیان سے ہٹا دیا جائے۔ مسلمان لڑکیوں کے لئے تعلیم گاہ قائم کیجائے۔ اس تحریک کا اصلی باعث ایک آدھ لڑکی کا اغوا تھا۔ چندہ فراہم کرنے کی غرض سے جلسہ کے انعقاد کی فکر ہوئی۔ شہر میں دعوت نامہ تقسیم ہوئے۔ ہر مقرر سے التماس کیا گیا کہ وہ کچھ فرمائیں اور دلوں کو گرمائیں۔ اسی مقصد کے لئے چند آدمی مولوی عتیق الحق صاحب کی خدمت میں حاضر ہوئے اور خطبہ کی فرمائش کی۔ اس زمانہ میں ان کی جون پر مغلیہ تاریخ چڑھی ہوئی تھی، اپنے ہر خطبہ میں تاریخی پہلو مدنظر رکھتے تھے، اس کو اپنی شہرت کا باعث خیال فرماتے تھے چنانچہ خطبہ کا موضوع "مغلوں کے حرم محترم" قرار پایا۔ اگرچہ یہ موضوع اصل مقصد سے دُور کا بھی تعلق نہیں رکھتا۔ تاہم ان کا نام آدمیوں کو دُور دُور سے گھسیٹ لانے کے لئے کافی تھا۔ یہ بھی ایک طرح مطلب برآری کا موجب۔ ان کی شہرت آجکل زوروں پر ہے۔ اس شہر میں ذرا مشکل ہی سے آدمی مشہور ہوتا ہے۔ بعض عقل کے دشمن اس کو چراغ تلے اندھیرے سے تعبیر کرتے ہیں۔ اصل بات یہ نہیں، دہلی کی سرزمین سے ایسے ایسے درخشاں چراغ روشن ہوئے ہیں کہ اُن کے سامنے ان جگنوں (چھوٹا چراغ) کی حقیقت

ہی کیا ہے کہ شہر والوں کی آنکھوں کو خیرہ کرسکے۔ دوسرے خطوں کا یہ حال نہیں۔ وہاں کوئی پیدا ہی نہیں ہوا اگر اچھا آگیا کوئی تھوڑا بہت قابل ہو جاتا ہے، اہلِ وطن اُس کو بانس پر چڑھا دیتے ہیں، جہاں رُوکھ نہیں وہاں ارنڈ ہی روکھ۔ چلو اسی کے ذریعہ سے اپنے وطن کی تو شہرت ہو گی۔ دوسرے ایک اور بات ہے۔ اس خاک کے ادنےٰ ادنےٰ آدمی میں ایک خاص قابلیت ہے، جو دوسرے ممالک کے آدمیوں سے اُسے ممتاز بنا دیتی ہے، یہی وجہ ہے کہ دہلی والا جہاں نکل جاتا ہے، ایک خاص حیثیت پیدا کر لیتا ہے۔ اس قابلیت کے دماغوں کے سامنے معمولی قابلیتوں کا چراغ جلنا مشکل ہو جاتا ہے۔ میں دوسری بحث میں پڑ گیا۔ اب نفسِ معاملہ سُنئے :۔

جلسہ چاندنی محل میں قرار پایا، شامیانہ تلے کرسیاں لگیں۔ وضیع اور شریف جمع ہوئے۔ مولوی صاحب بھی تشریف لائے۔ خموشی ایک کونے میں جا بیٹھے۔ نواب ثریا جاہ بہادر صدرِ جلسہ بنے، موٹے تازے، پورے سات فٹ کے، بھرے شاہزادے۔ سارے دہلی کے شاہی خاندان کی سب ان کی تعظیم کریں۔ انہوں نے پاٹ دار آواز میں مجمع کو مخاطب کر کے فرمایا :۔

" آپ سب صاحب مولوی عتیق الحق صاحب سے خوب واقف ہیں۔ آپ ہی کے شہر کے آدمی ہیں، کوئی اجنبی نہیں۔ انہوں نے اپنے خطبات سے دہلی کا نام روشن کیا ہے، ہم پر ان کا بڑا احسان ہے، آج کرم فرمایا ہے، خطبہ دینے تشریف لائے ہیں۔ خطبہ کا عنوان "مغلوں کے حرمِ محترم" ہے۔ یہ فقیر بھی اسی خاندان کا نام لیوا ہے۔ اس موضوع سے دلچسپی کیسے نہ ہو۔ میں جانتا ہوں دلی کا بچہ بچہ مغلوں پر جان دیتا ہے، ان کا نام آجاتا ہے تو آنکھوں سے آنسوؤں کے دریا بہہ جاتے ہیں۔" لیجیے اب مولوی صاحب کا خطبہ سُنئے :۔

خطبہ

معزز حاضرین اور صدر والاجاہ ثریا بارگاہ !

مجھے جو آج بلا کر آپ نے اعزاز بخشا ہے، اس کا شکریہ عرض کرتا ہوں اور ساتھ کے ساتھ ایک قطعہ پیش کرتا ہوں ؎

بڑھاپے میں جا کر جو عزت ملے گی ۔۔۔ تو کیا اور جینے کی فرصت ملے گی
مرا جو ہے دم وہ دمِ واپسیں ہے ۔۔۔ مسافر کو منزل پہ راحت ملے گی (از خواجہ)

جس موضوع پر میں بیان کرنے کھڑا ہوا ہوں، وہ نامکمل رہیگا۔ اگر میں پہلے ازدواج کے اصول کا ذکر نہ کروں، یہ مضمون اس قدر وسیع ہے، اگر شرح و بسط سے بیان کیا جائے تو ایک کتاب میں سمائے

ازدواج کا طریقہ معلوم ایسا ہوتا ہے کہ مدنیت اور حضریت سے پہلے موجود تھا، یہ اس عہد کی پیداوا نہیں، انسان کی جبلی خواہش تملیک اس کا مولد و منشا ہے۔ انسان بالطبع تملیک کا دلدادہ ہے اور اشتراک سے متنفر۔ ملکیت جمادات اور حیوانات پر بہ آسانی تصور ہو سکتی ہے، مگر نوع بشری پہ مشکل سے سمجھ میں آتی ہے۔ تاہم ایام قدیم میں بیش از بیش اور فی زمانا بھی ایک حد تک پائی جا ہے، غلام بنانا اور غلام کے جان و مال پر مالک کا تصرف اس کا بیّن ثبوت ہے۔ عورت کو ہمیشہ سے مرد نے اپنے سے ادنیٰ درجہ کی جنس تصور کیا ہے، وجہ اختلاف قوائے جسمانی ہیں۔ اسی بنا پر عورت لئے تحصن ہر زمانہ میں لازمی قرار پایا۔ یعنی ایک وقت میں وہ صرف ایک مرد سے اپنا مناکحتی تعلق رکھ سکتی ہے۔ برعکس اس کے مرد ہر مذہب و ملت میں بہت کچھ آزاد نظر آتا ہے۔ اگرچہ مذاہب نے پابندیاں لگا دی ہیں، یہ پابندیاں بھی اصول کے تحت معدوم ہوتی ہیں۔ اس کی بنا ملک کی مردم شما میں اعداد کا تناسب ہے۔ تاہم اعداد کا تفاوت بھی تحصن کے عام قاعدے کو نہیں توڑ سکا۔ یہ ہر ع میں اور ہر ملک و ملت میں نمودار ہے۔ محرمات شرعی کا مسئلہ ہر مذہب میں مختلف ہے۔ اس کی بنا اعداد کا فرق معلوم ہوتی ہے۔ صحرا نشین معاشرت کے زمانہ میں تملیک بزور بازو تھی۔ مدنیت آئی تو قسم کی تملیک میں دوسروں سے مدد لینے کی بنیاد پڑی، اس صورت میں ملکیت کا باضابطہ ثبوت لازم ہو تاکہ حقوق کی حفاظت حق پرستی کی بنا پر ہو سکے۔ قانون قاعدے اور شہادت کی حاجت ہوئی۔ یہی تحفظ اور ملکیت پردہ کی رسم کی بنیاد ڈالتی ہے۔ کسی کی عورت سے خلا ملا تو درکنار۔ وہ اس کا بھی روا نہیں کہ غیر شخص اس کی طرف آنکھ اٹھا کر دیکھے۔ اس میں انساب کی حفاظت مدنظر ہے، اور انساب کا شروع ہی سے شیفتہ ہے۔ نیز اولاد کی پرورش کا بار بھی مرد کے ذمہ ہے، کچھ عنصر شفقت کا بھی شہ ہے، یہ دیکھ کر یہ رسم درست معلوم ہوتی ہے۔

آمدم برسر مطلب، جب مغلوں کی قوم میں مدنیت آئی۔ ازدواج کی رسم جاری ہوئی، مگر ابتدائی طریقہ پر۔ مرد جتنی چاہے عورتیں اپنے تحت و تصرف میں لائے۔ عورت اس سے محروم رہی، خلاف روتیہ اختیار کرنے کی صورت میں عورت مردود خلائق۔ تاریخ بتاتی ہے کہ قبول اسلام سے مغلوں کے ہاں پہلی منکوحہ کو بڑے اختیارات حاصل تھے۔ چنانچہ یہ واقعہ بھی نظر سے گذرا ہے کہ پہلا نے اپنی سوکن کو باوجود اس کے کہ وہ شوہر کی پسندیدہ تھی، شوہر کی غیر موجودگی میں دوسرے مرد کے کر دیا۔ اور اس پر اعتراض نہ ہو سکا۔ عورت کا اس قوم میں مرد کی ملکیت ہونے کا اس سے زیادہ کیا ثبوت کہ باپ کے مرنے کے بعد اس کی بیویاں اولاد ذکور پر مثل دوسرے مال متروکہ کے تقسیم ہو جاتی تھیں،

اولاد کے ساتھ اُن کا زن و شو کا تعلق قائم ہو جاتا، ہاں سگی ماں اس سے مستثنےٰ تھی۔ نعوذ باللہ
سلام میں داخل ہونے کے بعد صرف ایک ایسے واقعہ کی مثال ملتی ہے۔
قبول اسلام کے بعد مغل دل و جان سے شریعت محمدی کے پابند ہو گئے۔ نکاح چار سے زیادہ نہیں ہوئے
نڈیاں اس شمار میں نہیں۔ مغل مفتوحہ ممالک کی رعایا کو بندی نہیں بناتے تھے، اس لئے اُن کے حرم میں جو
نڈیاں داخل ہوئیں ضرور ہے کہ وہ بیع و شریٰ کے ذریعہ سے حاصل کی گئی ہوں۔ اس کے جواز میں
ختلاف ہے، تاہم اسلامی ممالک میں یہ عمل ہمیشہ جاری رہا۔

اب مفصل حال سُنئے۔ بابر بادشاہ کے حرم میں صرف مغل عورتیں ہی تھیں۔ شاید لونڈیاں بھی ہوں
ہندوستان کی کوئی منکوحہ عورت نہ تھی، اور اگر تھی تو تاریخ میں اس کا کہیں ذکر نہیں آتا۔
ہمایوں کے نکاح میں حسب دستور سابق سب مغل عورتیں تھیں، صرف ایک ہندوستانی عورت کا
پتا چلتا ہے، یہ میواتن تھی۔ مسلمان میواتی پٹھانوں کی اولاد۔

دورِ اکبری معاشرتی تلاطم کا عہد ہے۔ ہندوستان میں بستے ہوئے تین پشتیں گزر گئیں، یہاں کی آب و
ہوا نے دماغوں کو ماؤف کر دیا۔ جا و بیجا خوشامد نے سر پھرا دیا۔ معاشرتی تلاطم کا راز اکبر کی بد دینی میں نہاں
ہے، مناسب معلوم ہوتا ہے کہ اس مسئلہ پر بھی خفیف سی روشنی ڈالتا چلوں۔ جو واقعات تاریخی پر مبنی ہیں۔ اکبر
صغیر سن تھا کہ باپ کا سایہ اُس کے سر سے اُٹھ گیا، جب تک سایہ تھا بھی تو وہ سایہ سے دور تھا۔ مغل کا خون
جنگ جو ہوتا ہے، وہ ہمیشہ مرد میدان رہتا ہے۔ اس باب میں محتاج تعلیم و تربیت نہیں، ہاں دوسرے
معاملات کے لئے دماغ کو صیقل کی ضرورت پڑتی ہے۔ یہاں یہ مفقود تھی۔ پے در پے کامیابیاں نصیب ہوئیں
ان کا ابتدائی عہد میں سہرا بیرم خاں کے سر ہے۔ اقتدار اور جبروت اچھے خاصے پڑھے لکھے کو فرعون بے سامان
بنا دیتا ہے۔ اور جہاں جہالت ہو تو یہ آتش جہاں سوز ہو جاتی ہے۔ آدمی اک باگا ہو کر رہ جاتا ہے۔ جدھر
منہ اُٹھ گیا ادھر کا ہو لیا۔

اکبر کی طبیعت میں جودت اور اختراع کا مادّہ بہت تھا، اس کے ساتھ ذہانت۔ تعلیم اس میں اعتدال
پیدا کر سکتی تھی اور راسخ الاعتقاد بنا سکتی تھی، مگر اُس کی نوبت ہی نہیں آئی۔ علم و دانش کی طرف شاہ کی
طبیعت راغب ہوئی۔ ملک میں قسم قسم کے مذہب رائج تھے، خصوصاً ہندو دھرم کی تو لاتعداد شاخیں تھیں
تحقیق حق کا شوق دامن گیر ہوا۔ علمائے مذہب جمع کئے گئے۔ مباحث شروع ہوئے۔ بحث کا کبھی کوئی نتیجہ
برآمد نہیں ہوتا۔ بلکہ ایک خالی الذہن اور جودت پسند طبیعت ہر مذہب کی یک رنگی اور ساتھ کے ساتھ تین
مختلف ان کے غیر حق ہونے کی طرف انسان کو راغب کر دیتا ہے۔ پھر ابو الفضل جیسے جیّد عالم اور ملحد کی

صحبت اور مباحث پر اُس کے حاشیہ چڑھانے، عالم فاضل کو گمراہ کردے۔ اکبر غریب کی تو کیا حقیقت تھی، کسی مذہب کا اعتقاد باقی نہیں رہا۔ سلطنت اور اُس کا جبروت دست بستہ حاضر تھا۔ اُکسانے والے پیٹ کے کُتے اُکسا رہے تھے، اور بار بار چڑھا رہے تھے۔ نری ہاں میں ہاں ہی نہیں ملاتے تھے، بلکہ اس کی خام خیالی کی دلائل و براہین سے تائید کرتے تھے۔ اپنے عقائد اور علمی نظائر پیش کرتے تھے، نتیجہ یہ ہوا کہ اس کو منصب شاہی سے اُٹھا کر منصۂ خدائی پر لیجا بٹھایا۔ پھر جو ہونا تھا وہ ہوا۔ معاشرت کے ہر شعبہ پر سیاست کا رنگ چڑھ گیا۔ سب میں مدِّ نظر سلطنت کا استحکام، ہولی کھیلی جانے لگی، چھوٹے بڑے سارے ہندوؤں کے تہوار منائے گئے۔ پوتھیاں کھلیں، تُلا دان ہوئے۔ برہمنوں نے تِلک کیے۔ ان پر اعتقاد نہ تھا، اور ہوتا بھی کیسے، جب مذہب ہی لا شئے ہے۔ یہ ساری کارروائی ہندوؤں کو خوش کرنے کی تھی، اس قوم کی تالیف القلوبی مدِّ نظر۔ مسلمان تو اپنے تھے ہی۔ غیروں کو اپنا بنانے کا منشا تھا۔

ہندوستان میں اسلامی سلطنت قائم ہوئے صدیاں گزر گئی تھیں، مگر تاج و تخت ڈانواں ڈول ہی رہا۔ کبھی کسی خاندان میں کبھی کسی میں۔ چلتی پھرتی چھاؤں تھی۔ اسباب یہ تھے، اور نئی بیرونی سپاہ فوج شاہی میں بھرتی ہوتی، اس کا طریقہ یہ تھا۔ سردار بیرونی سلطنت سپاہ جرار بھرتی کرتا، کیل کانٹے سے اُسے آراستہ کرتا۔ ساتھ لیکر ملک میں داخل ہوتا۔ بادشاہ کے روبرو پیش ہوتا۔ سپاہ کا ملاحظہ ہوتا، سردار ملازمت شاہی سے سرفراز ہوتا۔ یہ تازہ بیرونی جرأت اور قابلیت اور سپاہ گری کے ہنر اپنے ساتھ لاتے۔ بادشاہ سے زیادہ اپنے سردار کے مطیع فرمان ہوتے۔ ہندوستان میں بود و باش کرنے والے سرداروں کے دماغ اور قوٰی یہاں کی ماوُف کن آب و ہوا سے متاثر ہو چکے ہوتے۔ نئے دماغ اور جرأتیں ان کی جگہ سنبھال لیتیں۔ حکومت ایک گھرانے سے دوسرے گھرانے میں منتقل ہو جاتی۔ اس کی پیش بندی پیش نظر تھی۔ یہ اسی صورت میں ممکن العمل تھی کہ ہندوؤں کو ساتھ لیں اور بیرونی امداد سے مستغنی ہو جائیں۔ کیونکہ بیرونی امداد انہی کی سرکوبی کے لئے درکار تھی۔ اس مسئلہ کے حل میں یقینی ابو الفضل کا ہاتھ تھا۔ جہانگیر اپنے تزک میں لکھتا ہے "ابو الفضل کا دماغ یونانی حکمار کے مثل تھا"۔ ان کارروائیوں کا جو نتیجہ برآمد ہوا۔ وہ ہمارے موضوع سے تعلق نہیں رکھتا۔ اس لئے قلم انداز کیا جاتا ہے، ہمارے پیش نظر تو ازدواجی تعلقات ہیں۔

اگر مذہبی پابندیاں اُٹھا دی جائیں تو ازدواجی تعلقات میں بہت فراخی ہو سکتی ہے۔ اکبر کے پیش نظر یہ فراخی نہ تھی۔ بلکہ اصول سیاست پر نگاہ تھی، انگریزی مثل مشہور ہے Blood is thicker than water ہندوستان کی بہادر راجپوت قوم سے رشتۂ صہری پیدا کر کے ان کو مطیع نہیں بلکہ اپنا اور اپنی اولاد کا دست بنا لینا اصلی مقصد تھا۔ اس طرح حکومت اسی خاندان میں محصور ہو کر رہ جائیگی، یہ ہوا۔ مگر حرم میں ہندنیوں کے

داخل ہوجانے سے ہندوؤں کا اقتدار بڑھ گیا۔ اور مغلیہ سطوت میں فرق آگیا۔ اہل ہنود پر وہ رعب و داب جو شاہانِ پیشین کا تھا قائم نہ رہ سکا۔ رعایا کے ساتھ راعی کے خلط کا ہمیشہ یہی نتیجہ ہوتا ہے، خاصکر جہاں غیر قوم اور مذہب اور رعایا ہو۔ وہاں یہ عمل مہلک ثابت ہوتا ہے۔ اکبر اس قباحت پر نظر نہ ڈال سکا۔ جب پانی سر سے گزر گیا تو اورنگ زیب کو یہ خرابی صاف نظر آنے لگی، دفعیہ کی کوشش کی مگر ہندوؤں کا تسلط تمام سلطنت کے شعبوں پر اس درجہ ہو چکا تھا کہ کوئی تدبیر کارگر نہیں ہوئی۔ ہندوؤں کو ممنوع الملازمت کرنے کے احکام صادر ہوئے مگر تھوڑی ہی مدت بعد واپس لینے پڑے۔ محکوم قوم کی سازشیں روز بروز ترقی پذیر رہیں۔ اس کا مرکز محلوں کے اندر تھا، افراد اختیار سے باہر۔

اب اس مسئلہ کو مذہبی نکتۂ نظر سے دیکھئے۔ اس قسم کے ازدواج نہ ہندو دھرم جائز رکھتا ہے نہ اسلام۔ ایسے تعلق سے جو اولاد پیدا ہو دونوں مذہب اُس کو حلالی قرار نہیں دے سکتے۔ اکبر کا جبروت اس امر کے واسطے کافی نہ تھا کہ ایسی اولاد کو حلالی بنادے۔ اندیشہ تھا کہ آئندہ وراثت تاج و تخت میں یہ چیز خلل انداز ہوتی۔ نیز اگر ہندو ایسے رشتوں سے خوش دل ہوں تو مسلمانوں کے علماء مسلمانوں کو بددل کر دینگے۔ تدبیر یہ نکالی گئی، منکوحہ کو قبل از نکاح ایک مرتبہ کلمۂ طیبہ پڑھا دیا جائے، خواہ وہ اُسے خاک نہ سمجھے مگر آڑ تو ہو جائیگی۔ اولاد حرامی ہونے سے تو نہیں، مگر وارث تخت و تاج نہ ہونے سے تو بچ جائیگی، پھر عقد اسلامی شرع کے مطابق عمل میں آئے، اس طرح سے مسلمانوں کو گونہ تشفی ہوجائے اور مولویوں کی دست رس سے رستگاری ہو، حیلہ شرعی موجود ہوگا۔ اندر خانہ کچھ ہوا کرے، کسی کو کیا خبر۔ چنانچہ اندرون محل ان رانیوں کے واسطے مندر تعمیر ہوئے، اور دل کھول کر بُت پرستی ہوئی۔ اگر اسلامی نظر سے دیکھا جائے تو اولاد حرامی کی حرامی، بلکہ اُس سے بھی بدتر مُرتدہ کی اولاد۔ چلتے کا نام گاڑی ہے، کام چل گیا۔

اب باہمی ازدواج کا قصہ سُنئے۔ اس کو انگریزی مصنف بڑے آب و تاب سے بیان کرتے ہیں۔ مطلب صرف اتنا ہے کہ ہندو مسلمانوں کے مذہب میں رخنہ اندازی کریں۔ وہ اسے نگاہ استحسان سے دیکھیں۔ اور دونوں قومیں اس قسم کی مناکحت پر تل جائیں۔ نہ ہندو، ہندو رہیں، نہ مسلمان مسلمان۔ بددینی عام ہوجائے۔ مذہبی احساس دونوں میں سے جاتا رہے، جس کا حکومت کو ہمہ وقت خطرہ لگا رہتا ہے۔ کچھ انگریزی عقل کے پرستار اس پر ایمان بھی لے آئے ہیں۔ اور اکبر کی اس حرکت کو پسندیدگی کی نظر سے دیکھتے ہیں۔ خاصکر تعلیم یافتہ ہندو اس استدلال سے زیادہ متاثر معلوم ہوتے ہیں۔ غور کا مقام ہے، اوّل تو ہندو راجاؤں کی بیٹیوں کو جھوٹ موٹ ہی سہی، کلمۂ طیبہ پڑھا کر شادی کی گئی، یہ ہندو دھرم کی کیسی توہین ہوئی۔ مگر دنیاوی مفاد نے راجاؤں مہاراجاؤں کی آنکھوں پر پردے ڈال دیئے تھے۔ اس ذلت کو

اُتّم راجپوت بھی عزت سمجھتے تھے۔ خود اکبر کو آمیر کے راجہ نے اپنی بیٹی بہ طیبِ خاطر دی۔ کسی پنڈت یا دھرم دیوتا نے اس پر ناک بھوں تک نہیں چڑھائی۔ اللہ رے مغلوں کی حکومت کا اقتدار۔ مگر یہ سب کچھ راجاؤں تک محدود رہا، باقی ہندو دھرمی ادھرمی نہیں ہوئے۔ چوڑے چماروں نے بھی اپنی خوشی سے اپنی بیٹیاں مل امیروں تک کو نہیں دیں۔ اپنے دھرم پر جمے رہے، اس سے یہ خیال کرنا کہ ہندو بے غیرت ہیں یہ غلط ہے۔ بلکہ بے غیرت اور بے حیا تو راجاؤں کو کہا جا سکتا ہے جنہوں نے دنیاوی عزّ و جاہ کی خاطر یہ تذلیل گوارہ کی۔

ترکوں اور پٹھانوں کے عہد میں بھی مسلمان بادشاہ اور اُن کے امیر ہندو عورتوں سے نکاح کرنے سے نہیں چوکتے تھے، اس میں اور اُس میں بڑا فرق ہے۔ جب زبردستی نکاح ہوتے تھے، اور زبردستی اسلام قبول کرایا جاتا تھا۔ اب راضی رضا سے کام ہونے لگا۔ اس سے ذہنیت کا ابتذال ظاہر ہوتا ہے نہ افتخار، مسلمانوں نے کب ہندوؤں کی بیٹیاں لینے سے انکار کیا۔ یہ تو عورتوں کے ایسے شائق ہیں کہ حلال خوری اور چماری تک کو نہیں بخشتے۔ چہ جائے ستونتی عورتیں۔ علاوہ اس کے باہمی مناکحت تو یہ معنی ہوتے ہیں کہ بیٹی دیں اور بیٹی لیں۔ ذرا کوئی بتائے تو سہی، عین اس رسم کے عروج کے زمانہ میں کون سی شاہزادی یا امیرزادی یا شریف زادی اپنے اہل کی رضا و رغبت سے کسی ہندو راجہ مہاراجہ کے رنواس میں داخل ہوئی، کہیں ایک ہاتھ سے بھی تالی بجی ہے، اس کو نظرِ استحسان سے دیکھنا ہمارے انگریزی دان دماغوں ہی کا کرشمہ ہو سکتا ہے، جو انگریزی مورخوں کے دھوکے میں آکر اکبر کی اس کارروائی کو سراہتے ہیں اور بغلیں بجاتے ہیں۔ بریں عقل و دانش بباید گریست۔ ان کو تو اکبر کا سخت ترین دشمن ہونا چاہیے۔ اُس نے مال و جاہ کا لالچ دے کر دھرم اور آبرو کو خراب کیا۔ اگر کوئی راجاؤں کا گھرانہ قابلِ ستائش ہے تو وہ اودے پور کے راجپوت ہیں، اُنہوں نے یہ ذلت گوارا نہیں کی، اور راج پاٹ چھوڑ بیٹھے۔ مگر اکبر کے آگے سرِ تسلیم خم نہیں کیا۔ باقی سبھوں نے اپنی پگڑیاں اتار کر مغلوں کے قدموں میں ڈال دیں۔ عزت گنوا کر دنیا وہاں کی۔ سب سے بری حرکت مہاراجہ جے سنگھ کی عہد عالمگیری میں تھی جس کو میں بیان کرتے شرماتا ہوں۔

جہانگیر کی شادی جودھ پور والی جودھا بائی سے ہوئی۔ یہ والدۂ شاہجہاں ہیں۔ دورِ اکبری میں جو شادی بڑے دھوم دھام سے ہوئی وہ یہی ہے۔ اس کی شہرت کے راگ اب تک تاریخ میں گائے جاتے ہیں، مہاراجہ جودھ پور راجپوتوں کے سردار نامی گرامی معرکہ آرائی میں یکتا، ان کی بیٹی محلِ شاہی میں آتی ہے، ولی عہد بہادر سے بیاہی جاتی ہے۔ شہنشاہ بہ نفسِ نفیس بارات لیکر جاتے ہیں، باپ بیٹے

دونوں اپنے کندھوں پر ڈولا اٹھاتے ہیں۔ مہاراج کی عزت بڑھاتے ہیں، مہاراج پھولے نہیں سماتے، مگر حقیقت حال دیکھیے تو ایک دھرمی سورج بنسی ایک ملکش کو بیٹی دے رہا ہے۔ خواہ وہ کیسا ہی ذی مرتبہ شخص ہے۔ قلعہ اکبر آباد میں خاص محل تعمیر ہوتا ہے، اس کو یہ آباد کرتی ہیں۔ اس محل میں مندر بنتا ہے اور غیر اللہ کی پرستش ہوتی ہے۔ کیوں صاحب یہی اسلام ہے اور اسی کو اسلامی حکومت کہتے ہیں۔ مسلمانان در گور اور مسلمانی در کتاب۔ مولوی اور پنڈت دونوں ساکت ہیں، ان کو سانپ سونگھ گیا ہے۔ کوئی صدائے احتجاج بلند نہیں کرتا۔ جذبات مذہبی وہم ہو کر رہ گئے ہیں، دولت اور اقتدار کے آگے سر خم ہیں۔ سطوت مغلی اور خاصکر اکبری دم مارنے کی اجازت نہیں دیتی۔ سب کے لقمہ حرام سے پیٹ پل رہے ہیں۔ مہر سکوت منہ پر لگ گئی ہے۔ اسی ازدواج کا نتیجہ حضرت شاہجہاں بادشاہ غازی ہیں۔ نسل مخلوط ہو گئی۔ حرمت و حلت عقد آپ کے سامنے ہے۔ اب فرمایئے آپ کیا فرماتے ہیں۔ کیوں صاحب! دین سیاست کی قربان گاہ پر قربانی چڑھ گیا یا نہیں۔

شاہ جہاں کے یہاں یہ نظارہ نظر نہیں آتا۔ اس کی بھی کئی بیویاں تھیں۔ مگر سب مسلمان۔ اصل میں بیوی تو ارجمند بانو ہی تھی، جس کو پی چاہے وہی سہاگن کہلائے۔ اسی کے بطن سے ساری اولاد ہے۔ اب دھرم دیوتا حضرت عالمگیر کو ملاحظہ فرمایئے۔ محل میں کشت دار کشمیر کی بیٹی موجود ہے۔ محمد معظم اسی کے بطن سے ہے لیجیے وہ اسلامی ترنگ کہاں گئی۔ وہ دن کہاں گئے جب دارا شکوہ بدمذہبی کے الزام میں قتل کیا گیا۔ مولوی صاحبان نے اس غریب کے قتل کا تو فتوی دے دیا۔ مگر حضور کے گھر میں جو رانی صاحبہ تھیں ان سے تعارض نہیں کیا۔ یہاں زبان گنگ ہے۔ غزوے ہوتے ہیں، اسلام کے نام پر ملک سر کیے جاتے ہیں۔

.... ہندوؤں پر در ملازمت مسدود کیا جاتا ہے۔ بڑے مذہبی بادشاہ بنے بیٹھے ہیں۔ ساتھ کے ساتھ دکن میں دیویوں (مندروں) کے نام ایک نہیں بیسیوں سمستانوں (جاگیروں) کی سندیں اپنے مہر و دستخط خاص سے جاری فرماتے ہیں۔ یہ جاگیریں آل تمغہ میں لیجیے دھرم دیوتا یہ کام انجام دے رہے ہیں۔ بت پرستی کی اعانت فرما رہے ہیں۔ اگر یقین ہو تو ریاست حیدر آباد میں جا کر یہ سندیں اپنی آنکھ سے دیکھ لو۔ آخر یہ تماشہ کیا ہے، کیا اورنگ زیب پاگل تھا، ایک طرف تو ایسے کام کرتا، اور دوسری طرف اس کے برعکس۔ حضور وہ بہت عقلمند تھا، وہ دھرم دیوتا نہیں عقل دیوتا تھا۔ سارے کام سیاست کے تحت انجام پاتے تھے۔ ساری مغلیہ کارروائیوں میں اگر گہری نظر سے دیکھو یہی راز مضمر ہے۔ کسی کو برا بھلا کہنے کی گنجائش نہیں، یہ ہندو و مسلمانوں میں نفاق ڈالنے کی

غرض سے انگریزی مصنفوں نے ڈھونگ رچا رکھا ہے۔ ہم کو اتنی فرصت کہاں کہ مبسوط تاریخوں پر نظر ڈالیں، اور بال کی کھال نکالیں۔ پھر یہ تاریخیں سنگ لاخ فارسی میں۔ ہم کو تو انگریزی آگئی ہے۔ اسی میں پڑھ لیتے ہیں اور ایمان لے آتے ہیں۔ یہ جو کچھ میں نے عرض کیا صرف ازدواج کو مدِ نظر رکھ کر بیان کیا ہے۔ اگر دوسرے مغلیہ سلطنت کے واقعات منظرِ عام پر لائے جائیں تو معلوم نہیں کیا گل کھلے۔

یہاں تک خطبہ دے کر مولوی صاحب یہ فرمانے لگے، میں آپ صاحبوں سے معافی چاہتا ہوں اس کی نہیں کہ میں نے آپ کا بہت وقت لیا، بلکہ اس کی بھی کہ میں نے آپ کے معتقدات کے خلاف بہت کچھ پیش کیا۔ مجھے امید ہے کہ اگر کسی کو مجھ سے اختلاف ہوگا تو وہ معاف کریگا۔ کیونکہ میں نے اپنے نزدیک صداقت سے کام لیا ہے۔ کسی کی جانب داری نہیں کی۔ تاریخ جو منظر میرے سامنے پیش کرتی ہے، وہ میں نے بے کم و کاست آپ کے سامنے لا کر رکھ دیا ہے۔ یہ کہہ کر سامعین اور صدر کا شکریہ ادا کیا اور بیٹھ گئے۔

جلسہ ختم ہوا

خواجہ محمد عبد المجید دہلوی

"چاند سے!"

آج پھر تو میرے مکان کی چہار دیواری کے اُس پار سے جھانک رہا ہے، اُسی آن بان کیساتھ، وہی چمکیلی شعاعیں دامن میں چھپائے ——— میں نے تجھ سے سو بار کہہ دیا کہ تو آسمان والوں کا چاند ہے، زمین والوں کا نہیں، اور اگر زمین والوں کا ہو تو میرا چاند نہیں ——— میرا چاند کوئی اور ہے۔ ———

تُو نے میرا چاند دیکھا ہے؟ ——— وہ تجھ سے بھی زیادہ حسین ہے اور اسکی شعاعیں تجھ سے بھی زیادہ نرم اور روح افزا ہیں ——— تو ہنس رہا ہے؟؟ ——— اسی لئے ناکہ میرا چاند ایک بار میری دنیا روشن کر کے پھر روشن کرنے نہ آیا؟ اچھا ہنس لے ———

اچھا ایک بات پوچھوں؟ ——— لوگ کہتے ہیں تیری یہ پُرکیف شعاعیں اپنی نہیں۔ تُو نے یہ آفتاب سے مستعار مانگی ہیں، اگر آفتاب نہ ہوتا تو تیری یہ شعاعیں بھی نہ رہتیں اور شاید تو تو نہ رہتا ——— کیا یہ سچ ہے؟ ——— تو کیا میرے چاند کی شعاعیں بھی شمس ہی کی مرہونِ منت ہیں؟؟ ———

شمس ہاشمی
(کربلے پر سرائے)

مطالعہ

(از طالب العلم)

مارچ ۱۹۴۲ء کے ساقی میں آغا اشرف صاحب نے انڈیا آفس اور وزیر ہند مسٹر ایمرے سے ملاقات کے سلسلہ میں لکھا ہے کہ مسٹر ایمرے ہندوستان سے جاکر اپنے بھائی سے ہندوستانی یعنی اُردو زبان میں گفتگو کرنے کے کچھ دن عادی رہے۔ "لیکن بعد میں ایکا ایکی ...... یہ زبان بھول گئے" یہ اُس شخص کا بیان ہے جو آغا صاحب کو سورۂ فاتحہ اور حافظ کی غزل سُنا کر عربی خوانی، فارسی دانی کا ثبوت دیتے ہوئے تحصیل زبان تُرکی کا بھی اقرار کرتا ہے! یہ تو باور نہیں ہوتا کہ آغا صاحب کے دل پر اس بیان کا کچھ اثر نہیں ہوا ہوگا۔ مگر ع سُن کر جو پی گیا یہ مزا بیکسی کا تھا! لیکن صاحب وزیر ہند کی اس ستم کوشی کو تو دیکھیے کہ ان کو اس کا احساس بھی نہیں ہے کہ ہندوستانی کو اس کی "غلامی" یاد دلانے کا اب وقت نہیں رہا۔ اگر ہندوستان کی "غلامی" ہنوز مصدق نہ ہوتی تو وہ اس بیان سے خود اپنی ذلت محسوس کرتے۔ عدم احساس سے ان کا مرتبہ بلند نہیں ہو سکتا۔ مگر آغا صاحب کو لازم نہ تھا کہ جس نشتر سے خود خراشیں پا چکے تھے، اُس کو اس بے احتیاطی سے دوسروں کی طرف پھینک دیں!

امید کے لئے کافی سہارا تھا کہ "سُلطان" "وقار ہند" کے سچے محافظ ثابت ہونگے، اور کوئی شک نہیں کہ انہوں نے اپنے عروج کے وقت اپنی سی کی بھی۔ لیکن نتیجہ بدقسمتی سے اُلٹا ظاہر ہوا۔ بات دراصل یہ ہے کہ ولایتہائے ماوراء النہر سے "بوئے بلخ" اور خاک پاک عراق و حجاز سے "شمیم قدس" کے امیدواروں نے صرصر و سموم میں اڑتے ہوئے آنیوالے ذرّوں کو بھی کلیجہ میں اتار لینے میں چاہے اپنی بجا خوش خلقی کا ثبوت دیا ہو مگر دل کو ہوا دینے والا عضو رئیس مبتلائے سل و دق نہ ہوتا تو تعجب تھا۔ لہٰذا اس خوش خلقی کی تعبیر سے "شد پریشان خواب من" اور ماہرین "پر دپاگنڈہ" کے قول کی تصدیق ہوگئی کہ "غلط سے غلط بات کی بکثرت تکرار اس کو صحیح کرکے رہتی ہے" ہم بھی خوش خلقی کو بودا پن سمجھ کر اب اس سے تبرّا کرنے کی مشق کرنے پر تلے ہیں! ہندوستان نے ایران سے اگر کبھی "دعوتِ شیراز" کا دسترخوان عاریت لیا تھا تو آج بھی "کج کلاہی" کی طرف للچائی نظر سے دیکھ رہا ہے۔ اور "حُبّ الوطن من الایمان" کا ترجمہ "دیوبانی"

تخیل کی تحت "وطن پرستی" گرکے "اول ہندی" نام کے بت کو کعبۂ دل میں بٹھاتا جاتا ہے۔ ے

کعبہ سے جو بُت نکلے بھی تو کیا، کعبہ ہی گیا جب دل ہی نکل
افسوس کہ بُت بھی ہم سے چھٹے، قبضے سے خدا کا گھر بھی گیا

"نئی زندگی" کا تخیل اسی وقت تک خوش آیند ہو سکتا ہے، جب تک اس کو "پردۂ غیب" کے اندر ہی اندر "سبز باغ" بناتے چلے جائیے۔ ماضی قریب کے آئینہ کی طرف پلٹ کر دیکھئے گا تو اپنا ہی عکس "زبان حال" بنجائیگا۔ اس سے تو بہتر ہے کہ سبزی کا دم لگائیے اور بے موقع جاگ اُٹھنے والے غم کو دھوئیں کے ساتھ اڑتے دیکھ کر کہہ اُٹھئے۔ ے

عالم غبار "وحشت مجنوں" ہے سر بسر
کبتک خیال "طرۂ لیلیٰ" کرے کوئی

مجنوں وہ نہیں جس کی فرمائش ہوا کرتی تھی کہ ع باز گو از نجد و از یاران نجد بلکہ وہ جو یوں زمزمہ سنج ہے ع ہم اسکی بلبلیں ہیں یہ گلستاں ہمارا۔ "طرۂ لیلیٰ" وہی جس سے ع بتانِ بت پرست و برہمن سوز۔ کا حسن ملیح رنگ پکڑتا ہے۔

"طالب العلم" ہونے کی حیثیت سے میں سب سے زیادہ "نئی زندگی" کا مشتاق و متمنی ہوں مگر دیکھ یہی رہا ہوں کہ اس "ذوق عریانی" کے دار دورے میں بھی "باب پنجم" گلستان مصلح شیراز ہنوز خارج از اسباق ہے۔ "اساتذۂ کرام" غور فرمائیں۔ ع ساقیا مرنج از من عالم جوانیہاست!

"باب پنجم فراموش ہے" یاران طریقت! یہ کیا؟ ے

یہ کہاں کی دوستی ہے کہ بنے ہیں دوست ناصح کوئی چارہ ساز ہوتا، کوئی غمگسار ہوتا

بھلا "من ترا حاجی بگویم، تو مرا حاجی بگو" سے کیا ہوگا۔ کاغذ کی ناؤ کتنے دیر ٹھیریگی۔ مسلمان ہوں یا ہندو، عیب سے خالی دونوں میں سے ایک بھی نہیں۔ ے

درمیانِ کافراں ہم بودہ ام یک کمر شائستۂ زنار نیست

ہے کوئی مائی کا لال کہ "الحب للہ والبغض للہ" ہمت کرکے بھارت کے دونوں لالوں کو "الحق مرّ" کا کونین مکسچر ایسا پلادے کہ "تبخیر" جاتی رہے! سرسام کا خطرہ دور ہو۔ اور دونوں بچھڑے "مان جائے" اڑیں بھڑیں۔ چپتا پیتول۔ دھینگا مشتی۔ لپاڈکی چاہے جتنی بھی کریں اللہ کرتے چلے جائیں۔ مگر اس کا اثر جسموں ہی تک ہو۔ دل پاک، دماغ صاف رہے۔ نہیں تو "نئی زندگی" تو کہا۔ مشکل سے

لب تک آئے والے دم کی بھی امید نہیں !

"صورتِ انساں داری" کہتے کہتے قوالوں کا دم پھول جاتا تھا۔ اس کا ذوق رفتہ رفتہ کم تو ہوتا جاتا ہے، مگر خطرہ یہ نظر آتا ہے کہ کہیں "صورتِ انساں داری" کے بعد سوالیہ نشان نہ لگ جائے! حسن اگر تناسب سے پیدا ہوتا ہے، تو ہمارا زمانہ عنقریب اس پیداوار سے محروم ہونے والا ہے، کیونکہ صورت بگاڑ لینے کا ذوق "وبلائے عام" کی طرح بڑھ رہا ہے۔ مذہب کی طرف سے روک تھام کی باگ ڈھیلی ہو ہی چکی۔ "روشن خیالی" کی ذوق پروائگی میں "جبہ و دستار" سے عاری ہو کر ؎ اے زمشکیں طرّہ ات در ہر دلے بندے دگر! کی ہوا میں مدرسوں سے بھی "پر افشانی کی مشق" حد کمال کو پہونچائی جا رہی ہے۔ "محاسن شریف" کا دور گذر چکا۔ اب "چہار ابرو" ہی کی اصطلاح "غیر متعارف" ہے تو اس کا "صفایا" بھی "رائج الوقت" نہیں۔ مگر ایک طرف "آکسفورڈ" اور "کرزن فیشن" مردوں کو "فارغ البال" بناتا جاتا ہے تو دوسری طرف "طول شب ہجر عشاق" اختصار پذیر ہوتی جاتی ہے۔ بعض "نازنینانِ کالج" دونوں صورتوں میں "دیدارو" ہوں تو ہوں، مگر عام طریقہ سے "سیہ تاب" چہرے اور بھیانک خط و خال صرف "نمایاں" ہو کر آنکھوں کے لئے تکلیف دہ ہوتے ہیں، اور "پر قینچ" "لیلیٰ و شان مغرب زدہ" اکثر "مجنوں کی سگی" دکھائی دیتی ہیں۔ تعجب یہ ہے کہ "کنگھی چوٹی" سے آزاد بھی "آئینۂ حقیقت نما" سے بے نیاز جب نہیں ہیں تو کیوں انکی سمجھ میں نہیں آتا کہ ہر چہرہ پر نہ تو "ریش دراز" موزوں ہوتی ہے نہ "فٹ بال کا میدان" ساخت کے چہرے جاذب نظر ہوتے ہیں؟ بہتیری شکلیں دیکھنے والوں کی نظر میں بڑی حد تک "گوارا" ہو سکتی ہیں، اگر ان کے "بولتے ہوئے" عیوب کی پردہ داری پر مونچھیں مامور ہوں۔ خال خال ایسی صورتیں بھی ہیں جن کی "عیب پوشی" صرف مونچھوں کو تاؤ دیکر نہیں ہو سکتی۔ بلکہ ان کے لئے "زیر انداز" بھی درکار ہوگا۔

"اچھی صورت والے" بھی اس کو اچھی طرح نہیں سمجھتے کہ بعض اچھی سے اچھی حرکت بھی صورت کو کتنا برا بنا سکتی ہے! اس کو جانے دیجیے کہ نازک سے نازک خط و خال والے معشوق بھی جب "بے تکلف غصہ" یا "بے تکان اظہار نفرت" فرماتے ہیں تو ان کی "موہنی صورت" کیا سے کیا ہو جاتی ہے! نہ معلوم کتنی دفعہ دیکھنے میں آیا ہے کہ جس "خوبرو" کو دیکھ کر درود پڑھنے کی نیت کرتے تھے، اس نے جو "اظہار مسرت" میں "لب وا" کو "مجاز کار" کیا ہے تو ایسا معلوم ہوا کہ "پھاٹک حبش خاں" سے گورے سنگین لئے

نکلے پڑ رہے ہیں۔ ایسے موقعہ پر درود سہو نہ ہوجائے تو کیا ہو؟ "پھیلے ہوئے دہانے" جب "میا کی کساتھ" کھل پڑتے ہیں تو "ز کاشی تابکاشاں" کالے کوسوں کی مسافت پر "حسن گریزاں" "تل اوٹ پہاڑ" کے دامن میں روپوش ہوجاتا ہے۔ ان "ظالم" دلبروں کو کون بتائے کہ "بجلی گرانے کی مشق" میں یہ اندھیر تو نہ کیجئے! کیا واقعی ان "البیلے" "الہڑ" "ستم کے برق پاش" حسینوں نے "اپنے کو" آئینہ میں کبھی ہنسکر نہیں دیکھا ہے؟

اسی طرح "تنگ شکر" "قندلب" جب "تبسم اور تغافل" میں امتیاز کرنے سے عاری ہونیکا ثبوت "زہر خند" سے دینے پر تلے ہوتے ہیں اور اس "کفایت شعاری" سے "حسن سلیقہ" کی داد چاہتے ہیں تو یہی واہمہ بندھتا ہے کہ "آئینہ حیرت" کے طلسمات کی "لوح" "مہر دہان" بن کر رہ گئی ہے کیا؟

کریماں را بدست اندر درم نیست
خداوندان نعمت را کرم نیست

کیا قدرت اپنے عطایا کے خزینوں کو مقفل کر کے کبھی "کلید" گم بھی کر دیا کرتی ہے؟ اس سوال پر کاش کوئی مسکرا ہی کر دیکھ لے۔ وہ بھی میری طرف نہیں، بلکہ اپنے ہی آئینہ میں! مگر جس کو میں "پتہ" دلا رہا ہوں وہ کاہے کو دیکھے گا۔ حضرت غالب جو "الٹی پٹی پڑھا گئے ہیں" ۵

دشنہ غمزہ جاں ستاں، ناوک ناز بے پناہ
تیرا ہی عکس رخ سہی، سامنے تیرے آئے کون

"طالب العلم"

سے......!!

تم نے کہا تھا "میں شام کو آؤنگی" ——— میں نے سوچا "کیوں نہ تمہارے لئے کچھ کلیاں چن لاؤں ——— تم دیکھکر مسکرا دوگی اور کلیاں کھل کر پھول ہو جائینگی ——— میں کلیاں چن لایا، نرم و نازک کلیاں، منہ بند کلیاں ———

شام ہونیکو آئی - میرا دل دھڑک اٹھا ——— "تم آؤگی اور ضرور آؤگی" ——— کلیاں مسکرا رہی تھیں جیسے مجھے مبارکباد دے رہی ہوں ——— سورج ڈوب گیا اور شام کا دھندلکا چھانے لگا۔ مجھے تمہارے پیر کی چاپ سنائی دی، تمہاری شوخ دمضطر نگاہیں نظر آئیں، یکایک تالاب کے اس پار بیر کے درختوں کی جھنڈ سے کسی نے ایک نورانی گیند اچھالی ——— "چاند"! میں گھبرا گیا، میرا دل پھر دھڑکنے لگا لیکن کلیاں! ——— وہ مسکرا رہی تھیں جیسے کہہ رہی ہوں "فریب یقین"۔

شمس ہاشمی
(کرلے پرسرائے)

فریبِ ہستی

(از سید محمد حسنین عالم صاحب حسنین بھاگلپوری)

مجھے اس سے محبت تھی، کیوں تھی؟ یہ معمہ میں آج تک حل نہ کر سکا۔ شاید وہ محبت ہی کرنیکے لائق تھی، میں ہوس پرست اور تنگ نظر عشاق کے نظریہ کے خلاف اپنے رقیبوں کی تعداد کو روز افزوں ترقی پذیر دیکھ کر خوش ہوتا تھا کہ "میں اسے پیار کرتا ہوں جسے دنیا چاہتی ہے"! غالباً وہ ایک مقصد کو لیکر پیدا ہوئی تھی کہ دنیا کی ایک وسیع آبادی کو اس سے والہانہ عشق ہو۔ اور وہ اصل معنی میں محبوب کے حسین نام سے پکاری جائے۔ معلوم نہیں اس میں ایسی کیا امتیازی شان تھی جس نے اسے سب کی تمناؤں کا مرکز بنا دیا تھا۔

میں اسوقت یہ بتانا نہیں چاہتا اور حقیقت تو یہ ہے کہ بتا بھی نہیں سکتا کہ وہ کب اور کس طرح میری خوش باش زندگی میں حقیقی تبسم بن کر پیوست ہوئی۔ ہاں فقط اتنا یاد ہے کہ جب سے میں نے عقل و فہم کے حدود میں قدم رکھا بلکہ اس سے بھی پہلے وہ میرے دل کے مندر کی دیوی بن کر بیٹھ چکی تھی، شاید میں اسکا ازل ہی سے پجاری تھا۔ میری زندگی کا ہر لمحہ معنوی مسرت سے لبریز تھا۔ اور میں محبت کے لامتناہی سمندر میں اتنی تیزی سے بہا چلا جا رہا تھا کہ اس کے سہارا دینے کا احساس بھی نہ ہوا۔ میرے تمام احساسات اور جذبات اس کے عشق کی جنوں خیزیوں میں اس قدر گم ہو کر رہ گئے تھے کہ اپنی الفت کے علاوہ کسی کے جذبہ کے جائزہ لینے کا کبھی ہوش نہ آیا۔ در اصل مجھے اس کی محبت کی ضرورت ہی نہ تھی، اس کی توجہ اور ہمنوائی کا میں محتاج ہی نہ تھا، کیونکہ میری محبت کسی معاوضہ کی خواہشمند نہ تھی، مجھے صرف اپنی محبت سے سروکار تھا، اور میں اس میں اپنے خیال کے مطابق کامیاب تھا۔ میری تمنا اور امنگیں اس کے دیدار کی متمنی نہ تھیں، کیونکہ اسی کا خیال ــــــ صرف اسی کا تصور میرے قلب کے ہر گوشے پر مستولی تھا۔ میرے ہوش و حواس بھی والہانہ محبت کے زیر اثر میری ملکیت سے خارج ہو چکے تھے، پھر کوئی اور آرزو، کوئی غیر متعلق تمنا میری پابند اور مقید طبیعت کو اپنی طرف کیونکر کھینچ سکتی تھی۔ اسلئے میری اور اس کی زندگی میں کوئی ایسا واقعہ رونما نہیں ہوا جو قابل ذکر یا دلچسپ تعلقات کا آئینہ دار ہو کر دنیا کی نظروں میں وقیع اور غیر معمولی بن جاتا۔

ہاں ہماری حیات الفت کی بھی وہی عام داستان ہے جو فرسودہ اور پرانی ہو چکی ہے۔ اور اس سے زیادہ کہا بھی کیا جا سکتا ہے کہ "میں نے اسے دیکھا .... اور مجھے اس سے محبت ہو گئی"!

زندگی کے بدلتے ہوئے اوقات میں کوئی ایسا واقعہ نہیں آیا جس سے میری داستان پر کوئی خاص رنگ چڑھ سکتا، یا محبت کے عام واقعات کسی نئے طرز میں تشکیل پذیر ہوتے .... اس کے بعد جب میری ساکت زندگی نے اضطراب کی دنیا میں قدم رکھا تو ایک ایسا واقعہ پیش آیا .... جسے میں "ہوش کی کہانی"، یا "سبق آموز افسانہ" سے موسوم کر سکتا ہوں .... میں نے عالم بیہوشی میں واللہ اعلم کتنے برس گزار دیئے۔ کیسے کیسے انقلابات آئے اور مٹ گئے۔ دنیا نے کتنی کینچلیاں بدلیں اور اتار دیں .... لیکن "میری زندگی سوتے گذری اور سوتے گذر جائیگی"

بیہوشی !!

رات اندھیری تھی گنہگار کی ضمیر کی طرح کالی، ہوا کا زناٹہ سکوت اور جمود کے بھیانک سناٹے کو اور زیادہ ہیبتناک بنا رہا تھا۔ میری ٹوٹی ہوئی میز پر رکھا ہوا لیمپ بدتہذیب ہوا کے تند جھونکوں کا مقابلہ کرنے کی جد و جہد کر رہا تھا۔ اور سڑک کی طرف کی کھلی ہوئی کھڑکی کے کواڑ میری قابل رحم حالت پر ماتم کر رہے تھے، مگر میں سارے ہنگامہ سے بے نیاز ہو کر تصویر کشی میں مصروف تھا۔

میری سوکھی انگلیاں غیر ارادی طور پر حرکت کر رہی تھیں اور مخمور نگاہیں آنکھوں کے حلقوں سے نکل کر کاغذ کے جسم میں پیوست ہو جانے کے لئے ضد کر رہی تھیں، کمرے کی شکستہ دیواروں پر لٹکی ہوئی تصویریں جھکی ہوئی اپنی سہیلی کی قربت کے انتظار میں تھیں ۔ میں سال بھر میں ایک تصویر بنا کر پھر دوسرے سال کی پہلی صبح کو اپنے فرض کی تکمیل میں مصروف ہو جاتا۔ سال کی ۳۶۵ راتوں اور ۳۶۵ دنوں کا حاصل صرف ایک تصویر ہوتی جو نئے سال کی خوشی میں سورج کی پہلی کرن کے ساتھ کمرے کی دیوار پر تھپاں کر دی جاتی .... اور بس۔

وہ رات بھی سال کی آخری رات تھی اور تصویر مکمل ہو کر محبت کی سالگرہ کا نادر تحفہ بن چکی تھی، مگر دل کے خانہ میں ابھی تک حقیقت کا رنگ بھرنا باقی تھا۔

قلم کی تیز نوک سینے میں اتری اور خونِ دل کے چند قطرے مجوس کر باہر نکل آئی۔

اب ——— "قلب محبوب خون حبیب سے رنگین ہو گیا"

قلم رکھ دیا گیا۔ تحفہ مکمل، محنت پوری ہو چکی تھی۔

ہوا کا طوفان تیزی اور غیر ترتیبی سے بڑھتا جا رہا تھا۔ جس کی وجہ سے گہری نیند میں سوئی ہوئی کائنات بار بار کسی کرب و بے چینی کا اظہار کر رہی تھی .... گویا تھکی ہوئی زمین انگڑائے ہوئے

دم کو دھڑکتے ہوئے سینے کی تہوں میں چھپانے کی کوشش کر رہی تھی، لیکن اس کے لمبے لمبے سانسوں کا زیر و بم اور اس کی گھبراہٹ اس کے جرم کا راز فاش کئے دیتی تھی۔

زمین ——— اور جرم ؟

ہاں ——— جرم ——— اور زمین ——— اس نے بہت بڑے جرم کا ارتکاب کیا تھا۔ میں اپنے جذبات کو تصویری شکل میں منتقل کر چکا تو اس کو لئے ہوئے کھڑکی کے پاس جا کر کھڑا ہو گیا ——— دفعتاً میری نگاہ سامنے کے ہنگامہ اور جلتے ہوئے مکان پر پڑی۔

آہ! وہ ایسا روح فرسا منظر تھا جس کو دیکھنے کی مجھ میں ہمت نہ تھی۔ میری آنکھیں غم اور پریشانی سے کھلی کی کھلی رہ گئیں، اور وہ تمام شعلے جو سامنے کے مکان کو لپیٹ رہے تھے، اپنی آتشیں زبانوں سے میرے دل کو بھی چاٹنے لگے۔ ایک لرزہ خیز رَو میرے تمام بدن میں دوڑ گئی ——— ایک پُراسرار لہر تھی جو اُٹھی ——— ابھری ——— اور لمحہ بھر میں طوفان بن کر میری تمام ہستی پر چھا گئی۔

میری آنکھیں کھلی ضرور تھیں ——— مگر سجھائی کچھ بھی نہ دیتا تھا ——— تاریکی تھی ——— عالمگیر تاریکی ——— قبر کی سی تیرگی .... اُف!

اسی جنون خیز حالت میں میرا جسم لڑکھڑا کر بلندی سے گرا اور نیچے پتھریلی زمین پر تڑپنے لگا۔ نہ معلوم میرے کتنی شدید اور خفیف چوٹیں آئی تھیں۔ جن کی وجہ سے میں شاید اُٹھ بھی نہ سکتا تھا .... لیکن .... ایک نامعلوم قوت میرا ہاتھ پکڑ کر گھسیٹتی ہوئی اس آتش زدہ حلقہ کی طرف لے چلی، جس کی آغوش میں میری جانِ زندگی کا رشکِ ارم مکان تھا۔

بیباک شعلے ——— جن کو آندھی ہوا دے رہی تھی، لپک لپک کر آسمان کو بھی جلانے کی کوشش کر رہے تھے ——— گھر کی کل عورتیں اور بچے اپنی اپنی جان بچا کر جلتے ہوئے مکان سے باہر آ چکے تھے ——— مگر ——— وہ ——— ہاں ——— وہی اپنے کمرے میں بند تھی ——— میری محبت کی کشتی مجھے اپنے دامنوں میں محفوظ کئے ہوئے مصیبتوں کے ہچکولوں سے بے خبر، موت کے اس کنڈل کی طرف بڑھتی جا رہی تھی جس میں میری روح، میری زندگی گرفتار تھی، ——— مجھے خوشی محسوس ہو رہی تھی کہ ساری دنیا کے لوازم میں جو کچھ بھی میرے پاس تھا وہ اُس کی نذر کر رہا ہوں.......

مگر افسوس .... جب ایک پرزہ کاغذ جس کو میں اب تک بچائے ہوئے تھا جلنے لگا۔ تو نہیں کہہ سکتا کہ مجھ پر کیا گذر رہی تھی .... بخدا اس وقت مجھے ایسا محسوس ہو رہا تھا کہ جیسے میرا دل سینہ کی ہڈیوں کے شکنجہ کو توڑ کر کرب و اذیت کے پھندے میں جا کر پھنس گیا ہے۔

اس کی قیام گاہ تک پہنچنے میں غالباً دو ہی تین قدم کا فاصلہ تھا کہ ایک انسانی مجسمہ گرم ہَوا کے پردے پر رقص کرتا ہوا نیچے گرا۔ میں ابھی پوری طرح اسے دیکھنے بھی نہیں پایا کہ آگ کی لپٹوں نے اسے نگل لیا !! ——— عین اسی وقت بالائی منزل کی کھڑکی میں سے کسی کے چیخنے اور پکارنے کی دلدوز صدا آنی شروع ہوئی۔ آواز نسوانی لہجہ میں جیسے کوئی دکھیا عورت بہت دُور امداد کے لئے کسی کو بلا رہی ہو۔ مجھے اس وقت یہ سوچنے کی مہلت نہ ملی کہ جب ایک انسانی پیکر اسی کمرہ کی کھڑکی سے گر کر جل چکا ہے تو اب یہ پکارنے والا کون ہے، تو کیا میری نگاہوں نے میرے حواس کو دھوکا دیا ———؟

ہاں یہ ممکن ہے کہ اس کی رُوح مجھے بھی دعوتِ مرگ دینے کے لئے بلا رہی ہو۔ خیر میں سارے دنیوی تفکرات کا پاس کئے بغیر زینے کوٹے کر کے کمرہ میں داخل ہو گیا۔ آگ چاروں طرف کے کواڑوں کو جلا کر درمیانی وسعت کی طرف بھی بڑھنے کے لئے ہاتھ پاؤں مار رہی تھی .... اور وہ مسہری .... جس کے وسط میں میری متاعِ حیات اپنی حیران نگاہوں سے آنیوالی مصیبت کا انتظار کر رہی تھی .... جلنے سے باقی تھی۔ لیکن پہونچنے میں اگر پانچ سکنڈ بھی تاخیر ہو جاتی تو وہ .... آتشیں اژدہے جن کی زبانیں بجلی کی سی سرعت کے ساتھ چاروں طرف بھر رہی تھیں اسے بھی لقمۂ اجل بنا دیتے۔ میں نے دوڑ کر اسے گود میں اٹھا لیا، اور نہ جانے کن مشکلوں سے اسے صحیح و سلامت اس مصیبت کے بھنور سے بچا کر سڑک پر لے آیا !!

میرے تمام جسم کی چربی نکل آئی تھی ——— چنانچہ اس واقعہ کے بعد مجھے ہوش نہ رہا۔ میں کئی ماہ تک زیرِ علاج رہا۔ وہ ——— دوسرے تیسرے روز مجھے دیکھنے کے لئے آتی تھی، اور ہم میں نہ معلوم کیا باتیں ہوا کرتی تھیں؟ ہاں ایک مبہم سا خیال ہے کہ کچھ وعدے ہوتے تھے اور کچھ ——— عہد و پیمان ——— پھر ——— پھر اس نے آنا ترک کر دیا۔ چھوڑ دیا۔ وہ مدت تک نہ آئی ——— کیوں؟ میں نے اس سوال کا جواب سوچنے کی بھی کوشش نہیں کی۔

ایک دن مجھ سے کسی نے کہا کہ وہ بیمار ہے۔ میں اسے دیکھنے کے لئے گیا۔ وہ .... بسترِ مرگ پر دراز تھی! .... میں اس کی مسہری کے قریب بیٹھا ہوا تھا .... اس نے بمشکل تمام گردن پھرا کر مجھے دیکھا .... اور بہت دیر تک ٹکٹکی باندھے مجھے دیکھتی رہی۔ اس کی آنکھوں میں آنسو بھرے ہوئے تھے۔ کچھ دیر بعد اس کے ہونٹ ہلے اور دھیمی آواز میں بھرائے ہوئے لہجہ کے ساتھ اس نے بہت کچھ کہا .... مگر میں اس کی ایک بات کو بھی سُن نہ سکا .... اور نہ سمجھ سکا۔

"شاید وہ اپنی خطا .... خوفناک خطا کی معافی مانگ رہی تھی"

مَیں اس کو دیکھ رہا تھا - لیکن کافی غور و کوشش کے بعد مجھے احساس تک نہ ہوا کہ میں کیا دیکھ رہا ہُوں .... کُل کائنات اور سارا ماحول مجھے بیمار نظر آ رہا تھا .... علیل .... مضمحل .... اس کے ہونٹ ساکت ہو چکے تھے -

اور پھر بڑی بڑی آنکھوں میں بھرے ہوئے آنسو بھی .... خشک ہو گئے - دو ضعیف ہاتھ دوشالہ کے اندر سے نکلے اور میری طرف بلند ہو کر رہ گئے - نازک گردن تکیہ سے تھوڑی بلند ہوئی اور ایک جھٹکے کے ساتھ گر پڑی .... اس نے زیرِ لب کچھ کہا اور بالکل خاموش ہو گئی!

گھر والے دھاڑیں مار کر رو رہے تھے .... اس کی دُکھیا ماں دیواروں سے سر ٹکرا ٹکرا کر بین کر رہی تھی، لیکن مَیں چپ تھا - ممکن ہے کہ اس وقت کچھ دیر کے لیے میری روح جسم سے کھینچ لی گئی ہو "غالباً اس کی روح کو درگاہ خداوندی میں بحفاظت پہنچانے کے لئے"

ہماری راہیں زندگی میں بالکل الگ الگ رہیں - لیکن جب وہ آخری سفر کو روانہ ہوئی تو مَیں نے ایک سچّے رفیق کی طرح جہاں تک مجھ سے ہو سکا اس کا ساتھ دیا اور پھر موت کے بھیانک اور ڈراؤنے پردوں نے اسے ہمیشہ کے لئے نظروں سے اوجھل کر دیا -

ہوش

مَیں اپنے کمرے میں بیٹھا ہوا فانی چیزوں اور نشانیوں کو دیکھ رہا تھا - دیواروں پر لٹکی ہوئی تصاویر اسی طرح سرنگوں میری حالت کا جائزہ لے رہی تھیں، ان میں زندگی نہ تھی، چمک نہ تھی - ان کی آنکھیں موت کا مکمّل عکس بنی ہوئی تھیں - ان میں بھرا ہوا خونی رنگ سیاہ پڑ چکا تھا - وہ مر چکی تھیں -

اور میں بھی یہی سمجھ رہا تھا کہ وہ مر گئی ہیں .... مجھے پھر موت کی ایسی بے چینی اور کرب محسوس ہونے لگی - ان چیزوں کی موجودگی اور ان دیواروں کے حلقے میں جنہوں نے اپنے گوشے گوشے میں اس کی تخئیل .... اس کے تصوّر .... اور اس کی یاد کے ہزاروں سامان جذب کر رکھے تھے میرا رہنا محال تھا -

اس کی موت کے ساتھ وہ تمام اشیاء بھی مر چکی تھیں، اور میرے لئے ان مردہ لاشوں کو دیکھنا (جن کے اندر اس کا مجسّمہ جھلک رہا تھا) دشوار تھا -

مَیں باہر نکل آیا اور کسی تحریک کے بغیر چلتا چلتا قبرستان جا پہونچا ——— مَیں نے اس کی

سادہ قبر دیکھی، اس کے سرہانے ایک مرمریں کتبہ پر کندہ تھا :-

" اس نے محبت کی ـــــــ محبوبہ بنی ـــــــ اور مرگئی "

میں مٹی کے اس یاس انگیز ڈھیر سے چمٹ گیا اور سسکیاں بھرنے لگا - میں زندگی کی آخری سانس تک اسی خوفناک گورستان میں رو رو کر بسر کرنے کا ارادہ کر چکا تھا - لیکن ڈر تھا کہ ـــــــ کوئی مجھے اس سکون پرور مقام سے نکال نہ دے - اسلئے تھوڑی دیر کے لئے اس پیاری تربت کا پہلو چھوڑ کر پرانے قبرستان کی طرف چلا گیا، جہاں پچھلے زمانہ کے مردوں کی روحیں اپنے جسم کے ذرات کو خاک میں ملانے کی غرض سے آتی جاتی ہونگی، جہاں آنے والی نسلیں دفنائی جانے والی تھیں، زمانہ خود اس مقصد کے زیر اثر صدیوں کی قبروں کو پامال کر کے ہموار بنانے کی کوشش کر رہا تھا -

جب رات دنیا کی فضا کو لوری دیکر خود بھی خاموش ہو گئی تو میں اپنی جگہ سے اٹھا، اور قبروں کے کتبوں، پتھروں، لوہے کی باڑوں سے ٹکراتا ہوا انسانی لحاد سے نشو و نما پائی ہوئی خودرو جھاڑیوں سے الجھتا ہوا آگے بڑھتا جا رہا تھا .... مگر چاروں طرف چکر کاٹنے کے بعد بھی وہ پیاری لحد مجھے نظر نہ آئی - میرے گھٹنے اس شدت سے کانپنے لگے کہ میں ایک قدم بھی آگے نہ رکھ سکا، اور ایک قبر پر مردہ لاش کی طرح گر پڑا .... نہ معلوم کتنی دیر تک اسی طرح بے حس و حرکت پڑا رہا - دفعتاً مجھے محسوس ہوا کہ وہ مرمریں پتھر جس پر میں لیٹا ہوا تھا، ہل رہا ہے ـــــــ کیا واقعی وہ ہل رہا تھا؟ مجھ پر ایک خوف طاری ہونے لگا اور میں ایک چھلانگ مار کر سامنے کی قبر پر جا گرا -

مجھے صاف طور سے دکھائی دیا کہ قبر کے اندر سے ہڈیوں کا ایک برہنہ ڈھانچا اپنی ٹیڑھی پیٹھ سے پتھر کو اٹھا رہا ہے - تھوڑی سی دیر کے بعد وہ اس وزنی سل کو ایک طرف ہٹانے میں کامیاب ہو گیا - رات اندھیری تھی، مگر میں نے کتبہ پر موٹے موٹے نوری حرفوں میں یہ الفاظ پڑھے :-

" یہ ـــــــ کی قبر ہے، جسے اپنے عزیزوں سے بڑا اُنس تھا - یہ ایک شریف اور نیک انسان تھا جو عزت کی موت مرا "

مُردے نے زمین پر سے ایک نوکدار پتھر اُٹھا کر ان الفاظ کو کھرچ ڈالا پھر اسی نے اپنے ہاتھ کی ہڈی سے جو کبھی اس کی انگشت شہادت تھی، چمکدار اور جلی حروف میں یہ سطور لکھدیں :-

" یہ ـــــــ کی قبر ہے، جو دولت کی لالچ میں اپنے باپ کی موت کا سبب بنا - یہ دھوکا باز تھا جو ذلت کی موت مرا ...."

میں دیکھ رہا تھا کہ تمام مُردے اپنی اپنی قبروں سے نکل کر وہ جھوٹے اور لایعنی الفاظ جو انکے

عزیزوں نے کندہ کرائے تھے مٹا چکے ہیں اور اس کی جگہ حقیقت لکھ رہے ہیں ــــ عبرت آموز اور ــــ لرزہ خیز ــــ خوفناک - مگر قابل احترام حقیقت، جس سے دنیا بے خبر ہے - یا لاعلمی ظاہر کرنے پر مجبور ہے - اُف ! ــــ اب مجھے معلوم ہوا کہ مہربان والدین، وفادار عشاق، فرمان بردار اولاد، عصمت مآب خواتین، اچھوتی کنواریاں، ایماندار دوکاندار، باطنی طور پر ــــ جلاد - بے مروّت - سرکش - بدکار - مکار - ناپاک - بے ایمان اور جھوٹے تھے - جنہوں نے اپنی اپنی زندگیاں دجل وفریب کے پردوں میں نفرت انگیز اور شرمناک حالتوں میں بسر کی تھیں -

معاً مجھے خیال آیا کہ .... وہ بھی اپنی قبر پر ضرور کچھ نہ کچھ لکھ رہی ہوگی، مَیں جوش اضطراب سے مغلوب ہو کر کھلی ہوئی قبروں کو پھاندتا ہوا جا رہا تھا - مجھے یقین تھا کہ میں اسے دیکھ سکوں گا، اور میں نے اسے دیکھ بھی لیا - مگر میرے وہاں پہنچنے تک وہ پھر نظروں سے غائب ہو چکی تھی -

آہ سنگ مرمر کی تختی پر جہاں کچھ دیر پہلے میں نے یہ الفاظ پڑھے تھے :-

"اس نے محبت کی، محبوبہ بنی ــــ اور مر گئی"

وہاں اب یہ تحریر تھا :-

"اس نے دھوکا دیا - سچے محب کو چھوڑ کر خود غرض انسانوں سے تعلق پیدا کیا - مگر کسی سے بھی نباہ نہ ہو سکا - وہ روز نیا عاشق تبدیل کرتی تھی - ایک روز مینہہ برستے میں ــــ کسی کے پاس گئی ــــ اور سردی لگنے سے اس کے مرض نے اسے موت سے ہمکنار کر دیا ــــ"

مَیں یہ حقیقت حال پڑھکر وحشت زدہ ہو گیا ــــ دیوانہ ــــ پاگل ــــ سودائی ــــ لیکن اصل میں مجھے ہوش تھا - اتنا ہوش، جتنا مجھے عمر کے کسی حصّہ میں کبھی بھی نصیب نہیں ہوا تھا -

مجھے بتایا گیا ــــ کہ میں دوسرے روز قبر کے نزدیک بے ہوش پڑا تھا -

یہ میری آخری بے ہوشی تھی ــــ جس نے میری آنکھیں کھول دیں -

محمد حسنین عالم بھاگلپوری

رباعی

دُنیا میں نہیں کوئی کسی کا غمخوار ابنائے زمانہ سے ہے ملنا بیکار
سب عیش کے ساتھی ہیں خوشی کے ہمدم دولت کے شریک ہیں مطلب کے یار

"لجیا"

(از جناب ڈاکٹر سید قمر الدین حیدر صاحب ایم۔ بی ایچ)

لجیا تھی تو مہترانی، مگر شکل و صورت میں کسی رانی اور کس بل میں کسی چابک سوار سے کم نہ تھی۔ چھریرا بدن، گول چہرہ، بھرے بھرے گال، بڑی بڑی ملچھوڑی آنکھیں، گندمی پختہ رنگ، کمر پتلی اور گداز رانیں، غرض از سر تا پا وہ ایک مجسمۂ حسن تھی، جوانی کی راتیں اور بہار کے دن تھے۔ جوانی کی حرص وہوا نے شوخی و چنچل پنا، غمزہ و ناز، ادا و کرشمہ، دلربائی و کج ادائی، لگاوٹ اور بناوٹ سبھی کچھ کوٹ کوٹ کر بھر دیا تھا۔ اب وہ ان ہتھیاروں سے لیس ایک چلتا جادو، ایک پرکالۂ آتش، ایک مکمل عورت تھی، ــــــ آنکھ کا پانی تو کھیل کود میں محلہ کے لڑکوں کے ساتھ پہلے ہی ڈھل چکا تھا، اب عالم ہی کچھ اور تھا، بھرپور شہر میں بھلا عاشقوں کی کہاں کمی۔ چاروں طرف سے حسن کے شیدائی آتے اور اپنی اپنی بولیوں میں دادِ حسن دیتے۔ وہ کبھی شرماتی، کبھی لجاتی، کبھی آنچل سے بدن چراتی، کبھی ناک پر انگلی رکھتی، کبھی آنکھیں مارتی، رفتار سے قیامت بپا کرتی، الھڑپن سے گھبراتی تو آئینہ میں منہ دیکھتی، اٹھتی ہوئی جوانی پر نظر ڈالتی، آنکھیں لڑاتی، اور پھر جھرجھری کے ساتھ انگڑائیوں پر انگڑائیاں لینے لگتی، کبھی بل کھاتی، کبھی اینٹھتی، کبھی بربرتی، کبھی "چاہے جیا جائے رے لگی ناہیں چھوٹے"، گنگنانے لگتی، اور بادۂ شباب سے مخمور ہو کر جھومنے لگتی۔ ماں باپ یہ رنگ دیکھتے اور مسوس مسوس کر رہ جاتے، کوئی قابو نہ چلتا رات دن اسی خیال میں رہتے کہ کب اس کی شادی ہو اور کب سسرال دفع کیجائے، مگر کہیں سے بات چیت کی نوبت نہ آتی۔ ادھر اس کے شباب کی امنگوں کا یہ عالم کہ جب کبھی باہر نکلتی تو کسی پر نینوں کا بان مارتی، کسی کو پیروں سے ٹھکراتی، لوگ حسبِ حال اشعار سناتے۔ ع کبھی بن سنور کے جو آگئے تو بہارِ حسن دکھا گئے۔ ان میں سے کوئی چلاتا، ہائے مار ڈالا! کوئی اُف! کہتا، کوئی آنکھوں کا فرش بچھاتا، کوئی کھڑا مسکرا مسکرا کر اشارے کرتا، کوئی دودو سے روپے ٹھن ٹھناتا۔ اور یہ کسی کو بالا بتاتی، کسی کو ٹھینگا دکھاتی، کسی کو انگلی پر نچاتی، کسی کی طرف دیکھ کر مسکرا دیتی، لوگ ہائے بجلی گری، کہہ کر چلاتے اور کلیجہ پکڑ کر رہ جاتے۔ غرض محلے محلے، گھر گھر، قدم قدم پر اس کے حسن و شوخی کے چرچے ہونے لگے۔ شمع حسن روشن ہو چکی تھی، اب پروانوں کی باری تھی، ہجوم پر ہجوم ہونے لگا، کوئی جل مرا، کوئی سسکیاں لینے لگا۔ کوئی ادھ موا پڑا آہ سرد بھرنے لگا ــــــ اسکی

تو خبر نہیں کہ کتنوں کے ساتھ ساٹھ گانٹھ ہوئی۔ کتنوں سے بے وفائی کی، اور کتنوں کو تڑپا کر چھوڑ دیا۔ ہاں البتہ اتنے عاشقوں میں اگر کوئی سب سے زیادہ مشہور تھا تو وہ ایک نوجوان دولتمند گھرانے کا تھا جو آنکھ ملتے ہی فریفتہ ہو چکا تھا۔ دن بھر اس کی محبت میں تانے بانے کرتا مگر عشق کی کچھ چلائے نہ چلتی، دن تڑپتے رات بیچین رہتے گذرتی، کمخواب آتا، آنکھیں روتے روتے لوُن کی طرح لال ہو جاتیں، مگر نتیجہ حسب خواہ نہ ہوتا۔ لجیا بھی اس کی جوانی، اس کے دزرشی ہاتھ پاؤں پر ریجھ چکی تھی، مگر ہجوم عاشقاں مانع تھا...... ایک روز محلہ ہی میں ساون کا جھومر تھا۔ مہترانیوں کا بھی ایک علیحدہ غول تھا۔ جس میں لجیا بھی شریک تھی، اُس دن دھانی ساڑی پہنے، لٹ چھٹکائے، آنکھوں میں کچھا کھچ سُرمہ دیئے، المست بنی، جھرمٹ میں للکار للکار کر گا رہی تھی...... "تو ہیں بائیو جگ میں جوان سانول گوریا"...... "تو ہیں بائیو......" چار گنڈہ آگے چلیں چار گنڈہ پچھوان"...... "بچوا میں چلے لیوا و تان سانول گوریا"... "تو ہیں بائیو......" اور گاتے گاتے ایک حشر خیز آفت ریز چال سے قیامت بپا کرتی، اٹھلاتی، بل کھاتی، آگے بڑھتی اور مست ہو ہو کر جھومنے لگتی۔ جہاں جہاں اس کی آواز پہنچتی لوگ ٹڈی دل کی طرح آتے اور ٹھٹ کے ٹھٹ لگ جاتے۔ اسی میں وہ بیمار دل بھیک نوجوان بھی تھا ـــــ رات زیادہ جا چکی تھی، دونوں میں کنکھی مٹکی ہو رہی تھی، موقع ملنا تھا کہ دونوں غائب ہو گئے اور پھر صبح تک پتہ نہ لگا۔

(۲)

لجیا کا باپ شہری فضا سے عاجز آچکا تھا۔ اُس نے خیال کیا کہ کہیں دیہات ہی میں اس کی شادی کردے، جہاں کے لوگ بالکل سیدھے سادے ہوتے ہیں، اور گرہستی کی دُھن میں رات دن لگے رہتے ہیں یہی وجہ تھی کہ اُس نے ایک دیہاتی مہتر سے بات چیت ٹھہرا کر اس کا بیاہ کرکے شوہر کے ساتھ رخصت کر دیا۔ اسے خبر نہیں تھی کہ شہر ہو یا دیہات حسن ہر جگہ اپنا اثر دکھاتا ہے۔ شہر کا بازار تو سرد ہو چکا، اب دیہات کی باری تھی جہاں کے لوگ مُردہ دل کہے جاتے ہیں ـــــ لجیا سسرال پہنچنے پر آٹھویں روز بستی میں کمانے نکلی، سسرال کا واسطہ تھا، گھونگھٹ نکالے بل کھاتی، اور عادت کے موافق کمر لچکاتی چلی جا رہی تھی، گھونگھٹ کے اندر سے حسن چھنا پانی کر رہا تھا۔ لوگ نئی مہترانی کے انداز رفتار سے صورت دیکھنے کے مشتاق ہوئے۔ دیکھا اور بہتوں نے دیکھا، مگر جس نے دیکھا وہ گھائل ہو کے رہا۔ ہر نوجوان کے پاس دل ہوتا ہے، جذبات ہوتے ہیں۔ وہ شہری ہو خواہ دیہاتی۔ اثر! اور وہ بھی حسن کا اثر کیونکر خالی جاتا۔ دوسرے ہی ہفتہ میں ہل چل مچ گئی، چرچے ہونے لگے، لونڈوں کی نگاہیں دیدار جاناں کی متمنی رہنے لگیں، جا بجا تاک جھانک ہونے لگی، دن رات عاشقوں کا ہجوم بڑھنے لگا۔ شہر کی رہنے والی تجربہ کار لجیا کے لئے بھلا ان دیہاتیوں کو رجھانا کوئی بڑی بات تھی

نیچے تلے ہتھیاروں، اور منجی ہوئی چوٹوں سے کام لینے لگی - پھر کیا تھا - وہی ہائے وائے کے نعرے، وہی
گرم بازاری، وہی قتلِ عام شروع ہو گیا - غرض عشرہ کے اندر ہی اندر اک آگ تھی جو ساری بستی میں پھیل
گئی - لجیا اُن کے جلنے، مرنے، تڑپنے کا تماشہ دیکھتی، مسکراتی اور احمق بناتی، مگر کسی کو مُنہ نہ لگاتی، شاید
اس کی وجہ سسرال آنے کا پہلا اتفاق اور شوہر کی نگرانی ہو - غرض بستی میں سبھی اس کے پیچھے دیوانے تھے،
دل دے چکے تھے، اور تڑپ رہے تھے - کل ہی کی بات ہے، لجیا ذرا بن سنور کے گھر سے باہر نکلی اور بستی میں
چلی - قریب ہی پن چکی زوروں پر چل رہی تھی، مالک سڑک کے سامنے برآمدہ میں بیٹھا غلّہ لے رہا تھا - لجیا
وہاں پہنچی اور مالک پر اک نگاہ غلط انداز پڑ گئی، وہ تڑپ اُٹھا - "نینوں کا مارا ناہیں جیئے رے"، کہتا اُٹھ بیٹھا
چکی بند ہو گئی، وہ اُس کے پیچھے ہو لیا - اس وقت اُس کا دل محبت کی چکّی کے پاٹ میں پس رہا تھا - ——— وہ آگے
بڑھی ——— دھوبی کپڑے دھو رہے تھے، چھوڑ چھاڑ اس کی طرف دیکھنے لگے - دل ڈانوا ڈول، کلیجہ پانی پانی
ہو گیا - اپنی اپنی استری بھُولے اور اس کے عشق میں تلپنے لگے، اپنے ہی کُتّے کی طرح نہ گھر کے رہے نہ گھاٹ کے،
——— وہ آگے بڑھی ——— جولاہے تانا بانا کر رہے تھے، ہتھا کاندھے پر تھا، نظر پڑتے ہی سب
بھُول گئے - ہتھا گرا، بیتر ا بھُولے، سر چرخے کی طرح گھومنے لگا ——— وہ انہیں بغیر سنبھلے اور آگے بڑھی
——— سُنار کی دوکان تھی، اس کی طرف دیکھا - وہ دُوکان چھوڑ باہر نکل آیا، دیوانہ ہو گیا - دن بھر اسکے
فراق میں چاندی پیٹتا رہا - رات کا سونا حرام ہو گیا ——— لجیا دو قدم اور آگے بڑھی ——— اپنے
برآمدے میں بیٹھے ہاتھ میں مالا لئے ایک پنڈت بھجن گا رہے تھے، ان کی نظر جا پڑی، ہاتھ سے مالا چھُوٹ پڑی
زبان بند ہو گئی، ساری کتھا بھُول گئے، دیدے پھاڑے اُس کی طرف دیکھا کئے، وہ اور آگے بڑھ گئی ———
کنجڑہ میوہ فروشی میں مشغول تھا - اُس کو اپنے پھلوں پر بڑا ناز تھا - اسے کیا خبر کہ نخلِ جوانی کے ثمرِ نَورس کے آگے
رس بھری کیا؟ ——— لجیا اس کی دوکان کے سامنے ذرا اٹھلکی، کنجڑہ کے ہاتھوں سے ترازو، اور خریداروں کی
مُٹھیوں سے پیسے گر پڑے - اور وہ آگے بڑھ گئی ——— مختصر یہ کہ جس طرف سے بھی گئی، جس پر غلط انداز
ایک نگاہ بھی ڈالی، جسے تاک لیا، پھر اس نے پانی نہ مانگا - اب اسی سر دمہرِ عشق کی گرم بازاری تھی، اور سب کی
زبان پر اُسی کا نام ——— لجیا اب گھر لوٹ رہی تھی اور عاشقوں کا غول پیچھے، ایک کشش تھی، اک جذبہ
تھا، ایک مقناطیس تھی جو سب کو کھینچے لئے جا رہی تھی - اسی طرح لجیا گھر پہنچی - شوہر سے کہا ذرا باہر نکل کر
تماشہ تو دیکھو - بھلا ایسی حالت میں مَیں کیسے باہر نکل سکتی ہُوں - یہ دیہات تو شہر سے بھی بڑھ کر پاجی اور
اوباش نکلا - مَیں تو اب باہر نہیں جانے کی ——— شوہر باہر آیا، مجمع کو سخت و سُست کہا تو مدہوشوں
کو ہوش آیا اور ہارے ہوئے جواری کی طرح چونچ لٹکائے، بدن ڈھیلا کئے گھر گھر لوٹ گئے - آنے کو تو آئے

ر لوہار سے ہل، دھوبی سے گھاٹ، سنار سے دوکان، جولاہے سے کرگھہ، بنیوں سے بیوپار، پنڈت سے
پوجا، عامل سے عمل، وید سے ویدک، حجام سے کسوت، حکیم سے حکمت، اور زمیندار سے زمینداریاں چھوٹیں
—— غرض ایک انقلاب عظیم ساری بستی میں پیدا ہو گیا۔ جسے دیکھو وہ ایک ہی آفت میں مبتلا ہے، ایک ہی
آگ میں جل رہا ہے، ایک ہی شمع کا پروانہ ہے۔ ساری بستی شہر خموشاں بنی ہے، محلے ویران معلوم ہوتے ہیں
ایسا جیسے قیامت نازل ہوگئی ہو یا کوئی آفت آگئی ہو —— اس ہنگامۂ محشر خیز میں ہمارا شہری
نوجوان بجیا کا پرانا عاشق بیل کی خریداری کے بہانے گاؤں میں آیا اور دور سے اس نے دیکھا، اپنے کو دکھایا
مگر اتنے چاہنے والوں کے مجمع میں بھلا بات کا موقع کہاں —— بیل کا دام تو پٹ چکا تھا، مگر اسے لینا ہی
کب منظور تھا، وہ تو کسی اور ہی گھات میں آیا تھا۔ گاؤں کے من چلے نوجوانوں کا مجمع اس کے گرد ہو گیا جنہوں
نے اپنی آنکھوں سے اسکا جائزہ لینا شروع کیا، یاران طریقت سے بھلا اسکی نظریں کہاں چھپنے والی تھیں کہیں کسی نے
اشارہ کرتے ہوئے دیکھ لیا، بس پھر کیا تھا سارا راز فاش ہو گیا، تالیاں بجنے لگیں، تب تو یہ بہت شرمائے اور
الٹے پیروں یہ کہتے ہوئے ع "بہت بے آبرو ہو کر ترے کوچے سے ہم نکلے" شہر لوٹ آئے۔

(۳)

جس بستی کا سارا کاروبار بند ہو جائے، عورتوں سے ان کے مرد بیزار رہنے لگیں، کھانے پینے کا سہارا
جاتا رہے، بال بچے بھوکے رہنے لگیں، پھر اس بستی کی تباہی کا کیا پوچھنا، ہر عورت کے دل میں یہی آگ تھی جو
سلگ رہی تھی، یہی اک لو تھی جو لگی ہوئی تھی کہ کس طرح اس بلا کو ٹالا جائے۔ جب تک یہ یہاں موجود رہیگی
بستی کی یہی حالت رہیگی۔ جہاں کہیں چار عورتیں ایک جا ہوتیں یہی تذکرے ہوتے، یہی بات چلتی۔ بجیا کے
نکالنے کی سو سو فکریں ہوتیں، مگر دماغ کام نہ کرتا، سارے تریا چلتر دھرے رہجاتے۔ بالآخر یہ طے پایا کہ گمنام کہار
کے سامنے والے میدان میں گاؤں کی عورتوں کا "بٹور" ہو اور سب لوگ مل جل کر کوئی بات ایسی نکالیں جس سے
یہ بلا ٹالی جا سکے۔ غرض ایک روز رات کو گمنام کے دروازے پر بستی کی عورتوں کا ہجوم تھا۔ چائیں چائیں،
کچھ ہو رہی تھی کہ کہیں سے دمڑیا گوالا زمیندار کا پیادہ آگیا جس کے بال انہیں کاموں میں سفید ہوئے تھے۔
بات کو دیکھ کر اسے اچنبھا سا ہوا، پھر عورتوں کو ہٹاتا ہوا گمنام کے پاس پہنچا اور کہنے لگا۔ "کون ایسن بپت پرلی
کل ہو چکرے بدلے تہرے دوار ابٹور ہو۔ کا بھئل ہو" اتنے میں گمنام کی لڑکی نے ایک مچیا لاکر دی۔
... آرام سے بیٹھ چکا تو چلم بھر لائی۔ مشغلہ اچھا ہاتھ آیا تھا۔ دلچسپی کافی تھی، وہ ٹٹول رہا تھا کہ معاملہ
کیا ہے۔ دل سے دعا بھی کر رہا تھا کہ کہیں مٹھی گرم ہو —— ایک ادھیڑ تیلن ان کے سامنے آئی، کہنے
لگی۔ "چاچا! اب بستی کا ای ہے دسا رہی"، دمڑیا بولا "تہ کا بھئل ہو تون کوہ"۔ وہ بولی "بہن سے

جن کہلواوٗ آپن پتو ہوسے پوچھ لیہہ۔ ایسن بتیا نو لین جیسی کونو آن گاوں سے آج آئیلن ہیں۔" دمڑیا ہنسا اور کچھ دیر کھلکھلانے کے بعد بولا " تورا کہلاسے تنی منی اور رلت ہو، مدا تنہن سے معلوم ہوت تو او میسن اوپائے نہ ہوت۔" تیلن کے علاوہ اور عورتیں بھی قریب آگئیں، چاوں چاوں شروع ہو گیا۔ ایک دوسری عورت نے تیلن کے ہاتھ میں دو روپے دئے اور اشارہ دینے کا کیا۔ تیلن نے کہا "چاچا لجیا کے نا جانے لا۔" وہ ہنسکر بولا " ہاں ہاں! بوجھ گیلین۔ تہ کا چاہے لیو۔" تیلن نے کہا " بس کونو اوپائے ایسن بتاوٗ کہ او گاوں چھاڑے۔" اس نے کہا " تہ ایسے ہی کارج ای بتور بیٹھیل ہو؟ مدا کارن بہت مشکل ہے! ادھرمی کے بنی ہو۔" تیلن نے جواب دیتے ہوئے دو روپے ان کی نظر کردئے۔ پیادے کی مٹھی گرم ہوتے ہی وہ ڈھیلا ہو گیا اور آہستہ آہستہ صلاح و مشورہ ہونے لگا، پھر زور سے کہا " اوپائے تو ایسن ہے کہ بس رے بس مدا کھرچا سبھے کے ہوی۔" سب نے کہا " جرور جہاں سبھے ماپھک ہوی سہل جائی۔" دمڑیا کہتا ہوا کہ " اچھا تہ بیہان سویرے ٹھاکر کی ڈیوڑھی پر تنہن مل جل کے آوت جا، بات جون پڑی تون ہم بنالیب۔" اٹھ کر چلا گیا ——— دوسرے دن صبح کو منشی سکھ نندن لال کی کچہری پر پچاس ساٹھ عورتوں کا مجمع ہو گیا، جس میں ہر قوم و ملت کی عورتیں شریک تھیں، منشی جی نے عینک چڑھالی، اور کھانستے ہوئے ذرا عب دار آواز سے بولے " کیا ہے اور یہ کیسا مجمع ہے۔" چونکہ پیادہ پہلے ہی سے عورتوں کا ہم خیال ہو چکا تھا اسلئے آگے بڑھ کے بولا " حجور! ای آپن رعیت ہو اور بہت تباہ ہو رہل ہو۔ انکر یہ یاد ہوے کہ لجیا کے ایلا سے سب کر مرد ہاتھ پہ ہاتھ دھیلے سوچ بچار میں رات دن رہے لن۔ کیہو کونو کام کاج ناہیں کرت۔ سگر وبستی اوجاڑ ہو رہل ہو۔ لیکن بھوکھل مرت باٹیں۔ کونو اوپائے ایسن ہوئے کے چاہی کہ او دیہان ہو جائے، نہ رہے بانس نہ بجے بانسری۔" منشی جی عینک سنبھالتے ہوئے بولے " کوئی اپنی مہاراو کیسے چھوڑ سکتا ہے۔ کوئی قانون نہیں بتلاتا، نہ کوئی کسی کو مجبور کرسکتا ہے۔" پیادہ بولا " حجور! مدا روپیہ پیسہ سے تو سب کچھ ہو سکے لا۔" منشی جی بولے " تو پھر اس کے لئے جمع بھی تو چاہئے۔ معلوم نہیں دو سوے یا تین سوے۔ بھلا اتنا کہاں سے آسکتا ہے۔" پیادہ نے کہا " مالک اتنا تو ناہیں پرنتو سو پچاس بہری کمی کے اکٹھا ہو سکے لا۔" منشی جی نے کہا " تو دو سو روپیہ اگر یہ لوگ دیں تو میں اسے راضی کر دوں اور حرامزادی لجیا کو نکال باہر کروں۔" غرض سیکڑوں رد و قدح کے بعد ڈیڑھ سو پر راضی ہوئے عورتوں نے اسی وقت چندہ کرکے روپے جمع کرنا شروع کئے اور دوسرے دن ڈیڑھ سو روپے منشی جی کے یہاں جمع ہو گئے۔

جس وقت یہاں عورتیں روپے جمع کر رہی تھیں ٹھیک اسی وقت لجیا کا شوہر اپنے گھر پڑا سوچ رہا

تھا کہ ایسی عورت سے تو میں بے عورت کا ہی بھلا، اور ایسی خوبصورت سے تو کالی کلوٹی اچھی، اوّلاً تو اسے سنگار پٹار سے فرصت نہیں ملتی، دو مُسٹنڈے جس کے یار آشنا اتنے، بھلا وہ میرے کس کام کی! آخر کس مزے سے بھوجی رہتی ہے۔ گھر کا کام کاج کرتی ہے، باہر کمانے بھی جاتی ہے، اور سب سے بڑی بات یہ کہ بھیا کی نسل میں افزائش بھی کرتی ہے، ہر سال ایک سوانگ زیادہ ہی ہوتا جاتا ہے۔ وہ نہ ترقی کریں گے تو کیا میں کرونگا!!! مجھے جلد از جلد اسے نکال باہر کرنا چاہیئے، اور بھوجی کے رشتہ مندوں میں سے کوئی ویسی ہی عورت بیاہ کے لانا چاہیئے۔ یہ سوچ ہی رہا تھا کہ دمڑیا پیادہ کے پکارنے کی آواز آئی "ایلین مہراج" کہتا ہوا باہر نکل آیا۔ پیادہ اسے ساتھ لئے ہوئے زمینداری کچہری میں لایا ——

جیوں ہی دیوان جی کی نظر مہتر پر پڑی، آگ بھبھوکا ہو کر غصہ سے بولے "کیوں بے حرامزادے! تو ایسی پاجی اوباش اور آوارہ عورت کہاں سے بیاہ کے لایا ہے، جو تمام بستی میں ہل چل ہے۔ سب کام کاج چھوڑ بیٹھے ہیں، عورت کاہے کو ہے ایک بلا ہے جو ساری بستی پر مسلط ہے۔ کیوں نہ تجھے ایسی سزا دیجائے جو تجھے عمر بھر یاد رہے"۔ وہ رو رو کر کہنے لگا "مہراج! آپن سر پر نردوس ہے، ای شہریا پاپی ہمرے سنگ بھاٹ دیہلن۔ ہم کا وُ جانت۔ ہلیں کہ ای کھراب ہوئی۔ ٹھاکر! ای ہے بچار کرکے مورد جیرا کلیت بائے۔ کونو اُو پائے ہو کھے تہ کیہل جاؤ"۔ منشی جی گردن ہلاتے ہوئے بولے "عورت کو حاضر کرو۔ —— لجیا بلا کر سامنے کھڑی کیگئی۔ اسے علیحدہ کمرہ میں لیجا کر دیر تک .... بات چیت کرتے رہے پھر باہر آکر فرمانے لگے "وہ اس شرط پر راضی ہوئی ہے کہ تو اپنے چھوڑنے کا ڈنڈ اسے پچاس روپے دے اور اس کا خط جسے وہ بتلائے شہر لیجا کر پہنچا دے۔ مہتر خط پہنچانے پر تو راضی تھا مگر نقد روپے دینا اسے گوارہ نہ تھا۔ غرض ہوتے ہواتے پچیس روپے پر یہ معاملہ طے پا گیا اور لجیا کا شوہر نقد روپے داخل کرکے خط لیکر بتلائے ہوئے پتہ پر پہنچا آیا۔

جس کے نام خط تھا وہ دوسرے دن دوڑتا دھوپتا منشی سکھ نندن لال کے پاس حاضر آیا۔ منشی جی نے کچھ آہستہ آہستہ اپنی کارگذاری بیان کرکے اس پر احسان جتایا، اور لجیا کو بلا کر اس کے حوالہ کر دیا —— یہ وہی نوجوان شہری تو تھا —— مدتوں کی آرزو آج پوری ہو رہی تھی — لجیا کو لے جاتے وقت خوشی میں پچیس روپے بطور سلامی دیوان جی کی نذر کے —— اس طرح بستی کا روگ کٹا اور دیوان جی کی مٹھی گرم ہوئی۔

(ڈاکٹر) سید قمر الدین حیدر

وداع

از ملک عبد العزیز صاحب فطرت

مری نظر کی اداسی ہے یا جہاں ہے اداس
زمیں ملول ہے یا روئے آسماں ہے اداس

وہ رنگ بدلا ہے رنگِ بہار نے صد حیف
مری پسند کے نظارے ہو گئے بے کیف

رہی نہ چشمۂ کہسار میں وہ شانِ جمال
مرے خیال میں ممکن نہیں تھا جسکو زوال

وہ اسکا نغمۂ رنگیں وہ اسکا رقصِ حسیں
جواب جن کا زمانے کی شوخیوں میں نہیں،

سب اس سے چھن گئے یا ہے مری نظر کا قصور
خرام میں نہیں اس کے پرانا کیف و سرور

یہ دھیمی چال یہ ماتم سی لے قیامت ہے
نشوں سے ہو گئی عاری یہ مے قیامت ہے

درخت اگرچہ اسی طرح سرسراتے ہیں
مگر ملال کے افسانے اب سناتے ہیں

تھکی ہوئی سی زبانوں کی داستانِ الم
ہے سرد و گرم زمانہ کا شکوۂ پیہم

یہ امتدادِ زمانہ نے کر دیا مجھے کیا
مری نگاہ سے حسنِ نظر کو چھین لیا

ہر ایک رنگ میں رنگِ ملال دیکھتا ہوں
زمانہ پر اثرِ ماہ و سال دیکھتا ہوں

کسی زمانہ میں زیبائیِ طلوعِ سحر
مرے لئے تھی بڑا لطف آفریں منظر

مہ و ستارہ کی محفل کا سرد ہو جانا
افق کا نور زر افشاں سے زرد ہو جانا

عجب کشش کا تھا ساماں مری نظر کیلئے
میں راتوں جاگا ہوں اک منظرِ سحر کے لئے

مگر وہ خوابِ لطافت اب ایک حسرت ہے
نہیں نگاہ کا دھوکا نہیں، حقیقت ہے
طلوعِ صبح کی پہلی کرن بھی ہے مدغم
فغاں! کہ صبح کے آثار ہیں پیامِ الم
نہ ہلکے رنگوں کا پرکیف امتزاج رہا
نہ چوٹیوں پہ درختوں کی زر کا تاج رہا
نہ ہلکے سایوں کا طوفانِ آسماں پیما
نہ سرخیاں ہیں شفق کی نہ نور کا لہرا
یہ بات کیا ہے کہ محسوس ہو رہا ہے مجھے
غموں کی موج میں کوئی ڈبو رہا ہے مجھے

یہ کیسی صبح ؟ کہ مہمانِ آسمانِ سحر
وہ مسکراتا ہوا شاہزادۂ خاور
بکھیرتا ہوا لعل و گہر طلوع ہوا
بہ صد جلال بہ عزمِ سفر طلوع ہوا
مگر بجائے مسرت کے رنج لایا ہے
ردائے نور نہیں خود غموں کا سایا ہے
جبیں پہ اسکی نہیں آفتابِ نو کا جلال
یہ آفتابِ سحر اور یہ رنگِ اضمحلال
عجیب صبح ہے سحر دم جو سرور سے ہے
شراب خانہ تہی موجِ رنگ و نور سے ہے
وہ حسن اب نظر آتا نہیں نگاہوں کو
جو لالہ زار بناتا تھا میری راہوں کو
دھند لکے چھپانے لگے زندگی کی راہوں پہ
چڑھے غلاف اندھیرے کے اب نگاہوں پر
سحر کے وقت سے اظہارِ رنگِ شام ہوا
سفر ترا دلِ غم آشنا تمام ہوا

تکان سے دلِ زندہ کا مضمحل ہونا
ہر ایک بات کا احساس میں مخل ہونا
حیات کا سفرِ غیر مختتم بننا
مرے ایاغِ مسرت کا جامِ سم بننا
نفس کی آمد و شد جی پہ بار ہو جانا
ہر ایک ساعتِ غم بیکنار ہو جانا
فضا اداس ہے رنگ نظر پریدہ ہے
لبِ خموش پہ اب مرگ کا قصیدہ ہے
بس ایسے وقت میں تارِ نظر الجھ جانا
شرابِ یاس سے بھر جانا دل کا پیمانا
بہارِ رفتہ کی رنگینیوں میں کھو جانا
بس ایک خوابِ دلاویز بن کے سو جانا

وداع اے مری دنیا کہ میں روا نہ ہوا　　مسرّت و غمِ ہستی اب اک فسانہ ہوا

فرشتہ لے کے چلا میری رُوحِ نُورانی

فضا میں پھر مرے ماضی کی ہے درخشانی

عبدالعزیز فطرت

دلِ پُرآرزو

آرزوؤں کی انتہا ہی نہیں　　دلِ ناداں تو مانتا ہی نہیں

پہلے یہ "چاند" کو پکڑتا تھا　　خیر اس وقت تو یہ لڑکا تھا

پھر کھلونوں کے واسطے وہ ضدیں　　دینے والے بھلا کہاں تک دیں،

ہاتھ پاؤں نکالے جب اس نے　　عشق کرتا تھا اچھی صورت سے،

عشق کیا تھا ہوس جوانی کی　　جتنی پریاں تھیں سب کہانی کی

عقل جاتی رہی بڑھاپے میں　　یہ تو سمجھا کہ آئے آپے میں

لَو خدا سے لگائے بیٹھا ہے　　ماسوا کو بھلائے بیٹھا ہے

جیسے اللہ میاں بھی بھیجینگے　　ملک الموت کو نہ بھیجینگے

بعد مردن امیدِ جنّت ہے

دلِ پُرآرزو قیامت ہے

نغموں کی لہر

(جناب ایوب محسن صاحب)

مغنّی نے چھیڑا ہے دلسوز راگ — بھڑکنے لگی میرے سینے میں آگ
یہ نغمے - یہ آواز کی پختگی — زبان ولب ولہجہ کی شستگی
یہ مضراب سی کانپتی انگلیاں — ستاروں سے لے آئیں موسیقیاں
یہ نغمہ سرائی کا اعجاز ہے — کہ ہر لفظ بجتا ہوا ساز ہے
مغنّی کی ہر تان ہے نیشتر — غزل کا ہر اک شعر جادو اثر
ہر اک تان پہ ہیں ستارونکا رقص — ہر اک شعر میں ہیں شرارونکا رقص
یہ نغمہ یہ شعلہ بھڑکتا ہوا — کوئی نوجواں دل دھڑکتا ہوا
نکھرتی ہوئی زندگی کا خمار — سنورتی ہوئی چاندنی کی بہار
یہ نغمہ، رواں کیف، بڑھتا نشہ — برستی شراب اور چڑھتا نشہ
یہ نغمہ ہے یا بادۂ جاں گداز — مغنّی ہے یا ساقیٔ دلنواز
سریلے سُروں کی بہائی شراب — صراحی انڈیلی کہ چھیڑا رباب
اُٹھیں دل میں احساس کی سوزشیں — جگا دیں ہیں نغمہ نے سب خواہشیں
طبیعت میں ہیجان سینے میں جوش — یہ طوفان نغمات مینا بدوش
بکھیری ہیں نغمہ نے بیہوشیاں — لٹا دیں جوانی کی مدہوشیاں
ہے مقصود فکرِ غمِ حادثات — جواں ہو گئی غمزدہ کائنات
مغنّی نے دلکش ترانے سُنائے — شرابِ ترنم کے ساغر لنڈھائے

ہوئیں دل میں مستی کی لہریں رواں
سمندر میں جیسے ہوں لہریں رواں
میں گم ہو گیا نے میں اور تان میں
خوش آئند خوابوں کے طوفان میں

مری روح تحلیل ہو کر رہی
مسرت کی تکمیل ہو کر رہی

ایوب محسن

تمنائیں

(آزاد نظم)

میں بنوں ماہِ درخشاں اور چمکوں چرخ پر
یا بنوں زرّیں ستارہ نور پھیلائے ہوئے
ابر کا ٹکڑا بنوں جھوموں ہوا کی دوش پر
بن کے بجلی یا چمک اٹھوں میں بادل میں کبھی
یا بنوں پیاری کلی کی مسکراہٹ دلنشیں
بن کے شبنم بیٹھ جاؤں پھول کی آغوش میں
موج کی لہریں بنوں لہراؤں ناگن کی طرح
یا تو ساحل کے گھنے اشجار کے سائے بنوں
یا میں بن جاؤں ہوا کی سرسراہٹ خوشگوار
یا بنوں تتلی کی شوخی یا بنوں بھونرے کا راگ
یا نسیمِ کیف پرور بن کے میں جاؤں وہاں!
اور اپنی یاسمن کی زلف سے کھیلوں کبھی
اک سرور آمیز نغمہ، اک سرور انگیز راگ!
اور "وہ" سنتے ہمیں اک جذبۂ رنگیں کے ساتھ ——"!

آنسہ نسیمہ سوز

سفید کبوتر

(از مولانا شاہد حسن صاحب سوز ناروی)

اے مرغِ وفا کیش و سمن پوش و نکو تر
شفاف و درخشندہ و براق کبوتر

سب ایک طرف حسن ترا ایک طرف ہے
تجھ سے ہی تو عالم کے پرندوں کو شرف ہے

یاقوت کے پنجے ہیں تو کافور کے پر ہیں
کافور کے پر توبہ ارے نور کے پر ہیں

کیا لرزشِ پیہم سے کسی رنگ پہ ٹھیریں
گردن کی یہ شکنیں ہیں کہ ہیں دودھ کی لہریں

رنگینی و رعنائیِ فطرت کی ہے شہکار
اک غنچۂ سربستۂ گل ہے تری منقار

تو ہے شبِ تاریک کا ٹوٹا ہوا اختر
ترشا ہوا اڑتا ہوا اک پارۂ مرمر

سب بال و پر انوار کے اجزائے سرشتہ
تو میری نظر میں ہے پرندوں کا فرشتہ

میں شوقِ فراواں میں جو قابو کبھی پاؤں
چوموں کبھی تجھکو کبھی آنکھوں سے لگاؤں

اِس شکل و شمائل پہ قیامت ہے یہ مستی
اللہ رے ترا حسن، مری حسن پرستی

سوز ناروی

جنگ اور اسلام

(از جناب ذکی اورنگ آبادی)

بدلا ہوا ہے ارض و سما و فضا کا رنگ — آتی ہے ہر طرف سے صدائے نفیرِ جنگ
دوشِ ہوا پہ جنگ کے ہیں سُور ماسوا — برپا جہاں میں کیوں نہ ہو طوفان شعلہ بار
غارت گری کی جوش پہ ہیں چیرہ دستیاں — ہر سمت کشت و خوں سے ہیں ویران بستیاں

گلزارِ دہر آج ہے اک مذبحِ بشر — لاشے لہو میں تیر رہے ہیں اِدھر اُدھر
گھنگھور جنگ کی ہے گھٹا زیرِ آسماں — سہمی فضا ہے لرزہ بر اندام ہے جہاں
جنگی مشینوں نے وہ مچائیں تباہیاں — بیواؤں کی ہیں نالے یتیموں کی ہیں فغاں

خوں روئیے مآلِ جہاں سوز دیکھ کر — بربادیوں پہ ڈالیئے عبرت کی اک نظر
کل تک جو اپنے ملک کی خود ہی تھے حکمراں — وہ آج ہیں غلامِ غم اندوز و خستہ جاں
کل تک جہاں پہ لالہ رخوں کے تھے جمگھٹے — آج اُس جگہ ہیں خون سے دریا بھرے ہوئے

کل تک تھیں جس جگہ پہ فلک رس عمارتیں — آج اُس جگہ ہیں خاک پہ چورنگ عظمتیں
کل تک تھیں جس چمن کی فضا خیز ڈالیاں — آغوش میں وہ آج لئے ہیں تباہیاں
جن مہوشوں کی مست نگاہیں تھیں کیف بار
ماتم کناں ہیں آج وہ ہم صورتِ عشبار

اے جنگ کے کفیل مہذب بہادرو! — حرص و ہوا کے بندو وطن کے پجاریو!
باغِ جہاں کو تم نے جہنم بنا دیا — شادابیوں کو خاک میں تم نے ملا دیا

دم سے تمہارے تیرہ و تاریک ہے جہاں دلریش و دلفگار ہے ہر کودک و جواں

برباد ہو کے رہ گئی قوموں کی زندگی

کیا بات ہے تمہارے علوم جدید کی

اے خالق اذیت و پروردگارِ جنگ! اے بے نیاز امن و اماں ذمہ دارِ جنگ!

کیوں ہے اسیر حرص بعنوان آرزو؟ کیوں ہو رہا ہے شعلہ بدامانِ آرزو؟

کیوں کھا رہا ہے سینہ پہ پیکانِ آرزو؟ کیوں بکھر رہا ہے ہو کے پریشانِ آرزو؟

کیوں کر رہا ہے باغِ جہاں کو تباہ حال؟ کیوں خود بھی ہو رہا ہے مشینوں سے پائمال؟

سب آئیں زیرِ پرچم اسلام آج ہی مِل جائیگی فلاح بھی امن و امان بھی

اسلام ہی سے سیکھیں اخوت کا سب اصول

اسلام ہی سے سیکھیں حکومت کا سب اصول

کلام مبارک

(اثر خامہ عنبر شامہ فصیح العصر حضرت مبارک عظیم آبادی)

وہی انکی گلی ہے اور ہم ہیں
وہی وارفتگی ہے اور ہم ہیں

تمہاری انجمن ہے اور تم ہو
ہماری بیکسی ہے اور ہم ہیں

اُدھر منظر ہے خود آرائیوں کا
اِدھر نظّارگی ہے اور ہم ہیں

کہاں قسمت میں اسکی پھول ہونا
وہی دِل کی کلی ہے اور ہم ہیں

تری تصویر سی ہوتی ہیں باتیں
یہی اک دل لگی ہے اور ہم ہیں

تم آنکھوں میں ہماری بس رہے ہو
یہ سیر اب ہر گھڑی ہے اور ہم ہیں

ہماری بندگی کا پوچھنا کیا
تمہاری بندگی ہے اور ہم ہیں

وہی سوزِ دروں سی سازِ دِل کو
وہی دِل کی لگی ہے اور ہم ہیں

گلے میں تھیں کبھی باہیں کسی کی
گلے پر اب چھری ہے اور ہم ہیں

غنیمت ہی شبِ غم صحبتِ شمع
یہی اک دل جلی ہے اور ہم ہیں

قسم ہے جام کی، مینا کی، مے کی
اچھوتی میکشی ہے اور ہم ہیں

وہی ہر تاک جھانک اب تک مبارک
حسینوں کی گلی ہے اور ہم ہیں

بہارِ عنایت

(رشحاتِ کلکِ فصاحت جناب عنایت الرحمان صاحب عنایت منصف گنجی)

داغِ جگر کہ داغِ دلِ داغ دار کے — سب گُل کھلائے ہیں یہ مِرے نوبہار کے
پُرکیف رات، رات تھی لطفِ بہار کی — پُرجوش دن، وہ دن تھے زمانِ بہار کے
دُونی بہار بڑھ گئی، اپنی بہار کی — ہم رو دیئے جو ہجر میں اس نوبہار کے
صیّاد! باغ سے نہ چھڑا عندلیب کو — ظالم بہار ہے۔ یہی دن ہیں بہار کے
چہرہ ہے پھول، سرو ہے قد۔ نرگسی ہے آنکھ — باغ و بہار ساتھ ہیں اس نوبہار کے
شامِ خزاں ہوئی جو چھپا چہرہ زلف میں — الٹی جو زلف اس نے تو دن تھے بہار کے
کنجِ قفس تو کیا کہ چمن خار زار ہے — باتیں بہار کی گئیں شاملِ بہار کے
لو! نخلِ زندگیٔ عنایت قلم ہوا — کمبخت نوجوان تھا، دن تھے بہار کے

چھپرہ ہے جس کا نام عنایت بقولِ میر
ہم رہنے والے ہیں اسی اُجڑے دیار کے

عنایت الرحمان عنایت منصف گنجی

REGD NO P. 294.

REGD NO P. 294.

جون جولائی سنہ ۱۹۴۲ء

THE NADEEM JUNE JULY 1942.

ماہنامہ

ندیم گیا

مرتبہ

سید حسن امام

(قیمت اس نمبر کی ۱۰/ر)

جون سنہ ۱۹۴۲ء

بیادگار
حضرت خواجہ
عشرت مرحوم
لکھنوی

ندیم

جلد ۱۹ ماہ جون سنہ ۱۹۴۲ء نمبر ۶

"تبرکات"

(۱)

جلیسِ ماضی

(از حضرت خواجہ عبدالرؤف صاحب مرحوم عشرت لکھنوی)

مولانا سیّد اکبر حسین صاحب الہ آبادی مرحوم کسی تعریف اور تعرّض کے محتاج نہیں، لکھنؤ میں جب تشریف لاتے تھے تو منشی نثار حسین نثار مرحوم مالک پیامِ یار کے دفتر میں قیام فرماتے تھے۔

ایک مرتبہ ہم سے ملنے تشریف لائے۔ اس وقت ہم "اصلاحِ سخن" کے سکریٹری تھے۔ اور اس کی کارروائی "پنچ" اور ریاض الاخبار میں چھپ رہی تھی، دورانِ گفتگو میں فرمایا کہ "قابل تعریف یہ امر ہے کہ جس محبّت سے آپ اُردو کی خدمت کر رہے ہیں، ہمارے شہر میں تو اتنی کوشش لوگ ملازمت کے لئے بھی نہیں کرتے، یہ آپ کا حسنِ خدمت ضرور بارآور ہوگا"

پھر فرمایا "مجھے ایک کتاب 'گلستانِ مسرت' کی تلاش ہے، اگر آپ کی کوشش سے وہ مل جائے تو میں ممنونِ نوازش، منشی نثار حسین صاحب نے کہا ہے کہ اس کا ایک نسخہ آپ کے پاس ہے" میں نے کہا کہ کتاب تو میرے پاس ضرور ہے، مگر وہ معرضِ بیع میں نہیں ہے، اگر آپ ملاحظہ فرما کر واپس فرمادیں تو حاضر ہے، میں کل مکان سے

یتا آؤ نگا۔ کہنے لگے "بہتر ہے، میں دیکھ کر آپ کو واپس دونگا۔"

دوسرے دن میں کتاب لیتا آیا اور وہ حسبِ وعدہ چار بجے سہ پہر کو ٹھیک وقت پر تشریف لائے، کتاب یں نے پیش کی، کتاب لیکر فرمایا "یں منشی نثار حسین کے یہاں ٹھیرا ہوں، اس کو ایک روز کے واسطے یں دیکھ سکتا ہوں؟"

یں نے کہا شوق سے آپ ایک روز دو روز دیکھ لیں۔

کہنے لگے "آپ یہ بھی جانتے ہیں میں کتاب کا چور ہوں، اگر کتاب نہ ملے تو آپ شکایت نہ کریں، یا اسکی یمت ابھی مجھ سے لے لیں، آپ کو دوسرا نسخہ مل سکتا ہے اور مجھے دستیاب ہونا دشوار ہے آپ دونوں کا نقصان ٹھائیں۔" میں نے طوعاً و کرہاً قیمت لے لی۔ اس روز سے وہ جب تشریف لاتے تھے تو مجھ سے ضرور ملتے تھے، اور اپنا تازہ کلام منشی نثار حسین کے مکان پر مجکو لیجا کر اپنی بیاض سے سُناتے تھے۔ طبیعت باذاق ہے ور وہی شوخی ان کے کلام میں بوجہ احسن تھی، جب منشی نثار حسین کا انتقال ہو گیا تو آپ نے وہاں کا قیام رک کر دیا اور امین آباد میں قیام فرمایا۔

چوک میں میری ملاقات کو تشریف لائے اور کہا "اب ہمارا قیام امین آباد پارک کے پاس نمبر فلاں میں ہے پ کوئی وقت مقرر کریں تو ہم آپ کا انتظار کریں۔"

میں نے عرض کیا "اب تو آپ سے مجھ سے بعد المشرقین ہو گیا، میرے لئے امین آباد الہ آباد سے کم نہیں ہے۔ عدہ نہیں کر سکتا، لیکن آپ کے دَوران قیام میں فرصت مِل گئی تو حاضرِ خدمت ہونگا، وقت کی پابندی نہیں کر سکتا اس کے بعد اکثر جب کبھی وہ تشریف لاتے تھے اور امین آباد میں ٹھیرتے تھے، مجھے اطلاع ضرور دے دیتے ے۔ مگر شومیِ قسمت سے مجھے حاضری کا موقع نہیں ملا۔ اس کے بعد سُنا کہ اپنی آنکھیں بنوانے تشریف لائے ب، قصد کیا تھا کہ ضرور جا کر عیادت کرونگا، لیکن اس وقت جانا ہوا کہ وہ اچھے ہو کر الہ آباد جا چکے تھے، اور مجھے ناکام واپس آنا پڑا۔

اس کے بعد مولانا کا انتقال ہو گیا اور مجھے اس بات کا بہت دن تک افسوس رہا مجھے اس بات کا ناز ہے کہ اکبر نے زمانے کو خوب پہچانا تھا۔ اور وہ پختہ مذہبی آدمی اور فلسفی تھے۔ اور ان کی نصیحت زمانے کے موافق ہوتی تھی، ان کو معلوم تھا کہ زمانہ کہاں تک رنگ بدلے گا اور آئندہ کیا روش ہو گی۔ اس کے متعلق ن کی تمام پیشین گوئیاں پوری ہوئیں اور ہو رہی ہیں

(عطیۂ خواجہ غلام محمد صاحب برادر حضرت عشرت مرحوم)

تبرکات

(۲)

نفیسہ خاتون

(از خواجہ عبدالرؤف صاحب مرحوم عشرت لکھنوی)

نفیسہ خاتون ایک شریف خاندان کی پرورش یافتہ نیک مزاج لڑکی تھی اور خاصکر اس میں رحمدلی کا حصہ زیادہ شامل تھا، آدمی تو آدمی چیونٹی تک کو اس کے ہاتھ سے ایذا نہیں پہنچی۔ وہ کہتی تھی کہ آدمی آدمی سب برابر ہیں، پھر کیا سبب ہے کہ امیر لوگ غریبوں کو کم نگاہی سے دیکھتے ہیں۔ ہندوستان ہی ایک ایسا ملک ہے جہاں امیروں کے سوا غریبوں کی عزت کچھ نہیں۔ نہ علم کی قدر ہے، نہ شرافت کی قدر ہے نہ نیکی کی قدر ہے نہ رحمدلی کی منزلت۔ گورنمنٹ کی طرف سے ان باتوں کا کوئی خیال نہیں کیا جاتا۔ صرف دوستی کی قدر کیجاتی ہے آنریبل کا خطاب اسی کو دیا جاتا ہے جو دولت رکھتا ہے عزت نہیں رکھتا، اس کے افعال خراب ہیں۔ وہ رحم دل نہیں ہے، وہ غریبوں کو آزار پہنچاتا ہے گورنمنٹ کی رعایا بھی اسی کو آنریبل سمجھے تو کس قدر غلط فہمی ہے۔

گورنمنٹ کو چاہیئے کہ بعد تحقیقات کامل آنریبل کا خطاب دیا کرے تاکہ ہماری نگاہوں میں بھی اس کی اسی قدر عزت ہوا کرے جس قدر گورنمنٹ کی نگاہوں میں ہے۔ لیکن بہت سے آنریبل کے خطاب یافتہ نیک چلن اور رحمدل ہیں، وہ مردم آزار نہیں ہیں۔ لیکن اگر گورنمنٹ اس ٹائٹل کے دینے میں ایسا خیال رکھے تو زیادہ بہتر ہوگا۔ اس وقت آنریبل کے خطاب میں حقیقت کی جھلک پیدا ہو جائیگی اور یہ خیال دُور ہو جائیگا کہ گورنمنٹ سلطنت کے خوشامدی کو خطاب دیتی ہے۔

پندرہ برس کے سن میں اس کی شادی ایک کمسن نوجوان شریف خاندان کے لڑکے سے ہوئی، جس کا نام خلیق احمد تھا۔ وہ بی۔اے تک تعلیم پا چکا تھا، اب اس خیال میں کوشش کر رہا تھا کہ قانون کا امتحان پاس کرکے وکالت شروع کرد[illegible] مگر نفیسہ خاتون کو جب معلوم ہوا کہ اس کا شوہر وکالت کا پیشہ کرنا چاہتے ہیں تو اس نیک بخت نے کہا کہ آدمی کو روزی ایسی کمانی چاہیئے جس سے قوم کو نقصان نہ پہنچے۔ وکالت اگرچہ اچھا پیشہ ہے مگر وکلا نے اپنے طرز عمل سے

اس روزی کو ناجائز بنا دیا ہے۔ موکل بیچارہ اپنا پیٹ کاٹ کر ان کو فیس دیتا ہے۔ لیکن زیادہ روپیہ ملنے کی لالچ میں اسی تاریخ پر دوسرا مقدمہ لے لیتے ہیں اور اپنے عوض ایک دوسرے وکیل کو بھیج دیتے ہیں جو مقدمہ کی بحث کے لئے تیار نہ تھا۔ اور موکل جو فیس انہیں دے، وہ کچھ دوسرے معمولی وکیل کو دیکر خود کھا جاتے ہیں، اور اکثر خلاف قانون فیس لیتے ہیں جس سے روپیہ کا نقصان ہونے کے بعد بھی موکل کو کامیابی نصیب نہیں ہوتی، وہ اپنا کلیجہ پکڑ کے رہ جاتا ہے۔ دوسرا امر اس سے بھی برا کرتے ہیں کہ موکل کے مقدمہ میں فریب کا پہلو نکال کر حاکم کو فریب دیکر عدالت موجودہ سے کامیابی حاصل کر لیتے ہیں لیکن جب اس کی اپیل ہوتی ہے تو مقدمہ ڈسمس ہو جاتا ہے اور موکل کو اور زیادہ نقصان اٹھانا پڑتا ہے۔ تیسرا نقصان یہ کہ جھوٹے سچے مقدمے لیکر پیروی کرتے ہیں، اور موکل سے یہ نہیں کہتے کہ مقدمہ میں جان نہیں ہے، تم اپنا روپیہ کیوں خراب کرتے ہو۔

وجہ یہ ہے کہ وکیل بہت ہو گئے ہیں اور ہر شہر میں ضرورت سے زیادہ ہیں، اسلئے جو مقدمہ آتا ہے اسے کم فیس پر لے لیتے ہیں، اور موکل کے نقصان کا خیال نہیں کرتے، اس سبب سے ایسی روزی ناجائز ہوتی ہے، وکیلوں کی آمدنی بھی کم رہ گئی ہے۔ اب تو وکیلوں کو پیٹ بھر روٹی بھی نہیں ملتی، وہ ملازمت ڈھونڈتے ہیں اور نہیں ملتی۔

... ...

... ... میرا خیال یہ ہے کہ پڑھ لکھ کر کوئی پیشہ یا تجارت کرنا بہتر ہے، خدا نے اسمیں برکت دی ہے۔

خلیل احمد نے کہا دوسرا زینہ ترقی کا ڈاکٹری ہے۔ کہ ڈاکٹر سرکاری نوکر بھی ہوتے ہیں اور مریضوں سے فیس لیکر جلد ترقی کرتے ہیں۔ ہسپتال سے دو سو چار سو کی تنخواہ ہوتی ہے۔ مریض یہ اعتبار کرکے کہ سرکاری ڈاکٹر ہیں، ان کی تشخیص اچھی ہوگی ہسپتال میں جاتے ہیں، وہاں ڈاکٹر توجہ نہیں کرتے، اور جب ایک فیس دیکر گھر پر بلاتے ہیں تو توجہ سے دوسرا نسخہ لکھتے ہیں اور کہتے ہیں ہسپتال میں اچھی دوا ہی نہیں ہوتی ہیں اسلئے فائدہ نہیں ہوتا۔ جس دواخانہ سے ان کا نسخہ خریدا جاتا ہے وہاں سے بھی چہارم روپیہ فیس کا ملتا ہے۔ اس ترکیب سے ڈاکٹروں کو ترقی کا موقع مل جاتا ہے۔ نسخہ میں کچھ ایسے نشانات مقرر کئے ہیں کہ ہر دواخانہ سے وہ نسخہ نہیں بندھ سکتا۔ صرف وہی دواخانہ نسخہ کو باندھ سکتا ہے جس کے ساتھ ڈاکٹر کی فیس کا معاملہ ہو چکا ہے۔ اور کوئی بڑے ہسپتال میں کوئی آدمی آپریشن کے لئے آگیا ہے تو سمجھ لیجئے ڈاکٹر صاحب کے لئے خزانہ کا منہ کھل گیا۔ ڈاکٹر صاحب کے دلال کہتے ہیں ہسپتال کے مکان میں تو ڈاکٹر صاحب آپکی طرف خاص توجہ نہیں کر سکتے، خود ڈاکٹر صاحب نے ایک مکان اپنا مریضوں کے واسطے مقرر کیا ہے، آپ ڈاکٹر صاحب کے مکان پر علاج کیجئے تو آپ کو بہت جلد صحت ہو جائیگی جب مریض وہاں آیا تو ڈاکٹر صاحب فرماتے ہیں، آپریشن فیس پانچسو روپیہ ہوگی اور بعد صحت آپکو ہزار روپیہ دینا ہوگا، اور دوا کا خرچ مزید برآں۔ اور کمپونڈر کی فیس دو روپیہ، اور ڈاکٹر کا معائنہ روزانہ ہوگا، غرض اس قدر خرچ

بتا دیا جاتا ہے کہ مریض خود جیتے جی مرجاتا ہے، چونکہ جان کا مقدمہ ہوتا ہے، مریض تصور کرتا ہے جان کا مقدمہ اگر زندہ بچے تو پھر روپیہ کما لیں گے، ڈاکٹر صاحب تو اچھے ہیں اور ہسپتال میں نوکر جو کچھ مانگتے ہیں انہیں کا مُنہ (؟) زندگی بڑی نعمت ہے، اسلئے سب مظالم بیمار کو بھگتنا پڑتے ہیں۔"

یہ مثل چلی آتی ہے خدا وکیل اور ڈاکٹر کے پالے نہ ڈالے، اور جو روپیہ نہیں خرچ کرتے ہیں ان کا مرنا ہی بہتر معلوم ہوتا ہے، ایسے ایسے مصائب جھیلنے کے بعد بھی مریض اگر قسمت کا دھنی ہے تو زندہ رہجاتا ہے، ورنہ دوسرے دن لاش خانہ میں مرنے کو ڈال دیا جاتا ہے۔ اس سبب سے میں اسے بھی سب سے بدتر حرام روزی سمجھتی ہوں۔

خلیق احمد نے کہا "سرکاری سب ملازمتیں اسی ناپاک کمائی سے بھری ہیں۔ مقدمات میں جو رشوت کی بھرما ہوتی ہے، مدعی مدعا علیہ کا گلا گھونٹ کر جو روپیہ وصول کیا جاتا ہے، اس کی تم کو خبر نہیں، اسی لئے تو سرکاری ملازمت مسلمانوں کو نہیں مل سکتی۔ پچاس روپیہ مہینے کے نوکر اور دو سو ماہوار کی اوپر سے آمدنی، اگر تمہارا بس چلے تو دنیا کی آمدنی موقوف ہو جائے۔ حکام کو کیا غرض پڑی ہے کہ دنیا بھر کی رشوتوں کو تلاش کر کے بند کر دیں ایک سے ایک ملا ہوا ہے۔ سب کام بند نہیں ہو سکتا، پھر پیسہ کیونکر کمایا جائے۔"

نفیسہ خاتون نے کہا مجھے تو ایسے کام سے فاقہ کرنا قبول ہے۔ تم کوئی پیشہ یا کوئی تجارت جو شرعاً جائز ہو کرو۔ اسی میں خدا ترقی دے سکتا ہے۔ تجویز یہ ٹھیری کہ بساط خانہ کی دوکان کھولی جائے، لیکن یہ بات طے کرنے کے قابل تھی کہ دوکان بزازے میں لیجائے یا کسی دوسری جگہ کھولی جائے۔ نفیسہ خاتون نے کہا تمہارے مکان کے نیچے کے حصے میں دکانیں ہیں، انہیں میں سے ایک در لیکر دوکان کھولو۔ اور ابھی تھوڑا مال لے کر سال بھر کا حساب لگاؤ، اگر نفع ہو تو اسے رکھو، ورنہ دوسرا کام کرنا۔ ایک در میں دوکان کھولی گئی، سال بھر انتظار کیا، حساب کیا تو پچاس روپیہ ماہوار نفع حاصل ہوا۔ دوکان کا کرایہ نکال کر چالیس روپیہ ماہوار ملا۔ نفیسہ خاتون نے کہا۔ اب ہمکو امید ہو گئی کہ ہمکو اس کام میں خدا برکت دیگا، کیونکہ پانچسو روپیہ میں اگر پچاس روپیہ مہینا مل گیا تو ہزار روپیہ میں مہینے میں بہت کچھ مل جائیگا۔ یہ ضرور ہے کہ ہمکو اس صورت میں مشقت زیادہ پڑی روز کا روز مال خریدنا پڑا۔ باہر جا جا کر دکانداروں کے یہاں جانا پڑا۔ اور یہ نقص بھی رہا کہ تم مال کو سجا کر نہیں رکھ سکے۔ مال بے رونق ہوتا رہا۔ تمہاری قوت اتنی نہیں ہے کہ بار بار مال کو احتیاط سے رکھ سکو۔ ہمارے عزیزوں میں ایک یتیم بچہ احمد علی مرحوم کا ہے جس کا نام محمد علی ہے، اس کی ماں بیوہ ہے۔ اگر اس کی ماں سے کہا جائیگا تو شاید پانچ روپیہ ماہوار پر راضی ہو جائے گی، اسی کو نوکر رکھ لو۔" خلیق احمد نے ایسا ہی کیا دوسرے دن لڑکے کو اپنے ساتھ لے آیا۔ پھر نفیسہ خاتون نے کہا کہ دوکان تو تمہاری ذاتی ہے، اس میں ایک کھڑکی نیچے لگا کر مکان سے ملا دو تو مجھے بھی دکان دیکھنے کا موقع مل جائے گا۔ اور ہر قسم کا مال نفیسہ خاتون نے اپنا زیور بیچ کر چار ہزار

روپیہ کا یکمشت مال خرید کر دوکان قرینے سے سج دی۔ اب خلیق احمد دن بھر اپنی گدی پر بیٹھ کر مال بیچا کرتے ہیں، محمد علی خریداروں کو مال پسند کراتا اس کے بعد اپنی جگہ سے لگا دیتا ہے، شام کو نفیسہ خاتون سب مال درست کرتی ہے۔

دوکان کی صفائی معاملات سے خریدار خوش تھے، خریداروں کو معلوم ہو گیا، تاجر یک سخن ہی، رئیسوں کو اطمینان ہو گیا کہ قیمت نرخ بازار لیجاتی ہے، خریدار ٹوٹنے لگے۔ دوکان اعلیٰ پیمانہ پر چلنے لگی، خوش معاملگی کی شہرت ہو گئی، بازاری تھوک فروشوں میں اطمینان ہو گیا کہ خلیق احمد مالدار ہے، معاملہ کا سچا ہے۔ مال فرمائش پر برابر آنے لگا۔ نیا مال سب سے پہلے ان کے پاس آتا تھا۔ بمبئی کے تاجروں سے معاملہ ہونے لگا۔ تین سال شادی کو ہو چکے تھے، خدا نے ایک بیٹا انکو دیا، اس کی بڑی خوشی ہوئی، اور پیچھے بعد دیگرے دس برس میں چار بچے ہوئے، دو بیٹیاں اور دو بیٹے۔ ماں نے دعا کی خداوندا اتنی اولاد مجھے کافی ہے، انہیں کو زندگی عطا کر۔ اب اولاد کی ہوس نہیں ہے۔ خدا کا کرنا ایسا ہوا پھر کوئی اولاد بھی نہیں ہوئی۔ نفیسہ خاتون دن رات دُکان کے متعلق مال کی ضرورت ہوتی اس کی فہرست بناتی، بچوں کو اردو فارسی اور انگریزی کی تعلیم نویں کلاس تک پڑھا کر دوکان کے کام میں لگا دیئے۔ تین در کھول کر ایک کر کے اس میں مال بھر دیا گیا۔ اندر مکان میں کانٹیں لگا دی گئیں۔ خدا حلال کی کمائی میں ایسی ہی برکت دیتا ہے۔

(عطیہ خواجہ غلام محمد صاحب برادر حضرت عشرت مرحوم)

نمونۂ اصلاحِ حضرت عشرت مغفور

(عطیۂ جناب خواجہ حمید الدین صاحب حمید لکھنوی تلمیذ حضرت عشرت)

حمید۔ خیالِ دوست کو ہر حال میں پیشِ نظر رکھا — محبت کا یہی انداز ہم نے عمر بھر رکھا
اصلاح۔ ″ ″ ″ ″ ″ ″ ″ — ″ ″ ″ ″ دستور ″ ″ ″ ″
حمید۔ زمانہ کی ہوا جب ناموافق ہو تو مشکل ہے — پہونچنا تا بدامن ذرّۂ خاکِ پریشاں کا
اصلاح۔ ″ ″ ″ ″ ″ ″ ″ — پہونچنا اُنکے دامن تک مری ″ ″ ″
حمید۔ عقل دیتی ہے یہ تعلیم زراہِ تہذیب — بھول جانا جو کسی پر کوئی احساں کرنا
اصلاح۔ یاد رکھ راستی عقل کا فتویٰ ہے یہی — ″ ″ ″ ″ ″ ″ ″
حمید۔ اثر امید سے زاید ہوا ہے نالوں کا — کلیجہ ہل گیا آواز سننے والوں کا
اصلاح۔ ″ ″ ″ ″ ″ ″ — ″ ″ فریاد ″ ″ ″
حمید۔ وصلِ رخِ معشوق کا گویا دلیلِ مرگ ہے — شمع تک پہونچا جو پروانہ تو جل کر رہ گیا
اصلاح۔ جن کے دل میں سوزِ الفت ہے وہی جانباز ہیں — ″ ″ ″ ″ ″ ″ ″ ″
حمید۔ مجھ سے کہیں بڑھ کر مری شہرت کا قدم ہے — میں گھر میں ہوں بازار میں افسانہ ہے میرا
اصلاح۔ ″ ″ ″ آگے ″ ″ — ″ ″ ″ اور شہر میں ″ ″ ″
حمید۔ ثبوتِ سوزِ غم ہے شمع کا سر سے گزر جانا — وفا کی آخری منزل ہے پر جلنے کا مر جانا
اصلاح۔ دلیل ″ ″ ″ ″ ″ — ″ ″ ″ ″ ″ ″
حمید۔ اے وفورِ ناامیدی، تجھ سے ہل جاتی نجات — ساتھ دے دیتی اگر قسمت مری تدبیر کا
اصلاح۔ اے ہجوم ″ ″ ″ ″ — ″ ″ ″ ″ ″ ″ ″
حمید۔ کھائی ہیں ٹھوکریں جو محبت کی راہ میں — سارے بلند و پست جہاں ہیں نگاہ میں
اصلاح۔ ″ ″ ″ ″ ″ — ہر اک ″ ″ ″ ہے نگاہ میں
حمید۔ طینت بدل گئی ہے ستم جھیلتے ہوئے — بیداد تم کرو مجھے کوئی گلا نہیں

اصلاح۔ فطرت 〃 〃 〃 〃 〃　　〃 〃 〃 〃 〃 〃 〃

حمید۔ آدمی کچھ چاہتا ہے اور ہوتا ہے کچھ اور　　آسماں نے ساری امیدیں ملا دیں خاک میں

اصلاح۔ آدمی کچھ سوچتا ہے 〃 〃 〃 〃　　〃 〃 〃 〃 〃 〃

حمید۔ جو یہ کہتے ہیں ترے جلوہ میں رعنائی نہیں　　دیکھتے ہیں وہ مگر آنکھوں میں بینائی نہیں

اصلاح۔ 〃 〃 〃 〃 〃 〃 〃　　اُن کی آنکھیں ہیں 〃 〃 〃 〃

حمید۔ منزل ہے وہی میری جلوہ ہے جہاں تیرا　　اس سے نہیں کچھ مطلب کعبہ ہے کہ بتخانہ

اصلاح۔ 〃 〃 〃 〃 〃 〃　　〃 〃 〃 〃 ہو 〃 〃 〃

حمید۔ ہمتِ دل سے مہم عشق کی سر ہوتی ہے　　شبِ فرقت میں یہی سینہ سپر ہوتی ہے

اصلاح۔ 〃 〃 〃 〃 〃 〃 〃　　کہ شبِ غم 〃 〃 〃 〃

حمید۔ دوسروں پر جبر کرتا ہے جو خود مجبور ہے　　در حقیقت عقل سے انسان کتنا دور ہے

اصلاح۔ 〃 〃 〃 〃 〃 〃 〃　　〃 〃 〃 〃 کوسوں 〃 〃

حمید۔ کیوں فنا پر فخر تجکو اے دلِ رنجور ہے　　جلوہ گاہِ حسن میں یہ سعی نامشکور ہے

اصلاح۔ کس لئے نازاں فنا پر 〃 〃 〃 〃　　〃 〃 〃 〃 〃 〃

حمید۔ نصیحت باز رکھ سکتی نہیں راہِ محبت سے　　کہ ہے ہر آدمی مجبور اُفتادِ طبیعت سے

اصلاح۔ 〃 〃 〃 〃 〃　　کہ ہے مجبور انساں اپنی 〃 〃

حمید۔ اگرچہ خط سے بھی اظہارِ حالِ درد ممکن ہے　　مگر کچھ اور ہی ہے بات پیغامِ زبانی کی

اصلاح۔ اگرچہ خط بھی اظہارِ تمنا کا ذریعہ ہے　　〃 〃 〃 〃 〃 〃 〃

حمید۔ سوائے رنج کچھ حاصل نہیں ہے　　یہ دنیا رہنے کے قابل نہیں ہے

اصلاح۔ بجز تکلیف 〃 〃 〃　　〃 〃 〃 〃 〃 〃 〃

حمید۔ اللہ بچائے ترے کوچہ کی زمیں سے　　ہوتی ہے شروع آگ محبت کی یہیں سے

اصلاح۔ 〃 〃 〃 〃 〃　　لیتا ہے فلک ظلم کی تعلیم یہیں سے

خواجہ حمید الدین حمید۔ لکھنوی

خواجہ عشرت کی نثرنگاری

(از مرزا فدا علی خنجر لکھنوی)

خواجہ محمد عبدالرؤف عشرت مرحوم کو سفرِ آخرت اختیار کئے ۸ رجون ۱۹۴۰ء کو پورے دو سال ہو گئے۔ اس درمیان میں قدرت کا اٹل قانون اپنا عمل پورا کرتا رہا۔ دنیا نے سیکڑوں اُلٹے پلٹے کھائے۔ صدہا انقلابات رونما ہوئے، لیکن مرحوم کے سانحۂ ارتحال سے جہانِ ادب میں جو خلا[1] واقع ہوئی تھی، وہ اب تک جوں کی توں موجود ہے، اور شاید آنے والے ایام بھی مستقبل میں اُس کمی کو دُور کرنے سے قاصر رہیں گے۔

عشرت مغفور باقیات الصالحات کے سلسلہ کی ایک واجب الاحترام اور وقیع کڑی تھے، اُن کے موئے قلم کی جنبشوں نے نثر و نظم کی پھلواریوں میں جو حسین و جمیل گُل بوٹے کھلائے تھے وہ ہنوز اپنی بُو باس، رنگ رُوپ کی من موہنی صفتوں سے اربابِ ذوق و شوق کے دلوں کو موہ رہے ہیں۔ اُن کی رنگینی و بہار ہمیشگی ہے اور ہمیشہ رہیگی جب تک اُردو ادب کا باغ اپنی خدا ساز سرسبزی اور ہریالی کی پُرکیف بہاروں سے ضیافتِ طبع کا سامان فراہم کرتا رہیگا، خواجہ عشرت کے گُل بارِ قلم کے منت پذیر نقش و نگار اپنے طلوعِ اثر کا ناقابلِ انکار سکہ جمائے رہیں گے۔

خواجہ عشرت کی ادبی زندگی کا آغاز تو اُسی رنگین دَور کے مروجہ اصُول پر شاعری سے ہوتا۔ لیکن زمانے کی رفتار کے ساتھ ساتھ اُن کی مآل اندیشانہ توجہ آہستہ آہستہ نثرنگاری اور انشاپردازی کی جانب مبذول ہوتی گئی۔ ماحول کے خلاف اودھ میں چند اِنے ہی گنے لوگ نکلیں گے جنہوں نے آنے والے زمانے کا مذاق دریافت کرتے ہوئے جہاں شعر و سخن کی محفلیں گرمائی ہیں، وہاں نثرنویسی کے وسیع و کشادہ میدان میں اشہبِ قلم کی جولانیاں دکھانا بھی ناگزیر تصور کیا ہے۔ ان باکمال لوگوں میں خواجہ صاحب نمایاں دکھائی دیتے ہیں۔ انہوں نے اپنی نثرنویسی کے لئے سادگی اختیار کی، خیالات ظاہر کرنے کو ایسے الفاظ چُنے جو بالکل نرم، شیریں اور عام فہم تھے بیان کا اسلوب تصنع سے پاک اور عبارت دورازکار تشبیہات، بعیدازفہم استعارات اور مراۃ النظیر کی نامرغوب پیچیدگیوں سے دامن گردانے ہوئے ہمیشہ دُور دور رہی، مفہوم میں کوئی اُلجھاؤ پیدا ہوا نہ دقائق کی بھُول بھلیاں میں معنویت گُم ہونے پائی۔ سیدھی سادی لفظوں میں خدا ہی بہتر جاننے والا ہے کہ کس قیامت کی دلآویزی اور دلچسپی کوٹ کوٹ کے بھر دی ہے کہ اُس پر ہزاروں رنگینیاں نثار کیجا سکتی ہیں۔ یہی وہ اچھوتی اور بے نظیر خصوصیت ہے جس نے اُنہیں معاصرین میں نمایاں کرتے ہوئے ممتاز و سربلند کر دیا۔ مشہور ادیبوں نے اُن کے

[1] خلا مذکر ہے۔ ادارہ

فضل و کمال کو نہ صرف تسلیم ہی کیا بلکہ زبان و قلم سے اعتراف کے اسناد بھی پیش کرنے میں تامل کو دخل نہ دیا۔

خواجہ عشرت نے کم و بیش پچاس پچپن سال کی طول طویل مدت میں ہر قسم اور ہر موضوع کے بلند پایہ مضامین قلم بند کر ڈالے۔ اور ہر صنف و شعبہ میں سادگی کی اُسی خصوصیت کے ساتھ کامیابی حاصل کی جو انکے گراں پایہ مقالوں کا امتیازی طرۂ بنی ہوئی ہے۔ وہ علمی، ادبی، فنی، تاریخی، اخلاقی، معاشرتی اور جملہ موضوعات نثر میں کمال بے تکلفی سے اظہار خیال کے خوگر تھے۔ جن دنوں مثنوی "گلزار نسیم" مصنفہ پنڈت دیا رام نسیم آنجہانی پر مولانا عبدالحلیم شرر۔ اور پنڈت برج نرائن چکبست سے ادبی مناظرہ اور مباحثہ چھڑا ہوا تھا، طرفین سے دھواں دھار مضامین حوالۂ قلم کئے جا رہے تھے اور دنیائے ظرافت کا مشہور و معروف مزاحیہ اخبار "اودھ پنچ" "گلزار نسیم" کی طرفداری اور حمایت میں مخصوص ظرافت کے انداز سے مولانا شرر نیز اُن کے اتحادیوں پر سخت و شدید حملے کر رہا تھا مولانا شرر نے جوابی مضامین کی نشر و اشاعت کے واسطے خاص طور پر ایک ہفت روزہ اخبار جاری کیا۔ خود تو ذاتی مصروفیت کے باعث اخبار کی بقا و اشاعت کی ذمہ داریاں قبول نہ کر سکتے تھے، اسلئے نگاہِ انتخاب نے خواجہ صاحب کو چُن لیا، اور اُنہوں نے قدیمی تعلقات کو واسطہ بناتے ہوئے ان سے درخواست کی کہ یہ بات کی اہمیت اور وقت کی نزاکت کا لحاظ کرتے ہوئے اس ضروری کام کو قبول و منظور فرما کے اپنی ذات سے متعلق کر لیں۔

منشی سجاد حسین مرحوم مدیر "اودھ پنچ" سے وحید العصر ظرافت نگار کے مزاحیہ مقالوں کا ترکی بہ ترکی جواب دینا کوئی آسان کام نہ تھا کہ سوچے سمجھے بغیر قبول کر لیا جاتا۔ علی الخصوص اس عالم میں کہ اُس سے پہلے کبھی مزاحیہ مضامین پر توجہ کرنے کا موقع حاصل نہ ہوا ہو، اور گل ریز قلم ہمیشہ سنجیدگی اور متانت سے صحافتی میدانوں میں گزرنے کا خوگر رہا ہو، پھر بھی اس روشن حقیقت سے انکار نہیں کیا جا سکتا کہ دیرینہ تعلقات کا تقاضا اور مولانا شرر کا بے انتہا اصرار مجبور کر رہا تھا کہ خواجہ عشرت تمام مشکلوں، ساری دشواریوں کو نظر انداز کرتے ہوئے چار و ناچار دوست کی اس خواہش کے سامنے سرِ تسلیم و رضا خم کر دیں، یہی ہوا بھی کہ مروت قفلِ ذہن بنی اور طبعی اخلاق نے خدمت قبول کرنے کا اقرار کرا دیا۔

معرکہ شروع ہو گیا۔ طرفین سے سوال و جواب ہونے لگے۔ اُدھر سے جس انداز اور جس لب و لہجہ میں سوال ہوتا ادھر سے اُسی انداز، اسی لب و لہجہ میں جواب پیش کر دیا جاتا۔ خلع، جگت، پھبتی، او کھی طعن، کنایہ، ذو معنی، رعایت لفظی، روزمرّہ محاورے ظرافت کی چاشنی کے ساتھ اس طرح گھُلے ملے ہوتے گویا وہ ابتدا سے اسی رنگ میں لکھنے والے ہیں۔ جس طرح خود جوان تھے اسی طرح انشا پردازی، مضمون نویسی اور شاعری کی مشق و مہارت بھی جوان تھی۔ فکر معاش کے ساتھ ساتھ چند گھنٹوں کی توجہ میں پورا اخبار بھر جاتا تھا۔

منشی سجاد حسین کی طرف لکھنے والوں کی کمی نہ تھی، اس وقت کے مشاہیر اہلِ قلم انکے ساتھ تھے۔ ادھر ہوا خواہوں میں

کتنے ہی لوگ کیوں نہ شامل ہوں مگر کام کرنے والوں میں یا مولانا شرر یا خواجہ عشرت، باقی اللہ کا نام۔ ان دو میں مولانا شرر کی کچھ رو ملی تھی، فرصت ہوئی تو کچھ لکھ دیا، نہ ہوئی تو خواجہ صاحب جانیں اور اُن کا کام۔ ان دشواریوں کے باوجود تن تنہا حریفوں کے دانت کھٹے کر دیئے۔ ایسے ایسے منہ توڑ جواب دیئے کہ دشمن بھی لوہا مان گیا۔ اتنا ہوتے ہوئے بھی اخلاقی کیفیت یہ کہ کسی کا دل میلا نہ ہونے پائے، کسی فردِ واحد کے بھی شیشۂ دل کو ٹھیس نہ لگنے پائے۔ منشی سجاد حسین، مرزا مچھو بیگ عاشق، پنڈت جوالا پرشاد برق، پنڈت رتن ناتھ سرشار، شیخ ممتاز حسین عرف منے میاں عثمانی اور پنچ جماعت کے تمام ممتاز افراد خواجہ صاحب کے حلقۂ احباب میں شامل تھے۔ یہی وجہ تھی کہ خواجہ صاحب نے ایسے آتش ریز مضامین پر اپنا نام لکھا کر دوستوں کی پُرخلوص شکایتیں مول لینے سے یہ بہتر خیال کیا کہ مفروضہ ناموں کے تحت میں معرکہ لڑا جائے۔ چونکہ یکہ و تنہا پوری جماعت کا مقابلہ کرنا تھا اور علم خیالات کی بنا پر ایک چنا بھاڑ نہیں پھوڑ سکتا، مختلف نام تجویز کئے گئے۔ مثلاً ظرافت جنگ، ظریف الدولہ، تماشائی، شیر جنگ وغیرہ وغیرہ، اور انہیں ناموں کی آڑ میں نظم و نثر کے بلغ لگانا اور پھول کھلانا جاری کر دیا۔ جتنے عرصہ تک یہ عجیب و غریب معرکہ جاری رہا خواجہ صاحب کا قلم معدنِ ظرافت سے جواہر نکال نکال کر جوہر شناسوں کے سامنے پیش کرتا رہا۔ لطف یہ ہے کہ رازداری کی نقاب ایک آن کو چہرے سے جدا نہ ہوئی۔ لوگ سمجھتے تھے کہ مولانا شرر یا ان کے مخصوص احباب یہ مضامین لکھتے ہیں۔ خواجہ صاحب کی طرف کسی کا بھی دھیان نہ جاتا تھا۔ لکھنؤ اور بیرونِ لکھنؤ کے تمام شائقین جانتے تھے کہ انہیں طنزیہ مضمون نویسی یا مزاح نگاری سے کوئی لگاؤ نہیں ہے۔ لطیفہ تو یہ ہے کہ جب کوئی پھڑکتا ہوا مضمون نکل جاتا تھا تو مخالف جماعت کے افراد خواجہ صاحب کے پاس آ کر بے خبر کے عالم میں اپنا بول بالا رکھنے کی خاطر اس مضمون پر الٹی سیدھی تنقید کرتے ہوئے اعتراضوں کی چاندماری شروع کر دیتے تھے۔ اور خواجہ عشرت کی ستم ظریفی ملاحظہ ہو کہ آپ پردہ داری کے لحاظ سے ہنس ہنس اور مسکرا مسکرا کر اُن کی تائید کرتے جاتے، بیچ بیچ میں کوئی چبھتا ہوا جملہ کہہ کر ہلکی سی چٹکی بھی لے لیتے تھے۔ انہیں دنوں میں "بی سجادی[1] کا شکایت نامہ مولانا[2] کے نام" کے عنوان سے ایک خط لکھ کے اپنے اخبار میں شایع کیا تھا۔ اس خط میں شوخی یہ تھی کہ منشی سجاد حسین کی ان سختیوں کو جو مولانا عبدالحلیم شرر کے ساتھ جائز رکھی گئی تھیں خود اُن کی زبان سے مجملاً گنوایا ہے۔ اس خط کی محلاتی زبان اور بیان کا دل پسند اسلوب غور کرنے کے قابل ہے۔ معلوم ہوتا ہے، محل خانہ کی کوئی شیریں زبان خاتون کمال بے تکلفی سے محاورات و اصطلاحات کے موتی رول رہی ہے۔ اب ایسی میٹھی بولیوں اور ٹکسالی زبان سننے کو کان ترستے ہیں مگر نہیں سن سکتے۔ عنوان کے نیچے سے شروع کرتے ہیں۔ :-

"پیارے مولانا! قسم ہے اپنے سر کی۔ اگر میں جانتی کہ تم اس معاملہ میں اس طرح بگڑ کھڑے ہوگے، ایسا جھاڑ کا کانٹا بن کے میرے پیچھے چمٹ جاؤ گے تو کوئی ایک نہیں ہزار کہتا۔ میں نوج ایسے مردوئے کے بیچ میں پڑتی۔

---

[1] منشی سجاد حسین مدیر اودھ پنچ مراد ہیں۔　[2] مولانا عبدالحلیم شرر کی طرف اشارہ ہے۔

لے۔ میں تم سے کہتی ہوں۔ اللہ رکھے میں تو ہمیشہ سے تمہارے منہ چڑھی تھی، تم وہی مولانا ہو۔ ابھی چار دن کی بات ہے۔ تم نے "پردۂ عصمت"[۵] نکالا تھا۔ مجال کیا تھی کہ کوئی تمہاری مخالفت کر جاتا، مگر میں نے کیسا کیسا مسخرہ پن کیا۔ کیسی کیسی دل لگیاں کیں؟ تم سمجھ کر ہمیشہ ٹال دیا کئے۔ سچ کا کوئی پرچہ خالی نہیں جاتا جو میں تم کو نہ سناتی ہوں۔ تمہارے نام سے میرے دو ورقی کی رونق تھی۔ لوگ اس اخبار کو نہیں دیکھتے تھے جس میں سلامتی سے کچھ تم سے چھیڑ خانی نہ ہو۔ مضمون میں گرما گرمی نہیں آتی تھی جب تک تم سے نوک جھونک نہ ہو۔"

اسی سلاست و روانی کے ساتھ سارا خط گل سر سبد بنا ہوا ہے۔ تحریر کا انداز، جملوں کی بناوٹ، جگہ جگہ چوٹیں بالکل ویسی ہیں جو منشی سجاد حسین کا مخصوص طریقہ تھا۔ جس وقت اخبار کے صفحہ پر اس خط کے ابھرے ہوئے نقوش اپنی خصوصیتوں سمیت منشی صاحب کی نظر سے گزرے ہونگے تو یقیناً پھڑک اٹھے ہونگے، اور عجب نہیں کہ احباب کے دائرے میں بیٹھ کر صاحب مضمون کی ذہانت و ذکاوت نیز تحریری قابلیت و صلاحیت کو سراہا ہو۔

وہ زمانہ لطف زبان کا زریں زمانہ تھا۔ تحریر ہو یا تقریر، نظم ہو یا نثر، عروس تخیل کو الفاظ کے پھولوں سے سجایا جاتا تھا۔ محاوروں، اصطلاحوں اور تشبیہوں کے زیورس سے حسن دوبالا کیا جاتا تھا۔ مختصر یہ کہ بادۂ اردو کو دو آتشہ کر کے پیش کرنا ہی موجب کمال تصور ہوتا تھا۔ اس سے یہ نہ سمجھنا چاہئے کہ اساتذۂ ماسبق زبان کے ذائقہ اور شیرینی کو مقدم کرتے ہوئے اور خوبیوں کی طرف سے آنکھیں بند کر لیتے تھے۔ نہیں نہیں، ایسا نہیں تھا۔ وہ تمام چیزوں کا لحاظ کرتے تھے، مگر زبان کی سلاست کو کسی ایک جگہ بھی ہاتھ سے نہیں دیتے تھے، ہر خیال، ہر موضوع کے لئے الفاظ منتخب کرتے تھے، انہوں نے دفتر کے دفتر سیاہ کر ڈالے، مگر کہیں کوئی لفظ بے محل استعمال نہیں کی۔ کوئی جملہ فصاحت کے معیار سے گرنے نہیں پایا۔ کوئی محاورہ غلط مقام پر ان کے قلم سے نہیں نکلا۔ جو لفظ جہاں رکھ دی نگینے کی طرح جڑ گئی۔ یہی چیز ہے جو مجبور کرتی ہے کہ ہم اپنے پیش روؤں کے کمال کا اعتراف کریں۔ خواجہ عشرت کی کامیابیاں اسی معرکہ تک محدود نہیں رہتیں، وہ اسی جوش و خروش اور ہمہمہ سے دوسرے میدانوں میں بھی تگ و پو کرتے ہوئے گزرتے ہیں۔ وہ لکھنؤ میں پیدا ہوئے تھے لکھنؤ میں تعلیم و تربیت حاصل کی تھی، لکھنؤ میں طفلی و جوانی کے ایام گزارے تھے، اور لکھنؤ ہی میں پیری کے دن بسر کرکے عالم آخرت کی راہ لی۔ اس لئے انہیں لکھنؤ سے محض محبت ہی نہیں عشق تھا۔ وہ لکھنؤ کی ہر ہر چیز کو والہانہ نگاہ سے دیکھنے کے عادی تھے۔ پھول تو پھول، وہ لکھنؤ کے کانٹوں کا بھی درد رکھتے تھے یہی وجہ ہے کہ انہوں نے لکھنؤ اور اہل لکھنؤ کی تعریف و توصیف اور حمایت میں ساری کی ساری زندگی ختم کر دی، انکے مضامین کا تمام تر ذخیرہ لکھنؤ کی زبان، لکھنؤ کی شاعری، لکھنؤ کے ادبا و فصحا، لکھنؤ کے علماء و مشائخ، لکھنؤ کے شاہ و وزیر، لکھنؤ کے امرا و فقرا، لکھنؤ کی تہذیب

---

[۵] "پردۂ عصمت" کے نام سے مولانا شرر نے ایک زمانہ ماہنامہ نکالا تھا۔ خنجر

لکھنؤ کی معاشرت، لکھنؤ کا تمدن اور لکھنؤ کی صنعت و حرفت سے متعلق ہے۔

اودھ کے باذل اور رعایا پرور حکمرانوں سے زمانے کو نجانے کیا بیر ہے کہ شاہی کا ورق الٹتے ہی بے چارے ملامت کا نشانہ بن گئے۔ بدترین سے بدترین شخص میں بھی ڈھونڈھے سے کوئی نہ کوئی خوبی مل ہی جاتی ہے۔ خدا جانے یہ کیسے بدنصیب حکمران تھے جن کی ساری زندگی کی بھلائیاں معائب بن کر معترضین کی آنکھوں میں سما گئیں۔ اور انہوں نے آنکھیں بند کر کے قلم کی باگ ڈھیلی کر دی۔ دنیا کی کوئی کمزوری یا عیب ایسا نہیں جو ان مظلوموں کی ذات سے منسوب نہ کر دیا گیا ہو خواجہ عشرت نے ایسی ہی معترضین کا منہ چھپنے کو اپنی زندگی وقف کر دی، جہاں تک جوابات لکھنے کا تعلق تھا جوابات تحریر کیے۔ اسکے علاوہ ہزاروں سے زیادہ وہ خوبیاں، وہ اوصاف محامد جو تعصب کی گرد میں دبے پڑے تھے، کھوج کھوج کر نکالے۔ صاف کیا اور منصف مزاجوں کے سامنے پیش کر دیئے۔ خصوصیت سے نواب آصف الدولہ بہادر کی لطیف شاعری، خوئے شعر پروری اور وصف بذل و عطا کے حالات و واقعات عام نگاہوں کے سامنے لانے میں جو کامیاب و محققانہ کدوکاوش کی ہے اسکی نظیر دستیاب ہونا دشوار ہے۔ حضرت ظلِ سبحانی، جان عالم محمد واجد علی شاہ اختر جس بے دردی سے ہدفِ ملامت بنائے گئے وہ انصاف پسندوں کی نگاہوں سے مخفی نہیں۔ اُن کی علمی قابلیتوں، شاعرانہ خوبیوں، ادبی ذوق، رحیم المزاجی، کریم النفسی، تعمیری شوق وغیرہ وغیرہ محاسن و محامد پر پردہ ڈال کے اس شاہانہ مشغلے کو اچھال دیا گیا جس سے اُس زمانہ کا کوئی گھرانہ محفوظ نہ تھا، اور آج بھی زمانے کی مناسبت کے اعتبار سے شاید ہی کوئی متنفس بچ سکا ہو۔ بال رُوم کی رنگین محفلیں، شام کو ہوٹلوں میں بیانو پر لعبتانِ فرنگ کی نغمہ سرائی۔ محلے محلے سینما گھروں کی موجودگی، اور اسی طرح ہزاروں خفیہ و اعلانیہ تفریحیں کیا ہیں؟ انتہا یہ ہے کہ فی زمانہ رقص و سرود کی مشق و مہارت تہذیب میں داخل سمجھ کر مستورات کو تعلیم دینے کا رواج عام ہو رہا ہے۔ بدقسمتی سے کسی نوجوان کو موسیقی میں دخل نہیں تو سوسائٹی اُسے قبول کرنے میں متامل نظر آتی ہے خواجہ صاحب نے اسی چیز کو مرکز نظر بناتے ہوئے اس مظلوم سلطان کی حمایت کا حق ادا کیا ہے۔ اُنہوں نے دو چار نہیں سیکڑوں مضمون لکھ ڈالے ہیں اور اگر وہ سب یکجا کر دیئے جائیں تو بادشاہ کی اچھی خاصی سوانح عمری بن سکتی ہے۔

یہ خواجہ عشرت ہی کی سعیٔ بلیغ کا نتیجہ تھا کہ حق پسندوں کی آنکھوں میں بھولے ہوئے خواب کا مرقع کھنچ گیا اور مختلف زبانوں سے مظلوم اختر کی موافقت میں کچھ آوازیں نکل نکل کر رسائل و جرائد کے اوراق پر سایہ ڈالنے لگیں اور اُن متعصب مورخین کی تمام زہر افشانیاں خاک میں ملنے لگیں، جنہوں نے مخالفت کا بیڑا چبا کر قلم اُٹھایا تھا۔

خواجہ عشرت نے خانوادۂ سلطانی ہی کی مدح و حمایت کو شعار نہیں بنایا، بلکہ لکھنؤ کا چھوٹا بڑا کوئی طبقہ ایسا نہیں جو انکے گہر بار قلم کا رہینِ منت نہ ہو۔ انہوں نے وزرائے اودھ کے کارناموں کو جس طرح دنیا سے روشناس کیا ہے، اسی طرح امرائے لکھنؤ اور اہل وثائق کے اعمال خیر پر بھی روشنی ڈالی ہے۔ اُن کے یہاں مسلم غیر مسلم کا سوال کبھی پیدا نہیں ہوا انکے مضامین میں جو کر و فر جو شکوہ و عظمت مسلمان امیروں میں نظر آتی ہے۔ وہی شان و سطوت ہندو امراء میں دکھائی دیتی ہے

نواب حسن رضا خاں کے تذکرے کے ساتھ راجہ مہرا، راجہ ٹکیت رائے، راجہ جھاؤلال، راجہ بینی بہادر کا ذکر خیر بھی موجود ہے۔ اُن کی آنکھیں ہمیشہ اہلِ لکھنؤ کی خوبیاں تلاش کرتی رہتی تھیں۔ جہاں کوئی مطلب کی چیز معلوم ہوئی اورانہوں نے تحقیق و تفتیش جاری کردی، یہاں تک کہ مضمون کا مواد جمع ہوگیا۔ نجانے کتنے ایسے واقعات تھے جس کو مورخین کی نظر نے کسی مصلحت کے باعث ترک کردیا تھا، لیکن خواجہ عشرت نے کمال جستجو کے بعد اُن چیزوں کو قلم بند کرکے درحقیقت لکھنؤ کی تاریخ لکھ ڈالی۔ جو تدوین کے بعد موجودہ تاریخوں سے کہیں زیادہ مفصل اور مستند تاریخ بن سکتی ہے۔

لکھنؤ کی بیگموں پر اہلِ قلم نے بہت کم توجہ کی ہے۔ حتیٰ کہ مولوی عبدالحلیم شرر جنہوں نے بیرونِ ہند تک کی خواتین پر مقالے حوالۂ قلم کیے، اس جگہہ خاموش رہ گئے۔ لیکن خواجہ عشرت نے یہ کمی بھی پوری کردی، اور متعدد بیگموں کے حالات، اُن کے اوصاف سے لوگوں کو مطلع کیا۔ خصوصیت سے ان کے وہ مضامین جو نواب ملکہ زمانیہ اور نواب قدسیہ محل کے متعلق ہیں معرکہ آرا سمجھنا چاہیے۔ واقعات کی حیرت انگیزی، بیگموں کی اولوالعزمیاں، سخاوتیں، خدام پروری اور شاہانہ معاشرت کو کچھ ایسے دلپذیر اسلوب سے بیان کیا ہے کہ مضمون ختم ہونے تک نظر ہٹانے کو دل نہیں چاہتا۔ ہزار دلچسپ ناول ایک طرف اور یہ مضمون ایک طرف، لطف یہ کہ عبارت وہی سادہ، زبان آسان تر اور دل کشی زیادہ سے زیادہ۔

نثر میں رنگ بھر کر نظم سے بڑھا دینے کا کمال شمس العلماء مولوی محمد حسین آزاد مرحوم سے زیادہ کسی اُردو کے مصنف میں نہیں ملتا۔ اُن کا زندۂ جاوید تذکرہ "آبِ حیات" اور اردو کی بقا کے ساتھ باقی رہنے والی تاریخ "دربارِ اکبری"، تصنیف و تالیف کی دنیا میں اپنا جواب نہیں رکھتی، ان کتابوں کی عبارتیں بھی مغلق الفاظ سے پاک و صاف ہیں، مگر اس واقعہ سے بھی انکار نہیں ہوسکتا کہ جہاں وہ زیادہ رنگینی پیدا کرتے ہیں، وہ حصّہ عوام کے فہم سے بالاتر ہوجاتا ہے۔

خواجہ صاحب کی عبارت میں یہ دشواری کبھی پیدا نہیں ہوتی، اُنہیں جو کچھ کہنا ہوتا ہے، صاف صاف جملوں میں کہہ گزرتے ہیں، اور وہ داغ کی شاعری کی طرح کان میں پڑتے ہی دل میں اُتر جاتے ہیں۔ بیان کرنے کا ڈھنگ ایسا ہوتا ہے کہ رنگینیاں تلاش کرنے والے رنگینی اور مطلب سمجھنے میں سہولت ڈھونڈنیوالے اپنی اپنی مراد پالیتے ہیں۔

مولانا شبلی اور مولوی الطاف حسین حالی کا انداز نگارش متاخرین میں بہترین تسلیم کیا گیا ہے، اور یہ واقعہ بھی ہے، اُن کے کمال سے انکار کی مجال نہیں۔ لیکن اُن کی تصنیفات کا محاذ تاریخ، ادب، سیر تک محدود ہے۔ انہوں نے اسی کام کے واسطے اپنی عمر یں وقف کی تھیں، اسی راستے پر زندگی بھر گام زنی فرماتے رہے۔

خواجہ صاحب نے کسی موضوع کو مخصوص نہیں کیا۔ کبھی تاریخی مضمون لکھا، کبھی ادبی، کبھی مزاحیہ، کبھی سنجیدہ، کبھی افسانے اور کبھی بیان قلم بند کیں۔ ساتھ ہی ساتھ مستقل تصنیفات کا سلسلہ بھی جاری رہا۔ اُردو کا مبسوط لغت مرتب کرنے کے پہلو بہ پہلو علم عروض، علم صرف و نحو، علم کلام، تذکرۃ الشعراء وغیرہ کا سلسلہ جاری رہا۔ یہ انکی مجتہدانہ

قدرت کا کمال تھا کہ مختلف اصناف میں سادگی زبان کی خصوصیت قایم رہی۔ علم عروض میں ہزاروں ہی تصنیفات موجود ہیں۔ متاخرین نے تو آسان عبارت لکھنے کی پوری پوری کوشش بھی کی ہے۔ لیکن حق یہ ہے کہ خواجہ صاحب نے شاعری کا سِٹ لکھ کر اپنی قدرتِ زبان کو بے نقاب کر دیا ہے۔ اس کتاب کی نسبت اس دعویٰ میں ذرا بھی مبالغہ نہیں کہ پڑھنے والا پڑھانیوالے کی مدد حاصل کئے بغیر بطور خود عروض کے ابتدائی اصول سمجھ سکتا ہے۔

خواجہ صاحب کا وہ کارنامہ بھی سراہے جانے کے قابل ہے جو انہوں نے شعراء کے حالات لکھ کر کیا ہے۔ لکھنؤ اور دہلی کے عام شاعروں کا کیا ذکر ہے۔ بہت سی خاص خاص شعرا ایسے ہیں کہ خواجہ صاحب اُن کے حالات پر روشنی نہ ڈالتے تو دہلی اجڑنے اور لکھنؤ مٹنے کے بعد سے دنیا ان کے واقعات سے ناواقف رہ جاتی، انہوں نے ایسے باکمال شاعروں کے نہ صرف تذکرے لکھے، بلکہ اُن کے مٹے مٹائے مزارات کا پتا بھی بتایا ہے، اور یہ بھی دکھایا ہے کہ دہلی یا لکھنؤ سے نکل کر ان آوارہ وطنوں کی کیا درگت ہوئی۔ زندگی کی ضرورتوں نے کن کن ڈیوڑھیوں پر سجدے کرائے اور کہاں کہاں کی خاک نے ترس کھا کر اُن کے مردہ جسموں کو اپنی آغوش میں پناہ دی۔ مختصر یہ ہے کہ خواجہ صاحب کا کمال وہ کمال تھا جس سے ادبی دنیا اُن کی حیات میں خاطر خواہ فائدے حاصل کرتی رہی، اور اب جبکہ حکمِ قضاو قدر نے اُن کی زبان کو خاموش کر دیا ہے، اُن کے چھوڑے ہوئے ذخائر سے مستفید ہوتی ہے، نیز مستقبل میں آنے والی نسلیں بھی اسی طرح فیضیاب ہوتی رہیں گی۔

خنجر لکھنوی

کمالِ عقیدت بہ اُستادِ کامل (قطعہ دوم)

جز خدائے پاک ہر شے کو جناب ۔۔۔ لازمی اک روز ہونا ہے فنا
خواجہ عشرت تھے استادِ شفیق ۔۔۔ ہے بجا کرنا مرا آہ و بکا
اہلِ فن کی موت ہے موتِ فن ۔۔۔ مرگِ عشرت کیوں نہ ہو پھر غم فزا
آج سارے ہند میں ماتم ہے یہ ۔۔۔ ماہرِ فن لکھنؤ کا اُٹھ گیا
تیری درگاہ کرم اور رحم میں ۔۔۔ التجا اتنی ہے اے بار خدا
انکے پس ماندوں کو دے صبر جمیل ۔۔۔ اور کر مغفور کو جنت عطا
سالِ رحلت کی ہوئی دل کو جو فکر ۔۔۔ غم زدہ کامل نے یہ رو کر کہا
ہے سرِ زاری سے سالِ عیسوی ۔۔۔ خواجہ عشرت گئے دار البقا

۲۳ ۔۔۔ ۶۱۹

۴۷   ۱۹

کامل عظیم آبادی

خواجہ عشرت مرحوم اور آپکی حقیقت نگاری

(از ایم۔ ذکی اختر صاحب ہاشمی، بی۔ اے۔ آنرز)

حسنِ معشوق سے بھی حسنِ سخن ہے کمیاب
ایک ہوتی ہے ہزاروں میں طبیعت اچھی

ادب زندگی سے بے نیاز نہیں رہتا۔ شاعر اپنے ماحول سے جدا نہیں ہوتا۔ وہ اسی دنیائے آب و گل کا پروردہ ہے۔ اس کی شاعری کا اسی لئے ماحول سے منت پذیر ہونا مسلّم ہے۔ شاعر کا ذہن اس کی خارجی زندگی کے اثرات سے ہرگز سُبکدوش نہیں ہو سکتا۔ دنیا کا ہر شاعر اپنے ماحول کا ترجمان ہوتا ہے۔ اس کے ہر شعر میں اس کے سیاسی سماجی معاشی اور اقتصادی ماحول کی جھلک پائی جاتی ہے۔ یہ ماحول ہی ہے کہ مرزا غالب علیہ الرحمتہ کی قوتِ متخیلہ نے جامِ سفال کو جامِ جمشید پر ترجیح دی۔

اور بازار سے لے آئے اگر ٹوٹ گیا　　جامِ جم سے یہ مرا جامِ سفال اچھا ہے

حضرت خواجہ عبدالرؤف عشرت مرحوم کی ذات بابرکات مغتنماتِ عالم میں سے تھی۔ آپ اپنے وقت کے ایک مفکر ادیب تھے۔ آپ کو نظم و نثر کے تقریباً کل اصناف پر مہارت و قدرت حاصل تھی۔ آپ کا کلام بہ لحاظ طرز ادا مثل از بیتس دلچسپ ہے۔ تخیل بلند لیکن نیچرل ہے۔ جذبات و محسوسات نہایت ہی پاکیزہ اور حقیقت پر مبنی ہیں۔ سچ یہ ہے کہ حقیقت نگاری آپ کا خاص وصف تھا۔ اور یہی آپ کی شاعری کی روح ہے۔ آپ کے قلم کی رہینِ منت نظم و نثر میں مہمل اور فرسودہ مبالغوں کی بھرمار نہیں ہے۔ اپنے ماحول سے جدا ہو کر لغویت پر نظم و نثر کی اساس قایم کرنا بُرا جانتے تھے۔ علامہ عشرت مرحوم اپنی نیچرل نظموں کی باعث آسمان شاعری کے ایک درخشندہ ستارہ بن کر چمکے۔ اور اسی صنف شاعری میں ایشیائی شاعری کی نزاکتیں پیدا کیں۔ نزاکتیں کھوکھلی نہیں بلکہ فطرت کی گہری اور پوشیدہ خاصیتوں کا گہوارہ ہیں۔

حضرت خواجہ عشرت مرحوم شروع ہی سے حقیقت نگاری کے شیدا تھے۔ اور اسی باعث انہیں ملک الشعرا حضرت میر تقی میر علیہ الرحمتہ کا رنگ اور اُن کا انداز بیحد پسند آیا۔

جب سے ہوں پابند متروکات کی زنجیر میں　　لطف اُردوئے معلّٰی ہے مری تحریر میں

رنگ ناسخ ہے نظرِ مومن و غالب پسند ہے شکر ریزی مری بالکل زبانِ میر میں

حضرت میر علیہ الرحمتہ ہی کے خاندان میں زانوئے ادب تہ کیا، اور تاحینِ حیات اپنے استاد حضرت شیخ محمد جان شاد پیرو میر کے یادگار رہے۔ یہ اصل کی ایک ہو بہو نقل بن کر جلوہ آرائے بزم ہوئے۔ وہ شاگرد خوش نصیب ہے جس پر استاد کی فخر آمیز نگاہیں پڑتی ہوں۔ علامہ مرحوم سلسلۂ میر علیہ الرحمتہ کے ایسے شاگرد تھے جن پر شیخ محمد جان شاد پیرو میر علیہ الرحمتہ کو بجا طور پر ناز تھا۔ حضرت شاد مرحوم نے اپنا دل جو سفینۂ شاعری تھا حضرت عشرت مرحوم جیسے ذہین اور طباع شاگرد کے لئے فراخ کر دیا۔ قبل اس کے کہ علامہ مرحوم کے نمونۂ کلام پیش کئے جائیں، یہ کہنا مناسب ہو گا کہ علامہ مرحوم کیا تھے اور ہر دلعزیز آپ کا کیوں معتقد ہوا۔ علامہ مرحوم کوئی عالم یا فلسفی نہ تھے۔ وہ صرف معائبِ عشق اور اپنے ذاتی جذبات و محسوسات کو حال سے قال میں لانے والے شاعر تھے اور اس قال میں آسمانِ فلسفہ کے قلابے نہ ملاتے تھے نہ قاموسی الفاظ بولتے تھے۔ بلکہ سیدھی سادی عام فہم اردو میں ایسا کہتے جس کے لئے مناسب دلوں میں از خود جگہ بن جاتی۔

خواجہ عشرت مرحوم کا مذاقِ سخن قدیم تھا۔ لیکن ساتھ ساتھ تخیل کی فراوانی تھی۔ جذبات کی رو میں بہ جانے اور بے جوڑ باتیں بنانے کو شاعری کی توہین جانتے۔ حقیقت نگاری کا یہ ملکہ آپ کو حضرت میر علیہ الرحمتہ سے سینہ بسینہ ورثہ میں ملا۔ محاورے کے خلاف شعر کہنا برا سمجھتے۔ مہمل بندش، لغو قیاس آرائی اور مافوق العادت قسم کی باتیں بنانا شاعر اور شاعری کی غرض و غایت کے منافی جانتے۔ ذاتی محسوسات اور جذبات کی درست ترجمانی پاکیزہ الفاظ میں کر جانا آپ کا خاص حصہ اور وصف تھا۔ اصول شاعری کے نکات و رموز جو سینہ بسینہ خاندانِ میر علیہ الرحمتہ میں آرہے تھے شیخ محمد جان مرحوم شاد پیرو میر نے آپ کو بشفقت بتادیا۔ حقیقت نگاری کے علاوہ آپ کے طرزِ کلام کی زینت اقوالِ حکیمانہ اور تصوف ہے۔ خواجہ مرحوم کے یہاں تصوف کی اساس تزکیۂ نفس ہے۔ وہ تزکیۂ نفس اور تزکیۂ قلب کے بڑے حامی اور مداح تھے۔ یہی وجہ ہے کہ حضرت علامہ مرحوم کے ذاتی خیالات تصوف سے ملکنار اور رندی سے کوسوں دور اور بیزار تھے۔ آپ کی نظمیں اور غزلیں سوقیانہ اور حیا سوز مضامین کے بار سے سبکدوش ہیں۔

اثر سے ڈوبے ہوئے جذبات اور تاثیر سے بھرے ہوئے خیالات جو حضرت عشرت مرحوم کی فطری مایۂ ناز تھی صرف مشق یا زورِ طبع کا نتیجہ نہ تھیں۔

این سعادت بزورِ بازو نیست تا نہ بخشد خدائے بخشندہ

اس مختصر تنقیدی تمہید کے ثبوت میں کچھ اشعار پیش کرنا چاہتا ہوں کہ لوگ اس خامہ فرسائی کو حسنِ عقیدت پر محمول نہ کریں۔ علامہ مرحوم کی ایک غزل کا مطلع ملاحظہ ہو۔

عریاں جہاں میں آئے تھے عریاں ہی جائیں گے دھبہ نہ ہم کفن کا بدن پہ لگائیں گے

اللہ اللہ کیا خوب مطلع ہے۔ ذکرِ قیامت سنئے۔ ایک زندہ حقیقت کی کتنی درست اور سچی ترجمانی کی ہے۔ اس مطلع کے بعد ایک شعر میں خواجہ مرحوم فرماتے ہیں کہ انسان کو نہ زندہ رہنے میں چین ہے اور نہ بعد مردن آرام کی کوئی صورت ہے۔ اپنے اس خیال کو کس فصاحت سے ادا کیا ہے۔ ملاحظہ ہو۔ ؎

دشمن ہماری جان کے ہیں زیرِ خاک بھی ۔۔۔ بعدِ فنا لحد میں فرشتے جگائیں گے

ایک دوسری غزل کا ایک شعر ملاحظہ فرمائیں۔ ؎

ہمیں اک عقل دیکر آپنے محرم بنایا ہے ۔۔۔ یہ اچھا تھا کہ آئے بے خبر اور بے خبر جاتے

قربان جاؤں اس سادگی پر کتنی پتے کی بات صرف ایک شعر میں کہہ دی ہے۔ اور ایسی کہہ دی کہ کسی کو اس کے تسلیم کر لینے میں ذرا بھی عذر نہیں۔

دنیا کی ناپائداری اور بے ثباتی کا نقشہ بہتوں نے کھینچا لیکن ہمارے خواجہ مرحوم نے جو نقشہ اپنی رباعی کے اندر کھینچا ہے وہ ملاحظہ اور داد کے قابل ہے۔ ؎

آنکھیں کھُلیں تو دُنیا ناپائدار دیکھی ۔۔۔ مہمان چار دن کی فصلِ بہار دیکھی
اِس باغ کے گلوں میں بُوئے وفا نہ پائی ۔۔۔ جو چیز اسمیں دیکھی بے اعتبار دیکھی

دنیا کی بے ثباتی کا حال سُن چکے۔ اب اہلِ دنیا کا حال ذیل کے اشعار میں تمثیل کے ساتھ سُنیں۔ ؎

شبنم کیطرح گویا تھے اس چمن میں مہماں ۔۔۔ آئے تھے رات کو ہم اب دن کو جارہے ہیں،
باغِ جہاں میں کوئی غمگیں ہے کوئی خوش ہے ۔۔۔ شبنم تو رو رہی ہے ہنستے ہیں گل چمن میں
یہ زمیں ہے بے وفا یہ آسماں بے مہر ہے ۔۔۔ ہر مسافر اس سرا میں چار دن مہمان ہے

علامہ عشرت مرحوم کو فطرت کی عکاسی میں بڑا کمال حاصل تھا۔ آپ مناظرِ قدرت کے نقشے ایسے بھلے انداز میں پیش کرتے ہیں کہ سارا سماں ہماری آنکھوں کے سامنے آجاتا ہے اور یہی کمال ہے حقیقت نگاری کا۔ ملاحظہ ہو۔ ؎

کھیت کی مینڈوں پہ کیا بشّاش بیٹھے ہیں کساں ۔۔۔ سبز مخمل کا بچھونا دیکھتے ہیں بار بار

لکھنؤ کے ایک گوشۂ چمن کی ذرا سیر کریں۔ ؎

ہر ادھ کھلا کھلا اسطرف ہے جو ہی کھلی، ۔۔۔ اک پری سوئے یہیں ہے اک پری ہوشیار

ساون کی ایک رات اور کہرآلود فضائی نقاشی ملاحظہ ہو۔ ؎

چھائی ہے کالی گھٹا کیسی اندھیری رات ہے ۔۔۔ بجلیاں چمکیں کبھی جگنو نے کھلائی بہار

علامہ عشرت مرحوم ساون کی نکھری ہوئی فضا میں چودھویں کا چاند اور اس کی روشنی دیکھ کر بہت محظوظ ہوتے تھے۔ فوراً چند اشعار موزوں ہو کر ایک نظم بن گئے۔ انتخاب ملاحظہ ہو ؎

کس باغ کا تو پھول ہے کس بزم کی قندیل ہے — شعلہ ہے یا بجلی ہے تو یا نار ہے یا نور ہے
شیشہ ہے تو کس جام کا، تو ہے نگیں کس نام کا — کس سوز کا تو ساز ہے کس زخم کا ناسور ہے
آئینہ ہے کس ماہ کا نقش قدم کس راہ کا — تو قرص ہے کس خوان کا یا تودۂ کافور ہے
کس حور کا رخسار ہے کس دل کا تو دلدار ہے — یا آنکھ کی پتلی ہے تو یا نرگس مخمور ہے
تارے ہیں یا آنسو ترے یا قطرۂ خون جگر — یا دل میں تیرے زخم ہیں یا کوئی یہ ناسور ہے

علامہ عشرت مرحوم اخلاق حسنہ کی پیروی اچھا سمجھتے تھے۔ آپ کے کلام میں جا بجا اخلاقی درس و تلقین کا عنصر اکثر نمایاں ہے۔ اس عنوان کے چیدہ چیدہ اشعار درج ذیل ہیں۔ ۵

بلند و پست عالم کا خیال انساں کو لازم ہے — وہ گرتے ہیں زمیں پر جو فلک پر سر اٹھاتے ہیں
تواضع اہل فن کی ہے علامت — کہ شاخ بار در جھکتی ہے اکثر
زمیں میں جس قدر گہرا ہو گی — زیادہ ہو گا پانی اس کے اندر
بشر کو عاقبت کار کا خیال رہے — بغیر نیک عمل کے خدا نہیں ملتا
خاکساری کر کے کچھ دنیا میں حاصل ہو فراغ — پار یوں بحر فنا سے ہو اگر بیڑا اک ہی
بھلا چاہیگا جو غیروں کا اسکا بھی بھلا ہو گا — برا چاہتے جو اپنے ملک کا اسکو ذلت ہی
غرور انساں کو زیبا نہیں ہے ایک ساعت بھی — جو دولتمند ہے اسکے لئے تو اور بے جا ہے
امیروں کو زیادہ تر غریبوں کی ضرورت ہے — کہ دولتمند حاجتمند کا محتاج ہوتا ہے

ذیل کی چند سطروں میں خواجہ مرحوم کے ظریفانہ کلام کے چند منتخب اشعار ضیافت طبع کیلئے حاضر خدمت ہیں۔ سا

رخنہ اندازی بہت مذہب میں اب ہونے لگی — یہ نئی تہذیب ساری آبرو کھونے لگی
شش جہت میں موجزن ہے آجکل قومی نفاق — صلح جو بحر جہاں میں سر بسر نادان ہے
کر دیا از کار رفتہ جہل نے کتنا ہمیں، — ایک تو کڑوا کریلا اور اسپر نیم بھی،
زر داؤ شرافت تو کوئی چیز نہیں ہے — نہ کر کے رکھو بغچی میں اب چال چلن کو
کچھ دنوں سے عام رغبت ہے یہی — سیکھئے یورپ کا طرز زندگی
کوٹ پتلون ہو، نکٹائی ہو — ہیٹ کم، عمدہ نئی بنوائی ہو،

مغربی اخلاق ہے اب ہند میں پھیلا ہوا — مشرقی تہذیب کھسکی بوریئے کو باندھکر

مس بنی ہیں ہند کی سب بیبیاں حاجتِ زیور نہیں ہے آجکل
خارج از تہذیب وہ القاب ہے جس میں لفظِ مسٹر نہیں ہے آجکل
اسکی عزت خاک بھی ہوتی نہیں جو کوئی نوکر نہیں ہے آجکل
جس کو انگریزی زباں آتی نہ ہو اس میں کچھ جوہر نہیں ہے آجکل

داڑھی منڈوایئے برابر صاف اس چمن میں نظر نہ آئے خس
منہ ہو آئینہ کی طرح شفاف بیٹھنے پائے ناک پر نہ مگس
سب ایک ہوں اب دل یہی للچاتا ہے تفریق سے بے چین ہوا جاتا ہے
اب ہند کی پھوٹ پڑ گئی ہے پھیکی خربوزے میں قند کا مزا آتا ہے
مغربی تہذیب پھیلانے لگی اپنا اثر ہم بھی اب کہنے لگے گڈ مارننگ مائی ڈیئر
عدالت میں تو اب جاتے ہوئے اشراف ڈرتے ہیں سرِ دربار عملے والے سب جیبیں کترتے ہیں
مروج ہند میں یورپ کی بولی ہونے والی ہے کہار اب کیا کریں تابود ڈولی ہونے والی ہے

خواجہ عشرت مرحوم کی کلجگ کتھا ظرافت کی سچی آئینہ دار ہے چند منتخب اشعار ملاحظہ ہوں۔

شریفوں میں باقی شرافت نہیں ہے رئیسوں میں شان ریاست نہیں ہے
گلے کاٹے جاتے ہیں اہلِ غرض کے کہاں گرم بازار رشوت نہیں ہے
کہاں قدردانیِ اہلِ ہنر ہے کمالات کی قدر و عزت نہیں ہے
تجارت میں مکر و دغا کا چلن ہے یہ ٹھگ بدیا ہے تجارت نہیں ہے
زمانہ تو ہے معتقد ڈاکٹر کا طبیبوں کی چلتی طبابت نہیں ہے
گرانی سے مفلس کو مشکل ہے جینا کوئی پیٹ بھرنے کی صورت نہیں ہے
خطاباتِ شاہی تو ملتے ہیں اکثر مگر رسم تنخواہ و خلعت نہیں ہے
جو زرخیز تھا ہند مشہورِ عالم وہ مفلس ہے اب اسمیں دولت نہیں ہے
صفایا کیا چار ابرو کا ہم نے مگر لاٹ کرزن کی صورت نہیں ہے
دغا سے کسی شخص کا مال کھانا یہ ہے پالیسی کچھ خیانت نہیں ہے
اڈیٹر جو اخبار کے دام مانگے تو لکھتے ہیں ہم کو ضرورت نہیں ہے

ایم ذکی اختر ہاشمی۔ بی اے آنرز

بزمِ عشرت

(از عظمت حسین صاحب عظمت لکھنوی)

مرحوم خواجہ عبدالرؤف عشرت لکھنوی نے اپنی وضعداری اور قدیم تہذیب ادب سے جو غیر معمولی شہرت اور مقبولیت حاصل کی وہ کبھی نہ مٹنے والا تاریخی و ادبی واقعہ ہے۔ ملک کے ان نامور اور ہردلعزیز شاعر۔ ادیب۔ نثار۔ معنف ہوئے اور نقاد نے گو اپنی ادبی اور علمی زندگی قدیم روایاتِ ادب اور ان کی پیروی میں ختم کی، پھر بھی ان کے مضامین میں ندرت، کلام میں جدت۔ تصنیف میں شوخی اور تالیف میں بلا کا اثر پایا جاتا ہے۔ علم و فضل میں اگرچہ وہ کوئی متبحر عالم اور فنِ سخن میں میر تقی میر نہ تھے۔ پھر بھی ان کا اندازِ بیان اور طرزِ تحریر ایک ایسی سلاست، روانی اور دلکشی کا حامل ہوتا تھا جس سے پڑھنے یا سننے والے کے دل پر کافی اثر ہوتا تھا۔ آپ نے لکھنؤ کی اب سے پچاس ساٹھ برس پہلے کی بہاریں دیکھی تھیں۔ بڑے بڑے مشاہیر شعراء اور ان کا زمانہ آپ کی نگاہوں میں رقص کرتا تھا، اور وہ اب سے نصف صدی قبل کے علمِ مجلس اور تہذیبِ ادب کو آجکل کے مغرب زدہ انقلابی دور میں بھی دیکھنا چاہتے تھے۔ یہی وجہ تھی کہ انہوں نے زمانۂ حال کی علمی و ادبی صحبتوں سے قطعاً علیحدگی اختیار کر لی تھی اور باوجود دا... کے بھی کسی مشاعرے یا سوسائٹی میں شریک نہ ہوتے تھے۔ صرف یہی نہیں بلکہ انہوں نے شعر گوئی اور فکرِ سخن کو بھی قریب قریب ترک کر دیا تھا۔ ان کا قول تھا کہ "جب زمانہ ہم ایسے قدامت پرستوں کو شرفِ مقبولیت ہی نہیں بخشتا تو ہم بے بلائے مہمان کی حیثیت سے کیوں شبک سر ہوں۔ پھر اگر جائیں بھی تو کیا دیکھیں اور سنیں۔ کان جو سننا چاہتے ہیں وہ نصیب نہیں۔ آنکھیں جو دیکھنا چاہتی ہیں وہ نظر نہیں آتا۔ اس اجنبیت سے تو یہی بہتر ہے کہ گوشہ نشینی اختیار کر لی جائے۔" چنانچہ اسی پر وہ بہت سختی سے آخر وقت تک قائم رہے۔

لکھنؤ چوک بازار میں خواجہ عبدالرؤف صاحب عشرت کی کتابوں کی دوکان شعراء کی ایک منڈی کہی جاتی تھی مبتدی سے لیکر اساتذہ تک شام کے وقت چوک کی تفریح خواجہ صاحب کی دوکان پر بیٹھ کر کرتے تھے۔ یہی نہیں کہ محض تفریح ہی پر یہ صحبت ختم ہو جائے۔ شعر خوانی کا سلسلہ چھڑ گیا تو بیت بازی کا میچ ہو گیا۔ کسی کے کلام پر تنقید ہوئی تو اتنی بے مثل کہ دس پانچ ادبی رسالوں کا پیٹ بھر گیا۔ اساتذۂ قدیم کا تذکرہ ہوا تو میر تقی میر سے اوپر کا سلسلہ گردانا گیا۔ الغرض طرح طرح کی نقادی اور نغمہ سرائی کا مرکز خواجہ صاحب کی دوکان سمجھی جاتی تھی۔ آخر میں خواجہ صاحب کی رائے گرامی قولِ فیصل کا حکم رکھتی تھی، اور اسی پر پہر رات گئے تک بحث و مباحثہ کا خاتمہ ہو جاتا

ا۔ باہر سے آنے والے شعرا بھی دُور دراز سے لکھنؤ کا نام سُن کر آتے تو خواجہ صاحب کے آستانے پر ضرور جبیں سائی کرتے
ر اپنے وسے سے اسی دُوکان پر تعارف حاصل کرتے۔ دوکان میں پرانی قسم کے مرثیے، نوحہ اور سلام کے ایک
ب جز والے نسخہ، بغدادی قاعدہ اور کلام مجید کے ابتدائی پارے یا کچھ اور دینیات کی کتابیں مثل راہ نجات
ہشتی زیور وغیرہ جمع رہتے۔ رازق العباد اسی سرمایۂ کتب سے خواجہ صاحب کی زندگی کی تمام ضروریات پوری
تا تھا۔ اور وہ نہایت قانع اور مطمئن نظر آتے۔ آخری دس پندرہ سال میں خواجہ صاحب کے مضامین اور افسا
ں کی ادبی و علمی جان سمجھے جاتے تھے۔ ان کے افسانہ بالعموم شاہان اودھ کے مفروضہ کارناموں سے منسوب
نے تھے، جنھیں خواجہ صاحب لکھتے تو وہی تھے جو انکا دل چاہتا تھا مگر کسی عہد حکومت کی نسبت سے ان کے
سانہ میں تاریخ اور واقعیت کی جھلک نظر آجاتی تھی، جس کی وجہ سے افسانہ کی اہمیت اور مقبولیت بڑھ جا
جاتے تھے، پھر اندازِ تحریر بھی کچھ ایسا رواں اور سلیس ہوتا تھا جس سے پڑھنے والا بلا تکلف ختم کئے بغیر نہ رہتا
۔ آپ کے مضامین میں بھی تہذیبِ قدیم اور پرانی انشا نگاری کارفرما تھی، یہی وجہ تھی کہ اگر مغربی تعلیم یافتہ
والوں کو آپ کا لٹریچر پسند نہ آتا تھا تو قدیم دلدادگانِ ادب آپ کے لکھے ہوئے مضامین آنکھوں سے لگاتے
۔ اور مزے لے لے کے پڑھتے تھے۔ ان مضامین کے علاوہ خواجہ صاحب نے اور بھی مختلف موضوع پر چھوٹی
وٹی کتابیں لکھی تھیں جن میں شاعری کے متعلق ابتدائی سیریل بہت مشہور ہے۔ اور جس سے مبتدیوں کو کچھ
یں تو کم از کم شاعری کی ابجد تو آجاتی ہے۔ خواجہ صاحب کے مجموعۂ کلام میں غزلیں، مختلف نظمیں، قطعات، قصائد
باعیات سب ہی کچھ تو ہے جو باضابطہ تو نہیں مگر مختلف صورتوں میں شایع ہو چکا ہے۔ یہاں پر خواجہ صاحب کے
م پر تنقید مقصود نہیں۔ خواجہ صاحب کے حالات بجائے خود تنقید کا حکم رکھتے اور اربابِ نظر کے لئے یہی کافی ہے کہ
لکھنؤ کے اب سے نصف صدی قبل کے شاعر و ادیب تھے، جن کو زمانۂ حال کی بوقلموں شاعری اپنا بندہ نہ بنا سکی
اں تک فنِ سخن کا تعلق ہے، عشرت صاحب بہت اچھے اہلِ ہنر تھے۔ لکھنؤ کے مشہور و مسلم استاد جان محمد
د کے شاگرد۔ ضامن علی جلال۔ امیر مینائی اور جناب منشی امیر اللہ تسلیم ان کے معاصرین میں سے تھے۔
ریہ فضائل ان کے معتبر ہونے کے لئے بجائے خود کافی سے زیادہ اسناد ہیں۔ جن پر زمانہ جس قدر رشک کرے کم ہے
اں محمد شاد استاد خواجہ صاحب۔ میر کلو عرش مشہور عروضی کے شاگرد اور دیکھنے والے تھے۔ میر کلو عرش
ھنؤ میں ایسے صاحبِ فن گذرے ہیں جن کی موجودگی میں میر انیس اور مرزا دبیر کو مرثیہ خوانی میں جھجھک ہوتی
ی، اور اکثر ایسا ہوا کہ میر کلو عرش کی معنی خیز نگاہوں نے میر انیس اور مرزا دبیر کی نظروں کو نیچا کر دیا۔ الغرض
جہ عبدالرؤف صاحب عشرت ایسے خاندان سے وابستہ سخن تھے جب یہ شاعری اور علم عروض کو قیامت
ناز و فخر رہیگا۔ کیونکر کہا جا سکتا ہے کہ خواجہ عشرت لکھنوی صاحب فضل و ہنر نہ ہونگے۔

آپ کثیر الاحباب ہونے کے علاوہ صاحبِ تلامذہ بھی تھے۔ لکھنؤ کے علاوہ بیرونجات میں بھی آپ کے شاگردوں کی کافی تعداد اس وقت موجود ہے۔ لکھنؤ میں خواجہ حمید الدین صاحب حمیدؔ آپ کے عزیز اور ہونہار شاگرد ہیں۔ آپ کے کوئی اولاد نہ تھی۔ آپ کا مجموعہ کلام اور کتب کا ذخیرہ آپ کے برادرِ خرد خواجہ غلام محمد صاحب ساکن خانسامہ ٹولہ لکھنؤ کے پاس محفوظ ہے۔ اور انہیں سے خط و کتابت پر حاصل کیا جاسکتا ہے۔ آپ کی وضع بالکل سادہ تھی۔ قدیم ساخت کی سفید چکن جس میں بجائے بٹن کے کچھ گھنڈیاں اور بند ہوتے تھے ہزیب تن فرماتے تھے۔ چوگوشیہ یا دوپلی ٹوپی ہمیشہ زیب سر رہی۔ شروع میں غرارہ دار پائجامہ پہنتے تھے۔ مگر بعد میں گھٹنہ ہی استعمال کرنے لگے تھے۔ دلی وال جوتا یا سلیم شاہی سلیپر دوکان پر پہن کر تشریف لاتے تھے، خوشبودار تمباکو کا مداریا حقہ جس میں پھولوں کا ہار لپٹا ہوا ہوتا تھا، شام کے وقت چوک میں خواجہ صاحب کی دوکان کا خاص تعرّف کراتا تھا۔

لکھنؤ میں جسے جس شاعر کو تلاش کرنا ہوتا شام کے وقت خواجہ صاحب کی دوکان پر چلا جاتا اور ملاقات ہو جاتی۔ خواجہ صاحب کی دوکان پر یوں تو لکھنؤ کے سب ہی شاعر آتے جاتے تھے، مگر مرحوم صفدر مرزاپوری، بندہ کاظم جاوید، خلیل، بہار، یہ حضرات نہایت وضعدار اور پابند تھے۔ اور خواہ کچھ ہی ہو مگر شام کو چند منٹ کے لئے خواجہ صاحب کی دوکان کی حاضری لازم تھی۔ افسوس، ؎

جس چمن میں تھا بلبلوں کا ہجوم
آج اس جا ہے آشیانۂ بوم

وہی لکھنؤ ہے۔ وہی چوک بازار کی تفریحات۔ نظر بازوں کی ٹولیاں بھی چوک سے برابر گزرتی رہتی ہیں۔ شعراء بھی ٹکراتے رہتے ہیں۔ مگر آہ نہ اب خواجہ صاحب ہیں، نہ ان کی دوکان، نہ وہ ہار والا مداری حقہ، نہ زہر عشق کی داستان۔ انقلاب اسی کا نام ہے۔ دنیا ہمیشہ ایسے ہی عبرت ناک مناظر پیش کرتی رہی ہے۔ رونا کس بات کا۔ شکایت کیسی۔ یہ ضرور ہے کہ مرنے والوں کی یاد اس کے ملنے والوں کے دلوں سے جاتے جاتے جاتی ہے۔ خواجہ عبد الرؤف صاحب عشرتؔ بھی انہیں مغتنم اور نہ بھولنے والے بزرگوں میں سے تھے، جن کی یاد اُن کے دیکھنے اور ملنے والوں کو رلاتی ہے۔ اور وہ بے ساختہ پکار اٹھتے ہیں۔ ؎

صباح الخیر زد بلبل کجائی ساقیا برخیز
کہ غوغا می کند در سر خمارِ خمیرِ دوشینم

عظمت حسین عظمتؔ لکھنوی

شہ کارِ عشرت

تا دگر زخم بناسور تونگر گردد　ہدیہ از کفِ الماس فشانے من آر

مردم دیدۂ اعتبار نے جو دیکھا۔ نقشبند خیال نے جو سفینہ میں ٹانکا۔ سعادتمندوں نے اس کو اگر آنکھوں سے لگایا، دل میں اتارا۔ تو تقدیر جاگ اٹھی، مستقبل روشن ہو گیا۔ آفتاب ماضی کی ضو جیا ند کے ٹکڑوں میں نظر آنے لگی خوش حال قوم کے یہی آثار ہیں۔ ابن خلدون نے اپنے مقدمہ میں لکھا ہے کہ کسی قوم کی حالت معلوم کرنی ہو تو اس کے قبرستان کو دیکھو۔" ابن خلدون "قبر پرست" نہ تھا، اس کا مطلب یہ تھا کہ جو قوم اپنے پیشروں کا احترام اس حد تک کر سکتی ہو کہ اپنے اعزا و اقارب سے نامزد ہونے والے مٹی کے ڈھیر کو بھی اچھی حالت میں رکھنا اس کا شعار ہو تو باور کر سکتے ہو کہ اخلاقی و اقتصادی دونوں حیثیتوں سے وہ زندگی کا ثبوت دے رہی ہے۔ احسان فراموشی کا ہمراز سوائے اخلاقی پستی اور مالی زبوں حالی کے اور کہیں نہیں مل سکتا۔ اس میں شک نہیں کہ "احسان" بھی ہر قسم کے ہیں اور ان کی پذیرائی بھی درجہ بدرجہ ہے۔ مگر "ربِّ مجاز" کو "بے تکلف دوست" کہنے اور کہلانے کا ذوق رکھنے والے "آبائے ملت" اور "ابنائے قوم" آج اس کے سمجھنے سے عاری ہیں کہ "ام الکتاب" میں والدین کی باتوں پر اُف بھی کرنے کی ممانعت کیوں کی گئی ہے۔ "جذبۂ بے اختیار شوق" کا نتیجہ "توالد و تناسل" کو قرار دینے والے "خالق" کے منکر اور "مخلوق" کے لئے خطرہ ہوتے جاتے ہیں۔ ایسوں سے کیا کہئے کہ وہ "عجیب الخلقت" ہیں!

خواجہ عبدالرؤف عشرت مرحوم کو "علامہ"۔ "جانشین میر"۔ "جگت استاد"۔ "شاعرِ غرا" بتلا کر قوم کے سر سے احسان اتارا جا سکتا ہو۔ مگر یہ وہ اوصاف ہیں جو ان کی ذات کے لئے مختص نہیں کئے جا سکتے۔ "علامہ" اور "مولانا" سے زیادہ کسی اعلیٰ خطاب کی کسی قوم کے ہاتھوں مٹی پلید نہیں ہوئی ہو گی، باستثنائے بعض مستحق، آج ایسے ایسے ان خطابوں سے پکارے جا رہے ہیں کہ ان جیسوں میں اپنا شمار کرانا کسی کی غیرت قبول نہیں کر سکتی۔ پھر کیا غضب ہے کہ جو اٹھتا ہے وہ اپنی طرف سے عزت و احترام بخشی کے لئے انہیں لفظوں کو چُنتا ہے۔ "مہتر جبریل" اور "مہتر آدم" علیہما السلام کے ثبوت کے ساتھ اگر علامہ نویسوں کو کوئی "مہتر فلاں" کہے تو "ازالہ حیثیت عرفی" سے بچنے نہ پائے گا! غریب میر تقی جن سے نسبت فخریہ کیجاتی ہے، کب "علامہ" ہوئے؟ مگر اس کو سوچنے کی زحمت کون گوارا کرے؟ خیر یہ تو "آمدِ سخن" ایک بات یاد آگئی۔ میں لکھ رہا تھا کہ جن خطابوں سے خواجہ عشرت کو انکے معترفین یاد فرماتے ہیں، اس کے مستحق اور غیر مستحق دعویدار اور بھی ہو سکتے ہیں۔ تو اگر حضرت عشرت جیسے ہم میں

بکثرت ہوئے اور موجود ہیں، تو ہم ان کی یادگار منانے میں کیا غلو کے مرتکب نہیں ہوتے؟ آخر اوروں نے کیا قصور کیا ہے کہ ان کے ہوتے ہوئے عشرت صاحب کا "مرجح" ہو؟ اس کا جواب دینے کی زحمت کسی نے گوارا نہیں کی ہے۔ ادارہ ندیم بھی اَلدَّالُ عَلَى الْخَيْرِ كَفَاعِلِهٖ کے رُو سے برابر کا جوابدہ ہے، اس لئے ان چند سطور کے ذریعہ اس بات کو صاف اور واضح کر دینے کی ضرورت ہوئی۔

خواجہ عبدالرؤف عشرت مرحوم نے اردو فارسی کے دیوان مرتب فرمائے تو اپنے ذوقِ سخن سے مجبور تھے، کلام ان کا بلند پایہ ہوا، اس سے ان کی موزونیت طبع، ذہانت اور ذکاوت کا ثبوت ملتا ہے، اور اگلی صحبتوں کا مغتنم فیض کارفرما نظر آتا ہے۔ خود ان سے اصلاحِ سخن کا فیض جاری ہوا۔ اس کا حلقہ اثر ان کے تلامذہ کی جماعت میں محدود ہو کر اپنی اہمیت کے اعتبار سے اس وقت تک ناقابلِ لحاظ ہے جب تک ان کے سعادتمند تلمیذوں نے اس کی اشاعت گوارا کر کے اس کو "فیض عام" بنانا قبول نہ کیا ہو۔ حضرت عشرت مغفور نے قواعد عروض و ادب مرتب فرمائے اور لغات کی تسوید کی۔ یہ ضرور ان کا "کارنامہ" کہا جا سکتا ہے۔ مگر ع "شکرِ نعمتہائے تو چنداں کہ نعمتہائے تو" جب خدا کو کہا جا سکتا ہے تو اس سے زیادہ کے مستحق خواجہ صاحب نہیں ہو سکتے۔ خواجہ صاحب عزت دار تھے۔ مرنجان مرنج تھے۔ نیک تھے، باوقار تھے، خوددار تھے۔ اس کو درفِ قلمبند کر لینے سے کیا ہوتا ہے؟ دعوے ثبوت طلب رہجاتے ہیں۔ سند میں زندگی کے واقعات پیش کئے جاتے تو ہم آپ بھی نقشِ قدم پر چلنے کی کامیاب نہ سہی کوشش ناکام ہی کرتے۔ مرزا خنجر لکھنوی خواجہ صاحب کے شاگرد ان کی سوانح عمری لکھ کر سعادت حاصل کر رہے ہیں۔ امید ہے کہ اس سے ہماری واقفیت بڑھیگی اور ہم کو "حیاتِ عشرت" سے توفیق "عیش سعادت" نصیب ہوگی۔

ابھی تک میں یہ نہ بتلا سکا کہ ندیم نے "یادگارِ عشرت" منانے کی ضرورت کیوں سمجھی، دوسرے لفظوں میں حضرت عشرت کا وہ کون سا "شاہکار" ہے جو ہم سے خراجِ عقیدت لے رہا ہے۔ مختصراً عرض ہے کہ غالب کے نزدیک "بیرنگ من است" والا مجموعہ "ناقابلِ اعتنا" سہی اور فارسی کے "اقلیمِ خیال" میں اعجازِ کمال ان کا منتہائے نظر بجا۔ مگر دیکھیے تو "قبول عام" نے کس کو سر پر رکھا، اور ع دفترِ اشعار باب سوختن خواہد شدن" کس پر صادق آیا۔ فَاعْتَبِرُوْا يَا أُولِي الْأَبْصَارُ!

"علوم عشرہ" آج کی دنیا میں "شاخ در شاخ" ہوتے ہوتے کئی بار اعدادِ اصلی سے مضروب ہو کر کس شمار میں آئے ہیں کوئی بتلا سکتا ہے؟ ایک "علم تاریخ" ہی کو لیجئے۔ جس نے فرعون کو قبر میں بھی چین سے سونے نہ دیا اور "ربع الخالی" میں بھی "خلاء محال" کے ثبوت کے لئے "موتفکات" کا سراغ زمین کے اندر لگا کر دم لیا۔ "داستانِ پاستان" کا ذوق یہاں تک ترقی کے فلک الافلاک پر پہونچا کہ الف لیلیٰ جیسی بے سروپا مجموعہ حکایات پانچ پانچ سو روپیہ کو خرید کر لوگوں نے زینتِ کتب خانہ بنایا۔ خدا کے لئے غور فرمایئے کہ خلیفہ ہارون الرشید سے

جو باتیں منسوب کی گئی ہیں، وہ لکھنؤ کے مدک خانہ والوں کا ذہن بھی پیدا نہیں کر سکتا۔ "ستم بیرا" "سندباد جہازی" وغیرہ مافوق العقل و الفطرت وجود پر واقعی یقین کرنے والا آج پاگل دیوانہ نہ سمجھا جائے تو تعجب ہے۔ پھر الف لیلیٰ اور اس کی اتنی وقعت۔ چہ معنی دارد؟ الف لیلیٰ کے دلپسند روزگار ہونے کا راز صرف اس قدر ہے کہ حکایات اسکی بے تکی سہی مگر جس زمانہ کی ہیں، اس زمانہ کی معاشرت و تہذیب کی بے کم و کاست صحیح عکاسی اس میں ہے۔ دروغ آمیز "حقیقت" کی اگر یہ وقعت ہے تو کون اندازہ کر سکتا ہے کہ خواجہ صاحب نے تمام زندگی جو جستہ جستہ انفرادی، اجتماعی، معاشرتی۔ اخلاقی واقعات و حالات قلمبند فرما کر ہر گوشہ و خطہ ہند سے شایع ہونیوالے رسائل میں بکھیر دیئے ہیں، وہ ماضیات پر کیا کیا روشنی ڈال کر آیندہ آنے والے اہل بصیرت کے لئے کس کس عنوان سے مدد و معاون ثابت ہونگے؟ سچ تو یہ ہے کہ ان بکھرے ہوئے جواہر کے بارے میں ہم یہ بھی نہیں جانتے کہ ان کی واقعی قدر و قیمت کیا ہے۔

خواجہ صاحب مرحوم اگر کسی زندہ قوم میں ہوتے تو ان کے محنت و کاوش کی اور کچھ نہیں تو اتنی داد تو ضرور ملتی کہ ان کی اس قسم کی تحریروں کا حرف حرف محفوظ کیا جاتا۔ علمی اور تحقیقاتی ذوق رکھنے والے اس میں رقم شدہ ایک ایک واقعہ کو تاریخ کی روشنی میں جانچتے، پرکھتے۔ اور تمام چھان بین کے بعد اس پر حاشیہ لکھتے، جس کی تصحیح ہوتے ہوتے خواجہ عشرت کی تحریریں یا تو تاریخ کی رو سے ناقابل اعتنا قرار پاتیں یا پھر تاریخ اپنا اعتبار ان سے موافقت ہی کے ذریعہ حاصل کرتی۔ اس سے بلاشبہہ خواجہ عشرت کا رتبہ اتنا بلند ہو جاتا کہ جتنا بلند دیکھنے کے ہم متمنی ہیں اور اس وقت تک اس پر اصرار کا حق رکھتے ہیں جب تک اہل خبر اپنے دلائل سے ہم کو اپنی رائے کی ترمیم پر مجبور نہ کر دیں۔ بصورت دیگر یعنی خواجہ صاحب کی تحریریں صداقت سے عاری، محض فرضی افسانہ سے زیادہ وقیع نہ بھی ثابت ہوتیں تو بھی جس زمانہ سے اس میں بحث کی گئی ہے اس کی عکاسی کا اس سے زیادہ معتبر اور مستند مشرح و مفصل ذخیرہ اور کون پیش کر سکتا ہے؟ پھر اتنا متنوع اور ہر طرز معاشرت کو لئے ہوئے! شاہی سے لیکر گدائی۔ مردانہ سے تا بہ زنانہ رؤسا، و امرا سے لیکر ڈوم ڈھاری۔ اہل علم و خرد سے لیکر کبوتر بازاور مرغ باز تک سب پر حاوی! کیا "الف لیلیٰ" کی وقعت بھی اس کو نہ دیجاتی؟ حالانکہ سو بسوے اس میں لکھے ہوئے حال رتی رائی سب سچ ہونے کا بیش از بیش قرینہ ہے! ہمارے نزدیک حضرت عشرت کا یہی "شاہکار" ہے۔ اور وہ زمانہ دور نہیں جب سعادت مند اخلاف میری اس پیش گوئی کی تصدیق پر مہر قبول ثبت کر کے منوا دیں گے کہ حضرت عشرت کی ساتھ وہی معاملہ ان کے ہمعصروں نے روا رکھا کہ "چہ می ارزد چون داشتہ"!

ہم ناظرین ندیم سے شرمندہ ہیں کہ "شاہکار عشرت" پر نہ تو ہمکو خود کوئی بسیط مضمون سپرد قلم کرنیکی توفیق ہوئی نہ ان کے معترفین میں سے کسی نے اسکی طرف توجہ کی۔ اور ہم یا کوئی اور کیا کر سکتے ہیں جب کہ ابھی تک کسی کو اس کی ضرورت ہی محسوس نہیں ہوئی کہ ان اوراق پریشاں کی شیرازہ بندی ہی کی فکر کرے۔ دست بردِ زمانہ سے محفوظ کرنے کیلئے طباعت اور اشاعت کی منزل تو دور رہی! ے نعرۂ خونبار صد لقماں از ہمت با از جراحتہائے استغنا میرسد!

آہ اُستاذی علاّمہ خواجہ عشرت لکھنوی

(از جناب کامل عظیم آبادی)

افسوس صد افسوس کہ ملک الشعراء میر تقی میر علیہ الرحمۃ کے فخر خاندان و چشم و چراغ اُستاذی علاّمہ خواجہ محمد عبدالرؤف عشرت لکھنوی خلد آشیان، جنت نشیمن قریب قریب دو سال تک فالج کے عارضہ میں مبتلا رہکر بتاریخ ۸ رجون ۱۹۴۲ء اس دار فانی کو خیر باد کہہ کر داعی اجل کو لبیک کہتے ہوئے رہگزائے ملک جاودانی ہوئے اِنَّا لِلّٰہِ وَاِنَّا اِلَیْہِ رَاجِعُوْن ۝ ابھی کل کی باتیں ہیں کہ اپنے نیاز نامہ میں حضرت کو استاذی مدظلہ العالی لکھا کرتا تھا، اور آج آپ کا ماتمی ہوکر آپ کی تعزیت نامہ میں مدظلہ کی جگہ خلد آشیان، جنت نشیمن لکھنے پر مجبور ہوں۔ خداوند کریم آپکی تربت پر رحمت کے پھول برسائے اور آپ کے پس ماندگان کو صبر جمیل اور ہم غافلوں کو عبرت عطا فرمائے

آپ کی وفات حسرت آیات سے دنیائے ادب کو وہ ناقابل برداشت نقصان پہنچا ہے کہ جس کی تلافی اس قحط الرجال و فقدان علم و فضل و بے ہنری و بے کمالی کے زمانہ میں ناممکنات سے ہے۔ یوں تو بعض لوگ بحر ذخار نظم کے شناور ہوتے ہیں اور بعض معرکۂ نثر کے مرد میدان۔ مگر ہمارے استاد مرحوم و مغفور میں یہ دونوں خوبیاں بحد کمال مجتمع تھیں۔ ع خدا بخشے بہت سی خوبیاں تھیں مرنے والے میں۔

استاذی اعلی اللہ مقامہٗ کی سوانح عمری اور ان کے حالات زندگی اور کلام نظم و نثر پر تنقید لکھنا میرے امکان سے باہر ہے۔ مگر ہاں اتنا کہے بغیر نہیں رہ سکتا کہ یوں تو اردو کی حمایت میں رِم کے رِم کاغذ سیاہ کئے گئے۔ جلسوں میں پرزور تقریریں ہوئیں۔ اردو سبھا کی تجویزیں ہوتی رہیں، مگر جو فیض استاذی علاّمہ خواجہ عشرت مرحوم کی ذات با برکات سے اس زبان کو پہنچا اس کا زمانہ شاہد ہے۔ حقیقت یہ ہے کہ اس زبان کو مستند و بلند پایہ بنانے میں جو کچھ جگر کاوی اور عرق ریزی استاذی مرحوم مغفور نے فرمائی اس کے بار احسانات سے اردو دنیا کبھی سبکدوش نہ ہوگی۔ اور صرف یہی نہیں کیا کہ صحیح و بامحاورہ زبان میں فصیح و بلیغ مضامین لکھے، بلکہ اصول اردو کی متعدد کتابیں تصنیف فرما کر ملک میں پیش کر دیا۔ اور ہندوستان کا کوئی خطہ نہیں جہاں استاذی علیہ الرحمۃ کا کوئی شاگرد صحیح اردو کی تبلیغ سے مستفیض نہ ہوا ہو۔ بلکہ بیرون ہندوستان میں بھی آپ کے تلامذہ و غیر تلامذہ صحیح اردو کی تبلیغ سے مستفیض ہوئے۔

ادبِ اردو کی اتنی مستقل و مسلسل خدمت زبان اُردو کو ایسی پاکیزگی لطافت روزمرہ اور محاورات اُردو کو اتنی حیرت انگیز وسعت کسی مصنف سے نہ دیجا سکی جیسی استاذی علامہ خواجہ عشرت مرحوم نے دی۔ انکی کوئی تصنیف اٹھا کر دیکھو جائے، ایک سے ایک بڑھکر گوہر نایاب و دُرِ خوشاب ملیگا، جن پر زبانِ اُردو جب تک زندہ ہے بجا طور پر ناز کرتی رہیگی۔

علامہ خواجہ عشرت ۶ ربیع الاول ۱۲۸۵ھ کو بمقام لکھنو پیدا ہوئے آپکے والد ماجد کا اسم مبارک خواجہ عبد الشکور ہے اور جدّ اعلیٰ خان بہادر خواجہ عبد الشکور والیِ بلخ کے خلفِ اصغر تھے. جو والد کے انتقال کے بعد بھائیوں کی مخالفت سے ۱۱۸۰ھ میں ہندوستان تشریف لاکر نواب شجاع الدولہ بہادر سے ملے اور قلعہ دار الہ آباد کا خلعت اور خان بہادر کا خطاب حاصل کر کے ۱۱۹۰ھ میں وفات پائی، خضری دروازہ ہنوز آپ کی یادگار ہے۔

علامہ خواجہ عشرت مرحوم نے بذاتِ خود شاعری اختیار کی اور جناب شیخ محمد جان شاد پیرو میر کی صحبت میں رہے۔ چونکہ طبیعت میں قدرتی مناسبت فنِ شعر سے تھی، بہت جلد آثار شہرت پیدا ہوئے، استاد کی فیضان صحبت و فطری جذبات نے بہت جلد استاد بنا دیا مستغنی المزاج ایسے کہ تادمِ آخر کسی امیر کی تعریف میں قصیدہ نہ کہا، مگر اہلِ کمال کی صحبتوں میں جس عزت اور احترام سے ان کا نام لیا جاتا ہے وہ محتاجِ بیان نہیں، اور آپکی تصنیف کی جیسی قدر ہوئی اُس سے یہ نتیجہ نکالنا آسان ہے کہ خواجہ عشرت مرحوم نے جس گلزار سخن سے پھول چُنے ہیں ان کی بُو باس مشامِ جان کو معطر کرنیوالی ہے، اور یہ وہ پھول ہیں جو زمانہ کی ناقدر دانی کی گرم ہواؤں سے خشک نہیں ہوسکتے، بلکہ یہ کہنا ایک حد تک صحیح ہے کہ جوں جوں زمانہ ترقی کرتا جائیگا، آپ کے کمال و تصنیفات کی شہرت و عزت بڑھتی جائیگی۔

قواعد اُردو سے علیحدہ ہو کر فنِ سخن کے میدان میں آیئے تو عروض کی چھان بین میں بھی استاذی مرحوم تمام مصنفین سے دو قدم آگے بڑھے ہوئے تھے۔ شاعری کی پہلی، دوسری، تیسری، چوتھی کتاب لکھ کر یہ ثابت کر دیا ہے کہ ضروریاتِ زبان کے لحاظ سے پرانی کتابیں ترمیم و تنسیخ کی محتاج ہیں اور تمام بحور پر دلچسپی کے ساتھ جیسی عالمانہ بحث کی ہے وہ آپ کے اعلیٰ قابلیت کا نمونہ ہے۔ علاوہ ان کتابوں کے آپ کی تصنیفات سے چالیس جلدیں لغاتِ اردو کی ہیں جن میں سے صرف چار جلدوں کی اشاعت ہوسکی۔

خواجہ عشرت مرحوم حد درجہ استاد پرست تھے۔ اگرچہ جناب شاد مرحوم نے اپنی وفات سے بہت بیشتر آپ کے کلام پر اصلاح دینا ترک کر دیا تھا بلکہ دوسرے شاگردوں کا کلام بغرضِ اصلاح آپکے سپرد فرما دیتے تھے، لیکن راسخ الاعتقاد خواجہ عشرت مرحوم استاد کی زندگی بھر تبرکاً اپنا کلام آپ کی خدمت میں پیش کرتے رہے۔ چنانچہ استاد کی وفات کے بعد ایک مقطع میں استاذی خواجہ عشرت مرحوم فرماتے ہیں: - سہ

غزل محتاج اصلاح جناب شادؔ ہے عشرتؔ   انگوٹھی یہ وہ ہے جو بے نگیں معلوم ہوتی ہے

اردو اور فارسی کی ہر صنف کی شاعری پر استاذی مرحوم قدرتِ کاملہ رکھتے تھے اور نثر نویسی میں تو فردنا تھے۔ افسوس ہے کہ آپ کی تصنیف شدہ بہت سی کتابیں ہنوز طبع نہ ہو سکیں، جس کو ناقدری زمانہ پر محمول کرنا چاہیئے۔ ایک دیوان فارسی اور دو دیوان اُردو آپ کے مرتب رکھے ہیں۔ اور نثر کی بہت سی کتابیں مرتب اور غیر مرتب موجود ہیں۔ آپ کی اُردو نواسنجیاں بطور نمونہ ازخروارے پیش کیجاتی ہیں، ملاحظہ ہوں:۔

ہم خیالات کے محلوں میں پڑے رہتے ہیں   ہاتھ باندھے ہوئے مضمون کھڑے رہتے ہیں

جوہر ہے اگر تجھ میں تو کر گوشہ گزینی   برباد نہ کر عزت و توقیر ہنر کی،

ہے آرزو قاتل ترا یوں آخری دیدار ہو   اک ہاتھ میں سر ہو مرا اک ہاتھ میں تلوار ہو

جوہری ہیں سچے موتی کی نہ کیونکر قدر ہو   رحم آجاتا ہے انکو چشم پرنم دیکھکر

جہانمیں لے اُڑا شہرا مجھے رنگیں بیانی کا   مرا ہر شعر گلدستہ ہے الفاظ و معانی کا

حکما کہتے ہیں ہوتی ہے غذا جزوِ بدن   ہم تو تحلیل ہوئے جاتے ہیں غم کھانے سے

ڈالی نقاب رُخ پہ نزاکت سے باغ میں   تا بوئے گُل چھنی ہوئی آئے دماغ میں

کچھ لیلی و مجنوں کا یہ افسانہ نہیں ہے   دیوانہ جو اُن کا ہے وہ دیوانہ نہیں ہے

ہر شمع میں ہے معرفتِ یار کا جلوا   اک دفترِ کُن ہے پر پروانہ نہیں ہے

ہاں معرفتِ یار کا اک جام پلادے   پھر غم مجھے لے ساقیِ میخانہ نہیں ہے

اُردو کی زمزمہ سنجیاں تو آپ سُن چکے، ابھی نیچرل کلام بہت ہے جو مختلف رسائل میں شایع ہو چکا ہے اسلئے اس کے پیش کرنے کی چنداں ضرورت نہیں، لیکن استاذی مرحوم کا فارسی کلام جو ناقدری زمانہ سے غیر مطبوعہ پڑا ہوا ہے قابل قدر ہے۔ آپ فارسی بھی اسی طرح برجستہ فرماتے تھے جس طرح اردو۔ آغا شیخ عبد اللہ سیّاحؔ ایرانی سیاحؔ تخلص جو تمام اقطاعِ عالم میں سیاحت کرکے لکھنؤ میں سکونت رکھتے تھے مختلف زبانوں کے ماہر تھے، فارسی ان کی مادری زبان تھی۔ چنانچہ سیاحؔ تعجب کرتا ہے کہ علامہ عشرتؔ کی فارسی اہل زبان سے ملتی جلتی ہے اور بادی النظر میں کوئی فرق نہیں معلوم ہوتا۔ چند اشعار درج کیے جاتے ہیں۔ :۔

تا حسنِ تو گردید نہاں از نظر ما   بیتابیِ ہجراں تو شد پردہ درِ ما

پردہ دریدن بمعنی راز افشا کردن محاورہ عام ہے، یعنی جب سے تمہارا حسن میری نظر سے پوشیدہ ہو گیا تمہاری بیتابی فراق نے میرا راز ظاہر کر دیا۔

گر دل نبود بیک رہِ بیخودیِ عشق   در گوشِ محبت کہ رساند خبرِ ما

بیخودیِ عشق کی راہ کا قاصد اگر دل نہ ہو تو محبت کی کان تک ہماری خبر کون پہنچائے۔

اشکِ من معنیِ تکلیفِ جگر میگوید   ہست استادِ سخن طفلِ نو آموز مرا

میرے آنسو شرحِ تکلیفِ جگر کی کرتے ہیں، اشک کو شعرائے طفل سے تعبیر کیا ہے۔ اسلئے کہا کہ ایک طفل نو آموز میرے سخن کی سند ہے۔

دیدۂ کو تا نگرد جلوۂ معشوقِ ازل   می نماید ہمہ جا حُسنِ نظر سوز مرا

ایسی آنکھ کہاں ہے جو جلوۂ معشوقِ ازل کو دیکھے، مجھے تو ہر جگہ حُسنِ نظر سوز معلوم ہوتا ہے، حسن نظر سوز محاورۂ اعجام ہے بمعنی حُسنِ دلکش۔

میں نے بخوفِ طوالت فارسی کے محض چند اشعار پیش کئے ہیں ورنہ استاذ مرحوم کے اور بھی منتخب اشعار اس وقت میرے پیشِ نظر ہیں

علامہ خواجہ عشرت مرحوم کی انشاپردازی میں علاوہ اور دیگر اصنافِ نثر کے وقایع نگاری و تاریخ نویسی کا عنصر غالب تھا، چنانچہ آپ نے شاہانِ و بیگماتِ اودھ کی بہت سی تاریخیں لکھ کر ملک میں پیش کی ہیں اور داد وقایع نگاری و تاریخ نویسی دی ہے جس کی طرز تحریر و ادائے مطلب میں غضب کی دلکشی اور بلا کی دلچسپی ہے۔

ایک دفعہ استاذی علامہ عشرت مرحوم نے اودھ کی تاریخ پر ایک مضمون لکھا اُسے خان بہادر میر ناصر علی مرحوم دہلوی مدیر صلائے عام نے بیحد تعریف کرکے چھاپا اور علامہ مرحوم موصوف کو لکھا کہ "تاریخ لکھنے میں تو آپ کو ملکہ راسخ ہے، مجھے رشک آتا ہے کہ آپ اودھ کی تاریخ پر جو مضامین لکھتے ہیں کاش اس کے بدلے شاہانِ دہلی کے حالات لکھیں"۔

علامہ مرحوم ممدوح نے فرمایا کہ دہلی کے حالات میں تو تاریخ کی بڑی بڑی کتابیں موجود ہیں۔ ان کے علاوہ جدید حالات کا ملنا دشوار ہے، اودھ کی تاریخ نامکمل ہے اور اس کے حالات جدید بھی کچھ پرانے لوگوں سے مل جاتے ہیں اسلئے اُن میں تازگی پیدا ہو جاتی ہے۔ خان بہادر مرحوم نے لکھا "مجھے تو دہلی سے محبت ہے۔ آپ جو کچھ لکھیں گے اس میں تازگی پیدا ہو جائیگی"۔ اس زمانے میں دہلی کے ایک بزرگ خاندان وزارت کے دُرالتاج سید مبارک علی سہیل فارسی گو شاعر لکھنؤ میں رہتے تھے اور علامہ ممدوح کے پاس اکثر تشریف لایا کرتے تھے ان کو نواب میر حیدر آباد سے پنشن بھی تیس روپیہ ماہوار ملتی تھی۔ ہر مہینے اپنی حیات نامہ علامہ موصوف سے دستخط کرا کے بھیجتے تھے۔ استاذ مرحوم نے اُن سے فرمایا کہ کچھ دہلی کے پُرانے حالات جو آپ نے سُنے ہوں بیان کیجئے۔ دہلی کا نام سُن کے وہ رونے لگے اور کہنے لگے آپ نے ایسا تیر مارا جس کا اندمال مشکل ہے۔ کاش اور باتیں کرتے اور دہلی کا نام نہ لیتے۔ پھر کچھ اپنے بچپنے کی باتیں یاد کرکے بیان کیں، اس میں یہ بھی بیان کیا کہ

مومن دہلوی کا مکان ہماری خالہ کے مکان کے متصل تھا اور وہاں جاتے تھے تو دیکھتے تھے کہ حکیم مومن خاں اس گلی میں ٹہلتے تھے اور دونوں ہاتھوں کی اُنگلیاں متحرک ہیں۔ اور گنگنا کر کچھ شعر کہا کرتے تھے۔ گورے تھے، زلفیں رکھتے تھے، خوبصورت تھے، علاوہ اس کے اور بھی چشم دید واقعات بیان کئے۔ علامہ ممدوح نے ان سب باتوں کا ایک مضمون بنا کر خان بہادر میر ناصر علی مرحوم کی خدمت میں بھیجدیا۔ خان بہادر موصوف نے مضمون بہت ذوق سے چھاپا۔ خان بہادر موصوف نے فرمایا یہ کہ آپ کی تلاش کی داد ہے، آپ نے تاریخ میں دو چار واقعات اضافہ کر دیئے

استاذی مرحوم نے علاوہ تذکرہ "آب بقا" جس میں شعرا کے چیدہ و منتخب کلام معہ تنقید ہے اور شاعر کی قومیت اور پیشہ درج ہے ملک میں پیش فرما کر اپنی نقادی و کمال فن کا ثبوت دیا ہے۔

ایک مرتبہ میرے اخی الاعظم جناب مولوی حکیم محمد شریف متخلص بہ فخر عظیم آبادی مرحوم نے مجھ سے دریافت کیا کہ خواجہ عشرت صاحب کی کوئی اولاد ہے یا نہیں، میں نے جواب دیا کہ مجھے کچھ واقفیت نہیں ہے۔ حکیم صاحب مرحوم نے فرمایا کہ خط لکھ کر خواجہ صاحب سے دریافت کرو۔ چنانچہ میں نے استاد مرحوم سے دریافت کیا، اس کے جواب میں یہ تحریر فرمایا کہ "اولاد مجازی جس کو تم حقیقی سمجھتے ہو کوئی بھی نہیں۔ اور اولاد حقیقی جس کو تم مجازی سمجھتے ہو بہت سے ہیں جن میں ایک تم بھی ہو" سُبحان اللہ سبحان اللہ۔ محبت آمیز و صابرانہ و اطمینان بخش قلب و جگر جواب ہے، جس سے لاولدی کا غم و اندوہ مطلق نہیں ظاہر ہوتا۔ بلکہ اطمینان قلبی و سکون دلی و راضی برضائے الٰہی ہونے کا آئینہ دار ہے۔ فی الحقیقت اولاد کے ذریعہ سے دو چار پشت سے زیادہ بقائے نام و نشان نہیں رہتا، اور اپنے کلام اور تلامذہ کے سلسلہ سے علی الدوام رہتا ہے۔ چنانچہ میں اس کے ثبوت میں صرف ایک ملک الشعرا میر تقی میر علیہ الرحمتہ کو پیش کرتا ہوں کہ جن کی اولاد کا اب کچھ پتہ نشان نہیں ہے پھر بھی باوجود امتداد زمانہ میر علیہ الرحمتہ کا نام ان کے کلام اور تلامذہ کے ذریعہ سے زندۂ جاوید ہے۔ اور تابقائے زبان اُردو صرف جاری نہیں رہیگا۔ بلکہ آسمان شہرت پر نیر اعظم بن کر نور افشانی کرتا رہیگا۔

میرا ذاتی تجربہ ہے کہ استاذی مرحوم اپنے شاگرد کے ساتھ اولاد صلبی سے زیادہ محبت فرماتے تھے، وقتاً فوقتاً اظہار جوش الفت موعظہ حسنہ کی شکل میں ہوا کرتا تھا جس کا منشا یہ ہوتا تھا کہ اُن کا شاگرد سخن میں ایسا منہمک و فنافی الشعر نہ ہو کہ مفلسی کا شکار ہو کر اپنے نفس و وابستگان کے لئے موجب مصائب و آلام نہ ہو جس سے شاعری بدنام ہو جائے۔ چنانچہ میں نے اپنے احبا و اعزہ و اقربا کی شادیوں کے موقع پر سہرے بہت لکھے۔ ایک مرتبہ ایک سہرا بغرض ملاحظہ جناب ممدوح مرحوم کی خدمت میں بھیجا تو یہ نصیحت تحریر فرمائی "تم جب تک سہرے لکھے جاؤگے۔ میں یہ سمجھونگا کہ تم فکر معاش سے غافل ہو" کیا استادانہ و بزرگانہ آمیز نصیحت ہے کہ جس کے ماننے میں سرِ مو عذر کا موقع نہیں ہو سکتا۔ ع باپ یار ہوتے ہیں کب ایسے شفیق

عبدالغفور۔ کامل عظیم آبادی

عشرت بعشرت

۱۹۴۲

ساقی نو بہار شام اودھ
آج چل جائے دور جام اودھ

رشک کشمیر لکھنؤ کی زمیں
ساقی "مینا" لئے ہوئے ہے یہیں

موج زن تھا یہیں تو بحر علوم
ہے "فرنگی محل" کی کتنی دھوم

اختر بخت جان عالم بھی
بانی عیش و وقف ماتم بھی

میر میخانۂ سرور سخن
یہیں آسودہ ہے وہ کامل فن

شاد کام اُن کا پیر د کامل
عرش والوں کی تھی یہیں محفل

طرز انشا و طبع رنگیں سے
گل ہے محفوظ دست گلچیں سے

آتش گل کی ہے بہار یہیں
مصحفی ہے رُخ نگار یہیں

ناسخ بدعت سخن ہے کہاں
ایسی محتاط انجمن ہے کہاں

رند بھی پاکباز ہے تو یہیں
با حقیقت مجاز ہے تو یہیں

یہیں آرام میں ہیں میر حسن
شاعری میں تھے بے نظیر حسن

مائل اوج ہے دبیر سخن،
راجح خیر ہے ضمیر سخن

خاندان انیس کیا کہنا
انس مونس نفیس کیا کہنا

کیا تعشق بغیر لطف غزل،
یہیں نکتہ ہوا یہ آخر حل

شوق سے عشق زہر ہو جائے
جان پر میری قہر ہو جائے

اسی در کا فقیر بھی ہے امیر
"مرآۃ الغیب" ہے ضمیر منیر

باکمال جلال حسن جمال
کجروی کی نہیں فلک کو مجال

جامِ عشرت کا تھا مزا کچھ اور　　نشہ تھا اس شراب کا کچھ اور
شام پھر وہ بھی لکھنؤ کی شام　　چوک خوشبو سے بس رہا ہے تمام
راستہ تنگ، دِل کشادہ ہے　　غمزہ پُرکار رُوئے سادہ ہے
بام و در دعوتِ نظر کے لیے　　نازکے جھٹکے ہوئے اکڑ کے لئے
حسن والے دکاں لگائے ہوئے　　دلفروشی اُدھار کھائے ہوئے
کوئی زخمی ہو کوئی بسمل ہو　　زرکشی دلکشی کا حاصل ہو
سب نے بانی تھا جمع خرچ یہاں　　بزمِ عشرت کا تھا نظر میں سماں
ہاں شرابِ کہن پلا ساقی　　مستِ جامِ سخن بنا ساقی
سرِ بازار تو حجاب نہ کر　　بند فیضِ سخن کا باب نہ کر
آج دریا دلی دکھا ساقی　　بند کوزوں کی مئے پلا ساقی
دُور سے آئے ہیں ترے مشتاق　　جلوہ ساماں ہوا انفس و آفاق
اب قریب آگیا ہے میخانہ　　ساقیا بھر دے دِل کا پیمانہ
عشرتِ امروز عیشِ فردا بھی　　ساقیا دیکھ تو تماشا بھی
پیرِ میخانۂ سخن کے لیے　　سب حریفانِ انجمن کے لئے
ٹکڑے توبہ کے ایک جا کر کے　　انتہا کر دے ابتدا کر کے
ناظرہ خواں مصحفِ گُل ہیں　　اِس گلستاں کی ہم بھی بلبل ہیں
کیوں کتابیں لگی ہیں ڈھیر کی ڈھیر　　دَورِ صہبا میں کیا ابھی ہے دیر؟
بندگانِ "رؤف" کو ڈر کیا؟　　ابھی آئے نہیں ہیں صفدر کیا؟
دیکھو تہذیب پیرِ میخانہ　　اِتقا ہے بطرزِ رندانہ
چاند پر چاندنی سی چھٹکی ہے　　سبزہ آغاز سی سفیدی ہے
کیا کتابی ہے چہرۂ انور　　قابلِ قدر قامت بہتر
دو ہی زانو نشست اکثر ہا　　چار زانو ملے ہیں کمتر ہا

لب تبسم سے آشنا تھے ضرور
قہقہہ مارنا نہ تھا دستور

خندہ پیشانی سب سے ملتے تھے
انسے سرکہ جبیں ہی جلتے تھے

چاہے جسکی جہاں لڑی تھی نظر
شام کی جی لگی یہیں تھی مگر

کچھ نظر باز بھی جو آجاتے تھے
لطف شعر و سخن اٹھا جاتے

ایک تھے کیا شریر جو آتے تھے
سبھی اہلِ نظر تو آتے تھے

شاعروں کو عجب عقیدت تھی
اِن کی ہستی بڑی غنیمت تھی

قاعدوں کی سبب پہ بحثیں تھیں
یا نکاتِ ادب پہ بحثیں تھیں

اگلے قصے سناتے جاتے تھے،
اور نکتے بتاتے جاتے تھے

یہ بھی ہوتا تھا اتفاق کبھی،
چھیڑ دیتے تھے کچھ مذاق کبھی،

میرے منہ پر کہا یہ صفدر سے
ان کو ہے اعتراض سن لیجئے

خود ہی پھر اعتراض کر بیٹھے
دیر تک اسمیں سب الجھتے رہے

آخرش فیصلہ بھی خود ہی کیا
سب نے احسنت مرحبا ہی کہا

بعدہٗ یہ بھی کر دیا ظاہر
نام میرا لیا تھا کیوں آخر

جس کے ذمہ جواب عائد ہو
وہ نہ مرعوب جلسے سے زائد ہو

کیا طریقہ تھا کیسے تھے انداز
کیا مرنجاں مرنج ساز و باز

بردباری تھی انکساری بھی
ہلکے پھلکے تھے سب پہ بھاری بھی

وضعداری میں اپنی یکتا تھے
عبرت آموزیٔ تماشا تھے

مرثیہ خوان عہد ماضی تھے
پھر بھی جس حال میں تھے راضی تھے

آہ چرخِ کہن کو کیا سوجھی
اس طرح سے بساط کیوں الٹی

اب نہ عشرت نہ انکی بزم فروغ
حاصل عیش کیا؟ دروغ دروغ!

شمع روتی ہے انجمن کیلئے
اشک غم دیدۂ حسن کیلئے

کمالِ عقیدت بہ استادِ کامل

(قطعۂ اوّل)

نیستی ہی نیستی ہستی میں ہے — ہے عدم اوّل بھی اور آخر عدم
ہر گھڑی، ہر وقت، ہر لحظہ، مدام — گھات میں ہے موت اور غافل ہیں ہم
روز و شب، صبح و مسا ہے یہ رواں — بند اِک ساعت نہیں راہِ عدم
ناگہاں میں نے سنا یہ واقعہ — خواجۂ عشرت گئے ملکِ عدم
سُنکے یہ پر درد و جاں فرسا خبر — کیا کہوں مجکو ہوا جو رنج و غم
مغتنم ہستی تھی اُنکی دہر میں — اِک جہاں ہے مبتلائے حزن و غم
چل بسا ہے اِک ادیب بے نظیر — کیوں نہ لکھتے مرثیہ اہلِ قلم
مجمع اوصاف وہ مرحوم تھے، — وصف اُنکے جسقدر لکھوں ہے کم
حضرتِ اُستاد کی وہ شفقتیں — چٹکیاں لیتی ہیں دِل میں دم بدم
گلشن اسلام کے تھے عندلیب — دے انہیں یارب تو گلزارِ ارم
ہاتفِ غیبی نے دی کامل صدا — سالِ ہجری لکھنے کو بیٹھے جو ہم
از سرِ آہ و بکا تاریخ ہے — ہائے ہائے عشرتِ جادو رقم

۱ ۲

۱۳۵۶ھ
۳
۱۳۵۹ھ

رباعیات

صد حیف کہ صورت گرِ فطرت نہ رہے — تصویر کشِ دانش و حکمت نہ رہے
بہزاد سے بڑھکر تھے، مانی سے سوا — ہیہات وہ علامۂ عشرت نہ رہے

فردوسیِ دوراں تھے جنابِ عشرت — خاقانی ذیشاں تھے جنابِ عشرت
دی دادِ سخن فارسی و اردو میں — سرتاجِ سخنداں تھے جنابِ عشرت

کامل عظیم آبادی

REGD NO P. 294 ماہ جولائی سنہ ۱۹۴۲ء REGD NO P. 294

THE NADEEM JULY 1942

کالجوں اور اسکولوں کیلئے سنہ ۱۹۳۱ء سے منظور شدہ ماہنامہ

ندیم
گیا

قیمت سالانہ للعہ
" ششماہی ۱؎
" فی پرچہ ۶؍

مرتبہ:-
سید حسن امام

جلد ۱۹ فہرست مضامین ماہ جولائی سنہ ۱۹۴۲ء نمبر

حصۂ نثر

حصۂ نظم

نظرات

بگریہ دردِ دلِ تو گر اثر تواں کردن — ترا ز ذوقِ محبت خبر تواں کردن
قبولِ سلطنتِ ہر دو کون چنداں نیست — کہ با محبتِ تو سر بسر تواں کردن
بہ بند مردم ازیں راہ بر نمی گردم — بجستجوئے تو سر در خطر تواں کردن

بیانِ شوق بتقریر در نمی آید
نمی شود کہ سخن مختصر تواں کردن!

خدا کے فضل سے میرے اعزا و احباب میں ایک ایک فرد اتنی وسعت رکھتا ہے کہ تنہا ندیم کا کفیل ہو۔ چہ جائیکہ ان سب کی مجموعی کوشش! پھر اس میں ادب نوازانِ وطن کی شرکت کی توقع!! "سرمایۂ امید" "خجلت دہِ گنجِ قارون" مگر "ساحلِ مراد" کجا "نیلِ مرام" کا "سفینہ" "گردابِ یاس" میں غرق نہ ہو جائے یہی بہت ہے! کیونکہ ع گوشِ سخن شنو کجا، دیدۂ اعتبار کو!

پورنیہ سے شائع ہونے والا ہمعصر مجلہ ہفتہ وار آئینہ نے اپنی ۲۲ مئی کی تازہ اشاعت میں "خدا بخش خاں مرحوم کے مشرقی کتب خانہ" کے سلسلہ میں یہ صائب رائے پیش کی ہے کہ "نوادراتِ قلمی" کے مطبوعہ نسخے جہاں تک دستیاب ہو سکیں وہ بھی لائبریری میں رکھے جائیں تا کہ ریسرچ کرنے والے قلمی نسخوں ہی کو ہمہ وقت ہاتھ لگانے پر مجبور نہ ہوں" اور یہ رائے بھی ہمعصر مذکور کی قابلِ لحاظ ہے کہ دیگر مطبوعہ کتب بھی جو ریسرچ کے سلسلہ میں درکار ہو سکتی ہوں وہ بھی فراہم کی جائیں۔ اگر کانگریسی وزارت "ڈیڑھ اینٹ کی الگ" عمارت "گورنمنٹ اردو لائبریری" کی جگہ مشرقی کتبخانہ ہی کی اس ضرورت کی طرف توجہ فرماتی تو زیادہ مفید مطلب کام ہوتا" اس وقت تو جنگ کے عذرِ لنگ پر ہر شئے معرضِ التوا میں ہے۔ مگر انجمن ترقی اردو اور دیگر علمی و ادبی اداروں کو نوٹ کر لینا چاہیئے کہ آئندہ "مسجدِ ضرار" کے بجائے "مشرقی کتبخانہ" کے ذیل میں ریسرچ انسٹیٹیوٹ اور مطبوعات کا کتبخانہ جس میں مخطوطات کے نقول بھی ہوں قائم کیا جائے، اس کی اشد ضرورت ہے اور مشرقی کتبخانہ سے پورا استفادہ حاصل کرنا اس کے بغیر ناممکن ہے!

صوبہ کی تعلیمی جد و جہد سے ہمارا تعلق زبان و ادب کی حد تک ہے چونکہ ٹکسٹ بک کمیٹی پر اسکی ذمہ داری آتی ہے کہ انتخابِ درسیات میں اس پہلو پر بھی نگاہ رکھے، لہذا اس ادارہ کی تشکیل سے ہمارا اثر لینا ناگزیر ہے۔ بہار گزٹ مورخہ ۴ جون ۴۲ء میں اراکین کی جو فہرست شائع ہوئی ہے وہ اطمینان بخش نہیں۔ اربابِ حل و عقد کیا یہ بتانے کی زحمت گوارا فرمائیں گے کہ بہار کا صوبہ اردو ادیبوں سے بالکل خالی ہے جو ایک رکن بھی ایسا نہیں لیا گیا؟

اپریل کے ندیم میں اعلان کیا تھا کہ مبلغ پانچ روپیہ کا ایک منی آرڈر دفتر میں وصول ہوا ہے جس کے فرستندہ کا نام و نشان معلوم نہیں افسوس ہے "ہنوز روزِ اول" ہے! جمود و سکون کی آخر انتہا ہونی چاہیئے! اپنے پیسوں سے یہ استغنا، سمجھ میں آنے والی بات نہیں ہے!

ندیم

جلد ۱۹ بابت ماہ جولائی سنہ ۱۹۴۲ء نمبر ۷

علیگڈھ اور ادبِ اُردو

عناصرِ اربعہ

شبلی نعمانی

(۲)

از ناظر کاکوروی، بی۔ اے (علیگ)

(گذشتہ سے پیوستہ)

تبلیغ دین، دعوت و ارشاد، تدبیر و سیاست غرض سیاسی زندگی کے ہر شعبہ میں خطابت و تقریر کی ضرورت ہے۔ شبلی اس راہ میں بھی کسی سے پیچھے نہ تھے۔ علیگڈھ چھوڑنے کے بعد جب ان کی سیاسی زندگی کا آغاز ہوا تو اس جذبۂ خداداد نے پورا نشو نما حاصل کیا۔ کالج کی مختلف انجمنوں میں کانفرنس کے جلسوں میں شبلی برابر تقریریں کرتے تھے لیکن ندوۃ العلما کے جلسوں میں انکی شعلہ نوائیاں خاص اہمیت حاصل کر چکی تھیں، اور آج بھی وہ دنیا میں بے نظیر خطیب اور سحر البیان مقرر تسلیم کئے جاتے ہیں بقول ایک خشک ادیب کے "شبلی کا قد بلند اور بالا تھا، اس طرح ظاہری حیثیت سے بھی ہر شخص کی آنکھوں کے سامنے ایک باوقار شخصیت آجایا کرتی تھی، اُن کی آواز بلند اور گونجنے والی تھی، اور آواز کا پست و فراز تناسب آخر وقت تک یکساں رہتا تھا۔ یہی وجہ ہے کہ قدرتی طور پر زور، جوش اور کیف کی اُنکے یہاں کمی نہ تھی، اُن کے مزاج میں نہایت درجہ اشتعال، جوش و خروش تھا، وہ ہر موضوع پر آزادی سے تقریر کر سکتے تھے، تقریر میں شبلی مبتذل، عامیانہ شعر، دور از خیال قصے اور بازاری حکایات و واقعات اور لطائف سے قطعاً احتراز و اجتناب کرتے تھے۔ اُنکی تقریروں میں تاریخی واقعات، اسلامی مسائل اور علمی معلومات کی چاشنی ہوا کرتی تھی۔ ان کے موضوع بالعموم علمی و فنی ہوتے تھے۔ اور جملہ موضوع قرآن، حدیث اور تاریخ کے پر مغز معلومات سے پُر ہوتے تھے۔ اور جب وہ کبھی سیاسی مسائل پر تقریر کرتے تو اُن کی فطری شعلہ نوائیوں میں تاریخی ہوائیں زندگی کی لہریں پیدا کر دیتی تھیں۔ ان تقریروں کا یہ دلکش مجموعہ

۸ حصوں میں شایع ہو گیا ہے - حصہ اول میں مذہبی حصہ دوم میں ادبی - حصہ سوم تعلیمی مضامین - حصہ چہارم ناقدانہ تبصرے - حصہ پنجم میں اکابر اسلام کے سوانح و حالات - حصہ ششم میں تاریخی - حصہ ہفتم میں فلسفیانہ اور حصہ ہشتم میں قومی و وقتی اخباری مضامین کا مجموعہ ہے - علمی، مذہبی و قومی تقریروں کا مجموعہ بھی خطبات شبلی کے نام سے شایع ہو گیا ہے - جہاں تک مواد کا تعلق تھا، وسیع النظری کے ساتھ شبلی واقعات کے قبضہ میں نظر آتے ہیں - یہ حقیقت ہے کہ شبلی ایسی دو سطریں بھی نہ لکھ سکتے تھے جن میں بقول ایک ادیب کے حشم سخن کسی نہ کسی بڑے مسئلہ کی طرف اشارہ نہ کرتی جائے، اور یہ انشا پردازی کا کمال ہی نہیں، بلکہ میں تو اس کو سحر کہوں گا -

حیدر آباد سے ہٹنے کے بعد ایک مشہور انشا پرداز نے شبلی کو لکھا کہ "مجھکو ہمیشہ اس کا صدمہ رہے گا کہ حیدر آباد سے علیحدگی کے بعد آپ علیگڈھ کو اپنا مستقر نہ بنا سکے، اور یہ کالج کی انتہائی بدنصیبی ہے، میں اُن لوگوں کا ہمخیال نہیں ہوں جو سمجھتے ہیں کہ آپ نے ڈیڑھ اینٹ کی مسجد الگ بنائی یا یہ کہ موجودہ مشاغل آپ کیلئے ناموزوں ہیں - میرے خیال میں کوئی وجہ نہیں ہے کہ علمی مقاصد کے لئے مختلف موضوع کے لحاظ سے ملک میں ایک سے زاید تاسیسیں موجود نہ ہوں - میرے دل کا چور ہے جسے آپ سے چھپا نہیں سکتا کہ میں آپکو کالج میں دیکھنا چاہتا تھا" اس امر سے انکار نہیں کیا جا سکتا کہ علیگڈھ کی یہ بڑی بدنصیبی تھی کہ شبلی دوبارہ اُس کی مسند علمی کو نواز نہ سکے - لیکن اُسی کے ساتھ شبلی کو بھی علیگڈھ سے عشق تھا - ندوۃ العلماء کے ہر جلسہ میں کالج کا ذکر خیر کرتے تھے، اور وقتاً فوقتاً علیگڈھ میں رونق افروز ہو کر کالج کے طلبہ کو اپنے پاکیزہ خیالات اور اسلام کی اصلی تعلیمات سے آگاہ کرتے رہتے تھے - چنانچہ اپنی وفات سے تقریباً ایک سال قبل ۲۱ فروری سنہ ۱۹۱۳ء کو نماز جمعہ کے بعد اسٹریچی ہال میں طلبا کے رُوبرو ایک مبسوط تقریر فرمائی جس کا خلاصہ علیگڈھ گزٹ نے شایع کر دیا تھا، اور اب خطبات شبلی میں بجنسہ بھی شایع ہو گیا ہے:

"گو مجھے ہندوستان کے ہر گوشہ میں تقریر کرنے کے موقع ملے ہیں، لیکن حقیقت یہ ہے کہ تقریر کا اصلی مقام علیگڈھ ہے - کیونکہ تمام ہندوستان کے سات[1] کروڑ مسلمانوں کے سامنے تقریر کرنے کے برابر ہے - اس لئے میری ہمیشہ یہ خواہش رہی کہ سال بھر میں کم از کم ۶ مہینے کالج میں بسر کروں اور نواب محسن الملک مرحوم اور مسٹر مارِیسن کے زمانہ میں اس قسم کا ایک معاہدہ تک ہو چکا تھا، لیکن بعض مواقعے نے مجھے اپنے اس ارادہ کی تکمیل سے باز رکھا - خدا کرے کہ یونیورسٹی اسکیم جلد عملی صورت میں آئے تا کہ مجھے بھی اس کی خدمت کا موقع ملے - خوش قسمتی سے جیسے اولڈ بوائز اور طلبا علیگڈھ کو ملے ہیں اگر ندوہ کو ملیں تو اسکی ترقی کی فکروں سے سبکدوشی حاصل ہو سکتی ہے"

[1] اُس دور میں مسلمانوں کی تعداد سات کروڑ تھی، اور اب بجمعہ دس کروڑ سے بھی زاید ہے - کاش شبلی آج زندہ ہوتے -

شبلی نے غازی پور کے مدرسہ چشمۂ رحمت میں بھی تعلیم پائی تھی، مولانا محمد فاروق چریاکوٹی جو اس عہد کے فاضل اجل اور مولانا عنایت رسول چریاکوٹی کے برادر اصغر تھے وہ ان دنوں چشمہ رحمت کے پرنسپل تھے۔ شبلی نے متوسطات سے انتہا تک تعلیم مولانا فاروق سے حاصل کی۔ مولانا فاروق فلسفہ، منطق، ہندسہ، ادب عربی وادب فارسی میں یکتائے روزگار مانے جاتے تھے، اور مولانا فاروق کو اپنے شاگرد سے اس درجہ انس تھا کہ وہ خود اپنے کو "دین دانش کا شیر اور شاگرد کو بچۂ شیر" کہتے تھے۔ باکمال استاد نے فخر اسلاف شاگرد کا ایک بے نظیر سجع بھی کہا تھا وہ یہ ہے:۔ " أنا اَسَدٌ وَانتَ شِبلی "

آخر زمانہ میں مولانا فاروق غازی پور سے اعظم گڈھ چلے گئے۔ آج کی طرح یہ دور علما سے خالی نظر نہیں آتا۔ لکھنؤ میں آفتابِ وقت مولانا عبدالحی فرنگی محلی۔ دہلی میں مولانا نذیر حسین محدث، لاہور میں مولانا فیض الحسن رامپور میں مولانا عبدالحق خیرآبادی، اور مولانا ارشاد حسین، اور سہارنپور میں مولانا احمد علی محدث مسند افتا کو نوازرہے تھے۔ مولانا عبدالحی کمسن تھے۔ مولانا نذیر حسین اہل حدیث تھے۔ مولانا فاروق کمال متقی تھے۔ شبلی نے گلستان تعلیم کے ہر خوبصورت پھول کو سونگھا اور مست ہوئے۔ کچھ دنوں کے لئے شبلی اپنے ایک عزیز محمد عمر کی دعوت پر دیوبند بھی گئے، لیکن شریک تعلیم نہ ہوئے اور واپس آئے۔ مولوی ارشاد حسین سے فقہ کی اعلیٰ کتابیں پڑھیں اور جب ذکر آتا تو مولانا اپنے استاد کی فلسفہ دانی اور تبحر دینی کی بہت مدح فرماتے تھے مولانا فیض الحسن اپنے دور کے اصمعی اور ابو تمام سمجھے جاتے تھے۔ ہندوستان کے تمام دور اسلامی میں قاضی عبدالمقتدر کے سوا مولانا فیض الحسن ہی کی ایک ذات اقدس ہے جو عربی شاعری کا صحیح ذوق رکھتی تھی۔ انکی شرح حماسہ اور دیگر تصانیف اس کی کافی شاہد ہیں اور اب تو اُن کا عربی دیوان بھی شائع ہو گیا ہے۔

عمر ۱۹ سال کی تھی اور ترمذی شریف زیر درس تھی کہ خاندان کے بعض اعزہ نے بغرض حج سفر حجاز کا ارادہ کیا حوصلہ مند طالب علم کے لیئے یہ بہترین موقع تھا۔ چنانچہ استاد محدث سے اجازت لیکر سفر حجاز کے لئے روانہ ہوگئے۔ فریضۂ حج ادا کیا۔ دربار اقدس میں حاضری کی سعادت حاصل کی۔ ایک عالم وجد تھا جو عاشق رسول پر طاری تھا۔ اس عالم میں ایک قصیدہ اور ایک قطعہ فارسی زبان میں انشا فرمایا جو سراپا شوق و آرزو ہے۔ اُن کے لائق عظمت شاگرد و جانشین ڈاکٹر سید سلیمان ندوی بہاری اس قصیدہ کو بڑے ذوق وشوق سے پڑھتے ہیں مدینہ منورہ کے کتب خانوں کو دیکھا۔ اور ظاہر ہے کہ فن حدیث پر جو سامان شبلی کو وہاں نظر آیا وہ کہاں ملتا۔ ابن عبدالبر کی مشہور کتاب التمہیدی (شرح موطائے امام مالک) کی مدینہ منورہ کے کتب خانہ میں زیارت کی۔ شبلی سفر حجاز کا قصہ بڑے لطف دے دے کر بیان کرتے تھے۔ ایک ہندوستانی اہل دل بزرگ کا قصہ سناتے تھے

کہ اُن کے دونوں پاؤں کانٹوں سے چھلنی ہوگئے تھے، وہ موچنے سے کانٹے نکال رہے تھے، شبلی بھی جاکر کھڑے ہوگئے، انہوں نے اشارہ کیا کہ تم بھی نکالو - اور پھر سوز و گداز کی لے میں یہ شعر پڑھا - ؎

آبلے روتے ہیں خوں ہیچ بڑا ہوتا ہے
کوئی کانٹا جو کفِ پا سے جدا ہوتا ہے

شبلی پر اس واقعہ کا اثر تمام عمر قایم رہا - اس کے بعد سوز و گداز کا حصّہ زیادہ ہوگیا تھا۔ حساس طبیعت پر اس واقعہ نے سونے پر سہاگہ کا کام دیا -

سفرِ حجاز سے واپسی کے بعد اعظم گڈھ میں مشاعروں کی طرح ڈالی - شبلی میر مشاعرہ بنتے تھے اور بعض لکھنوی حضرات اپنی غزلیں سُناتے تھے - اس دَور میں پیام یار اور اودھ پنچ کا عنوان شباب تھا - اور شبلی کو اکثر طویل نظمیں اودھ پنچ کی یاد تھیں - ابھی تک فارسی زبان ہندوستان کے شرفا کی علمی زبان تھی - علیگڈھ پہونچنے تک مولانا تمام خط و کتابت فارسی میں کرتے تھے اور قلم برداشتہ خطوط لکھتے تھے؛ اُن کے اکثر فارسی خطوط دار المصنفین اعظم گڈھ میں محفوظ ہیں - مشاعروں کے علاوہ غیر مقلدوں کی تردید و تعذیب میں مصروف رہتے تھے - اس دور میں درس و تدریس کا سلسلہ بھی جاری تھا - مولانا حمید الدین اسی دَور کے فیض یافتہ تھے - شبلی اس عہد میں سخت درجہ مذہبی جابر اور متقشف تھے - تارکینِ غافلین صلواۃ کی سخت تنبیہ کرتے تھے - مسٹر محمد یحیٰی تنہا صاحب سیر المصنفین نے لکھا ہے کہ اکثر طلبا کو شبلی نے اس لئے کہ وہ آیندہ نماز پڑھنے کا مستحکم وعدہ کریں، دو دو گھنٹہ مارا ہے -

---

سب سے پہلی کتاب جس نے شبلی کی توجہ نشر و اشاعت کی طرف منعطف کی وہ پروفیسر آزاد کی سنین الاسلام تھی - اسی دَور میں شبلی (۱۸۸۲ء) علیگڈھ گئے، بانیِ مدرسہ سے بھی شرف نیاز حاصل ہوا پیرِ کہن سال نے جوہرِ دانش ناصیۂ شباب پر جلوہ گر پایا - للعہ روپیہ کی پروفیسری پیش کی اور بقول تنہا انقلابات اور گردشوں کے بعد جس کام کے اہل تھے وہی سپرد ہوا - شبلی کو خود سید احمد نے اپنی کوٹھی میں ٹھیرایا - اُس وقت حالی بھی وہیں تھے - اور مسٹر آرنلڈ بھی آگئے تھے، شب و روز عجیب علمی صحبت رہتی تھی، شبلی سید احمد صاحب کا کتب خانہ دیکھ کر باغ باغ ہو گئے - مصر و یورپ کی تمام جدید و قدیم مطبوعات الماریوں میں بالترتیب سجی ہوئی تھیں - شبلی گھنٹوں الماریوں کے پاس کھڑے رہتے - اور اکثر تھک کر الماریوں کے پاس زمین پر بیٹھ جاتے تھے - آرنلڈ کی معیت میں وہ قسطنطنیہ گئے اور وہاں سے ایشیائے کوچک، شام اور مصر ہوتے ہوئے ۶ ماہ کے بعد ہندوستان واپس آئے - بقول مسٹر تنہا جدید اسلامی ہندوستان کا یہ پہلا علمی سفر تھا جو کسی عالم کی ہمت نے قبول کیا - ان رہ نوردوں میں انہوں نے کیا کیا تماشے اور قدرت کی نیرنگیاں دیکھیں، خود شبلی کا خامۂ نقاش سفرنامہ

میں اُن کی رنگین تصویریں دکھا چکا ہے۔ علیگڑھ واپس جا کر ۹۶ء میں قصیدہ پڑھا۔ مطلع یہ ہے :۔

قاصد خوش خبر امروز نواساز آمد — کز سفرِ یار سفر کردۂ ما باز آمد

از سفر شبلیِ آزادہ بہ کالج برسید — یا مگر بلبلِ شیراز بہ شیراز آمد

دوستاں مژدہ کہ آں بلبل خوش لہجہ دگر — اندریں تازہ چمن زمزمہ پرداز آمد

مئی ۱۸۹۸ء میں مدرسۃ العلوم سے سید محمود کے برتاؤ سے بددل ہو کر رخصت لی اور وطن چلے گئے اسی دور میں سید احمد کا انتقال ہو گیا، اور شبلی نے ۱۶ سال کی دیرینہ خدمات کے بعد بصد حسرت و یاس علیگڑھ کو خیرباد کہا۔ اسی دور میں الفاروق زیرِ ترتیب تھی۔ کچھ دنوں کے لئے کشمیر چلے گئے۔ مگر وہاں صحت کو ہاتھ سے کھو بیٹھے۔ اور علیل ہو گئے۔ لیکن اس حالت میں بھی الفاروق کی تالیف و تحریر کا سلسلہ جاری رہا۔ جس روز الفاروق کی آخری سطور قلم نے لکھی ہیں، شبلی بسترِ مرض پر دراز تھے اور گھنٹوں عالمِ بیہوشی طاری رہا۔ قصیدۂ کشمیر اسی دور کی یادگار ہے۔ شفا پانے کے بعد حالی نے تہنیت لکھی جس کا ایک شعر یہ ہے۔ ؎

للّٰہ الحمد پس از ناخوشی و رنج دراز — شبلیِ ما بمراد از سرِ بالیں برخواست

علیگڈھ سے علیحدگی کے بعد مستقلاً اعظم گڈھ میں قیام کیا۔ یہاں ۱۹۰۶ء میں اتفاقیہ بندوق کی گولی چل جانے سے شبلی کے پاؤں میں سخت ضرب آئی، وہ بعد اچھے ہو گئے۔ لیکن لنگ باقی رہا۔ یہیں ایک انگریزی کا مدرسہ نیشنل اسکول قایم کیا

قیام کشمیر میں ہی الفاروق شایع ہوئی ... ...

ابھی کشمیر سے شبلی واپس نہ ہوئے تھے کہ ڈاکٹر سید علی بلگرامی نے باصرار تمام ریاست حیدرآباد میں طلب کیا۔ اور وہاں نظامت علوم و فنون کا عہدہ قبول کرنا پڑا۔ الغزالی۔ سوانحِ رومی۔ علم الکلام۔ الکلام۔ موازنۂ انیس و دبیر حیدرآباد کی علم پرور صحبتوں کی زندہ یادگاریں ہیں۔ اب حیدرآباد سے بھی دل اچاٹ ہونے لگا تھا کچھ دنوں کے لئے بمبئی سیر و سیاحت کے لئے تشریف لے گئے اور لکھنؤ میں مولانا محمد علی کانپوری اور دیگر اربابِ فہم کی تجویز سے ندوۃ العلماء کا سنگ بنیاد رکھا گیا۔ شبلی گو اس اس قسم کے کام کے لئے سراپا انتظار تھے، دوسرے اجلاس میں شریک ہوئے اور دارالعلوم کا خاکہ تیار کیا، اور مولانا محمد علی کے استعفا دینے پر ندوہ میں جب انحطاط شروع ہوا تو شبلی اپنے احباب کے اصرار سے لکھنؤ آئے اور دارالعلوم کو ۱۹۰۴ء میں اپنے ہاتھوں میں لے لیا۔ لیکن خیرہ چشموں سے ندوۃ العلماء کی یہ کامیابی اور درخشندگی دیکھی نہ گئی اور لوگوں نے رخنہ اندازی شروع کر دی۔ مجبوراً ۱۹۱۳ء میں شبلی ملول ہو کر علیحدہ ہو گئے۔

شبلی زخیلِ زمزمہ سنجاں قسم گرفت — بایں کہ ہیچگونہ زخیل و حشم نداشت

سنہ ۱۹۰۰ء میں امیر عبدالرحمن خاں والی کابل نے ترجمہ کا محکمہ قایم کیا، اُس کے لئے ہندوستان سے شبلی کا انتخاب ہوا، لیکن شبلی نے خود انکار کر دیا۔ سنہ ۱۹۰۸ء میں اڈنبرا مسلم سوسائٹی کے صدر ہوئے۔ سنہ ۱۹۱۱ء میں شملہ کی سرکاری اورنٹیل کانفرنس میں مدعو کیئے گئے، اور سنہ ۱۹۱۲ء میں الہ آباد کی سرکاری ورناکلر کمیٹی میں شریک ہوئے اور گورنمنٹ نے شبلی کی تجویز کو منظور کیا۔ رائل ایشیاٹک سوسائٹی کے رکن مقرر ہوئے اور جامعہ الہ آباد کے فیلو بھی۔ سنہ ۱۹۱۰ء کے تاجپوشی کے موقع پر ہز مجسٹی جارج پنجم نے شرف باریابی بخشا، اور بھوپال، رامپور، جزیرہ اور حیدرآباد کے رؤسا شبلی کے قدردان تھے۔ عثمانیہ یونیورسٹی کے وضع نصاب میں بھی شبلی کا تقرر ہوا۔

شبلی کی شہرت اب ہندوستان سے باہر بھی پہنچ چکی تھی، ہندوستان مصر و شام و ٹرکی، جزائر ملایا انگلستان، فرانس اور جرمنی سے علمی استفسار اور سوالات آیا کرتے تھے، شبلی ان سوالات کو بہت اہمیت دیتے تھے۔ انگلستان سے آرنلڈ، پیرس سے موسیو لوا۔ اور برلن سے ڈاکٹر (؟) برابر علمی استفادہ کرتے رہتے تھے۔ سنہ ۱۸۹۹ء میں اٹلی کے اورنٹیل کانفرنس میں شرکت کا قطعی ارادہ تھا۔ لیکن دفعتاً علالت کی بنا پر نہ جا سکے۔ سنہ ۱۹۱۳ء میں ٹرکی کی جانب سے مدینہ یونیورسٹی کے قیام کا جو خیال تھا، اُس کے واضعین نصاب میں شبلی کا بھی نام نظر آتا ہے۔ قانون وقف علی الاولاد کا مسودہ لکھا۔ اور اشاعتِ اسلام کی اسکیم بھی لکھی۔ آخر میں دارالمصنفین قایم کر کے علمی و ادبی خدمات کے لئے جدید راہیں کھول دیں۔ شبلی کا سب سے آخری اور اہم کارنامہ سیرۃ نبوی کی تالیف تھا۔ جس کی ناتمامی کا داغ آخر وقت تک اُن کے دل میں رہا۔ اپنی زندگی میں دوستوں سے کہتے تھے کہ "سیرۃ کو تمام ہی کرنا ہے گو جان دے کر ہی"۔ چنانچہ اسی مقولہ کے مطابق شبلی نے اس مقدس دھن میں جان دی۔ اگرچہ سیرۃ النبی شبلی ناتمام چھوڑ گئے۔ لیکن شکر ہے کہ ڈاکٹر سید سلیمان ندوی کی ادارت میں سیرۃ کی بقیہ جلدیں آب و تاب سے شایع ہو گئیں۔

شبلی کی سب سے آخری اور اہم خدمت سیرۃ النبی کی اشاعت ہے، اس کا مقدمہ سرنامہ اور ظہور قدسی کا حصہ اُن کی سحر آفرینیوں کا اعلیٰ کرشمہ ہے، اُردو ادب جس قدر بھی ناز کرے کم ہے۔ مقدمہ اختراع فائقہ ہے اور مغربی زاویۂ نگاہ سے جو رنگ تنقید اختیار کیا گیا ہے وہ اچھوتا اور بے نظیر ہے۔ واضح رہے کہ سیرۃ انگریزی خواں نوجوانوں کے لئے لکھی گئی ہے۔ اصل میں یہ وہی سید احمد کی روح تھی جو اس سے بہت قبل میور کی دریدہ دہنی سے متاثر ہو چکی تھی۔ شبلی بھی اس میخانہ کے رند خراباتی کی حیثیت سے متعارف تھے۔ کس طرح وہ اس آتشیں لپک سے محفوظ رہتے۔ ایسے دلچسپ و دلنشیں پیرایہ میں مسکت دلائل و براہین کے ساتھ شبلی نے سیرۃ

…ول نیچے اگلے سخنوروں کے چراغ جھلملاتے نظر آنے لگے۔ سیرۃ پر عہد قدیم سے اردو میں اچھی کتابیں موجود
…لیکن ان کتابوں میں زبان عالمانہ استعمال کی گئی تھی۔ جس کی فی زمانہ علمی فقدان کی بنا پر قطعًا ضرورت نہ
…سلسلہ میں مولانا ابوالمحسن حسن علوی کاکوروی کی بے نظیر سیرۃ تفریح الاذکیا (جلد دوم) اور تاریخ حبیب اللہ
…ہادر مفتی عنایت احمد کا بھی ذکر کیا جاسکتا ہے، جن کا انداز بیان عالمانہ تھا۔ لیکن شبلی کے طرز انشا نے
…ب کی مرکزیت کو بھی گھن لگا دیا۔ سیرۃ کی پہلی دو جلدیں شبلی کی سحر آفرینیوں سے مالا مال ہیں۔ پھر
…پر شبلی کی مخصوص طرز انشا میں کوثر و تسنیم سے دھلی ہوئی ٹکسالی زبان استعمال کی گئی ہے طرز نگارش
…اسلوب بیان موثر و مدلل۔ پیرایۂ سخن پر زور استعمال ہوا ہے۔ اور الفاظ کا انتخاب تو شبلی کا حصۂ خاص
…ہی وہ زبان ہے۔ جس پر لکھنو و دہلی کے مکاتیب ادب بھی افضلیت کی مہریں ثبت کرتے ہیں۔

نواب سلطان جہاں بیگم سابق چانسلر مسلم یونیورسٹی علیگڈھ والیہ بھوپال فردوس آشیاں نے سیرۃ نبوی
…راول کی اشاعت کے لئے تین ہزار کی گرانبہا رقم عطا کی، اور اعلیٰ حضرت قدر قدرت آصف جاہ سابع
…اللہ ملکہ نے سیرۃ کے مد میں دو سال کے لئے دو سو روپیہ ماہوار کا اضافہ منظور کیا۔ ایک مخلص دوست کا
…ہے کہ نواب سلطان جہاں بیگم شبلی سے مولویانہ تالیف چاہتی تھیں۔ لیکن شبلی کی آزاد خیالی ادب سے
…ہی۔ حقیقت یہ ہے کہ مذہبی موضوع پر ادائے خیال آسان نہیں، لیکن وسیع ذخیرہ الفاظ، تراش خراش
…بست بندش و نادر تراکیب کے لحاظ سے شبلی آج بڑے سے بڑے مغربی مستشرق سے کم سرمایہ دار نہیں
…برجستگی و آمد ہر جگہ موجود ہے۔

اور بقول ایک ادیب کے "آورد" کو جہاں کہیں چوری چھپے شبلی کی محفل خاص میں باریابی عطا ہوئی
…و دہاں بھی شائستگی، متانت اور خودداری نے بڑھ کر شبلی کے فانوس خیال کی بے ساختہ بلائیں لی ہیں
…یہی وہ اعلیٰ بلاغت تھی جو دور حاضر میں افسانہ وشی سے تعبیر کی جاتی ہے۔ ایک مرحوم انشا پرداز نے سیرۃ نبوی
…شاعت پر اپنے ایک دوست کو لکھا تھا کہ "سیرۃ نبوی کے ابتدائی اجزا مقدمہ کی حیثیت سے پڑھے۔ دل
…آیا کریہ لٹریچر اب کہاں؟ سچ ہے کہ شبلی کے ساتھ ادب کا لطف گیا۔ لیکن اعتراف مشکل ہے۔ شبلی کی
…تنقیدوں نے ملک میں ادبی وقار کو ممتاز کر دیا اور حقیقت یہ ہے کہ اس میدان میں کوئی ان کا مقابل و مماثل
…نہیں آیا۔ ان کا نفیس جمالیاتی ذوق، جن کی ہر شکل میں نمایش، فارسی شعرا سے واقفیت تامہ، یہ وہ اہم
…نفسیات ہیں جنھوں نے بحیثیت مجموعی شبلی کا ادبی وقار بہت نمایاں کر دیا ہے۔ وہ ہر جگہ ہر مقالہ میں عنفت
…روح اصلی سے متاثر نظر ہو کر اصلیت سے قریب تر ہوتے جاتے ہیں۔

[illegible]

صحافت کا تجربہ شبلی کو علیگڈھ ہی میں ہو گیا تھا۔ وہ شروع میں علیگڈھ منتھلی کو مرتب کرتے تھے، اور لکھنؤ میں الندوہ کو بھی مرتب کرتے تھے۔ تہذیب الاخلاق و علی گڈھ انسٹیٹیوٹ گزٹ کی قلمی اعانت اور اس کے مقناطیسی اثرات تھے جو شبلی کے کاروانِ حیات میں ہمیشہ شب چراغ کی طرح جگمگاتے رہے۔ الندوہ نے نوجوان طبقہ میں سیاسی تعلیمی، سماجی اور ادبی سرگرمیوں کی اشاعت میں خاص حصّہ لیا۔ اُن کی ادارت میں الندوہ باقاعدگی میں بالکل انگریز ہو گیا تھا۔ رسالہ وقت پر نکلتا تھا یہ وہ اہم خوبی تھی جو فی زمانہ بھی مشکل ہے۔ الندوہ کی مالی حالت سے شبلی مطمئن نہ تھے۔ اُن کا خیال کسی حد تک بہت صحیح تھا کہ تعلیم یافتہ طبقہ صحیح مذاقِ علمی سے تقریباً ناآشنا محض ہے .... ـــــ شبلی کی ان جملہ کاوشوں کا صلہ کیا ملا؟ یہ سوال بہت دردناک اور غیر دلچسپ بھی ہے۔ کتابوں کی اشاعت کبھی بھی امید افزا نہ تھی کہ وہ ندوہ سے علیحدگی کے بعد بہ فراغت تمام علمی مشاغل میں منہمک رہتے۔ کہتے ہیں کہ علیا بیگم بھوپال خلد آشیاں اور اعلیٰ حضرت نظام سابع خلد اللہ ملکہٗ نے کچھ امداد کی، لیکن ؏

عید ہوئی ذوق مگر شام کو

شبلی میں خصوصیت کے تمام امکانات بدرجۂ اتم موجود ہیں۔ اُن کا اندازِ تحریر دلکش ہونے کے ساتھ بلیغ ہے۔ وہ بڑی سے بڑی بات آسانی سے کہہ جاتے ہیں۔ وہ مغربی افکار و آرا ہی سے نہیں، بلکہ شعوری یا غیر شعوری طور پر مغربی طرزِ بیان سے بھی یکساں متاثر تھے۔ وہ پہلے اردو مصنّف ہیں جنہوں نے مغربی نثر نگاری کے اسالیب اور صور کو حل اور جذب کیا۔ تاریخ و سیر تحقیق و تنقید میں شبلی کا درجہ بدرجہ کمال بلند ہے۔ اُنہوں نے جدید علم و فن کو اصول کے رُو سے پرکھا اور اردو کی جدید اسالیب سے واقف ہو کر ایک زمانہ کو باخبر کیا۔ یہ اندازِ بیان بہ یک وقت قابلِ صد رشک اور کسی بڑی حد تک ناقابلِ تقلید کہا جا سکتا ہے۔ ان کی دلکش و رنگین طرزِ انشا کی امتیازی رفعت اور بنیادی منزلت، صفائی۔ نفاست اور نزاکت پر موصوف ہے۔ وہ ایک خوش سلیقہ نگینہ ساز کی طرح الفاظ کو اس خوبی و نفاست سے جڑتے کہ لوگ محو حیرت رہ جاتے ہیں۔ ان کی عبارتیں خشک اور بے ربط نہیں ہوتیں، صفحات کے صفحات پڑھ جایئے۔ لیکن کہیں بھی طبیعت پر بار نہیں ہوتا۔ اور اُن کے خوانِ ادب کے لقمۂ تر سے کسی طرح سیری نہیں ہوتی۔ ایک لطیف آہنگ، ایک بلیغ موسیقیت اور ارفع ترنم پایا جاتا ہے، یہی وہ حدیں ہیں جہاں شبلی اپنے معاصرین سے علیحدہ ہو کر مخصوص زاویۂ نگاہ سے دنیا پر نظر ڈالتے ہیں، اور یہیں شبلی بحیثیت ایک رنگین انسان کے دنیا پر چھائے ہوئے سے معلوم ہوتے ہیں۔

شبلی نے اکابر و مفکرین کے سوانح حیات لکھے۔ لیکن دنیا واقف ہے کہ انہیں ہر جگہ مؤرخ کی حیثیت سے کامیابی ہوئی۔ سیرۃ النبی۔ الفاروق۔ المامون۔ الغزالی۔ سیرۃ النعمان۔ سوانح مولانا روم اور رسائل خسرو میں اگرچہ شبلی کا نفس مضمون کسی مفکر کی سیرۃ ہے لیکن وہ اس کے ساتھ اُس دَور کے جملہ تاریخی واقعات، سماجی کیفیات، عمرانی خصوصیات کو بھی نظر انداز نہیں کرتے۔ شعر العجم کے اوراق میں بھی اُن کے سحر نگار قلم نے خوشنما رنگ بھر کر حیات جاوید عطا کر دیا ہے۔

اس واقعہ سے انکار نہیں کیا جا سکتا کہ شبلی نے فلسفہ یونان و اسلام کے سلسلہ میں فلسفہ قدیم و جدید کا موازنہ کرنا چاہا تھا۔ لیکن یہ کوششیں ناتمام رہیں۔ دنیا چاہتی تھی کہ فلسفہ خالص فلسفیانہ رنگ میں پیش کیا جائے جامعیت ہمہ گیری اور رکھ رکھاؤ کی حیثیت سے اختراعِ فائقہ کہہ سکیں۔ اس سلسلہ میں عام مذاق کی رعایت کی چنداں ضرورت نہ تھی، بلکہ اس سے عوام کے دماغی افق کی توسیع منظور تھی، اور یہ اُس وقت تک ممکن نہیں کہ جو کچھ لکھا جائے دوسروں کی عام رفتار سے علیحدہ ہو کر یعنی کہیں سے بھی کوئی بھرتی کا شائبہ نہ ہو، اور اسی کے ساتھ موضوع خیال اس قدر نادر اور اچھوتا ہو جس کو اوروں کے قلم نے چھوا بھی نہ ہو۔ اسی بنا پر شبلی نے الغزالی میں احیاء العلوم کو تو بہت سراہا ہے لیکن اخلاق پر مستقلاً اظہار خیال سے اجتناب کیا، اور لوگوں کو ایک گونہ مایوسی بھی ہوئی اور شیدایانِ ادب نے تشنگی کی شکایت محسوس کی۔

ایک مغربی ادیب کہتا ہے کہ جس طرح علمی مضامین کے لیے بڑی سخت قید ہے کہ موضوع سے جہاں ہٹے بے ضابطہ ہوئی۔ لیکن انشا پردازی میں یہ ضرور آزادی ہے کہ جہاں تک مسائل عصریہ کا تعلق ہے ادب کے تعلقات کی طرف چشم سخن اشارے کرتی چلی جائے۔ الفاظ کی ہیر پھیر اور چبھتی ہوئی نشست میں وہ نشتر پنہاں ہوں کہ زخمی قلوب میں تڑپ بڑھ جائے، اور یہی کمال بلاغت ہے۔ ادب و حسن کاری بہ ہیئت اجتماعی اور نظام تمدن کی خدمت میں اگر نشر و تبلیغ ہے۔ لیکن اس معیار کمال پر وہی ادب کھرا اُترے گا جس میں تفکر جذبہ آزادی ہو، روح تعمیر ہو۔ اور تاریکی میں شب چراغ کی طرح زندگی کی حقیقتوں کی روشنی ہو، جو حرکت سے بے چینی اور ہنگامہ پیدا کر دے۔ لیکن سُلائے نہیں، کیونکہ اب زیادہ سونا موت کی علامت

شبلی نے اس راز کو سمجھا اور اسی لئے وہ ادب کو تنقید حیات سے تعبیر کرتے تھے۔ ہم ادب کے مطالعہ سے اقوام و ملل کے تاریخی حالات، سماجی کیفیات اور ادبی دلچسپیوں سے باخبر ہوتے ہیں اور کما حقہٗ قیمت

پروفیسر نجم گیلانی کے پانچ اشعار آئینۂ تنقید میں

(از جناب شاہ سید منظور الرحمٰن صاحب اختر کاکوی)

پروفیسر نجم گیلانی کی دلپذیر نظم "نغمۂ نوبہار" جو مقبول ہو کر معرضِ بحث میں بھی رہی ہے، آج کی صحبت میں اس کے اعتراضات کو سامنے لا کر اس پر اظہارِ خیال مقصود ہے۔

(۱) میرے وطن بہار کو گلشنِ نوبہار دے — لالہ و کوہسار دے سبزۂ مرغزار دے

اس شعر پر چند اعتراضات ہیں۔

(ا) "گلشنِ نوبہار دے" روزمرہ کے خلاف ہے۔

(ب) سبزۂ مرغزار غلط ترکیب بیان ہے کیونکہ دونوں لفظ مرادف ہیں۔

(ج) گلشنِ نوبہار میں کوہسار اور سبزۂ مرغزار کی تمنا خلافِ فطرت امر ہے۔ لہٰذا ان غلطیوں کو دور کرنے کے لئے ایک نقاد نے یہ اصلاح دی تھی۔

بارِ خدا بہار کو موسمِ نوبہار دے — پھر نئے برگ و بار دے سبزہ و لالہ زار دے

اس اصلاح سے خامیاں تو دور ہو گئیں لیکن دوسرے مصرعہ میں "موسم" کا لفظ بیکار ہے لہٰذا اس کی بجائے "جلوہ" مناسب ہوگا۔ اس سے سقم بھی دور ہو جائیگا۔ اور کیفیت و حلاوت بھی بڑھ جائیگی۔ "بارِ خدا" کے ٹکڑے کی بھی ضرورت نہیں، کیونکہ اس سے پہلے کے اشعار میں دعائیہ کلمہ موجود ہے۔ شاعر کے اصل ٹکڑے "میرے وطن بہار کو" نکالنے کی ضرورت نہیں کہ اس سے کیف بھی بڑھ جاتا ہے، اور وطن دوستی کا ثبوت ملتا ہے جس کی یہاں پر ضرورت ہے۔ لہٰذا اس شعر کو یوں پڑھئے:-

میرے وطن بہار کو جلوۂ نوبہار دے — پھر نئے برگ و بار دے، سبزہ دے لالہ زار دے

(۲) پھر اسے لالہ زار کر سرو دے اور چنار دے — باغِ بہشت کا نظیر یعنی وہ کوہِ راجگیر

سرو اور چنار کو متشائم سمجھا جاتا ہے، کیونکہ دونوں پھل سے محروم ہیں، بلکہ چنار سے تو آگ بھی نکلتی ہے اس لئے کسی نقاد نے اس کو اس طرح بنایا تھا۔

پھر اسے لالہ زار کر رفعتِ زرنگار دے — پیارا وہ کوہِ راجگیر، خلدِ بریں کا تھا نظیر

رفعتِ زرنگار سے مضمون میں خاص بلندی نہ پیدا ہو سکی۔ بلکہ اصلاح سے مضمون اور بھی مخلِ فصاحت ہو گیا۔

نظیر زیادہ تر مؤنث ہی مستعمل ہے، اس لئے یوں پڑھئے تو بہتر ہو :- ؎

باغِ بہشت کی نظیر یعنی وہ کوہِ راجگیر — صورتِ کوہِ طور اسے جلوۂ آشکار دے

وہ طور کی ہمسری کی دعا سے بلندی پیدا ہو گئی اور پوری مناسبت قائم رہی۔

۳) مستوں کو آگیا ہی ہوش، مستیٔ جوئبار دے — بزم میں ساز ہیں خموش، نغمۂ آبشار دے

اس شعر پر مضمون کی بے ربطی کا الزام لگا کر ایک صاحب نے اس کو قلمزد کر کے اس کے عوض ایک دوسرے شعر کا اضافہ کیا تھا جو بالکل ہی مہمل اور بے معنی بات تھی اس لئے ہم اس کو لائقِ اعتنا نہیں سمجھتے ہیں، اور اصلی شعر کو سامنے لاتے ہیں۔ نجم صاحب کے پہلے مصرعہ میں مستوں کو مستی دینے کی جو خواہش کی گئی ہے وہ تاویل طلب ہے۔ اس لئے "مستوں کی بجائے" رندوں کا لفظ اگر رکھ دیا جائے تو مناسب ہوگا۔

۴) گرم ہو بزمِ ناؤنوش سر میں بڑھے جنوں کا جوش — بادہ کی یاں کمی نہیں اب کوئی بادہ خوار دے

"بادہ" کی بجائے کسی نے "دارو" کا لفظ تجویز کیا تھا جو مضحکہ خیز ہے۔ اس شعر پر دو اعتراضات ہوئے تھے

(ا) فارسی ترکیب کے بغیر اردو میں بادہ کا استعمال غیر فصیح ہے۔

(ب) جنوں یہاں پر "پاگل پن" کے معنی میں غیر صحیح ہے۔

جواب :- اردو نظم میں "گوش" اور "چشم" کی طرح "بادہ" بھی مستعمل ہے۔ منیر شکوہ آبادی کہتے ہیں :- ؎

روزِ ازل ہی نشۂ الفت زیادہ تھا — انگور باغ میں تھے کہ شیشہ میں بادہ تھا

لفظ "جنوں" پر اعتراض بھی صحیح نہیں، کیونکہ جنوں عشق کے معنی میں بھی مستعمل ہے۔ البتہ لفظ سرور زیادہ بامعنی اور پُرکیف ہوگا لیکن دوسرے مصرعہ کے اخیر کا ٹکڑا "اب کوئی بادہ خوار دے" محض برائے قافیہ لایا گیا ہے، اور بالکل ہی بھدا سا معلوم ہوتا ہے۔ سر میں جنوں کے جوش کی التجا کے بعد بادہ خوار کے وجود کی تمنا بے جوڑ سی بات ہے۔ اس لئے ایک صاحب نے اس پر یہ اصلاح دی تھی۔ ؎

گرم ہو بزمِ ناؤنوش، کیفِ سرور کا ہو جوش — ساقی لٹا دے آج خُم، بادۂ خوشگوار دے

لیکن یہ اصلاح سراسر بے لطف ہے اور غیر فصیح۔ کیف و سرور ہم معنی لفظ ہیں۔ دوسرے مصرعہ کی بندش بالکل ڈھیلی ہے۔ اس لئے یوں پڑھنا مناسب ہوگا۔ ؎

گرم ہو بزمِ ناؤنوش، دل میں سُرور کا ہو جوش — ساقیٔ دلنواز دو، بادۂ خوشگوار دے

(۵) اک نگہِ فسوں طراز اک نظرِ جنوں نواز — ناوکِ چشمِ نیم باز جو ہو جگر کے پار دے

"پار" کے کسی باشندے نے اس کو شاید اپنی مناسبت سے پار دینا سمجھ کر اعتراض کیا تھا۔ حالانکہ یہاں پر

پار ہونا استعمال کیا گیا ہے۔ نثر کرنے سے مفہوم واضح ہو سکتا ہے۔ یعنی ناوکِ چشمِ نیم باز دے جو جگر کے پار ہو۔ قافیہ ردیف کی وجہ سے تعقیدِ لفظی ضرور پیدا ہو گئی ہے لیکن اس کی ترکیب غلط نہیں۔ لہٰذا خواہ مخواہ اصلاح کی کوئی ضرورت نہیں معلوم ہوتی ہے۔

علمی ترقی کے لئے نقد و تبصرہ ایک ضروری چیز ہے لیکن افسوس ہے کہ اردو کا نقاد اپنے فرائض کو بہت کم محسوس کرتا ہے۔ ضروری باتوں کی بجائے غیر ضروری اور فضول باتوں سے مضمون کو پُر کیا جاتا ہے کہیں اہانت مقصود ہوتی ہے۔ تو کہیں مضحکہ خیزی۔ حالانکہ یہ طریقہ دامنِ نقد کا بدنما داغ ہے۔ رسالوں کے مدیروں کا یہ فرض ہے کہ وہ اپنی ذمہ داریوں کا احساس کرتے ہوئے اس قسم کی خرابیوں کے روکنے کی کوشش کریں تاکہ ملک و قوم کا اخلاق بلند ہو اور علم و فن کی صحیح خدمت ہو سکے۔ صاحب نقد کو چاہیئے کہ ایسے موقع پر جادۂ اعتدال سے نہ ہٹے۔ مضمون نگار اور مصنف کا فرض ہے کہ جائز اعتراض پر جبیں بہ جبیں نہ ہو۔ ہٹ دھرمی اور ضد سے کام نہ لے ہر حالت میں حق کا اعتراف و اقرار ہونا چاہیئے۔ اور باطل سے انکار و احتراز۔

(بقیہ صفحہ ۲۵ تتمہ مضمون "ہمارے قاضی جی")

کھینچ لیا۔ شامیانہ لہرا کر اڑ اڑا دھم زمیں پر اور قاضی جی، نوشہ، ہم اور جملہ براتی اسکے نیچے۔ ہم نے غور کیا، ادھر ادھر ہاتھ پھیلایا تو ایک جگہ شامیانہ کا کپڑا کچھ اٹھا ہوا معلوم ہوا، آہستہ آہستہ ادھر کھسک کر ہم جلدی سے وہ حصہ اٹھا کر ننگے پیر وہاں سے بھاگے اور صبح ہوتے ہوتے جب ہم اپنے "دولتکدہ" پر بہزار خرابی پہنچے تو یہ شعر ہماری زبان پر جاری تھا ؂

گر ہمیں قاضی و ہمیں خطبہ عقد خوباں تمام خواہد شد

"اللہ آبادی"

"سلکِ گہر" :۔ از محمد یعقوب صاحب مستری سالک

سرمستِ محبت ہوں اے نرگسِ مستانہ
ساغر پہ مجھے ساغر پیمانہ پہ پیمانہ

ایمان ہے ساغر میں شیشہ میں مرا تقویٰ
ہے پیر مغاں مرشد، کعبہ مرا میخانہ

ساقی ترے صدقے میں ساغر کو مرے بھر دے
لبریز ہوا جاتا ہے عمر کا پیمانہ

دنیا مجھے ہنستی ہے، دنیا پہ میں ہنستا ہوں
عاقل کا میں عاقل ہوں، دیوانہ کا دیوانہ

مژدہ تمہیں اے رندو، لو کالی گھٹا اٹھی!
وہ دوش ہوا پر ہے اڑتا ہوا میخانہ

ہے یادِ خدا اس میں تصویرِ بتاں اس میں
دل کعبہ کا کعبہ ہے، بت خانہ کا بتخانہ

چھوڑو بھی اسے رندو، بکتا ہی رہیگا یوں
کیا سنتے ہو زاہد کی، دیوانہ ہے دیوانہ

حسرت ہے تمنا ہے، ارمان ہے خواہش ہے
سالک کو نظر آئے پھر جلوۂ جانانہ

"مُطالِعہ"

(از طالِبُ العِلم)

"اُردو مجلسِ دہلی نمبر" ندیم میں خواجہ محمد شفیع صاحب دہلوی بانیٔ مجلس کا فیصلہ آپ "صاحبوں" نے ملاحظہ فرمایا ہوگا "عربی معنی" ہم ہندوستانی خال خال ہی جانتے ہیں۔ خواجہ صاحب کا احسان ماننا چاہیے کہ "صاحب" کے معنی کو "عذر فتوی" کے لئے الم نشرح کر کے فیصلہ فرمادیا کہ مرنے والے "مرحومین" کو اس لفظ "صاحب" کے اعتبار سے "محرومین" گردانا جائے۔ اب وہ تقدس واحترام کے چاہے جن لفظوں سے یاد کئے جائیں مگر "صاحب" نہیں کہے جاسکتے[1]! حالانکہ جس معنی میں تعظیماً "صاحب" کا استعمال ہوتا ہے وہ ہندوستانیوں کا "ایجاد بندہ" تھا۔ عربی میں اس طرح اس لفظ کا استعمال نہیں ہے! سمجھ میں نہیں آتا ہے کہ "تعبضۂ مخالفانہ" کو بھی خواجہ صاحب نے "بیک جنبشِ زبان وقلم" "مسترد وکالعدم قرار دیکر" "منسوخ" فرمادیا۔ قوم حکمران کے افراد جو "صاحب" بنے اس وقت تک معزز ہے۔ اس "حرفِ بیجا" پر "سات نواجاؤں کی چوکھٹ" سے کوئی حکم "امتناعی" صادر نہ ہوا عجب ہے۔ اور بیوی کا تہذیباً شوہر کو "صاحب" کہنا تو "حیاسوز اشارے" کے سوا اور کچھ کہا نہیں جاسکتا ہے۔ کیا یہ "محلِ نظر" نہیں ہے؟

علیگڑھ میگزین کا "احسن نمبر" نکال کر اس مجلہ کے ارباب حل وعقد نے قدر شناسی کی روشن مثال قایم کی ہے۔ ایسی توفیق خیر خدا سب کو ارزانی فرمائے۔ جہاں اس کے مطالعہ سے خوشی ہوئی، وہیں یہ دیکھ کر "پائے طاؤس" یاد آگیا کہ "سلطان العلوم" "بانیٔ کلیۂ عثمانیہ" خدیو گیہاں شاہِ دکن خلد اللہ ملکہ وسلطنتہ ایک طرف ڈاکٹر ضیاء الدین صاحب کو "حبیب قدیم" old friend

---

[1] اُردو مجلس دہلی نمبر ندیم کے صفحہ ۶ کے سطر ۱۶ میں خواجہ حسن نظامی صاحب تحریر فرماتے ہیں "نواب صاحب مرحوم"۔ اردو مجلس دہلی نمبر ندیم کے صفحہ ۶ سطر ۱۸ میں خواجہ حسن نظامی صاحب تحریر فرماتے ہیں "سید ظفر نواب صاحب مرحوم"۔ اُردو مجلس دہلی نمبر ندیم کے صفحہ ۱۹ کے سطر ۹ میں مرزا وجیہ الدین خانصاحب وجیہہ دہلوی نے حضرت اسمٰعیل شہید کو "شاہ صاحب ممدوح" لکھا ہے۔ اردو مجلس دہلی نمبر ندیم کے صفحہ ۱۹ سطر ۲۰ میں مرزا وجیہ الدین خانصاحب وجیہہ دہلوی نے "آغا فضل اللہ خانصاحب معاصر بہادر شاہ" کو لکھا ہے۔ اردو مجلس دہلی نمبر ندیم کے صفحہ ۲۰ سطر اول میں مرزا وجیہ الدین خانصاحب وجیہہ دہلوی نے "سید زمان شاہ صاحب دہلوی (ایک مرحوم کو) لکھا ہے۔ اردو مجلس دہلی نمبر ندیم کے صفحہ ۲۰ کے سطر ۱۳ میں مرزا وجیہ الدین خانصاحب وجیہہ دہلوی نے ڈاکٹر مختار احمد صاحب انصاری "تحریر فرمایا ہے۔ اردو مجلس دہلی نمبر ندیم کے صفحہ ۱۷ سطر ۸ و ۹ و ۱۴ و ۱۵ و ۱۶ میں کل مرحومین کے نام کے ساتھ "صاحب" موجود ہے! اردو مجلس دہلی نمبر ندیم کے صفحہ ۲۲ میں مفتی صدر الدین خاں مرحوم اور مولانا محمد علی مرحوم وغیرہ کے اسماء کے ساتھ "صاحب" موجود ہے۔ میر حسن دہلوی اپنے تذکرہ میں شیخ چند بہار کے متعلق لکھتے ہیں از یاران سراج الدین علی خان...

الفقیر بابِ الامیر علٰی نعم الامیر" دوسری طرف "نعم الامیر علٰی باب الفقیر" اور آپ کا مخلص" Yours Sincerely تحریر فرماکر "سر" افراز کرتے ہیں۔ دوسری طرف "نعم الامیر علٰی باب الفقیر" کی عزت بخشنے والے خانوادہ کے چشم و چراغ اردو زبان و ادب کے خادم مخدوم صفت حضرت احسن مرحوم کو "تم" سے مخاطب فرماکر ع قدر دانی عالم بالا معلوم شد "کہنے پر مجبور کرتے ہیں۔ قصور یقینی مرنے والے بزرگ کا تھا۔ بجائے بئس الفقیر علٰی باب الامیر! فاعتبروا یا اولی الابصار! مسلمانوں کے عروج کا وہ بھی ایک زمانہ تھا کہ" امام محمدؒ" کو وضو کے لئے "عباسی شہزادہ امین الرشید" پانی دے رہا ہے۔ جلالت و جبروت کا مجسمہ" خلیفہ ہارون الرشید" دیکھ کر کہتا ہے تو یہ کہتا ہے کہ کیا" امین "کا دوسرا ہاتھ نہیں ہے کہ استاد کا پاؤں بھی دھو سکے! جب جیسے تب تیسے۔

مولوی محمد حسین مرحوم آزاد "صاحب آب حیات" کے "نیرنگ خیال" کی دوسری جلد کو ع نقاش نقش ثانی بہتر کشد ز اول کی عقیدت کیشی نے "نیرنگ تماشا" پایا۔ طاہر صاحب نے افسوس ہے کہ استاد ذوقؔ کے اس نصیحت کو نظر انداز فرمادیا۔ ؎

علم نیرنج سے گر ہووے تو نخلِ نارنج بے مقدر نہ ہو حاصل ثمر خوش لذت

خیال تو کرنا تھا کہ" علم نیرنج" سے "نخلِ نارنج" کو برومند کرنے والا کیسا چاہیئے؟ کون تھا؟ اسکی "یاد داشت" کے اشاروں سے "گلستان بندی" کے لئے "سامری فن سحر کار" کی صلاحیتیں درکار تھیں۔ ع کاندریں راہ فلاں ابن فلاں چیزے نیست! مگر کاتا اور لے دوڑے "کا ذوق بھی عجیب ہوتا ہے۔ "نور چشموں" نے "صاحب نظر" بزرگواروں کے کتنے "اندوختہ زر و جواہر یونہی لٹائے گنوائے۔ افسوس ؎ دلِ بے خوں بدر آور دولے دیدۂ برخیت: اللہ اللہ کہ تلف کردہ کہ اندوختہ بود

حدود کے اندر" خدا" رہ نہیں سکتا تو "بندہ بشر" کی کیا تاب و طاقت کہ ع "جان گھٹ گھٹ کر دوں مرضی مرے صیاد کی ہے" اسی کی جان کو روتا رہے؟ شرع والوں نے لاکھ زور لگائے مگر" ابنائے آدم و بنات حوا" "درون خانہ" اور "ہمت مردانہ" سے "قید و بند" توڑ کر رہے! "قید حیات" "با مشقت" ہی سہی۔ مگر" تار عنکبوت" سے بھی کمزور۔ "زندگی اک شمع روشن ہی ہوا کے سامنے" لہٰذا اس کی کوئی اہمیت ہی نہیں۔ مگر اس پر بھی "راہ آزادی" میں ایک ع "بھاری پتھر تھا چوم کر چھوڑا" کو "ابنائے زمانہ" بھولے بیٹھے ہیں۔ "وہ" پسند اور ناپسند" کی قید ہے اول الذکر کے ہاتھوں "دل والے" پتھر کوٹتے ہیں اور آخر الذکر سے" مہ جبیں" سرکہ پیشانی "ہوکر" مثل قفل ابجد" ع تھا لکھا بات کے بنتے ہی جدا ہو جانا۔ کی" ادا بندی" کی مشق بہم پہونچاتے ہیں یہ" حسن مستور" کو "دعوت نظر" کا جواز دینے والو! ایک "لمحۂ فکریہ" اس طرف بھی۔ "صرف بیجا" ہی سہی مگر لازم ہے کہ" گر ضرورت بود روا باشد" کے قانون حق آسایش" کے رُو سے "حسن برہم" کی عذر داری" جائز ہے یا ناجائز؟

"حسن شباب" کے "ظرفِ عالی" کا کیا کہنا۔ "نصاب حسن" کو "حدِ کمال" پر بتا کر "چشمِ سخنگو" کے کیسے کیسے گرہ گرداتے ہوئے ع "لبش می جنبد و جانے ندارد" طرز کے سوالات کی تبسمِ زیرِ لب کے بجائے "ہنستی ہوئی" نگاہوں سے پذیرائی کرکے "رازداری" کی توثیق فرمانا فن کاری کا "حسنِ کمال" نہیں تو اور کیا ہے؟ اور پھر "حسن نظر" کے خراج کے لئے "قزاقانہ سینہ زوری" ع "دریں شیوہ خود را مسلّم گرفتہ" کی شان سے "خواب و خیال" کا واقعہ بھی ہو تو ع زاہد صد سالہ از مسجد خراب آید بروں! اس پر بھی جب ایک سے "چھپاکر" دوسرے کی "آہن گداز" نگاہیں بول اٹھتی ہیں کہ ؎

کہے دیتی ہیں یہ نیچی نگاہیں — کہ بالائے زمیں کیا کیا نہ ہوگا

تو "بالا بلند سروِ طنّاز" کی نظریں "اچٹتا ہوا جائزہ" لینے کے لئے اٹھتے ہی "زمیں میں گڑ جاتی ہیں" جب بیک آن باپ بیٹوں کی، بھائی بھائی کی، یار دوستوں کی، "حریص نگاہی" ایک ہی "مطالبۂ شوخ" پیش پیش کرتی نظر آتی ہے اور "صنفِ نازک" کو بارگاہ ستار عیوب کی جانب سے بخشے ہوئے "تخلیق" کے "مقدس جذبہ" کا "فشارِ قوی" عرق عرق کر دیتا ہے۔ اس وقت "صاحبِ نظر" محسوس کرتا ہے کہ "عورت" کو "ماں" بننے کا "شرف" کس قدر "عادلانہ انعام الٰہی" ہے! اور "حسن کی پذیرائی" ہر "ابن آدم" کا "موروثی حق" نہ ہوتا تو "ظلم" تھا ؎

اے ترا با ہر دلے رازے دگر — ہر گدا را بر درت نازے دگر

قطعاتِ تاریخ سالِ ارتحال مرشدی و مولائی حضرت قبلہ سید شاہ مظاہر امام منعمی ابو العلائی

(از مولانا ابو سلمان سید شاہ محمد عبد المنان صاحب مظہر میاں بیگھوی)

(۱)

داحسرتا وہ کون جہاں سے گزر گیا — غم کر رہے ہیں جس کا صغیر و کبیر آج
صوفی وہ دل کا صاف مشائخ و شیخ وقت — جس کا نہیں ہے کوئی عدیل و نظیر آج
یعنی جناب قاضی مظاہر امام آہ — ایسے تھے باخبر نہیں جن سا خبیر آج
بادِ اجل سے ہوگیا وہ گل چراغ حق — دامِ الم میں ہم ہوئے کیسے اسیر آج
تاریک کیوں نہ بزم طریقت ہو مظہرا — اوجھل نگاہ سے ہے وہ روشن ضمیر آج
پوچھا جو سالِ مرگ تو ہاتف نے یوں کہا — کل تھا جو نا گزیر وہی ہے گزیر آج
یعنی سرِ جہاں کو قلم کر کے دیکھئے — جنت کی سیر میں ہے وہ کامل فقیر آج

۱۳۶۱ھ

(۲)

چوں برفت از جہاں مظاہر امام — از دم مغموم شد خواص و عوام

[illegible]

ہمارے وکیل صاحب

(از حضرت مانپوری)

(گذشتہ سے پیوستہ)

چونکہ روزانہ صبح کو تقریباً ۸ بجے اپنی آڑھت پر جاتے ہوئے تھوڑی دیر کے لئے بھی وکیل صاحب کے یہاں کی حاضری گویا میرے لئے معمول میں داخل ہوگئی تھی اس لئے ان کی شان وکالت کے دلچسپ مظاہروں سے لطف اندوز ہونے کے اکثر مواقع مجھے ملتے رہے۔ چنانچہ حسب معمول ایک روز جیسے ہی وکیل صاحب کے یہاں پہونچا۔ اس کے دو چار ہی منٹ کے بعد میرے اور وکیل صاحب کے مشترک بے تکلف دوست تقی صاحب ہاتھ میں کچھ کاغذات لئے ہوئے پہونچے، اور آتے ہی انہوں نے بے تکلفانہ انداز میں کہا "اماں کچھ میرے مقدمے کی خبر ہے، مجھے کل یکایک خبر ملی کہ آج ہی اس کی تاریخ ہے۔" اس کا کوئی جواب وکیل صاحب نے نہیں دیا۔ جس موکل سے وہ بات کر رہے تھے۔ اور بھی ساری توجہ اس کی طرف مبذول کر دی۔ تقی صاحب نے ہنسکر کہا "اللہ رے انہماک، یہ وکیلانہ شتر غمزہ ٹھیک نہیں۔ اگر تمہاری غفلت اور بے پرواہی سے مقدمہ خارج ہو گیا تو حضرت، پھر میں ہوں اور آپ!" یہ بے تکلفانہ جملہ کہنا تھا کہ وکیل صاحب نے گردن انکی طرف موڑ کر نہایت ہی روکھے تیور سے فرمایا "شائستگی اور تہذیب سے بات کیجئے۔ یہ وکیل کا آفس ہے۔ کوئی کلب یا آپ کا گھر نہیں، ہنسی اور مذاق کیلئے بھی موقعہ اور محل کی ضرورت ہے۔" خلاف توقع اس بے رخی کے ساتھ اس طرح کے خشک جملے سُنکر تقی صاحب دیر تک کبھی میرا اور کبھی وکیل صاحب کا منہ تکتے رہے۔ یہ سمجھ کر کہ موکل کی موجودگی کے باعث اس وقت شاید اپنے اوپر وکالت طاری کئے ہوئے ہیں۔ تقی صاحب کے کان میں میں نے کہا کہ "اس اجنبی کے جانے کے بعد اپنے مقدمہ کے متعلق بات کرنا مناسب ہے۔" لیکن اس موکل کے رخصت ہو جانے کے بعد بھی تقی صاحب نے حسب دستور بے تعلقی ترک کر کے بجائے موکلانہ لہجہ میں کہا:-

تقی صاحب —— "جناب وکیل صاحب۔ آپ کی کیا رائے ہے۔ آج مہلت کی درخواست دیجائے یا اگر مسل دیکھ کر پہلے سے آپ تیار ہیں تو سوال مہلت کی ضرورت ہی نہیں۔"

وکیل صاحب —— (وکیلانہ تیور کے ساتھ) "اتنے دن سے آپ کہاں تھے۔ آج عین تاریخ کے روز تشریف لائے ہیں اور وہ بھی خالی ہاتھ۔"

تقی صاحب —— "[illegible] تو آپ کی فیس ایک [illegible]

کچھ باقی نہیں رکھا۔ جلدی میں چلے آنے کی وجہ سے فیس کے روپے ساتھ نہ لا سکا۔ گھر جا کر دو تین روز کے اندر بھیج دونگا۔"

وکیل صاحب ۔۔۔۔ "بات اصل یہ ہے کہ میں واقع ہوا ہوں ذرا مروت دار قسم کا آدمی۔ اپنے مخلص دوستوں کا ادھار کام کرنے سے محض اسی بنا پر احتراز کرتا ہوں کہ بقایا فیس کی نالش کرنے کی وجہ سے لوگ کہیں مجھ پر بے مروتی کا الزام نہ لگا دیں۔ اس لیے اگر مجھ سے کام لینا ہے تو بقایا دیکھئے امت رہنے دیجئے۔"

تقی صاحب ۔۔۔۔ "اب اس وقت روپے کا کہاں سے سامان کروں۔ اتنی پرانی ملاقات اور دوستانہ راہ و رسم کے باوجود دو روز کے لیے بھی آپ میرا اعتبار کرنے کے لیے تیار نہیں۔ اگرچہ ایسے بھلے پہچانے وکیلوں کی کمی نہیں۔ جو رعایتی فیس کے ساتھ اور اس میں بھی نقد کی قید نہیں۔ نہایت خوشی سے میرا کام کر سکتے ہیں مگر اب اتنا وقت کہاں کہ دو گھنٹے کے اندر مسل کے کل کاغذات دکھا کر تیار کر سکوں۔"

وکیل صاحب ۔۔۔۔ "جی ہاں! ایسی نرم پولیسی والے وکیلوں نے موکلوں کی عادت بگاڑ دی ہے، جہاں کوئی عزیز یا رشتہ دار مدعی یا مدعی علیہ کی حیثیت سے ہو گیا۔ بلا فیس، بلا عذر کام کرنے کو تیار۔ اور یہی نہیں بلکہ تا دوران مقدمہ اپنے رشتہ دار موکل کے نان نفقہ کی بھی کفالت اپنے ذمہ لے لی۔ کوئی دوست یا ملاقاتی ہو گیا رعایتی نصف فیس کو ہر چہ از دوست میرسد نیکو است کہہ کر قبول کر لیا۔ رشتہ دار اور دوست کا کیا ذکر کسی ناز رسیدہ مظلوم ستم رسیدہ موکل نے اپنی داستان غم سنائی اور فیس ایک دم معاف۔ اور صرف معاف ہی نہیں بلکہ اپنے پاس سے ٹکٹ اور نقل کے دام دیکر مفتیہ وکیل بن گئے ایسی ہی بے اصول اور کمزور دل والے وکیلوں نے بلاوجہ رعایت اور مروت سے وکالت جیسے معزز شعبہ کی قدر و قیمت گھٹا دی۔ خیر عزیز رشتہ دار مخلص دوست تو ایک بات ہوئی۔ کبھی ہم پیشہ وکیل پر کوئی نالش ہوئی تو اس سے فیس لینا تو درکنار اس کے مخالف سے بھی فیس لیکر خلاف کام کرنے پر راضی نہیں۔ آئے ہوئے فیس کو ٹھکرا کر واپس کر دینا آپ ہی کہیے کفران نعمت قسم کی بات ہوئی یا نہیں۔ پیشہ میں صرف "لفظ ہم" کا طرہ لگ جانے کی وجہ سے ہم پیشہ وکیل کے ساتھ منت والا معاملہ ہے۔ تو اسی اصول کے مطابق ہم خواب ہم صحبت، ہم بستر وغیرہ کی فیس بھی فری شپ میں داخل ہونے کے لائق ہے، تو جناب اس قسم کی رعایت و مروت کی لغویات کی مجھ سے امید رکھنا نور ایک طرح کا لغو خیال ہے۔ اس لیے اگر مجھ سے کام لینا ہے تو بس کیا خوب سودا نقد ہے اس ہاتھ دے اس ہاتھ سے کام لے۔ باقی رہی دوستی، محبت و خلوص، تو دوستانہ تعلقات اپنی جگہ پر اور وکالت اپنی جگہ پر۔ خلاف توقع وکیل صاحب کی اس بے مروتی اور بے رخی کو دیکھ کر تقی صاحب کا غصہ اور ساتھ ہی ساتھ ان کی بے بسی اس وقت دیکھنے کی چیز تھی، میں نے تقی صاحب سے کہا۔ تردد کی کیا بات ہے۔ میرے ساتھ چل کر فیس کے روپے میری دوکان سے لے آئیے۔ اسی غرض سے جب ہم دونوں ان کے آفس سے باہر نکلے، تو تقی نے غصہ کے لہجہ میں کہا دیکھا اس بے مروت طوطا چشم کی خود غرضی کو

ہم لوگوں کی کوششوں کی بدولت ذرا وکالت کیا چلی اخلاق و مروت محبت و خلوص سب غائب تب بھی کام میں نے لیا نہیں۔ ایک مخلص دوست سمجھ کر یہ امید دل میں لئے ہوئے میں پہونچا تھا کہ فیس تو اپنی جگہ پر ہے، کم سے کم یہ حضرت اخلاق سے پیش آئیں گے، اور مقدمہ کا کام ذرا جی لگا کر کریں گے۔ مگر اس نے تو ایسی آنکھ بدل دی، جیسے کبھی کی ملاقات ہی نہ ہو۔ میں نے ان کا غصہ دھیما کرنے کے خیال سے مزاحیہ انداز میں کہا کہ "اپنی ناتجربہ کاری اور حماقت کا احساس تو آپ کو ہے ہی نہیں اور غریب وکیل صاحب پر لگاتے ہیں الزام۔ چلے ہیں آپ معتقد ارادت اور ترقی پسند ہونا وکیلوں کے یہاں کے آداب مجلس سے واقفیت تک نہیں۔ اس بارگاہ وکالت میں حاضری کی پہلی شرط یہ ہے کہ آدمی عزیزداری، رشتہ مندی، دوستی کے مراسم و روابط کو ایک دم دماغ سے نکال کر ہر طرح کے تعلقات خصوصی کی آلائشوں سے دل کو پاک صاف کرکے موکلانہ یعنی فدویانہ و نیازمندانہ حیثیت سے مودب ہوکر نذرانہ پیش کرنے کے بعد نہایت خشوع و خضوع کے ساتھ اپنی دلی مراد زبان پر لائے۔ تو جناب ایسی بارگاہ وکالت میں جہاں پہونچ کر موکل کے سوا آدمی کی اور کوئی حیثیت نہیں رہتی۔ وہاں آپ گئے تھے وکیل صاحب سے دوستانہ بے تکلفی برتنے، اور خاص کر ان کے آفس ٹائم یعنی عین وکالت طاری ہونے کے اوقات میں جبکہ "لے زر تو [illegible]! نہی ولیکن بخدا [illegible]" کے زریں نظریہ کے مطابق قاضی الحاجات و ستار عیوب کے سوا ساری دنیا نظروں میں ہیچ ہو۔ ایسے موقع پر کوئی دوستانہ مراسم یا خاندانی تعلقات کا یہ جتلاتے ہوئے کہ اندریں راہ فلاں ابن فلاں چیزے نیست، بے موقع ذکر چھیڑ دے۔ اور اس گستاخی کے سبب اگر وہ لائق توجہ نہ سمجھا جائے تو غصہ ہونے کی کوئی وجہ نہیں۔"

اس پرلطف صوفیانہ دلائل پر غصہ ہونے کے بجائے مسکرا کر تقی صاحب نے بھی اسی انداز میں کہا کہ واقعی مجھ سے بڑی بھاری گستاخی ہوئی، مگر ہمارے وکیل صاحب کو تو وکالت جسے گون کہتے ہیں، زیب تن کئے ابھی چند ہی سال ہوئے ہیں اس قلیل عرصہ کی ریاضت میں تو ابھی مقام خودی پر پہونچے بھی نہیں، صرف دو چار مریدان عدالت کو اپنے گرد دیکھ کر قبل از وقت مقام لاہوت میں پہونچ گئے۔ اس کا جواب ہیں میں نے بھی مسکرا کر کہا کہ گرچہ ابھی وکیل صاحب اس درجہ پر نہیں پہونچے اور ابھی تک "لے زر تو خدائی ولیکن بخدا" کے منزل میں ہیں، مگر جلد از جلد اس دوری کو مٹا کر فنا فی الاموال کی انتہائی منزل پر پہونچنے کی کوشش کر رہے ہیں۔ غرض اسی طرح کی دلچسپ باتیں راہ میں کرتے ہوئے آڑھت میں ہم دونوں پہونچے۔ اور وکیل صاحب کی فیس کے روپے لیکر جب تقی چلے تو تقی نے چلتے وقت مسکرا کر کہا "اور سب کچھ سہی مگر دوستی اپنی جگہ پر اور وکالت اپنی جگہ کا فلسفہ میری سمجھ میں نہیں آیا۔ کیا یہ ممکن ہے کہ دوستانہ تعلقات کا معاملات پر اثر نہ پڑے۔" میں نے کہا محض ٹالنے کے لئے یہ بات انہوں نے کہہ دی۔ ورنہ عملی دنیا میں دوستی اپنی جگہ پر کے کوئی معنی نہیں۔ اور واقعی اس وقت تک میں بھی یہی سمجھے ہوئے تھا کہ یہ بے معنی جملہ محض دفع الوقتی کیلئے کہہ دیا گیا ہے۔"

لیکن اس کے ایک ہی ہفتہ کے بعد ہمارے وکیل صاحب

نے فوجداری کے ایک مقدمہ میں میرے خلاف وکیل ہونے کے ساتھ میرے پھنسانے کے لئے ایڑی چوٹی کا انتہائی زور لگا کر دوستی اپنی جگہہ پر اور پیشۂ وکالت اپنی جگہ پر کے اپنے زریں اصول کو اس طرح عملاً ثابت کر دیا کہ مجھے تو ان کے کیریکٹر کی پختگی اور ان کی اخلاقی جرأت کا قائل ہی ہو جانا پڑا۔ وہ تو اتفاق سے اطلاع اوّل اور نالشی درخواست میں اختلاف پڑ جانے کے باعث مجھے جیل کی سشر فیابی سے محروم رہ جانا پڑا۔ مگر اس میں ہمارے وکیل صاحب کا قصور کیا، انہوں نے اپنی دانستہ کوئی کسر نہیں اٹھا رکھی

اس فوجداری کے مقدمہ میں میرے حسب خواہ فیصلہ ہو جانے پر اسی روز شام کو جب احباب کی کافی تعداد مبارکباد دینے کی غرض سے میرے گھر پر جمع ہو گئی اور ان میں سے بعض منچلوں نے ہمارے وکیل صاحب کی دوستانہ روش کا ذکر کرتے ہوئے میری سادہ لوحی کا تمسخر اڑانا شروع کیا تو میں نے بھی اپنی خفت مٹانے کی غرض سے اسی رنگ میں وکیل صاحب کی طرف سے ڈیفنس کا پہلو اختیار کر کے ہر ایک کو جواب دینا شروع کر دیا۔

"۔۔۔۔۔ "کہئے آپ کے دوست وکیل صاحب نے تو آپ کے جیل ہی بھیجنے کا سامان کیا تھا"

میں ۔۔۔۔۔ "کیس ہی تھا جیل کی سزا کا تو بیچارے پھانسی کا دفعہ اس میں کیسے لگا دیتے"

"۔۔۔۔۔ "مدعی نے تو صرف آپ کے ملازم ہی کو اطلاع اوّل میں مدعا علیہ بنوایا تھا۔ مگر سنا ہے کہ آپ کے وکیل صاحب کے مشورہ سے حکم دہندہ کی حیثیت سے آپ کا نام بھی مدعا علیہم میں داخل کر دیا گیا"

میں ۔۔۔۔۔ "وکیل کا تو یہ فرض ہی ہے کہ موکل اپنی غلطی سے یا غیر ضروری سمجھ کر کوئی بات چھوڑ دے تو مقدمہ کو زوردار بنانے کے لئے اپنی طرف سے جو چاہے گھٹا بڑھا دے۔"

"۔۔۔۔۔ "دوستانہ تعلقات کا تو تقاضا یہ تھا کہ اس مقدمہ میں آپ کی طرف سے کام کرتے"

میں ۔۔۔۔۔ "ایک طرف دوستی کا تقاضہ، دوسرے جانب وکالت کا تقاضہ، ان دونوں تقاضوں میں جس میں زیادہ نقدی وصولی کی امید ہوتی ہے اسی پر آدمی زیادہ زور دیتا ہے"

"۔۔۔۔۔ "تو آپ بھی شاید مفت کام ان سے نہیں لیتے، اس پر یہ دوستانہ مراسم"

میں ۔۔۔۔۔ "دوستانہ مراسم اور موکلانہ مراسم میں زمین و آسمان کا فرق ہے۔ مدعی کی مقدمہ بازی کی بدولت بیچارے کو سالانہ ہزاروں کی رقم وصول ہوتی رہتی ہے اور میں پرانا دوست ہی، مگر سال دو سال میں مجھ سے شاید ہی ایک دو فیس ملتی ہو۔ آپ ہی انصاف کیجئے کہ نقدی زرخیز تختہ کے مقابلہ میں قدیم پڑتی کی طرف کون توجہ کریگا۔"

"۔۔۔۔۔ "آخر دوستی کا بھی تو کوئی حق ہے"

میں "آجکل اپنے بھائیوں اور عزیزوں کے شرعی حق کا تو کوئی خیال ہی نہیں کرتا۔ اور پرانے زمانہ کے تمادی شدہ حق دوستی کو لئے پھر رہے ہیں، اور پھر دوستی اور وکالت کا ایکدم علیحدہ اپنی اپنی جگہ رہنے کے باعث حق شفعہ بھی تو نہیں پیدا ہوتا۔"

"۔۔۔۔۔ "اب میں سمجھا، آپ کی اور آپ کے وکیل صاحب کی دوستی شاید ایسی ہے کہ یار یار ہے، اپنی اپنی جگہ سے

...انچ بھی نہیں کھسک سکتی ۔"

——"صحیح آپ نے سمجھا ، اگر ہم دونوں کی دوستی اپنی جگہ سے ذرا بھی ہٹی تو دوستی کی پوری عمارت ہی زمیں دوز ہو کر رہ جائے ۔"

——"اس مقدمہ میں اگر آپ کی طرف سے کام نہ کرتے تو کم از کم نیوٹرل ہی رہتے ۔"

——"اس کے یہ معنی ہوئے کہ دونوں جانب سے محروم رہیں ۔"

——"تو کچھ بیچ میں پڑ کر تصفیہ ہی کرا دیتے ۔"

——"اور اتنے دنوں تک جو مقدمہ چلا اس کی فیس کون دیتا ۔"

——"تو صرف فیس کے واسطے دوستانہ مروت و اخلاق پر پانی پھیر دیا گیا ۔"

——"یوں اور جو کچھ ان پر آپ اعتراض کریں بے مروتی اور بد خلقی کا ان پر آپ الزام عائد نہیں کر سکتے کیونکہ بات یہ ہے کہ اخلاق برتنے کے لائق آدمی ہونا چاہئے ۔ ہر ایرے غیرے کے ساتھ خلق و مروت کر کے اپنی اخلاقی قوت کو ضائع کرنا بھی ٹھیک نہیں ۔ کوئی ذی حیثیت ڈبل اسامی قسم کا موکل پہونچ جائے پھر دیکھیئے ہمارے وکیل صاحب کا حسن اخلاق اور ... ان کی وسیع الاخلاقی کا ثبوت اس سے بڑھ کر کیا مل سکتا ہے کہ جہاں کسی صاحب حیثیت اور ذی ... موکل کے نہ کام کی ... چاہے کسی عزیز ... نانی کا جنازہ سامنے آ گیا ہے ... کی زیادت کو پہونچا نہ ...

——"ذرا ان کے خساست اور بخالت کی بھی لگے ہاتھ توضیح فرما دیجئے کہ آج تک کسی قومی مذہبی تعلیمی ... میں کوئی امدادی رقم کیوں نہیں دی ۔"

میں ——"لاحول ولا بخالت سے ہمارے وکیل صاحب کو کیا سروکار ۔ قومیات ، مذہبیات کی مد میں اگر چندے نہیں دیتے تو حکام کی آفریحات ، کارپردازوں کی فرمائشات نفع بخش موکلوں کی خاطر مدارات میں اس سے کہیں زیادہ رقم خرچ کرتے رہتے ہیں ۔ اسلئے خساست اور بخالت کا تو سوال ہی نہیں پیدا ہوتا ۔ باقی رہے قومی اور مذہبی ضروریات ، تو ان کے چندوں کا اجر مرنے کے بعد خدا جانے کب ملے گا اور آپ جانتے ہیں کہ ہمارے وکیل صاحب فیس کی طرح کسی معاملہ کو ادھار پر چھوڑتے نہیں ۔ کیا خوب سودا نقد ہے اس ہاتھ دے اس ہاتھ لے کے اصول پر تاہلی اندکر قسم کے کاموں میں کافی رقم صرف کرتے رہتے ہیں ۔ اس کے علاوہ ان نکتہ چینیوں کی انہیں پرواہ بھی نہیں ۔ لوگوں کے اعتراضات اپنی جگہ پر ۔ اور ان کے خیالات اور عادات اپنی جگہ پر ۔ چائے کے دور کے ساتھ دیر تک دلچسپ گفتگو ہوتی رہی مغرب کے وقت جب سب رخصت ہونے لگے تو میں نے کہا یہاں نہیں ۔ بس اس پر خلوص مبارک باد کا شکریہ آپ لوگوں میں سے ہر ایک کے گھر پہونچکر ادا کرونگا ۔ اس پر بھائی نیس صاحب نے ہنسکر کہا کہ آپ کے آنے جانے کی کوئی ضرورت نہیں اپنے وکیل صاحب کے اصول کے مطابق آپ اور ہم لوگ دونوں اپنی اپنی جگہ ہی پر رہیں تو زیادہ مناسب ہے ۔ آخر میں چلنے کے وقت میں نے ہنسکر کہا ۔ خیر اب تو آپ لوگوں کو معلوم ہو گیا ہوگا کہ ... آپ ... کیسے ... "

ماہنامہ

"ہمارے قاضی جی"

(از حضرت اللہ پوری)

مجلس میں مرثیہ خواں۔ محفل میں طوائف۔ عرس میں قوال۔ کانفرنس میں صدر۔ نماز میں پیش امام۔ کتھا میں پنڈت۔ وعظ میں قبلہ مولانا کی حیثیت جیسی مسلمہ ہے۔ ویسے ہی "نوشاہ" اور "دلہن" کے علاوہ "قاضی جی" کی ہستی شادی کا ایک جزو لاینفک ہے۔ یہ "پُراسرار" ہستی عموماً رنگین عبا۔ بوٹے دار قبا اور سبز عمامہ کی ایک بندھی بندھائی گٹھڑی سے عبارت کی جاتی ہے جو محفلِ عقد میں اکثر "نوشہ" سے زیادہ خاموش اور سنجیدہ مُنہ پہ رومال رکھے ہوئے نظر آتی ہے۔ اور جس کی دنبالہ دار سُرمہ آلود آنکھوں کی خاموشی بزبان حال یہ کہتی ہوئی معلوم ہوتی ہے کہ اگرچہ ہم آئے ہیں نوشہ کا عقد پڑھنے کو لیکن اگر خود ہمیں کسی سے "منعقد" کر دیا جائے تو داڑھی پر ہاتھ پھیر کر کم از کم ایک بار تو ضرور کہہ دیں گے "جزاک اللہ خیرا"۔

تو ہمارے قاضی جی علیہ الرحمتہ بھی اسی قبیلہ کے ایک معزز فرد ہیں لحیم و شحیم ساکھو کے لٹھے کی طرح۔ آدمی کے آدمی دیو کے دیو۔ داڑھی اور توند میں دوڑ کا مقابلہ۔ لیکن حالت یہ کہ داڑھی توند مبارک کی آرزوئے وصل میں اگر ایک انچ آگے بڑھی تو توند نے انتہائی بے نیازی سے جو پھلانگ لگائی تو یہ لیجئے تین انچ آگے بڑھ گئی اور داڑھی انتہائی یاس میں یہ شعر پڑھتی رہ گئی۔

ابھی کیا تھا تصور ہی اس کے چھونے کا بلند ہو گئی دیوارِ "توند" قاضی کی

سفید براق داڑھی۔ کالے کوئلے سا چہرہ "چلئے اب دونوں وقت ملتے ہیں" کی مکمل تشریح۔ بازاروں میں اکثر آدھی کا "جھلجھل" کُرتا۔ کم از کم پانچ گز کا ڈھیلے دار پائجامہ۔ سر پر چوگوشیہ کامدار ٹوپی۔ پیر میں زری کا سلیم شاہی جوتا پہنے ہوئے دیکھے جاتے ہیں۔ دُور سے ایسا معلوم ہوتا ہے جیسے کپڑوں کا چلتا پھرتا پارسل جا رہا ہے۔ کالے کالے ہاتھ اور مُنہ ایسے معلوم ہوتے ہیں جیسے کپڑوں کے پارسل پر کہیں کہیں مال گاڑی کی کالک لگ گئی ہے اور کہیں لگ کر زیادہ پھیل گئی ہے۔

لیکن اگر قاضی جی کو قاضی جی کی طرح دیکھنا ہو تو بس کسی برات ہی میں دیکھئے۔ وہاں وہ صرف قاضی ہیں اور بس۔ وہی امتیازی شانِ قاضی۔ وہی رنگین عبا۔ وہی گلدار قبا اور دھانی عمامہ۔ "نوشہ" کے سامنے تن کر یوں بیٹھتے ہیں کہ نووارد سمجھے کہ "نوشہ" کے "والدِ محترم" آپ کے سوا دوسرا ہو ہی نہیں سکتا۔ لیکن خاموش متین اور سنجیدہ ایسے کہ گویا "نوشہ سے کہہ رہے ہوں۔ ع من ترا نوشہ بگویم تو مرا نوشہ بگو

اور جب تک کم از کم دس مرتبہ صیغۂ عقد پڑھنے کو نہ کہا جائے آپ اپنی زبانِ معجز بیان" کی اعجاز بیانی کو کسرِ شان سمجھتے ہیں۔ عربی اور فارسی کے جید عالم ہونے کا دعویٰ ببانگ دہل ہے۔ لیکن خطبۂ نکاح "اردو" ہی میں عنایت فرمایا جاتا ہے۔ آپ نے اردو میں خطبہ دینے کی تشریح ایک تقریب میں یوں فرمائی تھی :۔

" یا ایھا الناس۔ زمانہ ترقی پذیر ہے۔ ترکوں نے قرآن اور نماز ترکی زبان میں پڑھنا جائز قرار دیا ہے تو وہ ہیں ہمارے خلیفۃ المسلمین۔ ان کی پیروی ہم پر اسی طرح واجب و لازم ہے۔ جیسے جرمنی کو برطانیہ کی۔ جاپان کو چین کی۔ مسلم لیگ کو گاندھی جی کی اور کانگریس کو مسٹر جناح کی۔ اور یہ تو کوئی بتائے اگر میں عربی کا ایک خطبہ پڑھ دوں تو تم سمجھو گے کیا۔ اس سے بہتر تو یہ ہے کہ ہم دولہا سے کہیں کہ ؎

ببول کی ڈالی۔ گلاب کا پھول　　کہو نکاح ۔۔۔ ۔۔۔ ہوا قبول

اور چلئے قصہ طے ہے۔ وغیرہ وغیرہ "

وجہ کی معقولیت اور غیر معقولیت سے کوئی بحث نہیں۔ کیونکہ یارانِ سرِپل کو بخوبی معلوم ہے کہ عربی تو عربی آپ کو فارسی کی "دُم" کی بھی خبر نہیں، اور اردو کا ڈھونگ محض نقابِ کم مائگی ہے۔

خوش قسمتی یا بدقسمتی سے ایک ایسی ہی برات میں راقم الحروف کو بھی شریک ہونا پڑا۔ ہمارے ایک کرم فرما خانصاحب کے فرزند ارجمند کی شادی خانہ آبادی تھی۔ نکاح رانچی سے تین میل پر ایک بستی میں لڑکی والوں کے گھر ہونا قرار پایا تھا۔ ہم جانے پر تیار نہ تھے، اسلئے کہ دفتر صبح کے ۶½ بجے جانا ہوتا ہے۔ مگر خانصاحب اور سمدھی صاحب نے یقین ہی بلکہ حق الیقین دلایا کہ عقد ٹھیک ساڑھے چھ بجے "پڑھایا" جائیگا۔ اور عقد کے بعد فوراً "خوردن و برخواستن" کے منازل طے ہو جائیں گے۔ چنانچہ ۶½ بجے شام ہوتے ہوتے ہم براتیوں کے ساتھ "دلہن والوں" کے سر پر نازل ہو گئے۔ ایمان کی تو یہ ہے کہ لڑکی والوں نے نوشہ کے لئے آنکھیں فرش کر دیں اور وہ وہ ناز اٹھائے کہ ہم پر باوجود اس پیرانہ سالی کے پھر "اس زمانہ کا نوشہ" بننے کا خبط ایسا سوار ہوا ہے کہ نیتِ شب بخیر .... ۔۔ دوسری بات ہے کہ ایسی حالت میں نئی بیگم صاحبہ ہمارے" گالوں کے اور پرانی محترمہ" ہمارے "بالوں" کے درپے ہوں گی۔

ہاں تو خیر۔ شامیانہ جہاں عقد کا سامان کیا گیا تھا کھچ کھچ براتیوں۔ سراتیوں اور تماشائیوں سے بھرا ہوا تھا۔ تل رکھنے کی جگہ نہ تھی۔ ساڑھے سات، ساڑھے آٹھ بج گئے۔ لیکن عقد ہونے ہی کو نہیں آتا۔ براتیوں میں گھبراہٹ سی پھیلی۔ ہم نے قبلہ سمدھی صاحب سے دست بستہ کہا "خان صاحب! اس کار خیر میں استخارہ کیا دیکھا جا رہا ہے" انہوں نے منہ بسور کر کہا "میاں ابھی تک قاضی جی تشریف نہیں لائے" ہم نے عرض کی "کیا خبر نہیں دی تھی آپ نے" کہنے لگے "اجی۔ دن میں تو تین مرتبہ میں خود التجا کر آیا تھا۔ اور نوکر تو

دس روز سے روز یاد دہانی کرا آتا ہے۔" ہم نے کہا "تو پھر بھیجیے نا کسی کو۔ ایسا نہ ہو کہ جمی جمائی محفل اکھڑ جائے۔" سمدھی صاحب بوکھلائے ہوئے شامیانہ سے نکلے اور چار نوکر قاضی صاحب کو "فوراً سے پیشتر" لانے کے واسطے روانہ کر دیئے۔ قاضی صاحب کا مکان بھی نیرے وہاں سے دو میل پر تھا۔ قریب دس بجے نوکر "خالی ہاتھ" واپس آئے اور بیان کیا "قاضی صاحب شہر گئے ہیں۔ لیکن نوکر سے کہتے گئے ہیں کہ خاں صاحب کے یہاں نکاح پڑھانے ضرور جائیں گے۔" مجمع میں چہ میگوئیاں ہونے لگیں اور آخر کار صدائیں آنے لگیں۔" اس قاضی پاجی کو چھوڑو۔ کیا دوسرا قاضی نہیں ملتا؟ یہ قاضی جی ہمیشہ یوں ہی نخرے کیا کرتے ہیں۔" وغیرہ وغیرہ۔ اوروں نے دیکھا یا نہیں۔ لیکن ہم نے دیکھا اور بغور دیکھا کہ "میاں نوشہ" بھی اضطراب میں پہلو بدلنے لگے، ماتھے پر پسینہ آگیا۔ ہم نے فی البدیہہ یہ شعر پڑھا۔ ؎

اس بدنصیب نوشہ کی حسرت پہ روئیے
دلہن کے گھر پہ جا کے نہ قاضی ملے جسے

قبلہ سمدھی صاحب سراسیمہ و حیران و پریشان کبھی شامیانہ کے اندر کبھی باہر، نوکر شہر کی طرف دوڑائے گئے۔ اور مجمع بے قابو ہو رہا تھا۔ "صبح کی کچہری ہے صاحب۔" "ہم لوگ اب اٹھ جائیں گے۔" "ایسی برات کی ایسی تیسی۔" یکایک سمدھی صاحب کی نظر شامیانہ کے ایک گوشہ تک گئی۔ دیکھا کہ زبدۃ الحکما حکیم........ مولوی فاضل جلوہ افروز ہیں۔ بس دوڑ کر حکیم صاحب کا دامن تھام کر کہنے لگے۔ "حکیم صاحب خدا کے لئے عزت بچائیے صیغۂ نکاح پڑھ دیجیئے۔" حکیم جی نے جواب دیا۔ "لیکن میرے پاس کتاب تو نہیں ہے۔" سمدھی صاحب نے کہا "آپ نوشہ کے قریب چل کر بیٹھیے تاکہ لوگوں کو تسکین ہو جائے، جب تک میں کتاب قاضی جی کے یہاں سے منگوائے دیتا ہوں۔" حکیم جی اٹھ کھڑے ہوئے اور ہمیں انہیں "بہیئت مجموعی" دیکھنے کا موقعہ ملا۔ دبلے پتلے۔ لمبے سے آدمی۔ اس جلدی سے اٹھے کہ معلوم ہوا جیسے کسی نے اسپرنگ سے کھڑا کر دیا ہو۔ نہایت ہی کم رو۔ خال و خط حقیر۔ گالوں پر چاہِ ذقن کا دھوکا ہو سکتا تھا۔ آنکھیں بدکار کی قبر کی طرح دھنسی ہوئی۔ داڑھی کے بال ترش کر یوں معلوم ہوتے تھے جیسے آشیانے میں تنکے۔ اب حکیم جی چلے۔ صدائیں بلند ہوئیں۔ "حکیم لکڑی" "صاحب ذرا جلدی کیجیئے گا۔" "دو بول تو پڑھ دینے ہیں۔" وغیرہ وغیرہ۔ حکیم صاحب کی چال میں غضب کی لچک تھی۔ اور ہمیں تو ایسا معلوم ہوتا تھا کہ یہ خود نہیں چل رہے ہیں بلکہ ہڈیوں کے اس ڈھانچے کو وہ صدا دینے والے تار کھینچ کھینچ کر چلا رہے ہیں۔ آخر کار حکیم صاحب نوشہ کے قریب پہنچ گئے۔ اور مدِ مقابل ہو بیٹھے۔ لیکن مشکل یہ تھی کہ نکاح ہو تو کیسے۔ "قاعدہ بغدادی" تو بس قاضی جی ہی کے یہاں مل سکتا تھا۔ اور نوکر ابھی تک واپس نہیں آئے تھے۔ مجمع اب نسبتاً خاموش تھا کہ ناگاہ اک شور ہوا "آگیا آگیا۔" "وہ چلا آ رہا ہے۔" "کمبخت نے اتنی دیر کیوں کی؟" ہم نے سمجھا نوکر کتاب لیکر آگیا۔ حکیم صاحب سے کہا "بسم اللہ" حکیم صاحب نے بھی پہلو

بدلا - بند قبا درست کئے - دوزانو ہو کر اسی طرف دیکھنے لگے جدھر سے صدائیں آرہی تھیں - ہم بھی "ہمہ تن چشم" ہو کر متوجہ ہو گئے کہ مجمع نے راستہ دینا شروع کیا - اب جو دیکھتے ہیں تو جناب معلی القاب قاضی ... علیہ الرحمۃ بمعہ شانِ امتیازی بلامبالغہ لڑھکتے چلے آرہے ہیں اور آدمیوں کا سمندر اس سیاہ فام سفید پوش جہاز کے لئے راستہ دیئے جارہا ہے - لیکن قاضی جی نے نہ ادھر دیکھا نہ اُدھر - سیدھے نوشہ کے پاس جا دھمکے - حکیم صاحب پر نظر پڑتے ہی آپ نے سمدھی صاحب کو جو فدویانہ دست بستہ کھڑے تھے بنگاہِ غضب دیکھا - انہوں نے ملتجیانہ انداز میں کہا "حضور کے آنے میں جو دیر ہوئی تو ان کو "تھوڑی دیر" کے لئے قاضی بنا دیا گیا تھا" اب قاضی جی سونٹا ہاتھ میں، غصہ بات بات میں - ابروؤں پر بل ماتھے پر شکن حکیم صاحب کی طرف مڑے - اور کہا "اُغاہ! حکیم جی - تم اور قاضی - چہ خوش! ع "چہ داند بوزنہ لذات ادرک"۔ حکیم صاحب تو نگاہ خشمگین دیکھتے ہی مرحوم ہونے کے قریب ہو گئے - نہایت آہستگی سے پیچھے کھسکنے لگے - گویا روس کے مقابلہ سے جرمن فوجیں ہٹ رہی تھیں - لیکن ان کی آنکھیں ہمیں کبھی نہ بھولیں گی ، وہ آنکھیں جو بزبانِ بے زبانی کہہ رہی تھیں کہ واہ واہ یہ کیا بات ہے کہ ع من ترا قاضی بگویم تو مرا گوئی حکیم -

حکیم جی تو قطرۂ آب کی طرح انسانوں کے سمندر میں یوں جذب ہوئے کہ ہم نے پھر انہیں کبھی نہیں دیکھا - اب قاضی صاحب سنبھل کر بیٹھے - ریش مقدس پر ہاتھ پھیر پھیر کر نوشہ اور ان کے والد محترم کو اُن للچائی نظروں سے دیکھنے لگے جن سے مارواڑی مہاجن قرضخواہ کو دیکھتا ہے - پھر آوازیں آنے لگیں "اب کس کا انتظار ہے؟" "عقد ہوتا کیوں نہیں؟" قاضی جی نے "دستارِ فضیلت" فخریہ کج کی - سونٹے کے سہارے کھڑے ہوئے اور یوں بزبانِ اُردو "خطبۂ باری" فرمانے لگے :-

قاضی جی کا خطبہ (نقلِ کفر کفر نہ باشد)

اَعُوْذُ بِاللّٰہِ وَالْحَمْدُ لِلّٰہِ ... ... وَسَلِّمُوْا تَسْلِیْمًا

اَمَّا بَعْدُ - یَا اَیُّھَا الْحَاضِرِیْنَ - آج کی "صحبت" میں میں مسئلہ شادی شرعی پر گفتگو کیا چاہتا ہوں - اسلام ایک سوشل مذہب ہے ، اسلئے اس کے اصول سماجی اصلاحوں پر مبنی ہیں - میں نفس مطلب سے ہٹ گیا ــــ بہرکیف جس وقت سے میں اس جلسہ میں آیا ہوں ، دیکھ رہا ہوں کہ اشارے ہو رہے ہیں ، اور سُن رہا ہوں کہ لوگ کہہ رہے ہیں کہ قاضی جی یعنی این جانب کی وجہ سے مفت وقت ضائع ہوا - یا معاشر المسلمین - اسلامی شادی میں تو قاضی کی ضرورت ہی نہیں - شادی شرع میں ایک معاہدہ ہے - دولہن والے دولہا سے کہتے ہیں کہ بالعوض مبلغ ... ... ہم نے لڑکی زوجیت میں دی - اور دولہا اسے قبول کر لیتا ہے - لیجئے شادی ہو گئی - یہ کارِ خیر تو بغیر اس خاکسار کے بھی انجام پا سکتا تھا - آپ لوگ مسئلہ تو جانتے نہیں - مفت کا الزام قاضی کے سر - چہ خوش

ع " خود فراموشی کند تہمت دہد استاد را " کہنے کا مطلب یہ ہے کہ اگر صرف دلہا دلہن آپس میں ایجاب وقبول کریں تو عقد ہو جائے گا۔ نہ گواہ کی ضرورت اور نہ قاضی کی حاجت۔ گویا اسلامی شادی "چچا سعدی" کے " قول گلستان " کے مطابق "میاں بیوی راضی تو کیا کریں گے قاضی " کی سچی تصویر ہے۔ لیکن خدا کیلئے یہ نہ سمجھ لیا جائے کہ ہم قاضیوں کا وجود بالکل بیکار ہے۔ رجسٹری آفس میں جاکر دیکھ لیجئے۔ ہزاروں لاکھوں روپے کا کاغذ داخل کیا جاتا ہے۔ لیکن جب تک محکمۂ رجسٹری کی مہر نہ ہو وہ کاغذ عدالت میں پیش نہیں کیا جاتا۔ اُسی طرح ہم قاضی عدالت رب جلشانہ ہیں۔ نکاح صحیح تو ہو گا ضرور لیکن اللہ میاں کے یہاں فرشتے بغیر ہماری "مہر" کے پیش نہ ہونے دیں گے۔ چنانچہ اسی لئے حضرت عبداللہ ابن عباس رضؓ سے صحیح مسلم و بخاری میں آیا ہے کہ فرمایا رسول اللہ نے کہ جب تک قاضی کو اتنے سکے نہ مل جائیں کہ وہ خوش ہو جائے، اُس وقت تک نکاح زمین و آسمان کے درمیان معلق رہتا ہے ...... "

چچا سعدی تک تو خیر۔ مگر ہمارا خون اس صریح غلط روایت اور حوالہ سے کھولنے لگا۔ مجمع میں بھی مخالفت کی لہر دوڑتی معلوم ہوئی۔ قاضی صاحب نے تقریر جاری رکھتے ہوئے فرمایا ـــ " تو ہماری مہر اسلامی سلطنت چلے جانے کے بعد کھو گئی، اسلئے ہم سکہ رائج الوقت سے مہر دیتے ہیں۔ یہ وہی سکے ہیں جو ہمیں نذر دیئے جاتے ہیں۔ سکوں کی جتنی مہریں زیادہ ہوتی ہیں اتنے ہی زیادہ فرشتے نکاح کی خبر کا دامن تھام لیتے ہیں، اور جتنے فرشتے زیادہ ہوتے ہیں اتنی ہی عجلت سے " تحفۂ نکاح " رب العالمین کے حضور پیش کر دیا جاتا ہے "۔

" یہ تو ہوئی قاضی صاحب کی شرعی اور قانونی ضرورت۔ اب " میدان عمل " میں اس کی ضرورت ملاحظہ فرمائیے۔ ہمارے ہندوستان " نحوست نشان " میں جہاں اور بہت سے عیوب ہیں وہاں ایک عیب یہ بھی پایا جاتا ہے کہ نوجوان لڑکیاں بہت شرمیلی اور کم سخن واقع ہوئی ہیں۔ تنہائی میں انہیں کوئی حجاب نہیں ہوتا۔ لیکن اگر شرم ہے تو صرف زبان کھولنے میں۔ تو ذرا یہ نکتہ کی بات غور فرمائیے۔ شادی جیسا میں کہہ چکا ہوں ایک معاہدہ ہے اور یہ معاہدہ دولہا اور دولہن کے درمیان ہوتا ہے۔ اسلئے حسب اصول قانون معاہدہ دولہن کو خود دولہا سے کہنا چاہیے کہ میں خود کو بالعوض مبلغ ... ... آپ کی زوجیت میں دینا چاہتی ہوں۔ لیکن شادی کی خوشی سے دل میں لاوے پھوٹیں تو پھوٹیں۔ مگر اُن کے بھولے مُنہ سے یہ الفاظ نہیں نکلتے۔ چنانچہ قاضی لڑکی کے عوض وہی الفاظ دہراتا ہے۔ اور لڑکا قبول کرتا ہے۔ چنانچہ آپ کا یہ خاکسار آج کی شب دولہن کے فرائض انجام دے گا " ـــ ایک زبردست قہقہہ پڑا۔ لونڈوں نے سیٹیاں بجا بجاکر سارا شامیانہ سر پر اٹھا لیا کسی نے دو تین ڈھیلے پٹرومیکس بتی پر پھینک مارے۔ چراغ گُل ہوتے ہی کسی غنڈے نے شامیانہ کا ایک ستون

زندگی سے نزدیک

(از اختر جمالی)

ع "ابن مریم ہوا کرے کوئی !....."

میں چونک گیا- بالکل وہی آواز کا لوچ- آشنا صدائیں اور دل کو دھڑکا دینے والا نغمہ- نہ جانے کب تک محو رہا- یک بیک سیّد نے چٹکی لیتے ہوئے کہا-

"کیا غضب گاتی ہے کمبخت !"

پردہ گر چکا تھا اور وہ شعلۂ جوالہ نظروں سے غائب تھی-

"ارے کیا سوچ رہے ہو؟ گھر جانا ہے یا نہیں؟"

تخیلات کی کڑیاں بکھر چکی تھیں- میں گھبراہٹ میں مسکرا پڑا-

میں اسکول کی تعلیم کا آخری سال گذار رہا تھا- گیا کا ہنگامی ماحول! مگر میری دنیا میرے گھر تک محدود تھی- شاید میرے ہمسایوں کو بھی یہ معلوم نہ ہو کہ میں کون ہوں- زندگی کے دن بیتے جا رہے تھے بدستور- لیکن ایک روز میری فطرت میں انقلاب ہوا-

ان دنوں میں غالب کی امتیازی خصوصیات پر مضمون لکھ رہا تھا- مرزا نوشہ کا دیوان کھولے آہستہ آہستہ گنگنا رہا تھا-

ابن مریم ہوا کرے کوئی
دکھ کی میرے دوا کرے کوئی

مگر چند لمحوں کے لئے مجھ پر سکتہ کی سی کیفیت طاری ہوگئی- نسیمہ نہ جانے کب سے مجھے دیکھ رہی تھی، میری بیباک نگاہوں سے وہ خود شرما گئی اور لجا کر بولی-

"میں آپ سے اقلیدس کا ایک حل پوچھنے آئی تھی لیکن آپ اپنے ادبی مذاق میں اس قدر ڈوبے ہوئے تھے کہ میری آوازیں بھی آپکو اس دنیا میں واپس نہ لا سکیں-"

"معاف کرنا نسیمہ!" میں نے لاجواب ہو کر کہا "ہاں! واقعی آجکل میں تخیلی انسان ہو گیا ہوں- اکثر کھانے پینے تک کا خیال نہیں آتا-"

"بہت بڑے ادیب ہونگے آپ!" نسیمہ نے شوخی سے جواب دیا-

میں نے اقلیدس کا سوال حل کیا- اور وہ مسکراتی ہوئی چلی گئی-

میں نے اسے بار بار دیکھا تھا- لیکن اس ملاقات میں مجھے معلوم ہوا کہ اس میں ایک برقی کشش پیدا ہو گئی ہے- اس کے بعد وہ برابر آتی رہی، کبھی تاریخ کبھی ادب، کبھی اقلیدس کی کتاب لئے ہوئے-

میں انٹرنس میں کامیاب ہو چکا تھا اور آئی- ایس- سی کے لئے پٹنہ روانہ ہو گیا- میری مطلق خواہش نہ تھی کہ اپنے حسین ترین اور زندہ خواب کو چھوڑ دوں- مگر والدین

کے اصرارِ پیہم نے مجبور کر دیا۔ جب میں رخصت ہونے لگا تو نسیمہ کی آنکھیں ڈبڈبائی ہوئی تھیں۔ ان میں ایک جذبہ تھا۔ خاموش جذبہ! اور گویا کہہ رہی ہوں "بھول نہ جانا...... !"

اس وقت سے آج تک پانچ برس گذر چکے تھے۔ اب میں ایم۔ ایس۔ سی میں تھا۔ اس طویل مدّت میں متعدد بار گھر گیا مگر نسیمہ کی صورت پر نظر نہ پڑی۔ صرف اتنا پتہ چل سکا کہ وہ ایک رات اچانک لاپتہ ہو گئی۔ کتنا عجیب غریب تھا۔ یک بیک ٹیلیفون کی گھنٹی بجی۔ میں نے ریسیور اٹھایا۔ —— "ہاں! میں ہوں ...... نورِ جہاں! ...... آپ اپنے قیمتی وقت سے چند منٹ مجھے دے سکتے ہیں؟"

"بشوق تمام" —— پھر خاموشی تھی۔

"ہاں! میں وہی نسیمہ ہوں جمالی صاحب!"

لیکن نسیمہ! تمہاری زندگی کا یہ تغیر کتنا انوکھا ہے۔ اور شاید تم بھی انکار نہ کر سکو کہ تم نے مجھے خوشنما فریب میں مبتلا رکھا۔ ایسا دھوکا دیا جس میں زندگی کی شگفتگی تھی اور ...."

"مگر یہ تو بتایئے کہ آپ کی فطرت نہیں بدلی؟ کیا آپ وہی ہیں جو پانچ سال قبل تھے؟ کیا یہ ممکن تھا جمالی صاحب کہ آپ میری جدائی کا احساس کرتے ہوئے بھی ٹھیٹھ انہی غم نصیب تفریح گاہوں میں دل نہیں بہلاتے! سمجھے"!

تیرہ زندگی کے تلخ تجربات ہیں! یہ تو بتاؤ کہ تم نے اپنے مستقبل کے بارہ میں کیا سوچا ہے؟"

"ماضی۔ حال اور مستقبل ایک ایکٹرس کے لئے بے معنی الفاظ ہیں۔ جمالی صاحب! آپ ادیب ہیں فلسفی ادیب۔ آپ الفاظ کی الجھنوں میں پڑے رہتے ہیں لیکن میری ہم جنسوں کے پاس اس قدر وقت ہی نہیں کہ سوسائٹی کے اس مضحک خیال پر غور کریں۔ میرا حال ہی مستقبل اور سب کچھ ہے۔ بہت دیر ہو گئی۔ اب اجازت ہو"

"چھوڑو ان بیکار باتوں کو نسیمہ! میری نبض بھی کچھ سست ہو چلی تھی، مگر تمہارے آجانے سے زندگی کی نئی لہر دوڑ چکی ہے۔ آؤ! آج پھر ہم تم مل کر گذرے ہوئے خواب میں کھو جائیں۔ اور ان لمحوں کی یاد تازہ کر لیں جو کبھی سرمایۂ سکون تھے"

"مجھے حیرت ہی جمالی صاحب! کہ آپ سائنس کے ماہر ہو کر بھی ان مہلک اصطلاحی الفاظ سے کام لے رہے ہیں، صاف صاف کیوں نہیں کہتے کہ آپ میرا سودا کرنا چاہتے ہیں! کاروباری معاملوں میں کھری کھری باتیں کہیئے۔ تو سُن لیجئے میں مجبور ہوں۔ آج کی رات میں فروخت ہو چکی ہوں سیٹھ صاحب میرا انتظار کر رہے ہونگے! اور کسی روز چاہیں تو فون پر بلا کر کہہ دینگے، حاضر ہو جاؤنگی۔ اچھا خدا حافظ!"

میری محویت ٹوٹی تو وہ کمرے سے جا چکی تھی۔ باہر آیا۔ موٹر چیختی چلاتی جا رہی تھی، جیسے کسی بیوہ کی آہیں گونج رہی ہوں۔ ٹھیک اسی وقت ایک ستارہ آسمان سے ٹوٹا اور تاریکیوں میں گم ہو گیا۔ میں دیر تک سوچتا رہا! "زندگی سے کس قدر نزدیک! ......" سڑک پر کوئی منچلا نوجوان الاپتا جا رہا تھا۔ ع دُکھ کی تیرے دوا کرے کوئی!
...... ہاں ...... ہاں ......"

اختر جمالی

کیا سے کیا!

(از شنکر سروپ بھٹناگر)

گورا ماتھا - گھونگر والے بال - پتلی ناک - بڑی بڑی آنکھیں جو بات بات پر مسکراتی ہوں - یہی تو اس کا ہونے والا پتی تھا - دن رات مادھوی اسی کا تو دھیان کیا کرتی تھی - دن رات اسی کی تصویر لئے دل کو بہلایا کرتی تھی - یہ دھیان کر کے اس کو ایسا معلوم ہوتا جیسے کہ اس کے دل کے باغ میں کلیاں اچھل اٹھتی ہوں!! اور وہ اس باغ میں ایک کلی سے دوسری کلی پر مانند تتلی کے اڑتی پھرتی ہو!

وہ اکثر اپنے بے ترتیب خیالوں میں کھو جاتی اور انوپ اور خود کو ایسے الجھے ہوئے پاتی جیسے کہ ایک لتا کسی پیڑ سے لٹک گئی ہو۔ ویسے تو وقت پر دونوں ملتے ہی رہتے تھے - مگر ایسے ملنے کی کچھ زیادہ حقیقت نہیں تھی - دونوں جب ملتے تو ویسے ہی ملتے جیسے کہ دونوں کا ملنا کچھ ضروری سا ہو گیا ہو - مگر جس کا مطلب کچھ نہ ہو! دونوں ملتے اور مسکرا جاتے - شاید دونوں اپنے اپنے دلوں میں بات چھپائے ہوں جس کے پورا نہ ہونے کے ڈر سے دونوں اپنے اپنے دلوں سے ان باتوں کو نہ نکالتے ہوں - انوپ کو معلوم تھا کہ مادھوی اپنے پتا کی اکیلی لڑکی ہے جو کہ اس کے لئے دنیا میں سب سے زیادہ پیاری نعمت ہے - انوپ سمجھتا تھا کہ مادھوی کے پتا اس کو اتنی نعمت نہ سمجھیں!! کیونکہ اس کے ماں باپ نہیں ہیں اور اس کے پاس دولت بھی نہیں ہے - ہنر ہے اس کے پاس - روپ ہے اس کے پاس بلا سے دولت نہ ہوئی تو نہ ہو - ور روپ کیا!! اسی خیال سے شاید اس نے اپنے دل کی گہرائی میں اپنے راز چھپا رکھے ہوں!! اور جب مادھوی سے ملتا ہو تو مسکرا کر ہی ان باتوں کو ٹال دیتا ہو - یہ بھی ممکن ہو سکتا ہے کہ مادھوی کے دل کی گہرائی بھی خالی نہ ہو - مگر لڑکیوں کے خاص اور سب سے قیمتی زیور ان کے راز ہیں جن کو وہ ایسی ہی حفاظت سے رکھتی ہیں جیسے کہ زیوروں کو!! جب تک کہ ان کو کوئی سہارا نہ مل جاتا ہو تب تک اپنے رازوں کو اپنے دل کے اندر ہی رکھتی ہیں - مادھوی کو کوئی ایسا موقع نہ ملا تھا جس وقت وہ رازوں کو انوپ سے کہتی -

ایک دن مادھوی تعجب میں پڑ گئی - اس نے خیال کیا کہ کیا وہ دراصل وہی سن رہی ہے جو اسے سنائی دے رہا ہے - یا خواب تو نہیں دیکھ رہی - اسے ایسا معلوم ہو رہا تھا کہ جو کچھ وہ سن رہی ہے وہ خوابوں سے بھی دلکش ہے - وہ ایک کونہ میں کھڑی تھی اور الماری میں سے انوپ کے لئے ناشتہ نکال رہی تھی، ناشتہ نکال چکنے پر بھی وہ وہاں کھڑی تھی - اسکے پتا کہہ رہے تھے

"انوپ میں کیا کچھ خرابی ہے؟"

مادھوی کی ماں نے جواب دیا - "کچھ نہیں - کیوں؟"

اس کے پتا نے کہا۔ "اسکے پاس دولت تو ہے ہی نہیں!!"
"تو؟ ——" اس کی ماں نے کہا۔
"ارے یہ مطلب ہے کہ کیا انوپ ٹھیک نہیں رہے گا؟"
"کس بات کے لئے؟؟"
"ارے تم بالکل بے عقل ہو! عقلمند کو ذرا سا ہی اشارہ کافی ہے!"
"تم میں بہت زیادہ عقل ہے تو راستہ پر بہت سے بے عقل لوگ اور بھی پھرتے ہونگے، ان کو بانٹ دو مجھے ضرورت نہیں۔"
"ارے مطلب یہ ہے کہ مادھوی کا بیاہ انوپ سے کیوں نہ کر دیا جائے!——"

یہ سن کر مادھوی وہاں سے ایسی بھاگی جیسے کہ کوئی کسی گناہ سے دور بھاگتا ہو! اس کے دل میں ڈر اٹھنا لازمی تھا۔ کیونکہ لڑکیوں کو یہ سکھایا ہی جاتا ہے کہ اپنے بیاہ کی بات سننا اور اس میں دخل دینا اگر واقعی پاپ نہیں ہے تو پاپ کے برابر ضرور ہے اسی لئے مادھوی ادھوری بات ہی سنکر بھاگ گئی۔ مگر اسے ایسا معلوم ہو رہا تھا جیسے اس نے سب کچھ سن لیا ہو!! اس کے ہاتھ میں ناشتہ کی تھالی تھی، وہ انوپ کو ناشتہ دینے جا رہی تھی۔ مگر بالکل بے خبر سی۔ اس کا بھی اسے دھیان نہ تھا کہ انوپ بیٹھا ہوا ہے وہ تو یہی خیال کرنے لگی تھی کہ انوپ اس کا پتی ہوگا وہ اپنے دماغ میں انوپ کی تصویر بنانے لگی۔ وہی گورا ماتھا۔ گھونگھر والے بال۔ پتلی ناک۔ بڑی بڑی آنکھیں جو بات بات پر مسکراتی ہوں —— جیسے ہی اس نے انوپ کے سامنے ناشتہ رکھا ویسے ہی وہ چونک گئی، جیسے کہ اسے معلوم نہ تھا کہ کوئی بیٹھا ہوا ہے۔——
"کیوں —— چونک گئیں؟" انوپ نے کہا۔ مادھوی سٹپٹائی۔ وہ جواب ڈھونڈھ ہی رہی تھی کہ کمرہ میں سے اس کی ماں نکل آئی!!

اس نے اپنی سہیلی کے کان میں کہہ دیا۔ سہیلی نے مبارکباد دی۔ مادھوی نے کہا "چل ری" اور بھاگ گئی۔ دو تین روز بعد انوپ بھی مل گیا۔ وہ ہنس دیا۔ اس کو اس روز کا مادھوی کا سٹپٹانا کچھ عجیب سا معلوم ہوا تھا۔ جس کی وجہ اس نے اسی روز پوچھی تھی۔ مگر آج تک جواب کا انتظار کر رہا تھا۔ آج مادھوی کو دیکھ کر اسے اس کا سٹپٹانا اور چونکنا یاد آ گیا۔
"اس روز کیا بات تھی!" انوپ نے پوچھا۔
"کیا ——" مادھوی نے پوچھا۔
"کیا نہیں معلوم تھا کہ میں بیٹھا ہوا تھا۔"
"معلوم تو تھا ——"
"تو ایسے کیوں چونک گئی کہ جیسے بھوت دیکھ لیا ہو"
مادھوی خیال کرنے لگی انہیں باتوں کا ——
"مادھوی کا بیاہ انوپ سے کیوں نہ کر دیا جائے! انوپ میں کچھ خرابی تو ہے نہیں!"

مادھوی اپنے دل میں پتا سے سنی ہوئی باتیں نہ رکھ سکی۔ اس نے ایک ایک کرکے بہانے تک سنا کر انوپ کو بیان کر دیا۔ انوپ نے سنا اور اسے ایسا معلوم ہوا جیسے کہ زمانوں کے بعد اسکی مراد پوری ہوتی ہو!!
دونوں سوچ رہے تھے۔ "کیا دل کی مرادیں اسطرح

سے پوری ہو جاتی ہیں۔ کیا خیال کرنے سے ہی آرزوئیں پوری ہو جاتی ہیں۔ جیسے کہ کوئی شہزادہ بین پری کی بین بجادے اور آنکھ کی جھپکی میں محل کھڑا ہو جائے!

ایسے جس محبت کا احساس وہ دونوں نہیں دکھاتے تھے ظاہر ہونے لگا۔ دونوں ہی محسوس کرنے لگے جیسے کہ وہ اندھیرے میں سے اُجالے میں آگئے ہوں۔ جیسے کہ آسمان سے بادل ہٹ گئے ہوں اور ان کی دنیا ایسی ہی خوشنما ہوگئی ہو جیسے کہ نیلا آسمان!

"اس کے پاس دولت تو ہے نہیں!" ــــ مادھوی نے سوچا۔ "اگر نہیں ہے تو کیا؟" اس نے دولت کی برائیاں سُن رکھی تھیں، جس کے پاس دولت ہوتی ہے وہ شرابی ہوتے ہیں۔ وہ عیش و آرام میں بُری عادتوں میں پڑ کر روپیہ برباد کر دیتے ہیں ــــ اور ان کی بیویوں کی حالت! تو بہت ہی بُری ہوتی ہے!! دولت والے سب ایسے ہی ہوتے ہونگے!

مادھوی نے ناپ تول کیا کہ دولت نہ ہونا بُرائی ہونیکے بجائے ایک اچھائی ہے!! تو انوپ میں پھر کونسی بُرائی ہوئی ...... اس کا گورا ماتھا ...."

آگے سوچکر کچھ شرما سی گئی! اس نے چاہا کہ اپنے خیالات کو ختم کردے۔ مگر وہ بے بس سی خیالوں میں ہی لپٹی جارہی تھی!

"تو یہ تو اور اچھی بات ہے کہ دولت نہیں! جن کے پاس دولت نہیں ہوتی ہے وہ اپنی پتنی سے بہت محبت کرتے ہیں، وہی ان کے گھر کی لکشمی کہلائی جاتی ہے! ــــ اور پھر جب انوپ پہلے ہی سے مادھوی سے محبت کرتا ہے تو پھر شادی ہونے پر کیوں نہ اسکی محبت دُگنی ہو جائیگی۔

وہ تو اسے سب سے زیادہ پیاری ...... وہ آگے سوچنے بھی نہ پائی تھی کہ اس کے پتا نے آواز دی، "بیٹی!"

"ہاں" ــــ مگر اس کے پیر پتا کے کمرہ میں نہ پڑتے تھے وہ واپس چلی آئی۔

اس کے پتا ذکر کر رہے تھے کہ مادھوی کو تو بتا دیا جائے! سُن کر خوش ہو جائیگی!! بانسوں اچھل جائیگی۔ یہ سُنکر کہ ہیروں زیور ملیں گے پھولی نہ سماویگی۔ رگھوناتھ بہت دھنی ہے! ہزاروں کی آمدنی ہے!! ہزاروں کی!!! سارے شہر میں اسی کا کارخانہ مانا جاتا ہے۔ اور کارخانے تو ایسے ہیں جیسے سُورج کے سامنے دیا ہے!! مگر کچھ کالا ضرور ہے! شکل و صورت میں انوپ سے اچھا نہیں۔ تو شکل سے کیا! دھن تو ہے۔ اور آج کل دھن ہی سب کچھ ہے۔ میں کہتا ہوں کہ ذرا مادھوی کو تو بلاؤ! اس سے کہہ تو دو!!"

مادھوی کی ماں نے کہا "اس سے کیا کہنا۔ لڑکی اپنے بیاہ گونے کی بات کیا سمجھے!!"

دوسرے کمرے میں مادھوی بالکل بے خبر سی خیال کر رہی تھی۔ "گورا ماتھا۔ گھونگر والے بال۔ پتلی ناک بڑی بڑی آنکھیں جو بات بات پر مسکراتی ہوں، یہی تو اسکا ہونیوالا پتی تھا۔ جس کے پاس دولت کی کمی ہے لیکن محبت کی زیادتی ہے!

اس کو کیا معلوم تھا کہ اس کے ماں باپ اس کی زندگی کا الٹا ہی نقشہ بنا رہے تھے! اس کو معلوم کیسے ہو سکتا تھا لڑکیاں تو اپنے بیاہ گونے کی بات سمجھ ہی نہیں سکتیں!! مادھوی اپنے خیالوں کے مطابق زندگی کا نقشہ بنا رہی تھی جو اس کو ہیروں زیوروں سے بھی زیادہ پیارا ہو گیا تھا۔

مادھوی کی خوبصورتی کی خبر بجلی کی تیزی سے رگھوناتھ کے پاس پہونچ گئی تھی، جب وہ کارخانے میں کھڑا ہوتا تو خیال کرتا کہ اس گندے کالے کارخانے میں مادھوی کھڑی ہو کر اُجالا کردے گی۔ مادھوی اپنے گورے گورے بدن کو لیکر کارخانے میں گھومے گی اور ایک ایک کل کو دیکھ کر خوش ہوگی - اور جب وہ میری تعریف کریگی تو میرے کارخانے کا ستارہ اور بلند ہوجائیگا!

اور مادھوی خیال کر رہی تھی انوپ کے گھر کا! وہ ایک ایک کمرہ میں گھومے گی - اپنے ہی ہاتھوں سے ہی سارے کمروں کی روشنی کیا کریگی! اور جب انوپ گھر کے اندر جائیگا تو اس کے دل کا کنول مجھ کو دیکھکر کھل جاویگا - اور میری کلیاں بھی کھل اُٹھیں گی!

شادی کا دن ہے! یعنی اسکے پتی کے آنے کا دن - اسی پتی کا نا؟ جس کا ماتھا گورا - گھونگر والے بال - پتلی ناک ..... اور! .... کسی نے آکر اس کا ہاتھ دبا دیا - اس کا مُنہ سرخ ہوگیا - اس نے مڑکر دیکھا تو بجائے انوپ کے اس کی سہیلی تھی!!

" اری بتا تو تیرا پتی کیسا ہے؟ تو نے تک چھپ کر دیکھا ہوگا!! " اس کی سہیلی نے کہا -

" چل ہری - جیسے تو نے دیکھا ہی نہ ہو؟" مادھوی نے کہا " میں کیا گھر گئی تھی اس کو دیکھنے! ـــــ سہیلی نے چٹکی لیتے ہوئے کہا -

" تو کیا میں؟ ....."

" اچھا بتاؤ ـــــ بڑا چاند سا گورا ہے جو نظر لگنے کے ڈر سے نہ بتاتی ہو!! "

ــ ہے ہی ـــــ " مادھوی نے کہدیا -

" سنا ہے دولت مند ہے! " سہیلی نے پوچھا -

" ہاں ہے! ـــــ " مادھوی نے سوچکر کہا - " ایسی دولت جو خرچ کرنے پر بھی کبھی ختم نہیں ہو سکتی!! "

" اوـــــ اتنی دولت! "

" وہ اتنی نہیں ہے - وہ دولت ایسی ہی ہے!! "

لڑکے کو جب مالا پہنانے کا وقت آیا - مادھوی نے چاہا اپنی آنکھیں اُٹھا کر دیکھے - اپنے پتی کا گورا ماتھا مگر مادھوی کی آنکھیں رُک گئیں - چہرہ لال ہوگیا - وہ شرم سے دُہری ہوگئی -

سہیلی مادھوی کے پاس بھاگتی ہوئی آئی " اب اپنے پتی جی کو ڈبیا میں بند کر کے رکھنا - ہم نے دیکھ لیا - نظر نہ لگ جائے! بالکل چاند ہے!! " ـــــ اور وہ ہنس دی -

" تجھے پسند ہے؟ " سہیلی نے پوچھا -

" مجھے پسند کیوں نہ ہوگا؟ " مادھوی نے کہا -

" ہاں ٹھیک ہے - ہزاروں کی آمدنی ہے - کارخانے کے مالک ہیں - ان کے بیسوں نوکر ہیں! .... "

" کیا بک رہی ہے - " مادھوی نے کہا " بھلا انوپ کے پاس یہ سب کہاں رکھا ہے!! "

" انوپ؟ " ـــــ سہیلی تعجب میں رہ گئی - اس کی سہیلی آگے کہنے والی ہی تھی کہ وہ چپ ہوگئی! اس نے سمجھ لیا کہ مادھوی اسی دھوکے میں ہے کہ اسکی شادی انوپ سے ہو رہی ہے جبھی تو وہ خیال کر رہی ہے کہ اس کا پتی چاند سا گورا ہے اور جو اس کو پسند کیوں نہیں آویگا -

" تو نے جب مال پہناتے وقت اپنی انکھیا بند کرلیں تھیں!

سہیلی نے پوچھا ۔

" تو کیا پھاڑلیتی !! انوپ کو کیا کبھی دیکھا نہیں !! "

اس وقت سہیلی کا دل بھر آیا ۔ اس نے کہا ۔

تم مادھوی اتنی بھولی کیوں ہو ! "

اس نے اپنا پیر اپنے پتی کے گھر میں دیا اور اس کو ایسا معلوم ہوا جیسے کہ اس کا پیر کسی انجان جگہ میں جا گرا ہو ۔ وہ کمرہ میں پہونچی ۔ یہ کمرہ بھی اس نے کبھی نہیں دیکھا تھا اور ایسی سجاوٹ کا اس نے کبھی خیال نہ کیا تھا ۔ تو کیا آج انوپ نے میری خوشی میں دیوالی منائی ہے ۔ اس کا دل انوپ کے لئے تڑپ اٹھا ۔ مگر انوپ ابھی اس کے پاس کیسے آسکتا تھا ۔ وہ ایک کونے میں بیٹھ گئی ۔

رات بہت کافی ہوچکی تھی ۔ مادھوی کی آنکھیں انتظار کرتے کرتے پتھرا گئی تھیں ۔ ابھی تک انوپ نہیں آیا ! — یکایک آہٹ ہوئی ، کواڑ کھلے ۔ مادھوی نے خیال کیا کہ انوپ آیا ۔ مگر یہ انوپ کے سے سر تو نہیں !! وہ اور سُکڑ کر بیٹھ گئی ۔ مادھوی کا مُنہ کھولا گیا ۔ مادھوی اپنی آنکھیں اوپر نہ کرسکی !

" اوپر نگاہ تو کرو — " کسی نے کہا — مگر وہ آواز تو انوپ کی سی نہیں تھی ! اس نے نگاہ اٹھائی — ایک کالا سیاہ چہرہ اس کو نظر آیا ۔ یہ انوپ ہے کیا !! — ہائے ! کیا اس نے دھوکا تو نہیں کھایا ؟ "

" بولتی نہیں !! میری جیون کے چاند ! آج تم نے میری اندھیری راتوں میں چاروں طرف چاند کی روشنی کردی — میری طرف تو دیکھو !! "

مگر مادھوی کیا بولے ۔ اس کے جیون کا چاند نہ معلوم کب سے ڈوب چکا تھا ۔

" میری ساری دولت تمہاری ہے ۔ سارے کارخانے کی ایک ایک کل تمہارے درشن کو ویاکل ہے ۔ کل اپنا کارخانہ دکھاؤں گا ۔ تم کو معلوم ہو جاویگا کہ ایسا کارخانہ سارے شہر میں نہیں ہے "

" اس نے خیال کیا — تو کیا سہیلی سچ کہہ رہی تھی ۔ مجھے کارخانے میں ڈال دیا گیا ۔ اور انوپ ؟ — اس نے خیال کیا کہ اس کی شادی نہیں ہوئی ۔ بلکہ ڈاکوؤں نے اسے اندھیرے میں ڈال کر لوٹا ہے ۔

وہ اپنے گھر واپس آئی پیلی ہوکر ۔ سہیلی سے ملی ۔ تم نے سچ کہا تھا ۔ مگر میں تو اپنے ہی دھیان میں تھی یعنی کسی اور کی آس لگائے تھی — کارخانہ ہے ہزاروں کی آمدنی ہے مگر انوپ کہاں ہے ؟ وہ رونے لگی ۔ ہر ایک آنسو کے قطرہ میں وہی شکل بن رہی تھی ۔ — " گورا ماتھا ۔ گھونگر والے بال ۔ پتلی ناک ۔ بڑی بڑی آنکھیں جو بات بات پر مسکرا جاتی ہوں "

اس نے کبھی خیال کیا تھا کہ اس کے دل کے باغ کی کلیاں کھل اٹھیں ہیں ۔ آج وہ ایسے بیٹھی ہوئی تھی جیسے کہ کسی نے زبردستی اس کے دل کے باغ کی کلیاں نوچ لی ہوں !!!

شنکر سروپ بھٹناگر

میخانۂ مینائی کے جام پر جام

از حضرت رسا ہمدانی گیاوی، پرنسپل ایم اے۔ پروفیسر ڈی۔ اے۔ وی کالج سیوان

ہائے کیا ستم ہے، مولوی عبد السلام ندوی نے شعر الہند کے حصۂ دوم میں خمریات کے باب میں جہاں اور اردو شعرا کے اشعار نقل کئے، وہاں امیر مینائی مرحوم کا ایک شعر بھی نہیں لکھا۔ میرے دل کو یہ دیکھ کر بڑا صدمہ ہوا۔ میرے پاس امیر مینائی مرحوم کا دوسرا دیوان صنم خانۂ عشق موجود ہے۔ میں نے بسم اللہ کہہ کر کھولا تو پہلا شعر جو میری نگاہ سے گزرا وہ یہ تھا۔ ؎

منکر گوشہ نشینانِ خرابات نہ ہو کہ یہی گوشہ کہیں قبلۂ حاجات نہ ہو

پڑھکر طبیعت پھڑک گئی۔ یہ تو وہی حال ہوا کہ جب حافظ علیہ الرحمتہ کا جنازہ لیکر لوگ شیراز کی جامع مسجد میں پہنچے، مفتی شہر نے یہ کہکر کہ یہ پرانے پینے والے رند مشرب آدمی تھے، ان کے جنازے کی نماز پڑھانے سے انکار کر دیا۔ ایک جماعت ایسی بھی تھی جو حافظ کو بزرگ مانتی تھی اور انکی ولایت کی قائل تھی وہ بگڑ گئی۔ آخر فیصلہ یہ ہوا کہ حافظ کے دیوان سے فال لیجائے۔ اگر یہ بزرگ ہونگے تو خود اسکے متعلق کچھ ارشاد فرمائیں گے۔ دیوان جو کھولا گیا تو یہ شعر نکلا۔ ؎

قدم دریغ مدار از جنازۂ حافظ کہ گرچہ غرقِ گناہ است میرود بہ بہشت

پھر کیا ہوا کچھ نہ پوچھیئے، خلقت ٹوٹ پڑی اور بارہ ہزار آدمیوں نے نمازِ جنازہ پڑھی۔ اب امیر مینائی مرحوم کی دوسری کرامت ملاحظہ ہو کہ دوسرا شعر جس پر میری نظر انتخاب پڑی وہ یہ ہے۔ ؎

خم توڑ کر بنائے بہت ساغرِ شراب مستوں پہ محتسب نے نرالا کرم کیا

نہ عبد السلام ندوی صاحب یہ غلطی کرتے اور نہ میں میخانۂ مینائی کے جام پر جام ناظرین ندیم کے سامنے پیش کرتا۔ ہائے کیا خوب کہا ہے۔ ع خم توڑ کر بنائے بہت ساغرِ شراب، اس کو محتسب کے نرالے کرم سے تعبیر کرنا امیر مینائی مرحوم ہی کا کام تھا۔ جتنی بار پڑھتا ہوں ایک نیا کیف حاصل ہوتا ہے۔

(۱) خم توڑ کر بنائے بہت ساغرِ شراب مستوں پہ محتسب نے نرالا کرم کیا
(۲) جانا اگر حرم کو ہے منظور اے امیر تو میکدے سے راہ ہے سیدھی لگی ہوئی
(۳) مجلسِ وعظ میں آنا تو نہ ممکن تھا امیر ہم کو تھامے ہوئے یاں دستِ سبو لایا ہے
(۴) دو ہاتھ جب کنارہ ہو دیر آ میں کیا لگے ہم پیر کر شراب میں کوثر سے جا لگے
(۵) سوجھا ہے بیخودی میں یہ مضمون دُور کا پردے میں دختِ رز کے ہے جلوہ حضور کا
(۶) واعظو، وعظ کی مجلس میں تو تھا میں بدمست کچھ اگر ہوش میں ہوتا تو تمہاری سُنتا

(۷) پیئے گا تُو بھی تو زاہد وہی جناں میں شراب — جو میکشوں نے یہاں پی تو کیا گناہ کیا
(۸) دے جلد جام ساقی ٹوٹے خمار میرا — تیار ہے جماعت ہے انتظار میرا
(۹) مستی میں حلقہ کئے ایک ماہی سب یہ کرم — دورِ ساغر میں سبُو پیرِ مغاں بن بیٹھا
(۱۰) کھُل گیا زاہد کہ مستوں پر خدا کا رحم ہے — ابر جب قبلہ سے اُٹھا میکدے پر چھا گیا
(۱۱) جان اگر دیتی نہیں ہے ساقی گلفام پر — کیوں لہو روتی ہے مُنہ رکھکر صراحی جام پر
(۱۲) ساقی نے سنگھائی غش میں مٹی، — سوندھی سوندھی مجھے سبُو کی
(۱۳) مستی میں بہک کے کعبے پہونچے — جانا تھا کدھر، کدھر گئے ہم
(۱۴) تجھے کیا ہم جو وصفِ ساقیِ گلفام کرتے ہیں — تُو اپنا کام کر واعظ ہم اپنا کام کرتے ہیں
(۱۵) یار کے اُٹھتے ہی برہم ہو گیا سامانِ عیش — مے کہیں، مینا کہیں، ساقی کہیں، ساغر کہیں
(۱۶) گھر میں اللہ کو واعظ ہیں تو یہ کچھ ہے کلام — میکدے میں ابھی آئیں تو ہماری سی کہیں
(۱۷) مانگتا ہوں خدا سے روز شراب — میں بھی کیا رندِ پاک طینت ہوں
(۱۸) دستِ ساقی سے جو میں کچھ جام لینے میں رُکا — غیب سے آواز آئی یہ شبِ آدینہ ہے
(۱۹) زمانہ ہو گیا مد ہوشِ چشمِ مستِ دلبر سے — تماشا ہے چھلکی محفل کی محفل ایک ساغر سے
(۲۰) کوئی دم بے تکلف ہو کے مستوں میں اگر بیٹھے — تو جو کچھ عرش پر ہے دیکھ لے زاہد وہ گھر بیٹھے
(۲۱) بجائے دخترِ رز میکدے میں حُور آئے — جو توبہ توڑ دوں آواز یا غفور آئے
(۲۲) وہ مست جب کبھی گزرا ہے میکدے کی طرف — بہک کے دستِ سبو جا پڑا ہے ساغر پر
(۲۳) رواں ہے نکہتِ گُل کی طرح یہ عہدِ شباب — پلا شراب کہ ساقی بہار جاتی ہے
(۲۴) محتسب جامِ مے جو توڑے ہیں — میکشوں کے نصیب پھُوٹے ہیں
(۲۵) دیکھنا لغزش نہ کھانا واعظو — پی کے ہم آئے ہیں بزمِ وعظ میں
(۲۶) ساقی میں تیری نرگسِ میگوں کا مست ہوں — توبہ کا نام لیں مرے دشمن بہار میں
(۲۷) وہ مستِ شراب پھر رہے ہیں — ہم مفت خراب پھر رہے ہیں
(۲۸) ساقی میں کب سے لوٹ رہا ہوں خمار میں — اک جام ادھر بھی ساقیٔ کوثر کا واسطہ
(۲۹) اک مست کا خیال جو ہنگامِ خواب ہے — جو پلکوں میں نیند کے مجھے کیفِ شراب ہے
(۳۰) شراب خانہ کا عازم ہے تیرا دیوانہ — سبُو کے ہاتھ میں خشتِ خُمِ شراب لئے ہے
(۳۱) وہ سیہ مست ہوں ساقی کہ اگر پہلو میں — دلکو ڈھونڈھوں تو مرے ہاتھ میں بوتل آئے
(۳۲) خطاب ہے لبِ ساغر کا محتسب سے امیرؔ — پھرے جو پیرِ خرابات سے خراب رہے

مثنوی محمد یار خاں امیر

"برسات"

(عطیۂ قاضی عبدالودود۔ بیرسٹر ایٹ لا)

[محمد یار خاں امیر، نواب فیض اللہ خاں بانیِ ریاستِ رامپور کے بھائی تھے۔
اور فنِ سخن میں قایم چاندپوری کے شاگرد۔
سال وفات ۱۱۸۵ ہجری ہے۔ دیوان اب نہیں ملتا۔ یہ مثنوی ایک
قلمی کتاب سے نقل کی گئی ہے۔ قاضی عبدالودود]

اب کے کیا برسات نے ڈالی ہے دھوم
ہر طرف بادل رہے ہیں جھوم جھوم
اس برس کیا ہے گرہ ماہی کا اوج
ہر گھڑی آتے ہیں بادل فوج فوج
اس طرف گرتا فلک سے آب ہے
چرخ نہیں پھرتا گویا دولاب ہے
ٹپکنا بادل کا نہیں ہوتا ہے کم
ہوئے جوں نرلے کی ریزش دم بدم
مینہہ کا جاری ہے اتنا سلسلہ
ڈوبنے کی بات ہے گویا خلا
آب کے رہنے کی اوپر جا کہاں
ہو گیا غربال آبی آسماں
کس طرح کی اب کے یہ برسات ہے
خلق کو سارا دن آدھی رات ہے
مینہہ اس شدت سے برسے ہے مدام
بھیگنے کے خوف سے ہر صبح و شام

نہیں شفق جو لازم برسات ہے
چرخ پر بھی چادر ...... ہے
مینہہ کی شدت سے ہر تالاب پر
سبز کاہی کا ہے پٹو آب پر
سر پہ رہ رو کے ہے چادر اس طرح
چادر آبی پڑے ہے جس طرح
گھر میں ہی تنہا نہیں لگتی تلی
ہے ہر اک کوچہ چکا بو کی گلی
آسمان کے کھلے ہر گھر پہ راز
ہیں پلنگ پانی میں یوں جیسے جہاز
گھر میں جو باسن ہیں سیدھے سو غراب
اور جو الٹے ہیں سو مثلِ حباب
سیل نے ڈالیں بنائیں سب اکھاڑ
ڈھہ کے بستی ہو گئی مٹیا پہاڑ
تھا جو کچا گھر، گلا دا ہو گیا
اور جو پکا تھا، پزادا ہو گیا

بس کہ شدت طوفان کی حالت رہی
خلق بسم اللہ مجریہا کہی
ہول سے بارش کی بادل رو گیا
پیٹ میں گردوں کے پانی ہو گیا
بس کہ ہر اک دشت و بر پر آب ہے
اب بگولے کی جگہ گرداب ہے
بے سبب تو نہیں امڈنا تال کا
پردہ شاید پھٹ گیا پتال کا
لے زمیں سے آسماں تک سب غرق
طور ماہی کے کبھی اچھلے ہے برق
موسمِ برسات یہ کیا قہر ہے
آسماں پہ کہکشاں کی لہر ہے
چرخ کیسی نہیں ہے اگلی چال ڈھال
اس برس چلتا ہے پن چکی کی چال
جوف مثلِ طاس مالا مال ہے
مہر جس پر نامۂ گھڑیال ہے

اس قدر ہے ہر طرف طوفانِ آب
آسماں بھی جس میں ہے مثلِ حباب
شکل کیا بدلی ہے دستِ اس برس
چرخ یوں گھومیں بھنور میں جیسے خس
ہے اس عالم کی خبر گر روح کو
خوف اس طوفاں کا ہو گا نوح کو
ہائے یہ برسات یارو یا ہے قہر
بھوک سے مرتے ہیں اہلِ دیہہ و شہر
آگ ملتی نہیں جو کوئی روٹی پکائے
گھول کر آٹا مثلِ ستو خلق کھائے
آگ سے کس طرح ہو ربطِ تنور
یاں تو خود طوفان کرتے ہیں ظہور
دیگ دان سے دیکھیے سب بہہ گئے
چولھے اپنے منہ کو کھولے رہ گئے
اس طرح پانی میں غائب ہو گیا
جانیے مچھلی تھی یا مچھلی تو آ
آگ مستعمل ہے پانی کے محل
لوگ پھونکیں آگ اور کہتے ہیں جل
اور کھانے کا تو کیا امکان ہے
ہاں مگر چاہو تو آبی نان ہے
بس کہ اب بہتا ہے پانی تا سپہر
نت اچھلتا ڈوبتا پھرتا ہے مہر
مینہ کی شدت سے یہ کانپے ہے آب
موج کے سر پہ ہے چھتری ہر حباب
بھیگنے کی نہیں ز بس طاقت رہی
آتا ہے گرداب بھی پہلو تہی

یہ طراوت ہر جگہ میں عام ہے
خشک کا اس رُت میں تر نم نام ہے [۱]
آب کی کثرت تنک تو دیکھ تو ،
کاغذِ تصویر میں بہتی ہے جو ،
تیرِ باراں ابر سے ہے دم بدم
موج کی دریا رکھے منہ پر قلم
ہوئے ہے یوں طبقۂ ارضی سے پار
ہے گویا ہر بوند بوندی کا کٹار
تھے ثقہ جو بحرِ دنیا کے امیر
قول اب ان کا ہے پانی کی لکیر
ہوئے جب یہ آب سے حالت تباہ
کیوں نہ روئے پیٹ کر سر کو سپاہ
خان ساماں سے کرے ہے جو سوال
ہے مری تنخواہ زر جلدی نکال
یہ کہے مذکور کیا اس باب کا
ہے خزانہ تو خزانہ آب کا
جوں زرِ محلول سب زر آب ہے
سیم تھا سو صورتِ سیماب ہے
جائے خشک عالم سے ہے اب ناپدید
ہو رہے بازار و کوچہ سب پلید
چپقلش کیچڑ کی ایسی ہو رہی
آ رہا ہے ناک میں عالم کا جی
گر کوئی نکلے ہے گھر سے گاہ گاہ
ہو نہیں سکتا ہے جوتی کا نباہ
اس غضب میں ہائے سارا گاؤں ہے
حو تاں واں آبھ ننگے پاؤں ہے

اس قدر کپڑوں پہ کیچڑ کی ہے دھوم
شہر پر جیسے مگس کا ہو ہجوم
کیا کہوں کس مرتبہ ہے خلق خوار
گھوڑے سے لیکر ہے خواری تا سوار
گر کوئی نقرہ کبھی کیچڑ میں جائے
چھینٹوں کی افراط سے مگسی کہلائے
بس جب اتنا ہوئے کیچڑ کا وفور
بچ کے کیچڑ سے کوئی کیونکر ہو دور
کیچ سے خالی نہیں کوئی مکاں
آنکھ کے کونے میں بھی ہے کیچڑ نہاں
کیچ نے کھویا ہے دریا تک نام و ننگ
اس قدر اب رت سے جی آیا ہے تنگ
نام بارش مت زباں سے کوئی لو
سال کو بھی برس کہنا چھوڑ دو
بس اے میرا اتنا نہ کر منہ کو خراب
ہو رہے وہ شکوے سے تیرے آب آب
گر بڑھائے گا تو یہ قصہ یونہیں
کاغذ ابری پھٹے اب کاغذ نہیں
کب تلک سوچے گا یاں کار شعر خوب
فکر کے دریا میں بس اتنا نہ ڈوب

[۱] اس بیت کے بعد ایک فحش بیت تھا جو خارج کی گئی۔ قلمی نسخے میں اغلاط کتابت بہت ہیں۔ قیاسی تصحیح کی کوئی کوشش نہیں کی گئی۔
قاضی عبدالودود

شاعر اور پیرِ فرتوت

(از سنت پرشاد مدہوش)

پیرِ فرتوت۔ شاعر! تجھے سکھا دوں اب طرزِ زندگانی
لا دے مجھے جو پھر سے کھوئی ہوئی جوانی

شاعر۔ لے آؤ تم جوانی باقی یہ میرا ذمہ
دہرا اگر نہ دو تم بیتی ہوئی کہانی

ہے زعمِ تجربہ بھی اے پیر! نقشِ باطل
مٹ جائیگا یہ پل میں ابھرے تو نوجوانی

خوں میں کمی حدت ہی کا ہے نام دانش
جوشِ خرد ہے حضرت! احساسِ ناتوانی

ہاں ہاں یہ ضبطِ نفسی یعنی رکاؤ دل کا
پیدا ہوا ہے جب ہی خوں میں نہیں روانی

نازاں ہو کس لئے یہ، یہ بھی سب اک بھرم ہے
شل ہو کے رہ گئی ہیں رگہائے شادمانی

افسردگی کو اپنی سنجیدگی نہ سمجھو
ٹھٹھری ہوئی رگوں کی جانو اسے نشانی

مشرب مرا محبت ۔ تم بزدلی کے بندے
اس زہد و اتقا کا خوفِ سزا ہے بانی

شاعر کی گفتگو یہ اک پیرِ ناتواں سے
ہم آج سن رہے ہیں مدہوش کی زبانی

فریبِ رومانیت

(از سنت پرشاد مدہوش)

دی خودی نے قم باذنی کی صدا ہم اُٹھ پڑے
لغزشیں کھاتے ہوئے میخانۂ ہستی میں آئے

وجد میں آیا ہوا اپنا شبابِ چاک چاک
ہم کو پھر اپنے جنوں پرور زمانے یاد آئے

نشۂ وزعمِ خودی ہی کو سمجھ کر بے خودی
پھاڑ ڈالا جامۂ ہستی جو بدمستی میں آئے

وائے نادانی کہ جس پر روئے اہلِ راز خوب
اپنی اس حالت پہ ہم تا عمر کس لذت سے گائے

واہ طوفاں خیز دل کس ناز سے انداز سے
تو نے روزِ حشر سے پہلے ہی سو محشر اٹھائے

کشتیٔ عمرِ رواں کو کہہ کے رومانی حیات
کیا ستم تھا جانے دنیا اس کا جس دھارے بہ جائے

خودکشی ہے سمجھے تھے تہذیب و تادیبِ حیات
ارتقا کے راز ہم نے شغلِ سوحانی میں پائے

ہر تقاضائے تمنا کو سمجھ کر زندگی
فخر یہ کہہ بیٹھتے تھے ہم پیامِ زیست لائے

اوّل اوّل یہ جوانی اور اس کی واہ وا
آخر آخر عہدِ پیری اور اُسکی ہائے ہائے

کلام مبارک

(اثر خامہ عنبر شمامہ فصیح العصر حضرت مبارک عظیم آبادی)

ہماری خاک کے ذرّے بھی کُو بکُو نکلے
فنا کے بعد بھی سرگرمِ جستجُو نکلے

جو پانچ وقت مُصلّے پہ قبلہ رُو نکلے
انہیں بزرگوں کے زیرِ بغل سبُو نکلے

بڑا مزا ہو بُتِ کم سخن جو محشر میں
خدا کے سامنے حاضر جواب تُو نکلے

جو دل ملے تو ملے اس بہار کا یا رب
نگار خانۂ ارمان و آرزُو نکلے

وہ آہ آہ ہے جو دل میں چٹکیاں لے لے
وہ اشک اشک ہے بن بن کے جو لہُو نکلے

وہ گو سنا کیے لیکن ادا یہ کہتی رہی
نہ ذکرِ مہر و وفا میرے رُوبرُو نکلے

کسی کو دَیر کسی کو حرم مبارک ہو
ہمیں وہ در کہ جہاں دل کی آرزُو نکلے

کہاں پناہ ملے گی ستم رسیدوں کو
اگر وہاں بھی الٰہی یہ خوبرُو نکلے

اسی کے دن ہیں میسر ہو تیری دید جسے
اُسی کی رات ہو جس کی بغل میں تُو نکلے

ردائے کہنہ مری چادرِ قناعت ہے
کہ اس کے چاک نہ منّت کشِ رفُو نکلے

یہ قید ہے مرے حلقے میں حضرتِ ناصح
جمالِ یار کی نکلے جو گفتگُو نکلے

خدا تمیز دے ان احتساب والوں کو
اُسے نہ توڑیں جو مینائے آرزُو نکلے

وہ بادہ کش ہوں مبارک مرا جواب نہیں
نہ ایسا جام نہ ایسا کہیں سبُو نکلے

مبارک عظیم آبادی

تبرّکات علامہ نیّر کاکوروی (مؤلف نور اللغات)

وعدے کرم کے لاکھ ہوں دل کو یقیں نہیں
طرزِ جفا یہ اور کہاں ہے، کہیں نہیں

آنکھوں میں گھر کیا ہے دو عالم سے کیا غرض
یا رب جمال دیکھنے والے کہیں نہیں

خفیہ شریکِ جُرم رہی لُطف کی نگاہ
تیرے گناہگار اکیلے ہمیں نہیں

کشتی ہماری ٹوٹ کے منجدھار میں پڑی
آہیں تڑپ رہی ہیں کہ ساحل کہیں نہیں

دل کے غبار نے یہ بنا دی تھیں صورتیں
دل ہی حزیں نہ ہو تو اُداسی کہیں نہیں

شرمندۂ بہار ہمارا جنوں ہے کب
یاں تیس دن تو جیب نہیں آستیں نہیں

نیّر تو دوڑ دوڑ کے میخانے جاتے ہیں
جب پوچھیے تو کہتے ہیں حضرت کہیں نہیں

نیّر کاکوروی

نشترِ فصاحت

(از لفٹننٹ ازہر قدوائی صاحب آئی - ایم - ایس)

لب تھے خاموش، اور جبیں اک تمنا دل میں تھی — کس بلا کی شانِ خودداری ترے سائل میں تھی
وہ خفا تھے، میرا مستقبل تھا جن کے ہاتھ میں — میں اندھیرے میں تھا، گرچہ روشنی محفل میں تھی
اک نئی صورت سکوں کی ہے اب اسکے سامنے — ورنہ پیہم اک خلش سی پہلے اپنے دل میں تھی
پھر اطمینانِ یک ایفائے وعدہ ہو گیا — لذت صد زندگی ہر وعدۂ باطل میں تھی
کشتۂ چشم تغافل کیش آخر ہو گئی، — وہ جو اک کمزور سی امید میرے دل میں تھی
دھو گئی کیسی روانی اشکہائے یاس کی — ایک رنگینی جو اپنے عشق کے حاصل میں تھی
کچھ عجب تھا لطف ازہر کوششِ بے سود میں — وہ کشش منزل میں کب، جو دوریٔ منزل میں تھی

ازہر قدوائی -

غزل

(رشحۂ کلک فصاحت جناب عنایت الرحمٰن صاحب عنایت منصف رانچی)

راہ رو راہِ طلب میں کھو گیا — بے نیاز راہبر اب ہو گیا
دلمیں ارماں کی خلش کیسے نہ ہو — راہ الفت میں تو کانٹے بو گیا
کوئے جاناں بھی عدم آباد ہے — رہ گیا جا کر وہاں جو جو گیا
دیکھئے طغیانِ رحمت دیکھئے — آب دیدہ داغ عصیاں دھو گیا
واں نہیں دل کی سی ٹھنڈی گرمیاں — کیوں عنایت تم بھی جلتے ہو گیا
بند مٹھی کھول کر بولا وہ شوخ — یہ گیا دل وہ گیا دل لو گیا

خواب میں بھی اے عنایت وہ نہ آئے
سو گیا اپنا مقدر سو گیا

عنایت الرحمٰن عنایت منصف رانچی

ایں خانہ تمام آفتاب است

حُسنِ تغزّل

(از جناب سیّد شاہ ولی الرحمن صاحب ولی کاکوی۔ ڈپٹی مجسٹریٹ)

رگِ گل ہے سواہر تار خوشبو ہے گریباں کا
سمن زار جنوں ہے ہر خزف میرے بیاباں کا

مری آنکھیں دکھاتی ہیں تماشا ابر وباراں کا
دلِ بیتاب نقشہ کھینچتا ہے برق تاباں کا

نمایاں ہے ہر اک برگِ شجر سے رنگ عرفاں کا
تماشا دیکھ لے اے دیدۂ باطن گلستاں کا

غزالانِ حرم تک بھی اسی حلقہ میں آ جائے
کہاں تک سلسلہ پہنچا تری زلفِ پریشاں کا

نمک اتنا بھرا اُس قاتلِ عالم نے جھلا کر
ہوا جرّاح تک گو زخم پر دھوکا نمکداں کا

مری آنکھیں حقیقت بیں جو تھیں صورت پرستی میں
جنازے پر مرے مجمع ہوا گبر و مسلماں کا

جو وہ بہرِ عیادت نزع کیوقت آئے بالیں پر
قضا حسرت سے مُنہ تکنے لگی بیمارِ ہجراں کا

کھٹک سی ہے گر ملتی ہے لذّت اس کھٹک میں بھی
کوئی ٹکڑا نہ ہو زخمِ جگر میں اُنکے پیکاں کا

اٹھا رکھی نہ اپنی سی کسی نے دشتِ غربت میں
کروں دست جنوں کا شکر یا خارِ مغیلاں کا

خوشی ہوتی ہے جسکے دل کو غم بھی اُس کو ہوتا ہے
رُلاتا ہے لہو آخر تبسم زخمِ پنہاں کا

ادب تیغِ محبت کا تڑپنے میں بھی قائم تھا
مرا تارِ نفس ٹوٹا، نہ ٹوٹا زخم کا ٹانکا

تو ہی اے کعبۂ مقصود مطلوب زمانہ ہے
ترے کوچہ میں مجمع کیوں نہ ہو ہندو مسلماں کا

ہمارے زخم کو احسان لینا کب گوارا ہے
تو ہی اے شور بختی بند کر دے منہ نمکداں کا

نہ رازِ عشق لیلیٰ دیکھ امٹی میں ملے مجنوں
نہ پہنچے تا بہ دامن سلسلہ چاکِ گریباں کا

تبسّم زیرِ لب، چتون رسیلی، مست انگڑائی
قیامت زا ہے یہ عالم شبابِ فتنہ ساماں کا

تنوں پر زخم ہیں یا کیاریاں ہیں لالہ و گل کی
ترا کوچہ نہیں قاتل نمونہ ہے گلستاں کا

فتیلہ کاٹ ڈالا شمع کا گلگیر نے آخر
یہی تھا قصہ خواں باقی مری شبہائے ہجراں کا

ولیؔ کہتے نہ تھے ہم جا نہ اس کافر کے کوچہ میں
کیا خود فاش پردہ تو نے اپنے دین و ایماں کا

ولیؔ کاکوی

تاثیرِ درد

(از جناب سیّد شاہ منظور الرحمن صاحب اختر کاکوی برادر جناب وؔلی کاکوی)

شادماں تھا پہلے قاتل ہمتِ دل دیکھکر
اب پشیماں ہو رہا ہے حالِ بسمل دیکھکر

طاقتِ دیدارِ لیلیٰ قیس ہی بھی یا نہیں
پردۂ محمل اٹھانا ہمتِ دل دیکھکر

عشق کی تاثیر آخر کام اپنا کر گئی
رقص میں قاتل ہے خود اب رقصِ بسمل دیکھکر

مرتے مرتے بھی ہے آدابِ الفت کا لحاظ
ہاں تڑپ اے دل مگر دامانِ قاتل دیکھکر

رہروانِ راہِ الفت پُرخطر ہیں منزلیں
پائے شوق آخر بڑھانا ہمتِ دل دیکھکر

حالِ دل منزل میں کیا ہوگا نہ پوچھو ہمدمو
دُور سے جب بیخودی ہے شکلِ منزل دیکھکر

اُٹھ گیا پردہ تو پھر کیا حال ہوگا قیس کا
بیخودی چھائی ہوئی ہے شکلِ محمل دیکھکر

غرق کشتی ہو چلی افسوس ساحل کے قریب
حسرتیں سر پیٹتی ہیں ہوئے ساحل دیکھکر

نکتہ پرور کس قدر ہیں اور کتنے ناشناس
شعر پڑھنا ہو تو اختر رنگِ محفل دیکھکر

اختر کاکوی

"پی گیا"

(از جناب سیّد شاہ نعیم الرحمن صاحب صبا خلف جناب وؔلی کاکوی)

ظرفِ وضو کو پاؤں سے ٹھکرا کے پی گیا
ایماں و دیں کے قصر ہی کو ڈھا کے پی گیا

زاہد کو اپنے زہد پہ کتنا غرور تھا
ساقی کا اِک اشارہ مگر پا کے پی گیا

تھی بے خودی تو مے سے مجھے اجتناب تھا
پر کیا کروں کہ ہوش میں پھر آ کے پی گیا

ساقی تھا، چاندنی تھی، چمن تھا، بہار تھی
دل میں اُٹھی وہ لہر کہ لہرا کے پی گیا

پیتا نہ مے تو زیست کی لذت حرام تھی
غمہائے روزگار سے گھبرا کے پی گیا

تصویر کھینچ گئی نگہِ مے فروش کی
مستی میں جامِ مے کو جو چھلکا کے پی گیا

ہر گام پر سرور تھا ہر ہر نفس تھا کیف
مستی میں خُم کی ٹھوکریں کھا کھا کے پی گیا

ایک ایک شعر ساغرِ رنگیں سے کم نہ تھا
میں اے صبا جگر کی غزل گا کے پی گیا

صبا۔ کاکوی

تبصرے

"تسہیل الترتیل"

از الحاج صلاح الدین محمد الیاس برنی۔ ایم۔اے۔ ایل۔ایل۔بی (علیگ)
ملنے کا پتہ:۔ "مکتبہ ابراہیمیہ۔ حیدرآباد دکن۔ قیمت ۱۲ ؍

تلاوت فرقان حمید کا ذوق رکھنے والوں کو عام فہم طریقہ اور سیدھی سادی زبان میں قرارت کے نکات، علامات واعراب کی تمیز اور مختصر طور پر ترتیل کا طریقہ بتانے کے لئے یہ چھوٹی سی کتاب اپنے مؤلف کی سعی مشکور کو کامیاب ثابت کرتی ہے۔ مسجد کے اماموں، حافظوں اور عربی کے طلباء کے علاوہ ناظرہ خوانوں کو اس کا مطالعہ مفید مطلب ہوگا۔

THE HOLY QURAN ON SECTARIANISM.

از ایم۔ تیمور صاحب۔ ریٹائرڈ ڈسٹرکٹ انسپکٹر آف اسکولس دیناج پور۔ (بنگال)

انگریزی زبان میں باون صفحات کا ایک مضمون ہے۔ جس میں تیمور صاحب نے فرقہ بندی کے خلاف احکام قرآنی سے بحث کی ہے اور دکھلایا ہے کہ اسلام کی روح اس سے بیزاری ہے۔ ممدوح کا ذوق قابل ستائش ہے کہ گورنمنٹ ملازمت کی مدت پوری کرنے کے بعد کئی برسوں کی خانہ نشینی کو تحصیل علم عربی اور مطلب قرآنی تک رسائی کے لئے وقف کر دیا۔ تدبر فی القرآن کا نتیجہ آپ کا یہ مضمون ہے۔ کاش انگریزی کے بجائے اردو کے ذریعہ نتائج افکار کی اشاعت کی ہوتی تو حلقۂ اثر وسیع تر ہوتا۔

ماہنامہ مست قلندر لاہور

چندہ سالانہ چار روپیہ
دفتر رسالہ مست قلندر۔ وشنو لین، گوالمنڈی۔ لاہور

ڈاکٹر بریٹی سنگھ جی اڈیٹر مستحق مبارکباد ہیں کہ مست قلندر کے لئے ایسے ایسے صاحب فکر اہل قلم کا تعاون حاصل کرنے میں وہ کامیاب ہیں جن کے رشحات ہر معیار کے رسالے کیلئے مایۂ ناز ہوسکتے ہیں۔ مگر اس سے زیادہ کمال جناب اڈیٹر صاحب کا یہ ہے کہ ان سب صاحب طرز لکھنے والوں کو انہوں نے اپنے مجلّے کے پالیسی کا ہمخیال بنالیا ہے، وہ پالیسی بظاہر تو "خوش باش دمے کہ زندگانی این ست" ہے مگر اس کے پردے میں خود جناب مدیر اور ان کے قلمی معاونین "حسن صورت" کو "حسن سیرت" اور "خمار اور عیش" کو "دوام عشرت" سے بدلنے کی طرف طبائع کو ایسے غیر محسوس طریقہ سے مخاطب کرتے چلے جاتے ہیں کہ ع کافر نتواں شد ناچار مسلماں شو" کا منظر قریب ہوتا چلا آتا ہے۔ اس رسالہ کے لئے بجا طور پر کہا جاسکتا ہے

ع بلکہ مے میشود از صحبت ناداں بدنام!

REGD NO P. 294 REGD NO P. 294

THE "NADEEM" AUGUST, 1942

صوبۂ بہار کا سب سے قدیم

ماہنامہ

ندیم
گیا

مرتبہ

سید حسن امام

فہرست ماہ اگست سنہ ۱۹۴۲ء

"نثر"

"نظم"

"غزلیات"

نظرات

نشان آنکہ کردم قطع امید از دیار خود | نہادم در حریم کوئے او سنگ مزار خود
برہمن از حرم برگشت و حاجی از حرم آمد | من و اخلاص و عرض بندگی و کوئے یار خود
تو خواہی کافری دان خواہی مسلمانی | مرا کاریست با صدق دل امیدوار خود

ندیم اپنے وطن یعنی شہر گیا میں اب کسی کا زیر بار احسان نہیں۔ ڈاکٹر احمد امام صاحب کی مدت خریداری ستمبر میں ختم ہو جائیگی۔ آنریبل سر خواجہ محمد نور صاحب بالقابہم کیشر اکثر اکے یہاں سے بھی انکار لکھ کر آگیا۔ یہی ایک عظیم المرتبت ہستی تھی جس کے عطیات سے انکار کی کوئی صورت نہیں تھی۔ الحمد للہ کہ بجائے شکوہ دل متشکر ہے۔ ع خدا کا شکر ہے کیسے محبت آپنے کم کی! آخر جام و دردی!!

"عشرت نمبر" ندیم میں "بزم عشرت" کے زیر عنوان مضمون میں چند نادانستہ غلطیاں پائی گئیں جن کی طرف مرزا فدا علی خانصاحب خنجر لکھنوی نے بذریعہ خواجہ غلام محمد صاحب ادارہ کو متوجہ کیا۔ جسکے لئے شکریہ ادا کیا جاتا ہے اور ان غلطیوں پر اظہار افسوس کے ساتھ معذرت پیش کیجاتی ہے۔ واقعہ یہ ہے کہ خواجہ عشرت مرحوم کا ذریعہ نوادر ادب کے حصول کے لئے ڈھونڈھا جاتا تھا۔ اصل ذخیرہ کتب کرہ خانساماں میں رہتا تھا۔ خواجہ مرحوم کے استاد کا نام بھی "محمد جان شاد" تھا نہ کہ "جان محمد"۔ میر کلو عرش کے متعلق خنجر صاحب کے اس خیال کی تائید نہیں کرسکتا کہ "میر انیس" اور مرزا دبیر کے کمالات فن کا نقش انکے دل پر بھی موجود تھا۔ وہ ان ذوات مقدسہ سے نہ صرف حسن عقیدت رکھتے تھے، بلکہ خلوت و جلوت میں اعتراف کمال بھی کرتے تھے" جہانتک حافظہ کام کرتا ہے۔ کم ازکم میر انیس صاحب عموماً اپنا اپنا نیا شعر خواجہ آتش اور میر کلو عرش کو استفادتاً سنایا کرتے تھے" اور مرزا دبیر کو آتش نے لندھور کی داستان کے اشارہ سے جو اصلاح دی تھی وہ آب حیات میں مذکور ہی ہے" علاوہ بریں سمجھ میں نہیں آتا کہ میر تقی میر کی یادگار اور میر حسن کے پوتے کے درمیان صرف معاصرانہ اخلاق ہی برتے جاتے ہوں، وہ بھی محض اس حد تک عرش غریب کو انیس تو استاد زادہ سمجھیں اور عرش کے دل پر انکے کمالات کا نقش بیٹھے عرش اس باپ کا بیٹا ہے جس کے دوبارہ شعر پڑھوانے پر مصحفی کو فخر ہو، جس کے تلامذہ میں میر خلیق کو میر حسن خود داخل کر کے دم لیں۔ البتہ خواجہ عشرت سے حقہ نوشی کو منسوب کرنا خلاف واقعہ ہے۔ اور "خوشبودار تمباکو کا مداریہ حقہ جس میں پھولوں کا ہار لپٹا ہوتا تھا" مخترع دماغ کی پیداوار ہے۔ اسی طرح خواجہ صاحب کا لباس بھی تفصیل کے اعتبار سے صحیح نہیں ہے۔ ان دونوں باتوں کے متعلق خنجر صاحب کی تحریر سے مندرجہ ذیل اقتباس دیا جاتا ہے:-

" واقعہ یہ ہے کہ خواجہ عشرت مرحوم وضع کے بڑے پابند تھے، گرمی کی فصل میں الپاکا یا اسی طرح کسی دوسرے کپڑے کی شیروانی، اسکے نیچے تنزیب کا کرتا اور سفید سوتی [illegible] پہنا کرتے تھے۔ چالیس کا پاجامہ ڈھیلی مہری کا علیگڈھ کی وضع پر ہوتا تھا۔ ایرانی ٹوپی اٹلی یا لندن کی بنی ہوئی ہمیشہ زیب سر رہی۔ جوتے دوڑی دار ہوتے تھے کبھی سیاہ اور کبھی براؤن گرم کے۔ جاڑے میں شیروانی کشمیرے یا سرج کی ہوتی تھی۔ اس کے نیچے گرم کپڑے کی قمیص اور [illegible] سوئیٹر۔ اس وضع میں کبھی فرق نہیں آیا۔ حتی کہ جب شیعہ سنی اختلافات کی خلیج عمیق سے عمیق تر ہو چلی تھی بعض تنگ نظر احباب نے ایرانی ٹوپی (جو غلط فہمی سے شیعوں کی خاص ٹوپی سمجھ لی گئی تھی) کی مخالفت کرتے ہوئے ترکی ٹوپی استعمال کرنے کا مشورہ دیا جسکو انہوں نے قبول نہیں کیا۔ وہ بید یا چھڑی بھی ہاتھ میں نہیں رکھتے تھے۔ بار [illegible] کے زمانہ میں مینہ بوندی سے بچنے کو چھتری لے لیا کرتے تھے، انگلیوں میں انگوٹھیاں (انگشتریاں) پہنے کبھی نہیں دیکھا گیا۔ جہانتک مجھے علم ہے انہوں نے حقہ کو کبھی منہ نہیں لگایا۔ دکان تو درکنار، انکے مکان پر بھی حقہ موجود نہ تھا۔

پان بیشک نوش فرماتے تھے۔ وہ بھی غذا کے بعد یا کبھی دل چاہا تو ان اوقات کے علاوہ بھی ایک آدھ گلوری کھالی۔ وہ اپنی دوکان پر کسی کو حقہ یا بیڑی، سگریٹ پینے کی اجازت نہیں دیتے تھے۔ مجھے خوب یاد ہے کہ ایک دن شام کے وقت ان کی دوکان پر حاضر تھا کہ مرزا ثاقب صاحب قزلباش تشریف لائے۔ رسمی صاحب سلامت اور مزاج پرسی کے بعد موصوف بھی دکان پر میرے برابر بیٹھ گئے۔ اور کسی ادبی موضوع پر گفتگو چھڑ گئی۔ باتوں نے طول کھینچا اور مرزا صاحب نے سگریٹ نکال کر سلگانا چاہا، خواجہ صاحب دوکان کے اندرونی حصہ میں تشریف فرما تھے، فی الفور ٹوکتے ہوئے فرمایا "مرزا صاحب! دکان میں کلام مجید رکھے ہیں، ان کا احترام واجب ہے۔ اگر سگریٹ نوش کرنا ہے تو دکان سے اُتر کر نوش فرمایئے ورنہ بجھا دیجئے"

(خنجر لکھنوی)

خنجر صاحب نے "خلار" کی تذکیر کی طرف ادارتی اشارے کا بُرا مانا ہے۔ واقعہ یہ ہے کہ اس تذکیر کا تانیث بنا دینا ادارتی اقتدار سے باہر نہ تھا۔ مگر صرف خنجر صاحب کی تکریم مدِ نظر رکھ کر نوٹ پر اکتفا کیا گیا تھا۔ پھر بھی انہوں نے اس پر گرفت فرمائی ہے، اس کو سوائے اس کے اور کیا کہا جائے کہ ع کیا کہا ہم نے آپ کیا سمجھے!

نواب خواجہ محمد شفیع صاحب دہلوی کے مکمل افسانہ "سبق" کی طرف ناظرین کو خصوصیت کے ساتھ متوجہ کیا جاتا ہے۔ ٹکسالی زبان، لطفِ بیان، محاورات کا بجا استعمال، باتوں باتوں میں اصلاحِ حال و خیال، نثر میں شاعری، سبھی کچھ تو ہے، اس افسانہ کا ایک حصہ ہمارے خواجہ صاحب کی وسعتِ اخلاق سے موقر معاصر "نیرنگ خیال" لاہور کے صفحات کی زینت بھی بڑھا رہا ہے اور اس جملے تک وہاں شایع ہو رہا ہے "غرضکہ بارہ بجے تک یہ لطافت فردوسِ گوش اور جنتِ نگاہ بہم پہونچاتی رہی"

بابو رادھا موہن صاحب پرنسپل پٹنہ آرٹ اسکول ندیم کے قدردانوں میں اپنی حق پسندی کے اعتبار سے ممتاز ہیں۔ ادارہ کی اس تحریک کا آپنے فراخدلی سے خیر مقدم کیا ہے کہ "خوشنویسی" کی تعلیم کا بھی اسکول میں نظم ہونا چاہیئے۔ اس کیلئے سب سے اول ضرورت اقتصادی ہے جس کو سوائے قدردانوں کے کون پورا کرسکتا ہے۔ مگر مخیرین کا جو حال ہے ناگفتہ بہ!

لاہور کے مشہور فسانہ نویس جناب ایم۔ اسلم صاحب کا ساتھ انکی شریک حیات مرحومہ نے چھبیس برس کی یکجائی کے بعد بحکم قضا چھوڑ دیا انا للہ و انا الیہ راجعون۔ یہ حادثہ فاجعہ ۲۸ جولائی ۱۹۴۲ء کو شب کے وقت ہوا۔ ادارہ ندیم تعزیت پیش کرتا ہے:۔

قطعۂ تاریخ سانحۂ ارتحال بیگم ایم۔ اسلم لاہور طاب ثراہا

خارِ غم ہے حاصلِ کشتِ زمینِ زندگی
خونِ دل سے بھر گیا ہے ساتگینِ زندگی

خانہ ویرانیٔ اسلم سے فلک کیا مل گیا
کاش سمجھے تجھ سے ربّ العالمینِ زندگی

ایک دو دن کا نہیں چھبیس برس کا تھا ساتھ
ہائے تنہا رہ گیا اندوہگینِ زندگی

جو تھی جولائی کی بست و نہ جمادی ثانوی
رات بھر اشکوں سے تر تھی آستینِ زندگی

کیا کوئی تاریخ ہو اس عہد سے بہتر حسن
ماتمِ کاملِ شریکِ نازنینِ زندگی

۱۳۶۱ھ

ندیم

جلد ۱۹ بابت ماہ اگست ۱۹۴۲ء نمبر ۸

فہم قرآن
تشریح سورۂ یوسف

(از سید ناظم ہاشمی صاحب گیاوی)

ندیم ادب اردو کا خادم ہے۔ مذہبی مباحث سے اس کا کوئی واسطہ سروکار نہیں۔ اس پر بھی جناب سید ناظم ہاشمی کے مقالہ کو محض اس لئے جگہ دیجا رہی ہے کہ اس کا ادبی پہلو بھی ضمناً سہی مگر موجود ہے۔ "ادارہ"

سورۂ یوسف کی تشریح و تفسیر علمائے متقدمین و متاخرین دونوں ہی نے کی ہے۔ لیکن موجودہ دور کے علماء میں مولانا ابوالکلام آزاد اور مولانا حفظ الرحمن سیوہاروی نے جو تفسیریں کی ہیں وہ قابل مراجعت ہیں۔ مولانا ابوالکلام آزاد صاحب "ترجمان القرآن" میں عام زنانِ مصری کے ہاتھ کاٹنے کو کید سے تعبیر کرتے ہیں۔ اور وہ سمجھتے ہیں کہ ہر عورت حضرت یوسف علیہ السلام پر ریجھ گئی اور مکر سے اپنے ہاتھ کاٹ ڈالے۔" مولانا حفظ الرحمن صاحب نے بھی "قصص القرآن" میں انہیں اقتباسات پر اکتفا کی ہے جو مولانائے موصوف نے "ترجمان القرآن" میں لکھے ہیں۔"

میں سمجھتا ہوں کہ قرآن عزیز کی تفسیر و تشریح صرف لغت عرب ہی سے نہیں کیجا سکتی، بلکہ کہیں زیادہ پیغمبر خدا صلی اللہ علیہ وسلم کی احادیث مقدسہ کی معرفت بھی ضروری ہے۔ اب اس خیال کے ماتحت میں یہ دکھانا چاہتا ہوں کہ سورۂ یوسف

میں عزیز مصر کی بیوی کا وہ واقعہ جو حضرت یوسف علیہ السلام کے ساتھ پیش آیا۔ اس کی اصل توجیہہ کیا ہو سکتی ہے؟

قرآن حکیم ان تمام واقعات کو بیان کرتے ہوئے جو حضرت یوسف علیہ السلام کی بیع کے قبل پیش آئے تھے یہ ظاہر کرتا ہے:۔ وَقَالَ الَّذِي اشْتَرَاهُ مِن مِّصْرَ لِامْرَأَتِهِ أَكْرِمِي مَثْوَاهُ عَسَىٰ أَن يَنفَعَنَا أَوْ نَتَّخِذَهُ وَلَدًا "مصر کے اس شخص نے جس نے حضرت یوسف علیہ السلام کو خرید کیا۔ اپنی عورت سے کہا کہ اسے عزت و آبرو سے رکھو، شاید یہ ہمارے کام آئے۔ یا اسے ہم متبنیٰ بنا لیں۔"

حضرت یوسف علیہ السلام اس دور محن سے نکل کر جو ماقبل آیات میں مذکور ہے، ایک ایسی حالت سے دوچار ہوتے ہیں جس میں زندگی کی امید پائی جاتی ہے، مستقبل کے لئے راستے ہموار نظر آنے لگتے ہیں، اور دشمنوں سے چھٹکارا ملتا ہے۔ خداوند جل مجدہٗ کا فرمانا کہ یہ پہلا منظر تھا کہ حالات موافق نظر آئیں۔ تاریکی کے بادل ہٹتے چلے جائیں اور روشنی نمودار ہونے لگے یہاں پر اسی لئے فرمایا گیا ہے:۔ وَكَذَٰلِكَ مَكَّنَّا لِيُوسُفَ فِي الْأَرْضِ وَلِنُعَلِّمَهُ مِن تَأْوِيلِ الْأَحَادِيثِ ۚ وَاللَّهُ غَالِبٌ عَلَىٰ أَمْرِهِ وَلَٰكِنَّ أَكْثَرَ النَّاسِ لَا يَعْلَمُونَ "اور اسی طرح ہم نے یوسف (علیہ السلام) کیلئے زمین ہموار کر دی۔ اور البتہ ہم اُسے باتوں کی سمجھ بھی دیں گے۔ اللہ ہر کام پر غالب ہے۔ لیکن اکثر لوگ نہیں سمجھتے۔"

اب جبکہ حضرت یوسف علیہ السلام کے لئے زمین ہموار ہو چکی، راستے کی تمام دشواریاں ختم ہو چکیں تو حسب وعدہ علم و حکمت کی بخشش کی گئی:۔ وَلَمَّا بَلَغَ أَشُدَّهُ آتَيْنَاهُ حُكْمًا وَعِلْمًا ۚ وَكَذَٰلِكَ نَجْزِي الْمُحْسِنِينَ "اور جب وہ (یوسف علیہ السلام) جوان ہوئے تو ہم نے اُسے حکمت و علم عطا کی اور اسی طرح ہم نیک کام کا نیک بدلہ دیتے ہیں۔"

بظاہر ابھی حضرت یوسف علیہ السلام سے کوئی ایسا نیک کام دیکھنے میں نہیں آتا۔ لیکن قرآن کریم نے وَكَذَٰلِكَ نَجْزِي الْمُحْسِنِينَ کا کہہ کر حضرت یوسف علیہ السلام کے نیک کام کی تشریح کر دی۔

وہ نیک کام کیا تھا؟ بھائیوں کی بدسلوکیوں اور ایذا رسانیوں پر صبر۔ یہی وہ نیک کام تھا جس کا قرآن نے ذکر فرمایا ہے:۔ وَاصْبِرْ فَإِنَّ اللَّهَ لَا يُضِيعُ أَجْرَ الْمُحْسِنِينَ "صبر کر۔ اللہ نیک کام کرنے والوں کا اجر ضائع نہیں فرماتا۔ بہرحال اگر یوسف علیہ السلام کی گمشدگی پر یعقوبی صبر، صبر جمیل تھا۔ بَلْ سَوَّلَتْ لَكُمْ أَنفُسُكُمْ أَمْرًا ۖ فَصَبْرٌ جَمِيلٌ تو بھائیوں کی ایذا و تکلیف پر صبر کرنا درجہ تھا محسنین کا۔" اسی لئے قرآن حکیم نے وَكَذَٰلِكَ نَجْزِي الْمُحْسِنِينَ سے مخاطب فرمایا ہے۔"

آگے چل کر ہی واقعات رونما ہوتے ہیں جن کا اولین سطروں میں ذکر آچکا ہے۔ لیکن ایک لطیف نکتہ اور ہے جو بیان کر دینا ضروری معلوم ہوتا ہے۔ "حضرت یوسف علیہ السلام کو علم نبوت سے کب نوازا گیا؟" جو میں اب تک سمجھ سکا ہوں، اور پیرایۂ بیان بھی بتا رہا ہے کہ وہ یہی وقت ہے جبکہ حضرت یوسف علیہ السلام کو

نبوت عطا کی گئی۔ وَلَمَّا بَلَغَ اَشُدَّهٗۤ اٰتَيْنٰهُ حُكْمًا وَّعِلْمًا ؕ (یعنی) جب وہ جوانی کی منزل میں قدم رکھ چکے تو ہم نے حکمت و علم مرحمت فرمایا ـــــــ فَسُبْحٰنَ اللّٰهِ عَمَّا يَصِفُوْنَ ؕ اب حکمت و علم کی روشنی پالینے کے بعد امتحان ہوتا ہے۔ کیسا امتحان۔ سخت مشکل اور کٹھن امتحان ـــــ جوانی ہے، جوانی کی امنگیں ہیں، حوصلے ہیں اور پھر حسن آفتاب کو شرما دینے والا حسن۔ اللہ اللہ کتنا سخت امتحان اور کتنی زبردست آزمائش وَرَاوَدَتْهُ الَّتِيْ هُوَ فِيْ بَيْتِهَا عَنْ نَّفْسِهٖ وَغَلَّقَتِ الْاَبْوَابَ وَقَالَتْ هَيْتَ لَكَ ؕ قَالَ مَعَاذَ اللّٰهِ اِنَّهٗ رَبِّيْۤ اَحْسَنَ مَثْوَايَ ؕ اِنَّهٗ لَا يُفْلِحُ الظّٰلِمُوْنَ ۝ وَلَقَدْ هَمَّتْ بِهٖ ۚ وَهَمَّ بِهَا لَوْلَاۤ اَنْ رَّاٰ بُرْهَانَ رَبِّهٖ ؕ كَذٰلِكَ لِنَصْرِفَ عَنْهُ السُّوْٓءَ وَالْفَحْشَآءَ ؕ اِنَّهٗ مِنْ عِبَادِنَا الْمُخْلَصِيْنَ ۝ "اور اُس عورت نے جس کے گھر میں وہ (حضرت یوسف علیہ السلام) تھے، پھسلایا۔ اور دروازہ بند کر دیا۔ پھر کہا آؤ۔ (یوسف نے) کہا معاذ اللہ وہ میرا رب ہے جس نے مجھے ٹھکانے لگایا۔ یعنی ظلم کرنے والے فلاح نہیں پا سکتے۔ اور البتہ عورت نے ارادہ بد کر لیا، اور وہ بھی (یعنی حضرت یوسف علیہ السلام بھی) ارادہ کر لیتے اگر اپنے رب کی قدرت نہ دیکھ لیتے۔ ایسا ہوا تاکہ ہم اس سے برائی و بے حیائی ہٹا دیں، البتہ وہ ہمارے مخلص بندوں میں سے ہے۔"

یہاں پر[1] اِنَّهٗ رَبِّيْۤ اَحْسَنَ مَثْوَايَ ؕ اِنَّهٗ لَا يُفْلِحُ الظّٰلِمُوْنَ ۝ میں اِنَّهٗ کی ضمیر کا مرجع عام طور پر عزیز مصر کو بنایا جاتا ہے۔ لیکن اگر تھوڑی توجہ سے کام لیا جائے تو اصل حقیقت منکشف ہو جاتی ہے۔ اگر ضمیر کا مرجع عزیز مصر بنایا جا سکتا ہے، جو کسی حال میں بھی صحیح نہیں معلوم ہوتا، تو ایک بہت بڑا سقم پیدا ہوتا ہے۔ ایک پیغمبر کی زبان پر خدا کی کارفرمائیوں کا خیال نہ آکر عزیز مصر کی مہربانیوں کا ذکر آتا ہے۔" فرض کرو کہ اگر یہ معاملہ امرأۃ عزیز کا نہ ہوتا بلکہ کسی دوسری عورت کا ہوتا۔ تو کیا ایسی حالت میں سوء اور فحشاء جائز ہو جاتا۔ اگر ضمیر کا مرجع عزیز مصر کو بنانا مسلّم ہے تو پھر یہ بھی ایک تسلیم شدہ امر ہے کہ اُس وقت فحاشی و بدکاری اپنی جگہ پر فحاشی و بدکاری نہ تھی۔ حالانکہ حقیقت بالکل اس کے خلاف ہے۔ قرآن کریم کے اسلوب بیان پر نظر رکھو تو معلوم ہوتا ہے کہ بُرائی و بدکاری از آدم تا این دم ایک حالت پر رہی ہے۔ ایسا کبھی نہیں ہوا کہ ہر زمانہ میں برائی بھلائی کی ایک نئی لغت قائم کی گئی ہو۔ یہی وجہ ہے کہ قرآن کریم اکثر جگہ وَاْمُرْ بِالْمَعْرُوْفِ وَانْهَ عَنِ الْمُنْكَرِ کہہ کر حقیقت کی طرف رجحان پیدا کراتا ہے۔ جو قرآن کریم کا ایک خاص معجزانہ وصف ہے۔ علاوہ بریں اگر اِنَّهٗ کی ضمیر کا مرجع عزیز مصر کو بنایا جائے تو پھر بُرْهَانَ رَبِّهٖ کی حقیقت گم ہو جاتی ہے اور پھر ایسی تاویل کی ضرورت پڑتی

---

[1] ضمائر کے مرجع کی بحث یا اپنی ذاتی رائے جو میں نے پیش کی ہے۔ اگر اس کے خلاف مستند حدیث مل سکتی ہو تو میں اپنے خیال سے رجعت کر سکتا ہوں۔" (ناظم ہاشمی)

جو دُور از فہم ہے۔ لیکن اگر اس کے وہ معنی لئے جائیں جو میں نے بیان کیا ہے تو برہانِ رب کی حقیقت آشکار نظر آتی ہے

وہ برہانِ رب کیا تھا۔؟ برہان رب یہ تھا کہ یوسف علیہ السلام بھائیوں کے ہاتھوں سخت مصیبت میں پڑجاتے ہیں۔ ایک ایسی مصیبت جس میں لامتناہی آزمائش تھی، اور اس آزمائش میں پورے اترتے ہیں۔ پیالۂ صبر ہاتھ سے چھوٹنے نہیں پاتا۔ اُف تک نہیں کرتے ہیں۔ لیکن یہ اُسی کی کارفرمائی ہے کہ حضرت یوسف علیہ السلام کو بھائیوں کی ایذا رسانیوں سے بال بال بچالیا۔ یہی وجہ ہے خود ربّ ذوالجلال نے اِنّا مَکَّنّا لِیُوسُفَ فِی الْاَرْضِ کہہ کر برہانِ رب کی حقیقت ظاہر کردی۔ پھر وہ جوان ہوتے ہیں تو علم و حکمت کی عطایات نوازے جاتے ہیں، اور نبوّت کا انتخاب ہوتا ہے۔ لہٰذا سلم کی روشنی میں کون یاد آسکتا ہے عزیزِ مصر یا ربّ ذوالجلال، جس نے عزیزِ مصر کے ہاتھوں برہانِ رب کی حقیقت آشکارا کردی۔

اب رہا اَکْرِمِی مَثْوٰىهُ کہہ کر عورت کو پرورش کا خیال دلانا اگر حجت بن سکتا ہے ضمیر کا مرجع عزیزِ مصر کو ماننے کے لئے، جیسا کہ مولانا حفظ الرحمٰن سیوہاروی نے بایں الفاظ فرمایا ہے کہ "عزیزِ مصر نے یوسف علیہ السلام کے متعلق کہا تھا اَکْرِمِی مَثْوٰىهُ ، یوسف علیہ السلام نے اسی کو پیش نظر رکھ کر فرمایا اَحْسَنَ مَثْوَایَ ، میرے خیال میں یہ کوئی روشن اور واضح دلیل نہیں ہے، اور قرآن کا اسلوبِ بیان اس بات کا مؤید بھی نہیں ہے۔

اب اس کے بعد کے واقعات کو لو، جبکہ یوسف علیہ السلام اپنے بچاؤ کے لئے دروازے کی جانب بھاگتے ہیں، عزیزِ مصر کی بیوی ان کو پکڑنے کے لئے دوڑتی ہے، جیسا کہ قرآن حکیم نے وَاسْتَبَقَا الْبَابَ کہہ کر وضاحت کی ہے۔ دونوں بڑھے دروازے کی طرف۔ عورت پکڑنے کی خاطر، اور یوسف علیہ السلام اپنے بچاؤ کے لئے لیکن ناگاہ ٹھیک دروازے پر عزیزِ مصر کو پاتے ہیں اس کی بیوی اپنے سارے مکر و فسوق کو کام میں لانے کا تہیہ کرلیتی ہے دیکھتے ہی اپنے شوہر سے کہتی ہے:-

"ایسے شخص کی کیا سزا ہے جو تیرے اہل کے ساتھ برائی کا ارادہ رکھتا ہو (پھر خود ہی اس کا جواب بھی دیتی ہے۔) یا تو قید کردیا جائے یا دردناک عذاب میں مبتلا کردیا جائے۔" (حضرت یوسف علیہ السلام نے) کہا "اسی نے مجھے ورغلایا" (خدا کا کرنا دیکھو) اُسی کے اہل سے ایک شخص نے (عصمتِ یوسفؑ کی) گواہی دی کہ اگر پیراہن یوسف سامنے سے چاک ہے تو عورت راست باز ہے اور اگر پیچھے سے شکستہ ہے تو وہ (یعنی حضرت یوسف علیہ السلام) (عزیزِ مصر نے حالات کا معائنہ کیا تو) کہا کہ یہ عورت کی مکاریوں سے ایک مکاری ہے۔ عورتوں کا مکر بہت ہی بڑا مکر ہے۔ اے یوسف۔ ان باتوں سے درگذر کر۔ اور اے عورت۔ تو اپنے گناہ کی معافی طلب کر۔ بلاشبہ تو خطاکار ہے۔"

(باقی آیندہ)

سید ناظم ہاشمی گیاوی

علیگڈھ اور ادبِ اردو

علامہ شبلی نعمانی

ایک گروہ کا خیال ہے کہ شاعری نام ہے تخیل کا، دوسرا گروہ کہتا ہے کہ شاعری ایک طرح کی محاکات ہے۔ اور وہ محاکات کے دایرہ کو اس قدر وسعت دیتا ہے کہ تخیل اس سے باہر نہیں جا سکتی اور انشاپردازی کی غرض اصلی اثر ویزی اور جذبہ انگیزی ہے۔ شاعر کو اپنے مخاطب یا سامع سے کوئی غرض نہیں ہوتی۔ جو جن جذبات سے متاثر ہوتا ہے یا جو واقعات اس کی نظر سے گزرتے ہیں، ان جذبات و واقعات کو ظاہر و اُجاگر کر دینا اس کی غرض اصلی ہوتی ہے۔ لیکن اس طریقہ پر کہ سامع یا ناظر ان جذبات سے یکساں متاثر ہو۔ شاعری میں اوزان کی پابندی اور قافیہ و ردیف کا التزام کسی حد تک لازمی شے ہے۔ لیکن صحت واقعات اور اظہار حقیقت کی شے لازمی امر نہیں ہے اور بہت ممکن ہے کہ اظہار جذبات کا جوش اور تخیل کی بلند پروازی میں صحت واقعہ اور حقیقت امر کا دامن نہ چھوٹ جائے، برعکس انشاپردازی کی غرض و غایت کچھ اور بلند ہے۔ اس کا مقصد نہ تو خطابت کی طرح فوری جوش و خروش کو ابھارنا اور نہ ہنگامہ آرائی کرنا ہے۔ اور نہ شاعری کی طرح اظہار جذبات یا خیال آرائی منظور ہوتا ہے۔ بلکہ بقول ایک فلسفی وہ مستقل بالذات شے ہے جس کا مخاطب نہ تو کوئی انسان مجمع ہوتا ہے اور نہ وہ عاجز متکلمین کی جماعت سے تعلق رکھتا ہے۔ وہ اپنی اثر انگیزی میں ایک مخصوص زاویۂ نگاہ، ایک لطیف تاثر، ایک خاص مناسبت دلکشی ہے جو نہ بالکل وقتی ہوتا ہے اور نہ ضرورت سے زیادہ اور اس کے یہاں نہ تعجیل اثر کا لحاظ ہے۔ جس سے انشاپرداز صرف اپنے گردوپیش کی اشیا پر اکتفا کرے۔ اور نہ اوزان قوافی کی پابندیاں جس سے غیر ضروری یا نامناسب الفاظ بھرتی کرنا پڑیں۔ نہ اس کے یہاں تخیل کی بلند پروازی اور مکاحات کی شرط، جس سے صحتِ واقعات اور اظہار حقیقت کا دامن چھوٹ جائے، بلکہ بقول ایک ادیب کے انشاپردازی اظہار خیالات اور تحریر واقعات کا ایک ایسا ذریعہ ہے جو الفاظ کی بے جا نمائش اور معانی کے مبالغہ و غلو سے پاک ہے۔ اس کے ذریعہ واقعات نہایت سیدھے سادے طریقہ سے ادا کئے گئے ہیں۔ خیالات میں لغو اور پیچ نہ ہو، تشبیہ و استعارہ کی جگہ زیادہ تر نفس واقعہ سے کام لیا گیا ہو۔ غرض یہ ایک ایسا طریقہ ہے جو ہر معمولی شخص کے لئے ممکن الحصول اور قابل عمل ہے۔

بقول حضرت نیاز فتحپوری انشاپردازی نام ہے بہترین الفاظ کے بہترین طریقہ پر استعمال کا۔ جدید صفائی اور

خیالات روز پیدا نہیں ہوا کرتے۔ ایک ہی خیال ہوتا ہے جس کو انشا پرداز مختلف طریقوں پر ادا کرتے ہیں۔ اسی لئے کہا جاتا ہے کہ الفاظ و معانی کا تعلق لاینفک ہے اور انشا پردازی ان دونوں کی باہمی اشتراک اور موزونیت کا نام ہے۔ اسی بنا پر علمائے ادب نے انشا پردازی کی دو بڑی جامع اور مانع خصوصیات بیان کی ہیں۔ فصاحت و بلاغت۔ فصاحت کی بڑی خصوصیت یہ ہے کہ تحریر کے الفاظ نہایت صاف اور شستہ ہوں۔ صفائی اور شستگی الفاظ سے یہ مراد ہے کہ اُن کے بولنے میں زبان کو آسانی ہو اور سننے میں کانوں کو بھلے لگیں۔ فصاحت کی ایک بڑی خوبی روزمرہ اور بول چال کا استعمال بھی ہے۔ روزمرہ سے وہ زبان مراد ہے جو نہایت سادہ اور عام فہم ہو اور جسے لکھے پڑھے اہل زبان استعمال کرتے ہوں۔ ظاہر ہے کہ یہی زبان اور اُس کے الفاظ و محاورات رائج الوقت تسلیم کئے جائیں گے۔ فصاحت کے سلسلہ میں سلاست و عدم سلاست کی بحث بھی آسکتی ہے۔ لیکن ایک گروہ اس طرف گیا ہے کہ سلاست و روانی بذاتہٖ کوئی وصف نہیں ہے۔ بلکہ روزانہ کے بول چال اور کثرت استعمال سے تحریر میں سلاست و روانی پیدا ہو جاتی ہے۔ بلاغت کی پہلی شرط یہ ہے کہ اس میں فصاحت کی تمام خوبیاں موجود ہوں۔ بلاغت کا تعلق الفاظ و تحریر کی معنوی حیثیت سے ہے۔ یعنی جو الفاظ استعمال کئے گئے ہوں وہ مفائی کے لحاظ سے بالکل مناسب اور برمحل ہوں۔ بلاغت کی دوسری خوبی یہ ہے کہ جب ایک ہی معنی کے متعدد الفاظ ہوں تو اُن میں سے صرف ایسے الفاظ کا انتخاب کیا جائے جو معنی کے لحاظ سے وہاں سب سے زیادہ موزوں ہوں۔ جب ہم ان خصوصیات پر نظر ڈالتے ہیں اور شبلی کی تصانیف کو اس میزان ادب پر تولتے ہیں تو ایمانداری سے اقرار کرنا پڑتا ہے کہ شبلی کا ادبی وقار بہت بلند ہے۔

شبلی کے تصانیف میں اُن کے خطوط اُن کے مضامین سے بھی بڑھ کر قیمتی ہوتے تھے۔ ایک ایک سطر ادب و انشا پردازی کی جان ہوتی تھی۔ ان خطوط میں لطائف ادبی کی صحیح داد دینا مشکل ہے۔ انہوں نے اپنی مشکل پسندی کے ساتھ اس رنگ کو کس حد تک نباہا۔ اس کی نفس لٹریچر خود ایک مستقل چیز ہے۔ خاص طور پر شرافت اور نزاکت خیال چاہتا ہے۔ نرے روزمرہ اور محاورات کی اُلٹ پھیر سے کام نہیں چلتا۔ اور کمال انشا پردازی یہی ہے کہ وہ ادب اور اصناف سخن کی طرح مستقل بالذات ہو۔ مکاتیب دراصل دیکھئے تو ایک چیز ہے سچ ہے کہ اس علم کے پتلے کا کوئی ونگڑا بھی بقول مہدی بیکار نہیں۔

خط ادب کا ایک ایسا عنصر ہے جس میں لکھنے والے کے اہتمام کو چنداں دخل نہیں ہوتا۔ اگر وہ یہ چاہتا ہو کہ کبھی بھی اُس کے مکتوب کے اشاعت کی نوبت آئیگی تو اظہار خیال بھی اس پایہ کا ہو کہ انشا پردازی اُس کی بلائیں لیتی ہوگی۔ شبلی کے کمالِ فن کا یہ ایک ایسا رُخ ہے جس سے کوئی تذکرہ نگار قطع نظر نہیں کر سکتا۔ خانگی خطوط کا

مجموعہ بہت دلچسپ ہوتا ہے۔ خاصکر جب چشمۂ سخن ان امور کی طرف اشارہ کرتی جائے۔ نجی تحریروں میں چونکہ اہتمام کو قطعاً دخل نہیں ہوتا۔ اس لئے یہ ادبیات کا ایک اضطراری حصہ ہے جو لکھنے والے کی مرتبۂ انشاپردازی کی صحیح غمازی کرتا ہے۔ اچھے بولنے والے اور چوٹی کے شاعروں کو دیکھا ہے کہ دو سطریں سیدھی سادی نہیں لکھ سکتے۔

شبلی مکاتیب میں اپنی نظیر نہیں رکھتے۔ ان کی فطری آزادی، رنگین بیانی، لطافت خیال اور رعنائی جمال کو کسی طریقہ سے نظر انداز نہیں کیا جا سکتا۔ مکتوبات شبلی بھی نہایت درجہ دلچسپ و دلکش خطوط کا مجموعہ ہے۔ اور دلکشی میں رنگین افسانوں سے کسی طرح کم نہیں ہے۔ غالب کے بعد اردو کو ایسا رنگین ادیب نظر نہیں آتا۔ غالب کی سادگی و پرکاری کے بعد شبلی کا بے ساختہ پن دور حاضر کے انشا پردازوں میں، مہدی حسن اور نیاز فتحپوری اور امیر احمد علوی میں پایا جاتا ہے۔ شبلی جانتے تھے کہ معمولی روزمرہ کے واقعات میں تازگی و رعنائی کس طرح پیدا کی جا سکتی ہے۔ اور اہم و غیر اہم سوانح حیات کو اخلاقی چاشنی اور لطافت خیال سے کس طرح لطیف بنایا جا سکتا ہے۔ شبلی کی شخصیت مکاتیب میں بے نقاب نظر آتی ہے۔ لیکن خود وہ انانیت کی کشمکش کہیں بھی نظر نہیں آتی۔ شبلی کا جمالیاتی پہلو انہیں نوادر میں تلاش کیا جا سکتا ہے۔ معلوم ہوتا ہے کہ وہ حسن کو سادگی و صناعی و پرکاری سے فن کی حیثیت سے پیش کرنے کے قائل ہیں۔

ایک ممتاز انشا پرداز نے شبلی کے متعلق حسب ذیل صحیح تبصرہ کیا ہے۔ "غالب زندہ ہوتے تو شبلی کو اپنی اردوئے خاص کی داد ملتی۔ جس نے ایک نوخیز بازاری چھوکری کو جس پر انگلیاں اٹھتی تھیں، آج بس لائق کر دیا کہ وہ اچھی بڑی بوڑھیوں اور ثقہ بیبیوں یعنی دنیا کی علمی زبانوں سے آنکھیں ملا سکتی ہے۔ جوانی پر آئی ہوئی بچی نہیں بیٹھ سکتی تھی۔ باتوں باتوں میں شعر و سخن سے ایسا اتحاد رہا۔ رفقائے سن سے بری طرح کھل کھیلی۔ ہاتھ پاؤں نکالے اور بہتیرے بنائے بگاڑے۔ کیونکہ ایک زمانہ شیدائی تھا۔ لیکن یہ باتوں ہی باتوں میں ٹالتی رہی بعض جگہ بے آبروئی کے سامان ہو کر رہ گئے۔ اور بال بال بچی۔ آخر آخر میں ملک کے منچلے جہاں تک ہاتھ دھو کر پیچھے پڑے کہ اس کی پردہ دری میں کچھ اٹھا نہیں رکھا تھا۔ لیکن [illegible] اس کی حالت نے پلٹا کھایا۔ کثرت فواحش باعث شرمندگی ہو گئی۔ اچھے دن آئے [illegible] تو بگڑی بن جاتی ہے۔ اب وہ [illegible] لیکن سنا گیا [illegible] خوش اوصاف [illegible] زیادہ مانوس ہے۔ اور [illegible] انہیں کے تصرف میں رہتی ہے"

ایک عزیز دوست نے ان اوراق کو پڑھ کر [illegible] حسب ذیل رائے دی [illegible] "مضمون اگرچہ متعدد صفحات پر پھیلا ہوا ہے لیکن زندگی کی تلاش و تفتیش [illegible] دقت نظری کا تحریری ثبوت ہے، اگر معاف فرمائیے [illegible]

بھی تشنہ۔ سب سے بڑی کمی ان کی نظم و نثر شبلی کی مثالوں کی ہے۔ جستہ جستہ اور چیدہ چیدہ مثالیں ضروری ہیں۔ تاکہ مطالعہ کنندہ مشاہدات بیان کی تصدیق بھی حاصل کرتا جائے۔ تنگیہائے گنجائش رسائل ممکن ہے اس سے پیدا ہونے والی مزید اطالت کا بار اٹھانے میں تکلف کرے۔ مگر کتابی صورت سے شائع کرتے وقت اس کمی کو ضرور پورا کیجیے۔ بلکہ میں تو عرض کروں گا کہ اگر اس کی طرف عنان توجہ منعطف کرنے کا موقع ہو طبع وقار رغبت محسوس کرے اور مشاغل مقررہ سے وقت میسر ہو تو اس کمی کو پورا ہی کر دیں۔"

غالباً میرے عزیز دوست کو غلط فہمی ہوئی، اس سلسلہ کا مقصد مصنفین کے سوانح حیات یا اُن کے تصانیف کا انتخاب نہیں ہے۔ مقصد تو علیگڑھ کو اجاگر کرنا ہے۔ شبلی کو جس حد تک بلندی سے پیش کیا جا سکتا تھا وہ کیا گیا ہے، لیکن خیر اس بہانہ سے ایک فائدہ ضرور ہوا اس پورے مضمون میں کہیں بھی شبلی کے عادات و خصائل پر کوئی تبصرہ نہیں تھا، لیکن اب اس کمی کو پورا کیا جاتا ہے۔:-

شبلی نے ۲۱ ستمبر سنہ ۱۳ء کو ایک خط میں اپنے خصائل و عادات موجودہ پر تبصرہ کیا ہے۔:-

...... "متعدد دفعہ حیدر آباد اور دیگر ریاستوں میں بیش قرار تنخواہوں پر بلایا گیا۔ لیکن علمی مشغلہ کو چھوڑ کر نہ گیا۔ حیدر آباد سے جو معمولی وظیفہ مقرر ہے اس پر قناعت کی، ریاستوں نے صلے اور نذرانے دیئے اور دینا چاہے۔ لیکن ہمیشہ انکار کیا اور واپس کر دیا۔ رائے میں ہمیشہ آزاد رہا۔ سرسید کے ساتھ ۱۶ برس رہا لیکن پولیٹیکل مسائل میں ہمیشہ اُن سے مخالف رہا۔ اور ...... کو پسند کرتا رہا۔ اور سرسید سے بارہا بحثیں ہوئیں۔

وطن یعنی اعظم گڈھ میں مسلمانوں کا کوئی اسکول نہ تھا اور مسلمان انگریزی سے بالکل الگ تھے۔ میں نے نیشنل ہائی اسکول قائم کیا، اس کے اکثر مصارف خود ادا کئے۔ پھر ندوہ کی تحریک میں جزو غالب رہا۔ اور جب ندوہ بالکل مر گیا تھا اُس کو از سر نو زندہ کر کے ترقی دی۔ تصنیفات میں خاص یہ خیال رہا کہ مستقل شاخیں تیار کر دوں۔ چنانچہ علم الکلام، تاریخ لٹریچر (موازنہ و شعر العجم) تین شاخوں پر سیریز تیار کروں۔ فارسی شاعری میں زبانوں کو اصول پر برتا۔ ملازمت تو اکثر علمی ہی اختیار کی۔ لیکن وکالت اور سرکاری ملازمت کے زمانہ میں بھی درس و تدریس کا سلسلہ جاری رکھا۔ اور فطرت تھی بچپن سے میری صحبت جن لوگوں میں تھی، اور وہ لوگ ہمیشہ ان مشاغل کی [illegible] کیا کرتے تھے، لیکن کبھی ناچ رنگ بلکہ گانے میں شریک نہ ہوا۔ جب راجہ کشن پرشاد وزیر ہوئے اور حسب دستور [illegible] پہنے گیا تو ان کے [illegible] نے کہا کہ آپ نے تو تہنیت کا قصیدہ لکھا ہوگا۔ میں نے کہا یہ اوروں کا پیشہ ہے [illegible] کام نہیں کرتا۔ [illegible] بد دل ہوئی اور میں نے ناگواری کے ساتھ جواب دیا کہ میں کسی کی مدح نہیں کرتا۔ [illegible] نایاب کتابیں [illegible] بہم پہنچائیں اور کثرت سے مطالعہ کیں۔ سرسری باتیں لکھ دیں خود اپنا لکھا کیا گاؤں؟
[illegible] بیان کے بعد [illegible] کہا جا سکتا ہے۔ [illegible] مزاج میں تلون زیادہ تھا اور شبلی زود رنج بھی حساس ہونے کی وجہ سے

تھے ۔شبلی میدان ادب میں گو بعد کو آئے لیکن بقول تنہا سب سے پیچھے نہیں بیٹھے ۔ ؎

اس قافلہ میں آکے ملا گو وہ سب کے بعد — اگلوں کے ساتھ مگر رہ نورد تھا

ایک نہایت تجربہ کار اور وسیع معلومات جرمن مستشرق نے شبلی کی تصانیف کے متعلق حسب ذیل رائے دی ہے:
" اگر کوئی ہندوستانی تصانیف تحقیق و تدقیق کا پایہ رکھتی ہیں تو وہ علامہ شبلی نعمانی کی تصانیف ہیں۔گو یہ کس گونہ اسلامی رنگ لئے ہوتی ہیں ۔"

شبلی کی تصانیف بقول مسٹر تنہا بلحاظ عالمانہ استدلال و انداز کسی مستند یورپ [illegible] تصنیف سے کم نہیں۔ آپ کی سب سے بڑی خصوصیت منطقی رائے اور منطقی استدلال ہے، ان میں ایک قسم کی [illegible] بھی ہیں، اور طرز ادا میں دل آویزی اور عام فہمی کا خیال ملحوظ رکھا گیا ہے۔ عالمانہ عبور، غور و خوض کی قوت تجسس، درایت علمی حقائق نتائج کا استخراج، تقسیم و تحلیل شبلی کو درجۂ امتیاز بخشتی ہیں۔

نواب صدریار جنگ بہادر ڈاکٹر حبیب الرحمٰن خاں شیروانی رئیس حبیب گنج نے شبلی کے متعلق حسب ذیل رائے دی ہے :-

" سب سے اوّل ملاقات ۱۸۸۶ء میں ہوئی، آغاز تعارف اختلاف سے ہوا۔ المامون پر ریویو لکھا۔ یہی ریویو تھا جس کا علامہ شبلی نے جواب دیا۔ یہ بے نیازانہ شعر بھی جواب میں تھا۔ ؎

رسید انکہ بہ [illegible] ما کہ چو ما — خامہ گیری و حرف بنگاری

ملاقات بڑھ کر سرحد نیازمندی تک پہنچی، نیاز مخلصانہ محبت سے مبدل ہوا اور [illegible] اخلاص علامہ مرحوم کی رحلت تک قایم رہا، موت نے اخلاص میں کمی نہ کی، بلکہ حسرت کا اضافہ کیا۔ [illegible] سالہ مودت کے دوران میں صدہا ملاقاتیں ہوئیں۔ اس تجربہ کے بعد میں [illegible] سکتا ہوں کہ علامہ مرحوم سچے اور با اخلاص دوست تھے۔ اس زمانہ کی سوسائٹی کی بہت سی کمزوریوں سے پاک [illegible] اور صاف تھے۔ اُن کے [illegible] کا معیار بہت بلند تھا۔ نظر میں بلندی تھی، مزاج میں استغنا، حوصلہ [illegible] عزم تھا۔ مزاج میں نفاست [illegible]، دوستی اور مخالفت دونوں شدید تھیں، لیکن دوستوں کی مروّت کبھی اُن کو رسمی [illegible] ق و چاپلوسی پر آمادہ نہ [illegible] تی تھی۔ عزیز سے عزیز دوست کی خاطر وہ اپنی رائے سے نہیں ہٹتے تھے۔ صحبت نہایت پاکیزہ و شگفتہ تھی [illegible] ت شدید تھا۔ چائے سادہ اور کڑوی پیتے تھے۔ صبح کو نماز کے اوّل وقت چلہ [illegible] لی کر فارغ ہو جاتے [illegible] عادت میں سادگی تھی لباس عمدہ اور نفیس پہنتے تھے۔ غذا بہت کم تھی، آخر آخر میں اس کی قلت سے حیرت ہوتی تھی ۔"

خواجہ غلام الثقلین کا صداقت نامہ بھی ملاحظہ کیجئے :-

"۱۸۸۰ء میں جب میں اینگلو عربک اسکول دہلی میں مڈل جماعت میں پڑھتا تھا، اور مولانا حالی کے ساتھ رہتا تھا۔ پہلی بار مولانا شبلی کو دیکھنے کا اتفاق ہوا، اُس وقت اُن کی عمر ۳۰ سال کی تھی، چہرہ گول اور بھرا ہوا تھا، جس سے ذہانت اور قوت کے آثار نمایاں تھے۔ صبح امید اس سے قبل شائع ہو چکی تھی۔ اکتوبر ۱۸۸۹ء سے دسمبر ۱۸۹۵ء تک میں علیگڑھ میں رہا، چند درمیانی وقفوں کو چھوڑ کر کمرے کے علاوہ بھی مولانا سے ہفتہ میں دو چار بار ملاقات کا موقع حاصل ہوتا تھا۔ اس کے بعد حیدرآباد اور لکھنؤ میں بھی ملاقات کے بہت سے موقعے حاصل رہے۔ اس لئے ذاتی طور پر میں مولانا کے خصائل بیان کر سکتا ہوں۔ علیگڑھ کے طلبار میں مولانا شبلی عموماً غیر ہر دلعزیز تھے۔ اور اُن کو طلبار خشک اور مغرور سمجھتے تھے لیکن یہ خیال غلط تھا۔ مولانا کی نگاہ دور رس نہ تھی، اس لئے فاصلہ سے طلبا کو پہچان نہ سکتے تھے۔ جب کوئی سلام کرتا، یا سامنے سے گذرتا تو اُس کو غور سے دیکھا کرتے تھے اس سے طلبا کو غلط فہمی ہوتی تھی۔ دوسرے وہ بآسانی آشنا نہیں ہوتے تھے۔ جس میں علمی اور ادبی مذاق نہ ہوتا اُس کی ملاقات سے مولانا کسی مسرت کا اظہار نہ کرتے تھے۔ جو طلبار علمی مباحث میں دلچسپی لیتے تھے اُن سے مل کر وہ بہت خوش ہوتے تھے اور جلد بے تکلف ہو جاتے تھے، اُن کی صحبت میں جاہلانہ گفتگو کو بہت کم دخل ہوتا تھا۔ یہی سبب تھا کہ اُن کے ملنے والوں کا دائرہ بہت محدود رہتا تھا۔ وہ کسی دن بھی فلسکیپ کے دو یا تین صفحے سے زیادہ نہیں لکھتے تھے، زیادہ وقت مطالعہ میں اور زیادہ سے زیادہ ڈھائی گھنٹے لکھنے میں صرف کرتے تھے لکھتے دیر میں اور سوچ کر، مگر اس میں کاٹ چھانٹ بہت کم ہوتی تھی، ایک دو سطر بیچ میں چھوڑ کر کھلا کھلا لکھتے تھے۔ خط نہایت صاف اور باقاعدہ ہوتا تھا۔ آخر عمر تک خوشنویسی کی شان اس قدر تھی کہ شاید ہی کوئی اتنا بڑا مصنف حروف کی خوبصورتی کی اس قدر پروا کرتا ہو۔ ۱۷ برس کی عمر سے ۵۷ برس کی عمر تک اُن کے پورے ۴۰ سال خالص علمی زندگی میں بسر ہوئے۔ یہ علمی زندگی بھی محض تقلیدی ورق گردانی نہ تھی اور نہ صرف بیکار معلومات کا دماغ میں جمع کرنا اس کا مقصد تھا، بلکہ وہ اس کے ذریعہ روشنی اور آزادی پھیلانا چاہتے تھے۔ مولانا شبلی کے عزم و استقلال، محبتِ قومی علمیت اور بلند ارادوں سے کوئی انکار نہیں کر سکتا۔ روپے کی محبت مولانا کو کبھی ایک لمحے کیلئے بھی نہیں ہوئی"

مولانا عبدالحلیم شرر کا سرٹیفکٹ بھی دیکھئے :-

"مولانا نے جن درسگاہوں میں تعلیم پائی تھی، اور جن اساتذہ سے پڑھا اُن کی محبت نے ابتدا ہی میں اُنہیں سخت حنفی بنا دیا تھا۔ اسی شوق میں اُنہوں نے اپنے نام کے ساتھ نعمانی لکھنا شروع کیا۔ وہ نسباً نعمانی نہ تھے۔ جوش حنفیت کا تقاضا تھا کہ انہوں نے سیرۃ النعمان لکھی اور محمد بن المقیل بخاری اور امام ابوالحسن اشعری پر جا بجا حملے کئے۔ علیگڈھ میں ان میں جستجو و تحقیق کا سچا مذاق دیکھ کر سید صاحب نے اُن سے ربط و ضبط بڑھایا۔ اکثر کھانا ایک ساتھ کھاتے تھے اور روزانہ بلاناغہ مولانا اور سید صاحب میں گھنٹوں صحبت رہتی۔ سید صاحب ہمیشہ اعتقادی و کلامی مسائل اور

مورخانہ تحقیق کے غور و خوض میں رہتے تھے۔ اور تحقیق و تدقیق کے انہیں اکثر حدیث و فقہ، تاریخ و سیر کی کتابوں کے مطالعہ کی ضرورت پڑتی۔ سید صاحب نے یہ کام مولانا شبلی سے لینا شروع کیا اور مولانا شبلی نے اس خدمت کو اس خوبی اور قابلیت سے انجام دیا کہ جس قدر سید صاحب کی دقیقہ رسی اور وسعت نظر کے مولانا شبلی قائل ہوتے جاتے تھے اُس سے زیادہ سید صاحب ان کی تلاش جستجو اور جلب روایات کے معتقد و معترف ہو گئے تھے۔ سید صاحب کے اعتراف کی تو یہ حالت تھی کہ کوئی کام بغیر ان کے مشورہ کے نہ کرتے تھے۔ اور مولانا شبلی کے اعتراف کا یہ ثبوت ہے کہ صبح امید میں مسلمانوں کی غفلت اور سید صاحب کی برکت سے اُن کے بیدار ہونے کو نہایت ہی پر لطف اور موثر الفاظ میں ظاہر کیا ہے۔ یہ نظم علیگڑھ کے ایک طالبعلمانہ تھیٹر میں انہوں نے خود پیش کی تھی، وہ ایک دقیقہ رس شاعر تھے اور اپنی نظموں کو ایسی نغمہ خیز دھن میں سُنایا کرتے تھے کہ پبلک نے بہت پسند کیا، اور طلبار نے قومی نغمہ خوانی کی ایک مقبول عام دھن بنا کے سارے ہندوستان میں پھیلا دیا۔ وہ شاعر نہ تھے اور نہ شاعری کے لئے پیدا ہوئے تھے، بلکہ علم کے عالم میں اُن کی شان ایک شاعر کے درجہ سے بہت ہی ارفع و اعلیٰ تھی ——— علیگڈھ کالج سے علحدگی کے بعد ندوۃ العلمار میں شرکت کی، اُن کے بہت سے دوستوں نے روکا، بہت سمجھایا مگر اُنہوں نے نہ مانا اور نتیجہ یہ ہوا کہ گو اُنہوں نے ندوہ کو بے حد فائدہ پہنچایا اور ندوہ کو ندوہ بنایا، مگر آخر میں ندوہ والے مرحومین امت ہی کے ہاتھ سے مار کھا گئے جس کا اُن کے دوستوں کو بے حد ملال ہوا۔ اور نہ وہ بھی اپنی اس محنت کے اکارت جانے پہ کفِ افسوس ملتے ہوئے مرے۔"

شبلی کے اولاد میں محمد حامد تھے جو تحصیلداری کے عہدہ سے وظیفہ یاب ہوئے۔ خان بہادری کا خلعت و خطاب بھی ملا۔ ابھی حال میں انتقال ہوا ہے۔ شبلی کے برادر زادہ مسٹر محمد اقبال احمد اس وقت الٰہ آباد ہائی کورٹ کے چیف جسٹس ہیں۔ اور دیگر اعزہ بھی ماشاء اللہ خوش حال اور صاحب اقتدار ہیں۔ اصلی اولاد اُنکی دار المصنفین ہے جو صحیح معنوں میں مجمع العلمار (اکاڈمی) ہے اور اس اکاڈمی کو دیکھنے کا شرف مجھکو بھی حاصل ہے۔ اس کا ڈر کے تربیت یافتہ اس وقت ملک میں کافی روشناس ہیں اور پروفیسر نجیب اشرف کا علمی وقار اس اکاڈمی میں بہت بلند ہے۔ صوبۂ بہار نے اس اکاڈمی سے خاصہ فائدہ اٹھایا ہے، اور ہر دور میں صاحب قلم اس صوبہ نے دار المصنفین کو دیئے ہیں۔ آج بھی بہت سے قابلِ عظمت بہاری اردو ادب کی خدمت کر کے اس تاسیس اکبری کے موسسِ اعلیٰ کی روح پر فتوح سے دعائیں شب و روز لیتے رہتے ہیں ——— لیکن یہ سب صلہ ہے علیگڈھ کا!

شبلی کا کلام انسانی فطرت کی عکاسی ہے، وہ انسانی خد و خال میں اُس کی باطنی اوصاف کی جھلک دیکھنا چاہتے

ہیں، ان کا مطمح نظر بلند ہے۔ ان کی نگاہ دُور بین سطحی حسن ہی تک محدود نہیں رہتی اور یہی وجہ ہے کہ اکثر اوقات شبلی کی شگفتہ نگاری نے اکثر فلسفہ و تاریخ کے خشک و فرسودہ مضامین میں جان ڈال دی ہے۔ صفحات کے صفحات پڑھ جایئے طبیعت نہیں اُکتاتی، بلکہ رنگین بیانی و ادبی لطافت سے قالب بے جان میں رُوح پھونک دی جاتی ہے۔ اور دقیق مسائل بھی عام فہم ہو جاتے ہیں اور گزشتہ صدیوں کی سیاسی بساط کی پُرپیچ چالیں بچوں کا کھیل معلوم ہوتی ہیں اور حیرت انگیز تاریخی واقعات آنکھوں کے سامنے صاف آجاتے ہیں۔ شبلی محتاط سیرت نگار بھی تھے، وہ سطحی حالات کو زیادہ اہمیت نہیں دیتے، لیکن باطنی سیرت سے ان سطحی جزوی واقعات سے تعلق ظاہر کرنے کی کوشش کرتے تھے۔ اصل یہ ہے کہ وہ باطنی اور ظاہری سیرت کے امتزاج سے ایک مکمل شخصیت پیش کرنا چاہتے ہیں اور یہ بھی ایک بڑی حد تک اہم کامیابی ہے۔

کامیاب ترین ادب وہ ہے جو حال و مستقبل کا آئینہ دار ہو، جس میں واقفیت نامہ، تخیل افادیت اور جمالیاتی آہنگ کا فقدان نہ ہو، اور اجتماعی و انفرادی حیثیت سے وہ ہمارے ذوقِ عمل اور ذوقِ حُسن کو بیک وقت (ایک نقطۂ کمال پر پہنچ کر) لطیف سنجیدگی کے ساتھ آسودہ کر سکے۔ کیا شبلی کا ادبی وقار اس اعلیٰ اصول اور برتر زاویہ سے آپ کو کچھ ہٹا سا نظر آتا ہے؟

اب وقت آیا تھا کہ شبلی اپنے فضل و کمال کی داد پاتے اور اگلے سخنوروں کی طرح اُن کے فرقِ ہمایوں پر بھی تاجِ فضیلت کا طرۂ امتیازی نظر آتا لیکن بے رحم موت نے اُن کو موقع نہ دیا۔ ایک ٹانگ حادثہ میں پہلے ہی ضائع ہو چکی تھی، شبلی ہنگامۂ مشرق میں پیدا ہوئے اور ۵۷ کے سن میں ارکانِ ندوہ کی کج ادائیاں، اغیار کی مسلسل حرف گیریاں رنگ لائیں اور بقول مہدی حسن ان کا دل ٹوٹ چکا تھا کہ چھوٹے بھائی کی موت نے کمر توڑ دی اور ۱۵ دن کی علالت کے بعد ۱۸ نومبر ۱۹۱۴ء مطابق ۲۸ ذی الحجہ ۱۳۳۲ھ کو ایک گراں مایہ ہستی دفعتاً پیوندِ خاک ہو گئی، اس قدر جامع صفات شخصیت اب کہاں آفتاب نہ کہیئے کہ وہ پھر بھی طلوع ہو سکتا ہو۔ سچ یہ ہے کہ علم مجسم ہمیشہ کے لئے اعظم گڈھ میں دفن ہو گیا۔ ؎

رفتم و از رفتنِ من عالمے تاریک شد
من مگر شمعم چو رفتم بزم برہم ساختم

تصانیف:۔ رسالہ گذشتہ تعلیم ۱۸۸۴
الجزیہ۔ کتب خانہ اسکندریہ۔ المامون، رسائل شبلی
سیرۃ النعمان۔ الفاروق۔ سفرنامہ۔ الغزالی۔ علم الکلام۔
الکلام۔ سوانح مولانا روم۔ موازنہ انیس و دبیر۔ شعر العجم
مقالات شبلی۔ مقالات عالمگیر۔ سیرۃ النبی۔ مجموعہ کلام اردو۔
مکتوبات شبلی } اردو میں
دیوان شبلی۔ دستہ گل۔ بوئے گل :۔ فارسی میں
سکات المعتدی۔ بدء الاسلام۔ الجزیہ۔ الانتقاد علی التمدن الاسلامی: عربی میں

یہ کتابیں دار المصنفین اعظم گڈھ سے مل سکتی ہیں۔

اعتراف:۔ میں نے ان کتابوں سے آزادی سے کام لیا ہے، اس کے علاوہ مولوی محمد یحییٰ صاحب کی بے نظیر سیرۃ المصنفین سے بھی آزادی سے کام لیا ہے۔ اگر اس مقالہ میں غلطی پائیں تو براہ کرم مجھکو مطلع فرمائیں تاکہ اصلاح ہو سکے۔ متعدد رسائل اور اخبارات سے بھی میں نے فائدہ اٹھایا ہے، میں سب حضرات کا شکریہ ادا کرتا ہوں۔

ناظر کاکوروی

۳۶ ساؤتھ ملاکا الہ آباد

نام میں کیا رکھا ہے!

(از جناب ایم۔ ایم عسکری صاحب)

"نام میں کیا رکھا ہے" انگریزی شاعر شیکسپیر کا ایک مشہور جملہ ہے، جس کا یہ ترجمہ ہے۔ واقعی بہت سچ کہا ہے۔ مطلب یہ ہے کہ اگر کسی کے نام میں کوئی صفت یا اچھائی پائی جائے اور وہ اُس نام والے میں نہ ہو تو اس سے کیا فائدہ؟ فرض کیجئے کہ کسی شخص کا نام صادق (سچا) یا رستم (مشہور بہادر پہلوان) ہو اور وہ شخص ان صفتوں یعنی سچائی اور بہادری سے عاری ہو یعنی اُس میں یہ صفتیں موجود نہ ہوں تو پھر نام اُسکو کیا فائدہ پہنچائیگا۔ مرزا غالب کہا کرتے تھے کہ بادشاہ یا شہنشاہ ایک بھک منگے فقیر کا بھی نام ہو سکتا ہے۔ اکثر ایسا ہوا ہے کہ نام بالکل اُلٹے رکھے جاتے ہیں۔ فارسی کی مثل ہے "برعکس نہند نام زنگی کافور" حبشی کا نام اکثر کافور ہوتا ہے۔ حالانکہ کافور بالکل سفید ہوتا ہے اور حبشی کا رنگ سیاہ ہوتا ہے۔ ہندی کا مشہور شاعر کبیر داس دنیا کی انہی الٹی باتوں پر بہت افسوس کرتا تھا۔ کہتا ہے ؎

زنگی کو نار نگی کہیں اور رانت مال کو کھویا   چلتی کو گاڑی کہیں یہ دیکھ کبیرا رویا

میرے خیال میں جب نام شروع میں رکھے گئے ہونگے تو اُنمیں اس بات کا ضرور خیال کیا گیا ہوگا کہ اسم با مسمیٰ ہونا چاہیئے یعنی نام والے میں وہ صفت بھی ضرور پائی جائے جو نام سے ظاہر ہوتی ہے۔ مثلاً تقی (پرہیزگار) نقی (پاک و صاف) شروع میں اُن لوگوں کو کہتے تھے جن میں پرہیزگاری اور پاکیزگی کی صفتیں پائی جاتی تھیں۔ عسکری (سپاہی) ابتدا میں یقیناً کسی سپاہی کا لقب ہوگا۔ مگر اب اسکی مطلق ضرورت نہیں سمجھی جاتی کہ نام معنی دار اور مسمیٰ میں اسم کی صفتیں بھی پائی جائیں۔

مسلمانوں نے نام رکھنے میں عجب عجب جدتیں اور طبع آزمائیاں کی ہیں۔ دنیا کی تمام چیزوں پر اُنہوں نے ایک نظر ڈالی اور جو چیزیں اُنہیں اُن کو پسند آئیں یا جن کو اپنے حق میں اچھا اور مبارک سمجھا یا جو اُنکی نظر میں خوبصورت ٹھیریں، بس وہی اُنہوں نے بطور نام کے اختیار کر لیں۔ ہم اس مختصر مضمون میں صرف ہندوستان کے مسلمان اور اُنمیں بھی خاص اپنے صوبہ یو۔پی، سی۔پی، پنجاب اور بہار کے مسلمانوں کے ناموں سے بحث کرینگے۔ اسی کے ساتھ انہی اطراف کے ہندوؤں کے بعض ناموں کی خصوصیت بھی بتلائیں گے، اور جابجا عورتوں کے نام بھی بتائے جائیں گے۔

ناموں میں خدا کے نام سے نسبت سب سے پہلے مسلمان اور ہندو دونوں نے اپنے تئیں خدا یا کسی دیوتا سے نسبت دینا چاہی اور واقعی ایک با مذہب قوم کیلئے ایسا کرنا ضروری اور مناسب بھی تھا۔ مسلمانوں نے خدا کے ناموں پر اور ہندوؤں نے اپنے دیوتاؤں کے ناموں پر نام رکھے۔ مسلمانوں میں خدا کے ننانوے نام مشہور ہیں۔ اُنمیں سے صرف ایک لفظ "اللہ" اسم ذات ہے اور باقی اٹھانوے اسم صفات یعنی خدا کی صفتوں کے نام کہلاتے ہیں۔ جیسے رحیم، کریم، رحمان۔ حسیب، حفیظ، مجید وغیرہ۔ یہ لفظ "اللہ" ہمیشہ کسی دوسرے لفظ کے ساتھ بولا جاتا ہے، خواہ وہ پہلے آئے یا بعد کو جیسے سمیع اللہ۔ کلیم اللہ، اللہ دیا

اللہ یار بیگ وغیرہ۔ ایسے ناموں میں لفظ "اللہ" تنہا نہیں بولتے، مثلاً اللہ یار بیگ اور اللہ دیا کو مختصر کر کے کبھی خالی اللہ نہیں کہیں گے۔ گو سمیع اللہ اور کلیم اللہ کو چھوٹا کر کے سمیع اور کلیم کہہ سکتے ہیں۔ اسی طرح خدا کے صفاتی ناموں کے پہلے یا تو لفظ "عبد" آتا ہے۔ جسکے معنی بندہ کے ہیں، جیسے عبدالرحیم، عبدالرحمان، عبدالحمید وغیرہ۔ اور یا انکے بعد کوئی دوسرا لفظ آتا ہے جس سے نام پورا ہوتا ہے، جیسے مجیب احمد، حبیب احمد، قادر حسین وغیرہ کہ ان میں مجیب، حبیب اور قادر خدا کے نام ہیں اور باقی دوسرے الفاظ ہیں۔ ایسے ناموں میں بھی مختصر کر کے ہم شروع کے لفظ بول سکتے ہیں مثلاً مجیب احمد کو مجیب، حبیب احمد کو حبیب، اور قادر حسین کو قادر کہہ سکتے ہیں۔ البتہ یہ ضرور ہے کہ یہ مختصر نام صرف بے تکلفی کی بات چیت میں استعمال ہونگے نہ کہ تحریر میں۔

یہی حالت ہم ہندؤں کے ناموں کی بھی پاتے ہیں جنہوں نے اپنے مشہور تین بڑے دیوتا برہما، شیو، اور مہادیو کے ناموں پر اپنے نام رکھے۔ جیسے برہما دت، شیو رام، مہادیو پرشاد وغیرہ۔ مسلمانوں کے "اللہ" کی طرح سنسکرت لفظ اوم بھی ہندو ناموں کے شروع میں آتا ہے۔ جیسے اوم پرکاش، اوم ناتھ۔ پرکاش روشنی کو کہتے ہیں۔ لہٰذا اوم پرکاش مسلمانوں کے "نور اللہ" ہوئے۔ یہ بات بھی قابل غور ہے کہ خدا کے وہ نام جن میں قہاری و جباری کی شان ہے وہ رواج نہ پاسکے۔ ہم نے عبدالقہار یا عبدالمتکبر آج تک نہیں سنا۔

پیغمبروں اور اوتاروں کے ناموں سے نسبت خدا کے بعد مسلمانوں نے اپنے پیغمبر اور دوسرے پیغمبروں کے ناموں پر نام رکھنا ضروری اور مبارک سمجھا۔ پیغمبر اسلام (صلواۃ اللہ علیہ) کے ذاتی نام محمد اور احمد ہیں۔ اور القاب حبیب اللہ نبی اللہ، مزمل، بشیر، نذیر وغیرہ ہیں۔ چنانچہ انہیں ناموں پر مسلمانوں کے بکثرت نام پائے جاتے ہیں۔ یعنی وہ جنکو شروع یا آخر میں لفظ محمد یا احمد ہو جیسے محمد علی اور علی محمد۔ احمد کبیر اور کبیر احمد وغیرہ۔ اسی طرح ابوالقاسم محمد حبیب اللہ محمد نبی اللہ، محمد بشیر، محمد نذیر، مزمل حسین وغیرہ کہ یہ پیغمبر صاحب کے القاب ہیں۔ قدیم پیغمبروں کے نام اور القاب دونوں پر بھی کثرت سے نام ملیں گے۔ جیسے محمد ابراہیم، موسیٰ خاں، عیسیٰ خاں، محمد نوح، محمد یوسف، محمد یعقوب، اسحاق علی خلیل اللہ، روح اللہ وغیرہ۔ اسی طرح کرشن جی اور رام چندر جی اور نیز دیگر اوتاروں اور بیروں کے نام اور القاب بھی ہندو ناموں میں آگئے ہیں، جیسے کرشن پرشاد، رام داس۔ مہابیر پرشاد، مکٹ بہاری لال، مرآری لال، بنسی دھر، شام بہاری، گوپال کرشن، کنہیا پرشاد وغیرہ۔

مسلمانوں کے دینی خلفا اور اماموں کے نام ایسے نام اور القاب بھی بکثرت رائج ہیں جیسے محمد ابوبکر، محمد صدیق، محمد عمر، محمد فاروق، محمد عثمان، اسد اللہ خاں، مرتضیٰ حسین وغیرہ۔ اور مسلمانوں کے بارہ امام بھی، جیسے محمد باقر، کاظم علی، محمد تقی، علی نقی وغیرہ۔ ان کے علاوہ اپنے مشہور ہیروز کو نہ مسلمان بھولے نہ ہندو۔ جیسے مسلمانوں میں محمد طارق، محمد خالد، سکندر خاں، رستم علی، حاتم علی، آصف علی، (سلیمان پیغمبر کے مشہور وزیر آصف بن برخیا کی یادگار ہے)

اور ہندوؤں میں کالیداس، تلسی داس، کبیر داس، نانک چند، گوبند پرشاد، چیتن سنگھ، گوتم پرشاد وغیرہ کہ یہ سب ہندوؤں کے مشہور شاعر اور ہیرو گذرے ہیں۔

آسمانی چیزوں کے نام | انسانی ناموں کے لئے آسمانی چیزوں کی طرف توجہ کی گئی۔ خود لفظ آسمان یا اُسکی عربی فلک نے تو کوئی نام نہیں دیا مگر جنت سے جو مسلمانوں کے اعتقاد کے موافق آسمان پر ہے جنت حسین، فردوس خاں موجود ہیں۔ دوزخ ایسی ڈراونی چیز سے بھلا کیا نسبت دی جا سکتی ہے لہٰذا اسکے نام پر نہ کوئی نام ہے اور نہ ہو سکتا ہے۔ ہاں جو فرشتہ جنت پر مقرر ہے اُسکا نام رضوان ہے۔ اس سے رضوان اللہ نکلے اور جنت کی مشہور نہر کوثر سے کوثر علی۔ اور پیغمبر اسلام کے مشہور سفر شب سے جسکو مسلمان معراج کہتے ہیں معراج الدین بنائے گئے۔ آسمانی کتابیں قرآن شریف اور وید سے فرقان علی یا پھر محمد طٰہٰ، محمد یٰسین، قل ہو اللہ شاہ، وید سنگھ وغیرہ ہیں۔

چاند سورج اور دوسرے ستاروں کے نام | چاند اور سورج کے علاوہ پانچ بڑے سیارے جو سولر سسٹم یعنی نظام شمسی میں شامل ہیں اور قدیم زمانے سے جن کا علم ہم کو تھا زہرہ، مشتری، عطارد، مریخ اور زحل ہیں۔ ان میں پہلے دو یعنی زہرہ اور مشتری اور نیز انکی فارسی ناہید اور برجیس زیادہ تر عورتوں کیلئے مخصوص ہیں البتہ برجیس کے آخر میں کوئی تذکیر کا لفظ لگا کر مرد کا بھی نام ہو سکتا ہے جیسے برجیس قدر۔ مریخ اور زحل چونکہ منحوس مانے جاتے ہیں ان پر کوئی نام نہیں رکھا گیا۔ اسی طرح ثریا اور سہا بھی جو دو مشہور تارے ہیں ان پر بھی مرد اور عورت دونوں کے نام ہیں جیسے ثریا قدر، محمد سہا، چاند، سورج اور قطب تارے سے بھی نام بنائے گئے جیسے چاند سے چاند خاں، مہ پارہ، قمر الدین اور سورج سے آفتاب الدین، شمس الدین، سورج مل۔ قطب تارے سے قطب الدین۔ تعجب ہے کہ لفظ "چاند" جو ہندی ہے اس سے تو فائدہ اٹھایا گیا مگر سورج پر مسلمانوں نے کوئی نام نہیں رکھا۔ ستاروں کی خاص خاصیت اُن کی روشنی یا نور ہے۔ اس سے نور الدین، ضیاء الدین وغیرہ بنے۔ اسی طرح ہندی لفظ پرکاش سے بھی سورج پرکاش موجود ہیں۔ خود لفظ ستارہ اور اُسکی فارسی اختر سے بھی نام رکھے گئے ستارہ اور اختر عورتوں کے نام ہوتے ہیں۔ اختر مشترک ہے۔ ٹوٹنے والے تارے (Meteor) جن کو عربی شہاب کہتے ہیں ان سے شہاب الدین نکلا، اور چونکہ ہندو مسلمان دونوں ستاروں کی تاثیر کے بھی قائل ہیں لہٰذا اس خیال نے طالع یار خاں اور طالع ور خاں نام پیدا کئے۔ روشنی کے سلسلے میں چراغ اور اسکی عربی سراج اور مصباح پر نام موجود ہیں۔ جیسے چراغ دین، سراج الحسن، مصباح الدین۔ آسمانی چیزوں میں ابر بھی ہے جس کی ہندی بادل ہے چنانچہ بادل خاں، بدلو، میگھ [illegible]

ارضی چیزوں کے نام | تعجب ہے کہ کرہ ارض کے باہر یعنی چاند، سورج اور ستاروں پر تو بڑی توجہ کی گئی۔ مگر کرہ ارض جو انسان کا مرکز ہے اُس پر ہم کو کوئی نام نہیں ملتا۔ البتہ زمین پر جو تغیرات اُسکی گردش سے ہوا کرتے ہیں یا جو اشیا اُسمیں قدرتی طور پر پائی جاتی ہیں اُن پر کثرت سے نام ملیں گے اُن کو ہم طبقہ وار لکھتے ہیں۔

پہلا طبقہ - حیوانات | طبقہ حیوانات (Animal Kingdom) [illegible]

بہادری کی صفت کا خیال کرکے شیر سے جو جانوروں کا بادشاہ کہلاتا ہے فارسی، عربی، ہندی سب میں بکثرت نام لئے گئے جیسے شیر خاں، شیر سنگھ، اسد علی، ضیغم الدین، ضرغام الدین، ببر علی وغیرہ (ضیغم اور ضرغام شیر کو کہتے ہیں) اور لفظ سنگھ جو شیر کی ہندی ہے، اسکی تو یہ کثرت ہے کہ ہر چھتری کے نام کے آخر میں یہ لفظ ہوتا ہے۔ جہانگیر نے ایک مشہور بہادر راجپوت کو جس نے شیر سے کشتی لڑی تھی اور اُسکو پچھاڑ دیا تھا سنگھ دلن (شیر افگن) کا خطاب دیا تھا۔ کتے میں وفاداری اور مالک سے محبت کی خاص صفت پائی جاتی ہے، لہذا عربی لفظ کلب سے کلب علی، کلب عباس نکلے۔ ہرن کو غزال کہتے ہیں اس سے غزالہ عورتوں کا نام پڑا۔

چڑیوں کی طرف کم توجہ کی گئی۔ ہمکو بھی ایسے ناموں کے انتخاب میں دقت واقع ہوئی۔ خدا بھلا کرے اکبر الہ آبادی مرحوم کا کہ اُنکے ایک شعر سے طوطا رام یاد آگئے۔ اسکے بعد اور بھی نام یاد آئے جو دیئے جاتے ہیں، مثلاً باز بہادر، شہباز خاں، نیلکنٹھ، مینا، قمری، ممولا، کبوتری کہ یہ آخری چار نام خاص عورتوں کے ہوتے ہیں، راجہ رامچندر جی کی مشہور لنکا کی چڑھائی کی یادگار ہنومان پرشاد بھی کہے جاسکتے ہیں۔

دوسرا طبقہ نباتات طبقۂ نباتات (Vegetable Kingdom) میں درخت، سبزہ، پھل پھول داخل ہیں، بڑے درختوں پر کوئی نام نہیں ملتا، البتہ لفظ جنگل سے جو بڑے بڑے پیڑوں کا ایک قدرتی مجموعہ ہے جنگلو اور جنگلی رام ہیں، پھلوں کی طرف بھی کسی نے توجہ نہیں کی، اسکی وجہ شاید یہ ہو کہ یا تو پرانے زمانے میں ہندوستان میں پھل کثرت سے نہ تھے یا کسی کو پھل کھانے کا زیادہ شوق نہ تھا اور (Eat more fruit) کا پروپگنڈا اُس وقت رائج نہ تھا۔ ہندوستان کا مشہور میوہ آم ہے جسکو فارسی میں انبہ کہتے ہیں، اس سے امبالال اور امبا پرشاد نکلا۔ مگر ممکن ہے [illegible] سے ہندی الفاظ سے ماخوذ ہو۔ ترکاریوں پر بھی نام کم ہیں۔ البتہ کریلا اور چھچھونڈا بہت تلاش سے ملے کہ یہ دونوں بادشاہی زمانے کے مشہور بھانڈ تھے، ہرے دھنیے سے دھنیا مہری اور پیاز سے پیازو نکلے۔ دھنیا مہری نصیر الدین حیدر شاہ اودھ کے محل کی ایک مہری تھی جس کا پُل اب بھی مشہور ہے۔

جو کمی پھلوں اور ترکاریوں نے نام پیش کرنے میں کی تھی وہ ایک حد تک پھولوں سے پوری ہوئی، سب سے پہلے لفظ باغ ہی کی فارسی گلشن و گلزار ہے۔ گلشن علی، گلزار علی، ریاض الحسن حاصل ہوئے۔ بوٹا خاں اور بوٹا بیگم کو بھی ایک نسبت باغ سے ہے پھلواری مخصوص عورتوں کا نام ہے۔ پھولوں میں اکثر ہندوستانی پھولوں کے نام پائے جاتے ہیں۔ چونکہ پھول ایک نہایت حسین اور نازک چیز ہوتی ہے لہذا اس سے زیادہ تر نام عورتوں ہی کے ہوتے ہیں، جیسے گلاب (مرد اور عورت دونوں میں مشترک ہے) چنبیلی، جوہی، نسرین، نسترن، کامنی، چمپا، کیتکی وغیرہ۔ گل محمد اور پھول چند بھی اسی باغ کی یادگار ہیں۔ تلسی کا پاک پودا بھی مردانے اور زنانے نام دونوں میں مشترک ہے۔ ریحان سے ریحانہ عورتوں کا نام ہے۔ باغ ہی کے تلازمہ میں بہار، نسیمہ اور شمیمہ بھی سمجھنا چاہیے جو مرد اور عورت دونوں کے نام ہو سکتے ہیں۔

تیسرا طبقہ - معدنیات طبقۂ معدنیات (Mineral Kingdom) میں صرف بیش قیمت پتھروں یعنی جواہرات سے فائدہ اٹھایا گیا۔ ان سے بکثرت نام ہندو مسلمان دونوں کے ہاں ملیں گے جیسے الماس علی خاں، ہیرا خاں، ہیرا سنگھ، زمرد حسین، پنا لال، لعل خاں مانک چند، میاں یاقوت، موتی لال، چنی لال، جواہر لال، نیلم، فیروزہ۔ آخری دو نام عورتوں کے ہیں۔

ملوکیت کی یادگار مغفور مرزا قیصر حسین، وزیر مرزا، امیر علی، یہ سب ملوکیت کی اصطلاحوں سے نکلے، ملکہ جہاں ملکہ بیگم عورتوں کے نام ہیں۔ ڈیماکریسی کے پریسیڈنٹ کو اگر ہم صدر کہیں تو اس سے صدر الدین ہیں۔ ملوکیت ہی کی تخیل میں وہ صفتیں بھی داخل ہیں جو بادشاہ کیلئے مخصوص ہیں، جیسے شجاعت اور ہمت اور وہ ہتھیار بھی جن سے قدیم زمانے میں ملک گیری کیجاتی تھی۔ شجاعت اور بہادری سے شجاعت علی، محمد شجاع، علی بہادر، ہمت بہادر، اور تلوار سے جو اظہار شجاعت کا بہت بڑا ذریعہ اور ملک گیری کا بہت بڑا حربہ بھی سیف الدین، حسام الدین، صمصام علی، شمشیر خاں، تیغ بہادر وغیرہ نکلے اسی طرح کٹارا سنگھ، جھنڈا سنگھ، علمدار حسین۔ فتح بہادر، ظفر حسین کو بھی جنگ سے ایک قسم کا تعلق ضرور ہے۔

پہاڑ، دریا، اور شہر چونکہ مسلمان باہر سے آئے تھے، اسلئے اس ملک کے پہاڑ دریا، نہروں، جھیلوں کے ناموں سے ان کو زیادہ دلچسپی نہ تھی۔ البتہ ہندو نام بکثرت موجود ہیں جیسے بدری ناتھ، کیلاش ناتھ، کیدار ناتھ پہاڑوں میں، گنگارام جمنا داس، سرجو پرشاد، بھاگیرت، گومتی پرشاد۔ نربدا پرشاد دریاؤں میں۔ کاشی رام۔ پراگ نرائن، بنارسی داس بندرابن، اجودھیا پرشاد شہروں میں پائے جاتے ہیں۔ عام لفظ دریا اور سمندر سے دریا خاں اور سمندر بیگ اور اسلامی شہر مکہ، نجف اور کربلا سے مکا، نجف علی اور کربلائی حسین ملتے ہیں۔

انکے علاوہ دوسری چیزوں پر نام الف۔ بے کے بعض حروف پر بھی نام ہوتے ہیں۔ جیسے الف خاں، الف بیگ، غالب کے ایک دوست الف بیگ تھے، انہوں نے بڑھاپے میں شادی کی اور ایک لڑکا پیدا ہوا جو بہت دبلا پتلا تھا، غالب سے جب نام کی فرمائش کی گئی تو انہوں نے کہا کہ ہمزہ بیگ نام رکھو، اس وجہ سے کہ ہمزہ بھی تو الف ہے۔ صرف ٹھٹھرا ہوا اور پتلا ہوتا ہے۔ لفظ نون بعض پنجابی ناموں کے آخر میں ہوتا ہے۔

عربی جملے بھی کبھی نام کا کام دیتے ہیں۔ جیسے انشاء اللہ خاں، ماشاء اللہ خاں، تعالی اللہ خاں، سبحان اللہ خاں ایک صاحب کا نام عبد الرحمن الرحیم۔ مالک یوم الدین بھی ہم نے سنا ہے۔

غلہ کی یادگار میں ہم صرف میاں مٹرو پر کفایت کرتے ہیں۔ ہفتہ کے دنوں میں پیرو۔ پیر خاں۔ منگلو، منگل داس، بدھو۔ جمعراتی۔ جمعہ خاں۔ جمن۔ اور مہینوں اور تہواروں میں محرم علی، رجب علی بیگ، شعبان علی خاں، شبراتی۔ رمضانی۔ عیدو، عیدن۔ بقریدن۔ بقریدی ملتے ہیں۔

ایم۔ ایم۔ عسکری

سبق

(از خواجہ محمد شفیع صاحب دہلوی)

پڑوس میں شادی ہے، گھر مہمانوں سے بھرا ہوا۔
عورتیں گوندنی کی طرح زیور سے لدی پھر رہی ہیں۔ کمخواب
مشترو۔ اطلس۔ اک رنگے کے ڈھیلے۔ ایک برے۔ طاؤسی
فرشی پاجامہ ادھر سے اُدھر سے ادھر سے ادھر سے سرسر
کرتے پھر رہے ہیں۔

لوٹ جالی۔ آب رواں۔ شبنم کی انگیا کرتیوں کی جھلک
جسم کے رونگٹے کھڑے کر رہی ہے۔

پٹاپٹی کی گوٹیں، نیرنگ عالم کا پتہ دے رہی ہیں—
... ول بھرے دوپٹوں میں عارض گلگوں سیم کار صراحی
... گلابی کی جھلک دکھا رہے ہیں۔

... فراموش حسین دکیھت بھولی کے دوپٹوں میں
دین و دنیا بھلائے دیتے ہیں ——— ماہی آبِ ہیبت کھیال
اپنا جال پھیلا رہے ہیں۔

زلفِ سیاہ کے زیر سایہ ماہتابی ماتھوں پر افشاں
... ہوتا ہی ناگ چاندنی رات میں من لگے بیٹھے ہیں۔
بھویں کٹار۔ مژگاں کالوں کی ڈار۔ چشم آہو چوکڑی بھلادے
اس پر سرمکی تحریر خطِ تقدیر۔ گلابی رخساروں میں پیازی
موتی کی آب۔ مستی آلود ہونٹوں میں دُرِ دنداں کی جھلک جیسے
نیلگوں آسمان میں کہکشاں کی تحریر۔ یا کویل اپنے
پروں میں انڈے لئے ہوئے۔ یا ماریہ کی مٹھی میں لالی آبدار
چاہ زنخداں کی چاہ کوئیں جھنکائے۔ یوسفِ
رخ تک انسان پہنچنے نہ پائے۔ غبغب سیمیں
سونا حرام کر دے۔ صراحی دار گردن پر کتابی چہرہ
رباعیاتِ خیام کا لب لباب۔

سینۂ صافی۔ صوفی صاف باطن کو سیاہ کار بنادے
اس پر معکوس بلوریں پیالے، دل کی دنیا تہ و بالا
کرنے والے۔

سیلی سیلِ اشک کا پیام، سیلِ غنا کی تصویر——
جوئے نور میں ناف گردابِ بلا۔
ماتھے پر جھوم خوشۂ پروین۔ چوٹی میں ٹھپہ کا موباف

مشترو۔ اطلس۔ اک رنگا، کپڑوں کے نام ہیں۔
طاؤسی۔ ایک برکے۔ فرشی، پاجاموں کی قسمیں ہیں۔
لوٹ جالی۔ آب رواں۔ شبنم، کپڑوں کے نام ہیں۔
پٹاپٹی کی گوٹ، رنگارنگ ٹکڑے جوڑ کر گوٹ بنائی جاتی ہے۔
دکیھت بھولی۔ ایک قسم کا جال جس کی وضع نہایت پیچ در پیچ ہوتی ہے۔

کالی گھٹا میں بجلی کی چمک - یا اوتھیلو کے آغوش میں ڈسڈمونا یا شیرازی کبوتروں کا جیب جوڑا مصروفِ اختلاط - یا شام و سحر گلے ملتے ہوئے۔

کانوں کی بجلیاں، بجلیاں گرائیں - کرن پھول آفتابِ رخ کے قریب کرن کے مترادف - جڑاؤ بانکے بانکے مکھڑے پر بلا گرداں -

ناک میں ہیرے کی لونگ، جیسے کہکشاں پر عیوق یا چمپا کی کلی پر شبنم کا قطرہ - یا شمعِ کافور پر منجمد بوند -

گلے میں ٹیپ - جیسے خوشنما بند پر ٹیپ کا مصرعہ - جڑاؤ ہار گلے کا ہار -

غرض کہ گھر اندر کا اکھاڑا بنا تھا، اور یہ پریاں اٹھلی گیلی پھر رہی تھیں - ہم صبح سے کوٹھے پر پہنچ گئے اور سب کی نظروں سے چھپے کواڑوں کی جھریوں میں آنکھیں سینکتے رہے۔ ——— یوں تو جس پر نظر پڑتی جم کر رہ جاتی اور زبانِ حال سے کہتی۔ ؎

بسانِ شکل تو بت کمتر آفرید خدا
ترا کشیدہ و دست از قلم کشید خدا

لیکن ایک پری چہرہ برق دم ما آفت کا پرکالہ بجلیاں گراتی پھر رہی تھی - آنکھیں خیرہ ہوئی جاتیں - ہوش و حواس جواب دے رہے تھے - مکھڑے کی چمک آنکھ جمنے نہ دیتی اور چشمِ دیدار طلب کی خواہش کہ آنکھوں میں بٹھا لے۔

سر سے پا تک حسن کی چلتی پھرتی، بولتی چالتی تصویر - بوٹا سا قد - گداز بدن، جادو بھری انکھڑیاں - بھرے پرے گھر میں پتلی سی پھر رہی تھی۔

یہ نغمۂ بلبل سے ناآشنا، باغِ جناں کی کلی، دامنِ رضواں کا گلِ سرسبد تھی - نالۂ قمری سے ناواقف، صدر شکِ سرو و شمشاد، عاشقِ مہجور کے گلے کا طوق بنی تھی - اشکِ شبنم سے غیر متعارف شگوفہ کسی کو خون کے آنسو رلا رہا تھا -

حسنِ یوسف بلائیں لے رہا تھا - عشقِ زلیخا اس ملکۂ حسن کے دربار میں قصیدہ پڑھ رہا تھا - شہزادی صبا کا حسنِ مذاق نقشِ سلیمانی لئے کھڑا تھا - اور میرے منہ سے سراپا دیکھ کر بار بار نکل رہا تھا - ؎

زفرق تا بقدم ہر کجا کہ می نگرم
کرشمہ دامنِ دل میکشد کہ جا اینجاست

شادی کا گھر ہے اور گھر بھی نواب یوسف علی خاں کا جو محلہ بھر کیا شہر بھر میں من چلے خراج مشہور ہیں - پھر پہلا کاج اور وہ بھی اکلوتے لڑکے کی شادی خانہ آبادی - دولت پانی کی طرح بہائی جا رہی ہے - لو ترٹون کر رئیس ہیں اور ابھی کچھ چن باقی ہے - دل بھر کے دل کے ارمان نکال رہے ہیں - خدا نے یہ دن دکھایا ہے، جو کچھ کریں سو کم ہے - سامنے بھی ٹکر برابر کی ہے - جمشید نگر کے رئیس ہیں شاہی زمانہ کے تعلقہ دار - جاگیروں - پرگنوں کے مالک -

---

اوتھیلو - شکسپیر کے ڈرامہ کا حبشی ہیرو - OTHELO.

ڈسڈمونا - اسی ڈرامہ کی ہیروئن اوتھلو کی معشوقہ - DESDIMONA.

عیوق - ایک ستارہ ہے، جو کہکشاں کی دائیں جانب نمودار ہوتا ہے -

لاکھوں کی آمدنی اور پھر ایسے ہی خراج - علاقہ بھر میں انکی بابت مشہور ہے کہ کسی کی تو انگلیوں[1] میں چھید ہوتے ہیں ان کی ہتیلی میں سے "پیسہ ٹکتا ہی نہیں - دل کے غنی ہیں ہاتھ کے حاتم - جو آتا ہے لٹاتے ہیں - ان کا یہ واقعہ بچہ بچہ کی زبان پر ہے کہ گورنر کی ٹی پارٹی میں چندہ کی فہرست گھومی، سارے تعلقدار جمع تھے اور ایک ہز ہائینس بھی - حفظ مراتب کے تحت کاغذ پہلے ہز ہائینس کے سامنے گیا انہیں یہ بات ناگوار گذری، بعد میں کاغذ جو انکے سامنے آیا تو ہز ہائینس نے ایک لاکھ چندہ لکھا تھا - اس میر شیر نے دو سے ضرب دے دی اور آگے یہ الفاظ ایزاد کر دیئے -

تونگری بدل است نہ بہ مال

بس یوں سمجھ لیجئے کہ جمشید نگر کے رئیس کی لڑکی کی شادی نہیں ہے جشنِ جمشیدی ہے -

ادھر بھی توڑوں کے منہ کھل گئے ہیں، ادھر بھی دولت بہائی جا رہی ہے - ——— ابھی برات جانے میں عرصہ ہے، پر ہماہمی مہینوں پہلے سے شروع ہو گئی - زنانہ میں چوبیس گھنٹے ڈھولک پٹ رہی ہے - دور دور سے ڈومنیاں آئی ہیں - ایک چہل پہل، گہما گہمی، دن عید رات شب برات ہے -

ہمارا بھی یہ دستور کہ صبح ہوئی اور کوٹھے پر جا پہنچے رات گئے بادلِ ناخواستہ اترے - کروٹیں بدل بدل کر صبح کی اور پھر دیدار بازی، اللہ راضی -

پڑوس کا معاملہ - خاندانی تعلقات - دیرینہ مراسم کا خیال، مزید برآں نوشہ میاں لاڈلے سے نہ صرف ہمسایہ کے تعلقات، بلکہ ساتھ کے پلے بڑھے - نہ اشارہ کر سکیں نہ کنایہ - جھری میں سے بھی ڈرتے ڈرتے جھانکیں - غرضکہ ہم دل کے ہاتھوں مجبور، اور دلِ ٹھیرا دیوانہ -

وہ چلتی پھرتی نظر آجائیں، جان میں جان آجائے - ورنہ جان مضطر و دل بے قرار - احباب سے ملنا جلنا چھوٹ گیا - باہر کا آنا جانا ترک - ——— دن تو کوٹھے پر گذرتا ہی تھا - اب ہم رات کو بھی وہیں بسیرا لینے لگے دل انگلی پکڑ کر کلائی پر ہاتھ ڈالتا ہے - جب طرف دیدار بازی سے کل نہ آئی اور دل چاہا کہ نامہ و پیام تو معلوم کریں، شاید خدا کوئی شکل نکالے - سائیں کے سو کھیل - تو ہم نے تدبیریں سوچنی شروع کیں - ——— کسی ماما اصیل کو ملائیں، اس کے ہاتھ پیغام سلام پہنچوائیں - ہم اسی ادھیڑ بن میں تھے کہ شام کو دولہا میاں، میاں لاڈلے کا پیغام آیا کہ "صورت ہی نہیں دکھاتے - کیا کچھ ناراض ہو - میں مایوں[2] بیٹھا ہوں، گھر سے نکل نہیں سکتا - کیا تمہارے پیروں میں بھی مہندی لگی ہے، آج رات کو ضرور آنا - لکھنؤ سے مہ لقا آئی ہیں، ان کا مجرا ہے، اور کھانا بھی ہمارے ہی ساتھ کھانا" -

——— یہاں یہ حال کہ نہ مجرا اچھا لگے، نہ طائفہ - سچ تو یوں ہے کہ اپنی جان تک بری لگنے لگی تھی ——— ایسا محسوس ہوتا تھا جیسے کوئی جان و دل کی طنابیں کھینچ رہا ہو

[1] کسی کی تو انگلیوں میں چھید ہوتے ہیں، انکی ہتیلی میں ہے "کہتے ہیں کہ جب آدمی ہاتھ کھول کر انگلیاں ملائے تو اگر انکے بیچ میں چھید رہ جائیں تو اس شخص کے پاس روپیہ ٹکتا نہیں -

[2] شادی سے کچھ قبل دولہا مایوں بٹھایا جاتا ہے اور اس کے بعد پھر باہر نہیں نکلتا -

—— جب اس کبکِ رفتار کو اٹکنائی میں مصروفِ خرام دیکھتا، دل پہلو سے نکلا جاتا تھا۔ اور یہ طائرِ بسمل اس قفسِ آب و گِل کو چھوڑ کر اُس طاؤسِ جناں کے قدموں پر لوٹنا چاہتا تھا۔ حقیقت یہ ہے کہ میرا متاعِ جان، اور سکونِ دل اس نے لوٹ لیا تھا۔

مغرب بعد لاڈلے میاں کا پھر تقاضہ آیا کہ "اب تک آئے کیوں نہیں"۔ میں قہرِ درویش برجانِ درویش یہ کہتا ہوا اُٹھا

میں جاتا ہوں دِل کو ترے پاس چھوڑے
مری یاد تجھ کو دلاتا رہے گا

مُنہ ہاتھ دھو، کپڑے بدل، گو دِل نہ چاہتا تھا مگر گیا۔ وہاں عجب رنگ تھا۔ مہ لقا چاہنے والوں میں ایسی گھری بیٹھی تھی جیسے چاند ہالہ میں۔ میرا حال خراب تھا چہرہ پر کبیدگی کھل رہی تھی۔ لاڈلے میاں نے کہا۔ "بھئی کیا بات ہے، بہت ہی مضمحل ہو رہے ہو۔ سب کی نگاہیں مجھ پر تھیں مُنہ سے بے ساختہ نکل گیا۔ ع

اِک مہ لقا کی چاہ میں حالت خراب ہے

سب ہنس دیئے۔ مہ لقا بھی مسکرائی۔ بولی "اسم گرامی؟" میں نے کہا "چکور"۔ فرمایا "کوئی پر قینچ نہ کر دے"۔ میں نے جواب دیا "بہتر ہے کبکِ دری کو کابک میں بند کر لو کہیں پردہ دری نہ ہو جائے"۔ کہنے لگی "ماشاء اللہ جناب بہت اونچے اڑ رہے ہیں"۔ میں بولا۔ "ہوں بھی تو طائرِ سدرہ نشین"۔ جو لوگ مہ لقا کو گھیرے بیٹھے تھے اس نے ان کی طرف اشارہ کرتے ہوئے کہا "فی الحال تو یہ ہالہ سدِ راہ ہے۔ جناب کا سدِ راہ کہاں ہے؟" میں نے کہا "یہیں کہیں اور سدِ راہ کی فکر نہ کیجئے ہم بصد راہ پہنچ جائیں گے"۔

نہیں روزن جو قصرِ یار میں پروا نہیں ہم کو
نگاہِ شوق رخنہ کرتی ہے دیوارِ آہن میں

وہ بولی "یہ جناب کا حُسنِ ظن ہے، ورنہ روزنِ دیوار سے جھانکنے والے کو روزن نہیں ملتی، رونا پڑتا ہے"۔ میں نے کہا

عرفیؔ اگر بگریہ میسر شدے وصال
صد سال می تواں بہ تمنا گریستن

اتنے میں ملازم نے اطلاع دی کہ کھانا چن دیا گیا ہے اور ہم سب اُٹھ کر طاق الطعام میں چلے گئے۔

میں دولہا کے قریب صدر میں بیٹھا۔ اور مہ لقا ہمارے سامنے —— کباب میری طرف سرکا کر بولی "کباب ملاحظہ فرمایئے"۔ میں نے کہا "خود کباب سیخ ہوں"۔ تھوڑی دیر بعد وہ ایک اور رقاب آگے بڑھا کر بولی "بریانی ملاحظہ فرمایئے"۔ میں نے جواب دیا "دل بریاں رکھتا ہوں" —— "اچھا تو کچھ شیرینی سے شوق فرمایئے"۔ میں نے کہا "ایک شیریں دہن کی یاد نے زندگی تلخ کر دی ہے" —— کہنے لگی "اچھا تو جرِ پانی ہی پیجیے"۔ میں نے کہا "بلا نوشِ ہُوں سیلِ اشک سے پیاس بجھاتا ہوں" —— اس کے بعد ہاتھ جوڑ کر مجھ سے کہا۔ "مرغ —— سے شوق فرمایئے"۔ میں نے جواب دیا "مرغی کی —— خواہش نہیں ہے"۔

مہ لقا یہ فقرہ کہنے کو تو کہہ گئی۔ لیکن پھر مہرِ سکوت برلب ہو بیٹھی۔ آنکھیں اظہارِ ندامت کر رہی تھیں۔

کھانا ... ... محفل آراستہ۔

مہ لقا کے لیا ... ۔ در و دیوار سے موسیقی ...

تھی۔ شجر و حجر مست ہوئے جاتے تھے۔ کسی کامل فن نائک کی سکھائی ہوئی تھی۔ سُر کی ایسی سچی کہ جہاں ٹک گئی ٹک گئی۔ تال کی ایسی پکی کہ کیا مجال جو آدھا ماترا بھی ادھر سے اُدھر ہو جائے۔ اور پھر ظالم کو وہ وہ چیزیں یاد کہ شاید و باید ہونے پر سہاگا اس کی ادائگی گانگی بتانا۔ ہر شعر کی کیا ہر ہر بول کی تصویر بن جاتی، سو سو طرح ادا کر کے دکھاتی۔ ناچتی بھی قیامت کا تھی۔ کولہوں کی حرکت پر کرۂ زمیں گردش میں آئے، گنبدِ فلک تھرّائے۔ آنکھ پتلی سی پھرے، شفاف ماتھے کے نیچے بھوؤں کی حرکت گردشِ لیل و نہار کے مترادف ــــــ پاؤں متحرک، جیسے دو حسین فاختائیں مصروفِ خرامِ ناز۔ مُنہ کو آنچل سے چھپائے تو محفل کے مُنہ سے بے ساختہ نکل جائے ــ ؎

مُنہ کو آنچل سے چھپا کر جو وہ رقصاں ہوتا
شعلۂ طور چراغِ تہِ داماں ہوتا

گھونگروؤں کی آواز رم جھم، رم جھم مینہہ برستا معلوم ہو۔ طبلہ کی گمک دل پر جا کر بیٹھے۔ سارنگی سو رنگ سے ہمہ زبان ہو ــــــ غرضکہ بارہ بجے تک مہ لقا فردوسِ گوش اور جنتِ نگاہ بہم پہنچاتی رہی۔

اب دوسرا طائفہ کھڑا ہوا، اور مہ لقا زنانہ میں چلی گئی۔ حالانکہ اُس کے بعد رنگ جمنا مشکل تھا۔ لیکن یہ بھی دلّی کی نامی گرامی ڈیرہ دار طوائف تھی۔ پہلی ہی تان کچھ اس ٹھاٹھ سے لی کہ رنگ محفل بدل دیا سب ہمہ تن گوش ہو بیٹھے۔

میں کوئی دو بجے کے قریب اُٹھ آیا۔ نیند آنکھوں سے بیگانہ ہو چکی تھی۔ تارے گنتا رہا۔ دماغ دِل کا غلام تھا۔ اپنے آقا کے رُوبرو نت نئے منصوبے پیش کرتا۔ دلِ ناداں کو کھلونوں سے بہلا رہا تھا۔ ریت پر سست بنیاد محل بنا رہا تھا۔ کبھی سوچتا کسی ملازمہ کو ملاؤں، پھر خیال آتا کہ پرانی نمک خوار ہیں، اس پر یہ احتیاط کہ گھر کی رہنے والی باہر جانے نہ پائے۔ زندہ آئے اور جنازہ جائے۔ غیر عورت کا اندرونِ خانہ گذر نہیں۔ ؏

ہائے کس گھر میں مرا یہ دلِ دیوانہ پھنسا

آخر کار خیال آیا کہ مہ لقا کو گانٹھوں، وہ مجرا کرنے گھر میں جاتی ہی ہے پتہ چلائے گی۔ رنڈی ذات پیسہ کی میت میں رقم کا لالچ دُونگا، جس راہ چلاؤنگا چلے گی۔

صبح ہوتے ہی نانک نقیب کو بلایا۔ دریافت کیا مہ لقا کہاں ٹکی ہے۔ معلوم ہوا اپنی سہیلی مشتری کے ہاں قیام ہے۔ سویرے سویرے ہی بغیر اطلاع کے جا پہنچنا اچھا نہ معلوم ہوا۔ رنڈی اپنے دِل میں کیا سمجھے کیا نہ سمجھے ــــــ دِل کہے ابھی چل، عقل کا مشورہ آہستہ خرام۔ آخر کار نانک کے ہاتھ اطلاع کرائی کہ ہم دس بجے آئیں گے۔ جوں توں کر کے یہ وقت کاٹا۔ زیادہ دیر کوٹھے ہی پر رہا ــــــ موہوم امیدِ وصل کے ساتھ آتشِ شوق تیز تر ہو گئی۔ اُس چھت کو دیکھ دیکھ کر اور خدا خدا کر کے دس بجائے، اور ہم مشتری کے کمرہ پر جا براجے۔ مہ لقا انتظار کر رہی تھی۔ جانے کو تو چلے گئے، دل بے قرار لے گیا۔ پر اب وہاں کوئی بات بنائے نہ بنی۔ لاکھ ہمت باندھتا ہوں پر زبان نہیں پلٹتی ــــــ رسمی گفتگو کے بعد ہم بھی چپ ہو بیٹھے اور وہ بھی۔ لیکن وہ ٹھیری طوائف، لگی اِدھر اُدھر کی باتیں کرنے۔ ہم بھی ہاں میں ہاں ملاتے رہے ــــــ

"دلی اچھا مقام ہے۔ مجھے تو بہت پسند آیا"

"صاحب۔ اب کیا دھرا ہے۔ لُٹ چکا"

"پھر بھی سب کچھ ہے۔ ہاتھی لُٹ کر بھی سوا لاکھ ٹکے کا ہوتا ہے"

آپ کیا فرماتی ہیں کھنڈروں کی دنیا ہے۔ عمارتوں کے بھی کھنڈر رہ گئے ہیں۔ پرانے خاندانوں کے بھی"

غرضکہ ایسی ہی بے سری باتیں ہوتی رہیں۔ ہمارا دل و دماغ کہیں اور تھا۔ وہ بھی ایک نظر باز عورت تھی تاڑ گئی۔ کئی مرتبہ خاموش ہوئی کہ مجھے جو کچھ کہنا ہو وہ شروع کروں۔ پر کیا کرتا زبان نے ساتھ نہ دیا۔ حرفِ مدعا لب تک آ آکے رہ گیا ——— شریف لڑکی کا ذکر۔ طوائف کے سامنے اور پھر اظہارِ عشق کے ساتھ۔ شرافت مانع آتی تھی، زبان رُکی جاتی تھی۔ دل کچوکے دے رہا تھا۔ عجب کش مکش کا عالم تھا کہ میرے مُنہ سے بیساختہ نکل گیا۔ ؎

مرا دردیست اندر دل اگر گویم زباں سوزد
وگر دم درکشم ترسم کہ مغزِ استخواں سوزد

اس نے جواب دیا:-

رکاوٹ خوب نہیں طبع کی روانی میں
کہ بُو فساد کی آتی ہے بند پانی میں

"جو دِل چاہتا ہے کہہ ڈالیئے۔ اسے مارنا اچھا نہیں۔ بہت نازک ہوتا ہے ذرا سے میں کملا کر رہ جاتا ہے"

مَیں نے کہا۔ ع کیا کہیں کچھ کہا نہیں جاتا

وہ فوراً بولی۔ ع بن کہے بھی رہا نہیں جاتا

میں نے بمشکل زبان کھولی اور اتنا مُنہ سے نکالا۔

"اِک مہ لقا پہ مرتا ہوں"

بولی:- "یہ تو صورت بتا رہی ہے۔ آہِ سرد، دل پر درد۔ رنگِ زرد۔ لیکن سوال تو یہ ہے کہ وہ کونسا ماہ ہے جسکے آپ چکور ہیں۔

کہنے کو تو اتنا کہہ گیا پر آگے زبان کِل گئی۔ ہونٹھوں نکلی کوٹھوں چڑھی۔ ناموس کا معاملہ، عزت کے سودے۔ دل سودائی کہہ دینے پر مجبور کرے۔ ناصحِ عقل زبان ہلانے کی اجازت نہ دے میری یہ حالت دیکھ کر وہ بولی:" ایسی کونسی شیریں ہے جس نے آپ جیسے چہچہاتے ہوئے فرہاد کے لب بند کر دیئے"

میرے مُنہ سے بے ساختہ نکلا:- ؎

سینہ میں دل ہے دل میں داغ داغ میں سوز و سازِ عشق
پردہ بہ پردہ ہے نہاں، پردہ نشیں کا رازِ عشق

بولی:- اچھا تو یوں کہیئے خیر سے کسی پردہ نشین پر دل آیا ہے، جب ہی تو کل دیوارِ آہن میں روزن کئے جا رہے تھے۔ بند پردہ یہ لوہے کے چنے ہیں۔ ؎

کوہکن کو حکم جوئے شیر ہے
عشق بازی سخت ٹیڑھی کھیر ہے

مَیں نے کہا "جانتا ہوں پر کیا کروں دِل دیوانہ نہیں مانتا للہ کوئی تدبیر بتایئے" جواب ملا "دِل بہلانے کی؟" میرے مُنہ سے بے ساختہ نکل گیا۔ ع

دلِ بے تاب بہلتا نہیں بہلانے سے

فرمایا" مَیں اب سمجھی۔ جناب کو ان تک رسائی کی تدبیر میں اس ناچیز کا مشورہ درکار ہے۔ سچ ہے یہ فن رنڈی سے زیادہ کون جان سکتا ہے۔ آپ ماشاء اللہ ٹھیرے اپنیلے۔ عشق کی گھاتوں کو، محبت کی باتوں کو کیا جانیں۔ کسی نے آپ ہی جیسوں کی بابت کہا ہے۔ ع "ہم بہو بیٹیاں یہ کیا جانیں"

مَیں نے کہا۔ آپ تو خفا ہو گئیں۔ غرض دیوانی ہوتی

ہر اور اس وقت ہم پر بُری پڑی ہے۔ للّٰہ ترس کھائیے۔ فرمایا اچھا تو میرے مشورہ کی فیس؟ میں نے کہا جان تک حاضر ہے۔ کہنے لگی۔ آپکی جان آپکو مبارک، میں اسے جہاد سمجھتی ہوں ــــ تھوڑی دیر سوچنے کے بعد بولی دیکھیے صاحب اگر گھر کے قریب رہتی ہیں تو گڈی پر عاشقانہ شعر لکھکر گرائیے۔ جب ذرا پینگ بڑھ جائیں تو حرف مدعا ملٹ پر لکھکر دکھا دیجئے۔ پھر آبگینہ کو آئینہ سکندری بنائیے۔ جب وہ شیشہ میں اتر آئیں تو گلے سے لگائیے۔ گھر کی کسی ماما کو ملائیے۔ پیغام سلام کروائیے۔ اظہار مدعا کیجئے۔ تب اُدھر سے انکار ہو تو جوگی کا برن لیجئے۔ اُن تک یہ خبر پہنچوائیے کہ جنگل بیابانوں میں دیوانہ وار پھر رہے ہیں۔ آہوان صحرا ہیں اور بیخبرا نشین اور

ع تیرا ہی نام لب پہ ہے نام خدا کے بعد

اگر یہ داؤں بھی نہ چلے اور وہ شمع رُو نہ پسیجے تو پھر یہ ڈرامہ گرم کر لیجئے کہ چار روز ہوئے تولہ بھر افیوں کھالی۔ وہ تو خدا نے جان بچالی۔ اتفاق سے ایک دوست نے بازار میں خریدتے دیکھ لیا وہ بھی سائے کی طرح ساتھ ہو لیا۔ شہر کے باہر جا کنوئیں میں سے ڈول کھینچ گولی منہ میں ڈال اوک سے پانی چڑھا گئے۔ یار نے دلدار کی قسمیں دلا کر قے کرائی۔ شہر لیکر آیا۔ ڈاکٹر حکیم ہو رہے ہیں وہ تو یہ خیر ہوئی کہ پولیس کو خبر نہ لگی۔ نہیں تو لینے کے دینے پڑ جاتے آپکا نام بھی کوتوالی چبوترہ پر لیا جاتا۔ آبرو خاک میں مل جاتی یہ وار بھی خالی نہیں گیا۔ بس یوں سمجھیے پھر تو ع

کچے دھاگے سے چلے آئیں گے سرکار بندھے ــــ پھر کیا ہر یاروں کے گھرے ہی گھرے ہیں۔ راوی چین ہی چین لکھتا ہے ــــ باغ میں اس نونہال چمن حسن کو بلائیے۔ محفل جمائیے۔ پھر کچھ حصہ بہار عشق کا اور کچھ زہر عشق کا ادا فرمائیے"

اس کا لیکچر دلربایانہ اور ہجر و وصل کی داستان میں محو ہو گیا۔ اور نہ سمجھ سکا کہ میرا مذاق اڑایا جا رہا ہے۔ جب اُسکے ہونٹوں پر مسکراہٹ کھیلتی دیکھی تو احساس ہوا اور یہ مصرعہ پڑھتا ہوا اُٹھا۔

ع دیدہ و دل پہ مرے زخم جگر ہنستے ہیں

اس نے میرا ہاتھ پکڑ کر بٹھا لیا اور کہا۔ ع

ہنسنے دو یارہ گرو ہنستے ہی گھر بستے ہیں ــــ اور پھر کہنے لگی اس پہیلی کی جو تھوڑی بہت بوجھن میں سمجھ سکی ہوں اس سے تو یہ اندازہ ہوتا ہے کہ کسی شریف گھر کی لڑکی پر دل ٹوٹکر آیا ہے۔ میں نے اس کے جواب میں یہ شعر پڑھ دیا۔ سہ

سینہ میں دل ہے دلمیں داغ داغ میں سوز و ساز عشق

پردہ بہ پردہ ہے نہاں، پردہ نشیں کا راز عشق

یہ سُن کر وہ کچھ غوطہ میں پڑ گئی، پھر بولی۔ یہ عزت کے سودے ہیں ناموس کے معاملے دل لگی نہیں۔ ہماری مانیے تو اُدھر سے خیال ہٹا لیجئے۔ عالم رنگ و بو میں دل بہلائیے، یہ رنگ تو نبھ سکتا ہے اور وہ خیال بُرا رنگ لائیگا۔ مانا کہ میں آپکے خیال میں عمر سے اتر چکی ہوں جسکی طرف جناب نے اس ناچیز کو مشاطہ کا کام سپرد فرما کر نہایت لطیف پیرائے میں اشارہ بھی فرمایا ہے۔ سچ ہے ع قحبہ چوں پیر شود پیشہ کند دلالی ــــ تاہم میری سہیلی آپکے شہر کی رہنے والی شستری بائی جناب کے حکم سے باہر نہیں ہو سکتی میں نے احتجاج کیا اور کہا خدا کی قسم یہ مراد نہ تھی۔ اس نے جواب دیا میں جانتی ہوں یہ تو محض بطور مذاق عرض کیا تھا۔ بہر کیف میری صلاح یہی ہے کہ اس خیال سے باز آئیے، اور کسی حسن فروش سے دل لگائیے۔ میرا ذمہ خیال ہٹ جائیگا۔ اس لونڈی کو جو تھوڑا بہت مردوں کا تجربہ ہے اس کی بنا پر عرض کر رہی ہے ان کا دل انجن کی طرح آتا ہے لیکن ذرا بھی لائن بدل دیجائے تو پھر پرانی پٹڑی کو ایسا

بھول جاتا ہے۔ جیسے ؎

اِن تلوں تیل ہی نہ تھا گویا
ہم سے کچھ میل ہی نہ تھا گویا

میں نے کہا۔ ع ناصحا مت کر نصیحت دل مرا گھبرائے ہے

بیگم "یہ وہ نشے نہیں جنہیں ترشی اُتار دے" ——— جواب ملا "میں ایسی نادان نہیں ہوں ترشی پیش کروں۔ ہم لوگوں کا کام نشہ اتارنا نہیں گھٹوانا ہے۔ میں تو کہتی ہوں کسی شکر لب شیریں دہن کے ساغرِ چشم سے ساز باز کیجیے۔ شرابِ وصل لنڈھائیے" میں نے یہ شعر پڑھ دیا۔ ؎

لبت شکر بمستاں داد و چشمت مے بہ میخواراں
منم کز غایتِ حرماں نہ با آنم نہ با اینم۔

آخر کار وہ مایوس ہو کر بولی۔ آپ نہیں مانیں گے۔ اچھا تو پھر فرمائیے میں کیا خدمت کر سکتی ہوں۔

کچھ ہچکیاں لے لے کر ہم نے بیان کیا۔ کچھ کرید کرید کر اس نے پوچھا۔ غرض یہ مدعا ادا ہو گیا کہ وہ گھر میں جاتی ہیں اتا پتا ہم بتائیں، نام پتہ وہ معلوم کر کے آئیں تاکہ کوشش کی جا سکے ——— تھوڑی دیر تو وہ سوچتی رہی اسکے بعد بولی۔ "میاں شریفوں رئیسوں میں اس لونڈی کا منہ کالا کر والیجیے گا۔ آپکو معلوم ہے اکثر و بیشتر گھرانوں میں ہم کو اندرونِ خانہ پھٹکنے بھی نہیں دیتے۔ انتہا یہ ہے کہ رنڈی یا طوائف کا لفظ بھی بہو بیٹیوں کے منہ سے نکلنا معیوب سمجھا جاتا ہے۔ کوٹھے والی کی ہوا بھی انکو نہیں لگنے دیتے۔ اس احتیاط میں جہاں اور مصلحتیں پنہاں ہیں، ان میں سے ایک یہ بھی ہے کہ ہم باہر کی بات گھر تک پہنچا سکتے ہیں۔ گھر کی باہر لیجا سکتے ہیں۔ اور میری بہنوں نے ایسا یقیناً کیا ہوگا۔ انہیں گنوں سے ہمارا دائرے کو پہنچے کر کسی کو ہمارا اعتبار نہیں رہا۔ اب اگر کوئی گھرانہ ہماری یہ عزت افزائی کرتا ہے کہ مستورات تک ہمکو جانے دیتا ہے تو اسکا اُسے یہ پھل دیں کہ اندرونِ خانہ عاشقانہ پیام سلام پہنچائیں۔ کنواری بچیوں کے نام نشان عیاش طبع نوجوانوں کو آ کر بتائیں۔ معاف کیجیے بندی سے ایسا نہیں ہو سکتا" ——— ان الفاظ سے ایک چوٹ سی لگی، اور ایسا معلوم ہوا جیسے رگِ جاں پر کسی نے نشتر لگایا ہو۔ میں نے احتجاج کرنا چاہا لیکن رنڈی نے بات سچی کہی تھی، زبان گُل گئی، الفاظ ہونٹوں تک آ نہ سکے۔

——— وہ مسلسل کہتی رہی۔ کیا عرض کروں، مجھے اس اعتماد کی لاج ہے جو مجھ پر کیا گیا ہے اس خدمت سے معذور ہوں۔ بس البتہ اتنا اور عرض کرنا چاہتی ہوں کہ اگر اپنی ناموس عزیز ہے تو پرائی پر نظر نہ ڈالیے۔ میں ذاتی تجربہ کی بنا پر کہہ رہی ہوں ——— عزت اور عصمت کی دولت سے کبھی میں بھی مالا مال تھی۔ اس نعمت کی قدر اس کے زوال کے بعد ہوئی۔ اور اُس شخص کا بھی انجام مجھے معلوم ہے جس نے میری چادرِ عصمت اتار مجھے ننگا بازار میں کھڑا کر دیا"

کچھ ان باتوں نے مجھے ایسا شرمندہ کیا کہ وہاں ٹک نہ سکا۔ اور اُٹھ کھڑا ہوا۔ وہ اتنا سمجھی کہ میں ناراض ہو گیا۔ وہ اصرار کر کے روکتی رہی لیکن قلب پر کچھ عجیب کیفیت تھی اور اُسکا پوری طرح اطمینان کیے بغیر چلا آیا۔ پہلے تو نیچے ہی کمرہ میں منہ لپیٹے پڑا رہا۔ جب دل نہ مانا تو مجبوری کوٹھے پر چڑھا لیکن آج پاؤں کچھ آہستہ اُٹھ رہے تھے۔ اور رجا کو بھی اُن کواڑوں سے دور ہو بیٹھا، جن کے قریب جانا چاہتا تھا ——— مقاومت کرنے والی مچھلی کو شکاری ڈھیل دے دیکر کھینچتا ہے۔ مجھے بھی جذبہ بے اختیاریہ دیکھ

اُن جھریوں تک سے ہی گیا جن میں سے اُن کا جمالِ جہاں آرا نظر آتا تھا لیکن آج تار نگاہ لوٹ لوٹ کر واپس آجاتا میرے قدموں میں خوشامدانہ انداز سے لوٹتا اور جانے سے انکار کرتا معلوم ہوتا تھا ------ چند روزہ دیدار کا سہارا تھا اُس کا بھی مزا آدھا رہ گیا۔ میں افسردہ خاطر اُٹھا اور گلی کی جانب ایک کھڑکی کی چوکھٹ سے لگ، آتے جاتوں کا تماشہ دیکھنے لگا۔ سامنے سے میرے ہاں کی حیدرآبادی ماما آبنوس کا کندہ لیکن آنکھ ناک سے اچھی آتی نظر آئی۔ اس کے پیچھے پیچھے ایک ادھیڑ عمر کے مرد معقول مجنوں صفت چلے آرہے تھے۔ اس رشکِ لیلےٰ نے پلٹ کر اُن سے کچھ کہا۔ وہ پیچھے ٹھٹک گئے اور دیوار کا سہارا لیکر کھڑے ہو گئے۔ جب کوئی اُدھر سے گذرا تو یہ صاحب ٹہلنے لگتے اور پھر اپنا مورچہ آن سنبھالتے ------ میرے تن بدن میں آگ ہی تو لگ گئی۔ غضب خدا کا میرے گھر کی ماما پر کوئی بُری نظر ڈالے۔ دو نوکروں کو بھیج شریفوں کی گلی میں بلاوجہ مشتبہ انداز سے کھڑے رہنے کے جرم میں انکی کندی کروائی۔ ماما کی بابت یہ حکم نافذ کر دیا گیا کہ آج ہی ایک نوکر اسے حیدرآباد کی ٹرین میں سوار کروا آئے۔ ہمارے ہاں ایسی کا کام نہیں۔

جب غصہ اُترا تو مہ لقا کے یہ الفاظ کانوں میں گونجنے لگے کہ "اپنی عزت عزیز ہے تو دوسروں کی عزت پر نظر نہ ڈالو"۔ بلا ارادہ دماغ میں آتے تھے اور ٹالے ٹلتے نہ تھے۔ دل کی گونج تھی جو دماغ کے گنبد سے ٹکرا ٹکرا کر آرہی تھی۔ مجھ پر قیامت بیت رہی تھی، وہاں تو ہر عضو بدن ہمارے خلاف گواہی دیگا۔ یہاں ہر بنِ مو زبانِ شعلہ بنا مجھے جھلس رہا تھا۔ اور یہی کہتا تھا کہ تیرے گھر کی ماما کو کوئی دیکھے تو تو آگ بگولا ہو جائے، اور تو دن دن بھر شریفوں کی بہو بیٹیوں کو گھورے۔

جو کواڑ مجھے مقناطیس کی طرح کھینچتے تھے، اب بُرے لگنے لگے، جن جھریوں پر میں آنکھیں جمائے بیٹھا رہتا تھا وہ اب دُور سے آنکھیں دکھانے لگیں۔ میں پژمردہ ہو کر نیچے اُتر آیا اور مُردہ کی طرح پلنگ پر پڑ گیا ------ مغرب کے بعد لاڈلے میاں کا آدمی آیا یہ پرچہ لایا۔ لکھا تھا مہ لقا یاد کرتی ہیں۔ نہ جاتا تو بُرا مانتے شکایت ہوتی، لکھ بھیجا ابھی آتا ہوں۔

جب میں پہنچا تو بزم جمی تھی۔ قہقہے چہچہے ہو رہے تھے، میری آنکھیں سُرخ تھیں، دل کے شعلہ ان آئینوں میں جھلک رہے تھے۔ ایک نے کہا۔ ؎

سُرخ ڈورے تری آنکھوں کے پتہ دیتے ہیں
رام زنگی میں بسر کی ہے کہیں آپ نے رات

دوسرا بولا۔ ؎

تو شبانہ می نمائی بر کہ بودی امشب
کہ ہنوز چشمِ مستت اثرِ خمار دارد

مہ لقا کچھ نہ بولی، میری طرف اک نگاہ ڈالی اور آنکھیں جھکا لیں۔ دستر خوان بچھا، میں نے کھانے سے انکار کر دیا۔ مہ لقا اور لاڈلے میاں نے اصرار کر کے بٹھا لیا زبردستی مجھے کھلاتے رہے۔ اب گانا شروع ہوا۔ محفل بے تکلف تھی مہ لقا صدر میں ہمارے پاس بیٹھی رہی گنو بھٹکی نے یہ غزل شروع کی ؎

عشق کی رنگین ادائیں یاد کرتی ہیں تجھیں
عہد ماضی کی خطائیں یاد کرتی ہیں تجھیں

جو زمیں پر گر رہے ہیں آسماں سے ٹوٹ کر
ان ستاروں کی ضیائیں یاد کرتی ہیں تمہیں
میکشوں کی توبہ جن کے در پہ کرتی ہے سجود
کالی کالی وہ گھٹائیں یاد کرتی ہیں تمہیں،
روتے روتے جو در مقصد پہ آخر سو گئیں
غمکدہ کی وہ دعائیں یاد کرتی ہیں تمہیں،
سسکیاں بھر کر جو روتی ہیں نہ جانے کر رہے
وہ فسردہ التجائیں یاد کرتی ہیں تمہیں،
جب سکون زندگی کو کہہ چکا ... وداع
... مائیں یاد آتی ہیں تمہیں

میری ... حت خراب ... غزل نے ... نیا تہ و بالا کر دی
انگارے سے دل کے نیچے ابار ... تو آنسو امڈے چلے
آئے ... بار اسے ضبط ... نہیں۔ رونے کا موقع نہیں کہ آتشِ بار
نکلنے کو بے قرار۔ دل بہلائے نہ، کلیجہ منہ کو آئے۔ مہ لقا
پریشان ہو ہو کر میری طرف دیکھ رہی تھی۔ خدا خدا کر کے
غزل ختم ہوئی اور مہ لقا نے ... نے کہا لیجئے صاحب اب
وہ غزل مجھے لکھوا دیجئے جس کا آپ نے کل وعدہ کیا تھا۔ میں
پریشان کہ یا الٰہی یہ کیا ماجرا ہو گیا۔ ... میں خوش ہوا۔ وہ بولی
یہ نہیں ہو گی۔ غزل میری ہو چکی ... میں آج ہی گاؤں گی
دیکھئے نواب صاحب۔ یہ وعدہ کر کے پھر رہے ہیں۔ قولِ مرداں
جان دارد۔ اور پھر لاجواب غزل ہے۔ محفل پھڑک اٹھے گی
آپ مدد فرمائیے۔ مجھے جلدی اس لئے ذرا ذہن بھی
ہٹانی ہو گی ... ساتھ ہی ساتھ مجھے آنکھ سے اشارہ کیا۔ میں سمجھا
تو خاک نہیں، ہاں میں ہاں ملا کر ساتھ ہو لیا۔ کاغذ قلم دوات
کیلئے نوکر سے کہہ دوسرے کمرہ میں چلا گیا ——— بولی
پہنچتے ہی کہنے لگی۔ آپ مجھ سے خفا ہیں۔ میں نے کہا نہیں،
بولی۔ خدا کا شکر ہے، میں تو سارے دن پریشان رہی۔ معاف
کیجئے گا۔ میں آپکو محفل میں سے اٹھا لائی، اس ظالم نے چیز ہی
ایسی شروع کی تھی۔ انہوں نے کا دل بھر آئے اور پھر آپ تو
چوٹ کھائے ہوئے ہیں لیکن حضور ع
قابو میں جگر رکھتے ہیں قبضہ میں نگاہیں" ——— مجھے
ڈر تھا کہ اگر ایک اور چیز اس نے ایسی ہی شروع کر دی تو
... اندر دل ساغرِ چشم سے چھلک نہ جائے اور کنور سہیلی کو
آجکل آگ ہو رہی۔ وہ بھی بھینکی بیٹھی ہے۔ کم بخت جو بیس گھنٹہ
ایسی ہی چیزیں گاتی رہتی ہے۔ دل کا سوز آواز میں آگیا ہے
تیر ... کا کام کرتا ہے۔ اس وقت مجھے دل سنبھالنا مشکل
ہو گیا تھا۔ آپکی تو بات ہی دوسری ہے۔

اتنے میں نوکر ... قلم دوات لے آیا۔ اور اس نے پانی کے
دو گلاس منگا... پھر ... آگے ... نواب صاحب ... تیز
کو بلائیے یا خود تکلیف فرمائیے۔ کچھ ضروری باتیں کرنی ہیں۔
سچ یہ ہے کہ میں آپکو اتنا ڈوبا ہوا نہیں سمجھتی تھی، بہت اچھا
اب کل باتیں ہونگی۔ میں کس وقت انتظار کروں۔ میں نے کہا
اچھے صبح پہنچ جاؤنگا۔ لیکن غزل تو آپ نے ابھی لکھی ہی
نہیں۔ بولی۔ میں ابھی یاد سے لکھے لیتی ہوں۔ آپ کی دعا
سے سیکڑوں یاد ہیں۔ میں نے کہا یہ بات غلط ہے اسوقت
تو میری ہی بتائی ہوئی گانی پڑے گی۔ بولی جو حکم۔ مگر اک
شرط کے ساتھ۔ میں نے پوچھا کیا۔ آپ للہ طبیعت کو قابو
میں رکھئے گا۔ میں نے اسکو یہ غزل لکھوا دی۔ ع

کام کیا معلوم کس کی ... جائے کہاں
کیا خبر لب گردش آفات لے جائے کہاں

اس نظارے سے بھی تو آغاز سفر کوئی کرے
شام ہو جائے کہاں یا رات آ جائے کہاں

آسماں کے جور کا بھی ذکر ہم کرتے نہیں
کیا خبر چل کر کہاں سے بات آ جائے کہاں

دیدہ و دل سے کوئی غفلات نہ ہو جائے کہیں
یعنی اب وہ جان محسوسات آ جائے کہاں

مے پرستوں کے لئے حیرت کسے معلوم ہے
پھر کوئی ایسی ہی اک برسات آ جائے کہاں

اس نے استادوں کو بلا، دھن قایم کرنی شروع کی۔ میں پھر محفل میں آ بیٹھا۔ لوگ کچھ مشتبہ ضرور تھے لیکن میرے فوراً چلے آنے اور استادوں کے بلائے جانے پر شکوک رفع ہو گئے۔

ایک نئے کا عمل تھا جو میں گھر پہنچا۔

صبح ایسے حسب وعدہ مشتری کے ہاں جا براجا۔ مہ لقا راہ دیکھ رہی تھی، بولی "گھائل کی گت گھائل جانے اور نہ جانے کوئے" کل آپکی عالت دیکھ کر میرے زخم تازے ہو گئے۔ بیتی ہوئی داستانیں، گذرے ہوئے فسانے یاد آ گئے۔ سوچا کہ کچھ دیر باتیں ہی کریں گے۔

پہلے میری لکھوائی ہوئی غزل کا ذکر آیا اور پھر شعر شاعری ہونے لگی حتیٰ کہ بیت بازی چھڑ گئی۔ اس کا ایک شعر کاف پر ٹوٹا۔ اور میرے منہ سے بے ساختہ نکلا۔ ؎

کافی ہے تیرا نام بھی تسکین قلب کو
گر تو نہ بزم میں ہو تری گفتگو رہے

وہ مسکرا کر بولی۔ ؎

یار کا ذکر کئے جاتا ہوں وصل کی فکر کئے جاتا ہوں

میں نے کہا۔ ؎

تا بکے اندازکے تیرو ں کا ستم دل میں اک نشتر لئے جاتا ہوں

بولی۔ ؎

نام لینے میں کیا برائی ہے ❊ دل کی تسکین کی اک صورت ہے

میں نے کہا۔ ؎

یاد مجھکو تری نصیحت ہے ❊ اس لئے میں خموش بیٹھا ہوں

جواب ملا۔ ؎

ناصحا تو بھی زخم خوردہ ہے ❊ بے تکلف سنائیے صاحب

اور پھر کہنے لگی۔ بندہ نواز۔ کل آپکی حالت مجھ سے دیکھی نہ گئی۔ ع ذکر حبیب کم نہیں وصل حبیب سے۔ یہ لونڈی جب تک یہاں ہے۔ کم از کم اتنا ہی فرض انجام دیگی کہ ان کی باتیں آپ سے کیا کرے ——— باتوں باتوں میں نوبت بہ اینجا رسید کہ ہم نے ماما کا سارا قصہ کہہ سنایا۔ اس نے کہا حضور بندی نے تو پہلے ہی عرض کیا تھا کہ چاہ کنندہ را چاہ در پیش۔ شکر کیجئے کہ ماما ہی پر ٹلی۔ شریف آسانی سے سبق لے لیتے ہیں۔ نیز شفیق معلم قدرت بھی اتنی ہی تادیب کرتا ہے جتنی ضروری سمجھتا ہے۔ پھر برسبیل تذکرہ نہایت خوبصورتی سے مجھ سے دریافت کر لیا کہ شادی ابھی نہیں ہوئی۔ ارشاد ہوا تو پھر وہ ہی کیوں نہیں کر لیتے۔ میں نے کہا۔ مجھ سے یہ جنجال بھگتا نہیں جائیگا۔ بولی تو پھر تنکوں ہی پر گذر کرنے کا ارادہ ہے۔ آپکی خوشی۔ ہاں اتنا میں عرض کرتی ہوں کہ بہو بیٹیوں پر خدارا کرم رکھئے گا۔ یہ نگہ کرم شاہدان بازاری تک ہے تو بہتر ——— حالانکہ شریف کیلئے تو اس میں بھی خرابیاں ہیں۔ میں نے کہا "نہ خدا تو دے نہ میں دوں"۔ بہو بیٹیوں پر نظر نہ ڈالو۔ حسن فروشوں میں

دن گذارو، اور خرابیاں وہاں بھی موجود۔ حضرت ناصح اگر لگے ہاتھوں ان سے بھی آگاہ فرمادیں تو انسب ہے"۔

بولی۔ میں آپکو کیا بتاؤں، ابھی چند روز کی بات ہے۔ ہمارے لکھنؤ میں ایک شریف زادہ کا تعلق طوائف سے تھا، ہونی شدنی بات اسے حمل قرار پاگیا۔ ان کے تلووں سے لگ گئی کہ یہ کیا ہوا۔ تھے خاندانی، آبرو کا پاس، عزت کا خیال ایسے گھر میں اپنی اولاد ہونی کون گوارا کرسکتا ہے۔ لڑکا ہو تو بُرا اور لڑکی کا تو پھر کہنا ہی کیا۔ دل میں ٹھان لی کہ اسقاط کرائیں گے۔ رنڈی کے ماں باپ نے بڑے پیر پھیلائے۔ آخر چار ہزار روپیہ لے کر راضی ہوئے۔ ڈاکٹرنی نے بھی خاصی بڑی رقم جھیری۔ دقت کی خوبی رنڈی آپریشن میں مرگئی۔ پولیس تھانہ ہوا۔ نک کٹائی جگ ہنسائی ہوئی روپیہ پانی کی طرح بہایا جب کہیں خدا خدا کرکے عزت بچی سو میاں حرام تو پھر حرام ہی ہے رنگ لائے پر لائے۔

یہ باتیں ہو رہی تھیں کہ لاڈلے میاں کے ہاں سے نوکر آیا، پیغام لایا کہ دن کا کھانا وہیں کھانا اور ذرا جلدی آجانا۔ میں اجازت لیکر اُٹھ آیا۔ اس مسئلہ پر غور کرتا رہا۔ آخر دوسرے دن جا ہم نے منہ لقاؔت کہدیا کہ جو اس کام میں تم ہماری مدد کردو تو ہم انہی سے شادی کریں گے۔ بولی شریف کا علاج ہے۔ میں نے صرف گردن ہلادی۔

کہنے لگی اچھا تو آج میں محلسرا میں جاؤنگی۔ ان کے جوڑے کا رنگ مجھے بتا دیجئے۔ میں نے کہا معلوم نہیں۔ بولی کیا فرمایا۔ میں نے کہا اس ناچیز نے غرض کیا معلوم نہیں۔ فرمایا کیا روزن دیوار مسدود ہوگئے۔ میں نے جواب دیا۔ ہم نے دیکھنا بند کردیا۔ کہنے لگی، یہ آخر کیوں۔ میں نے بہت آہستہ آہستہ ایک ایک لفظ پر زور دیکر کہا" اگر اپنی ماں بہن کی عزت پیاری ہے تو دوسروں کی ماں بہن کی عزت پر نظر نہ ڈالو" ——— اس نے مجھے سر سے پا تک دیکھکر کہا" خدا کا شکر ہے۔ سچ ہے شریف انسان کو ایک بات کافی ہوتی ہے۔ اچھا تو اب جبکہ جناب نے شرعی قدم اُٹھانے کا فیصلہ کرلیا ہے تو انہیں دیکھ لیجئے گا اور مجھے محفل میں کسی عنوان سے بتا دیجئے گا۔ آپکو زبان پر قدرت ہے۔ اور میں بھی نافہم نہیں۔ میں نے کہا اس پر تو میری بھی صاد ہے۔

شام کو مغرب سے قبل انکے جوڑے کا خوب اچھی طرح جائزہ لیا۔ شادی کے ارادہ کے بعد سے ان کی جانب میرے جذبات کا عنوان بدل گیا تھا۔ دل وہی تھا مگر تعلق خاطر کچھ اور، آنکھیں وہی تھیں دیکھن بدل گئی تھی۔

ان بیگم نے سر سے پاتک کاسنی جوڑا زیب بدن کر رکھا تھا۔ آج میں بن بلائے لاڈلے میاں کے ہاں جا دھمکا۔ انہوں نے کہا۔ زہے نصیب آج تو حضور خود تشریف لے آئے۔ منہ لقاؔ وہ بہت وہیں تھی۔ بولی مزاج تو اچھا ہے۔ میں نے کہا آج کچھ دل پر گرمی سی محسوس ہو رہی تھی، ابھی زلال کاسنی پی کر آرہا ہوں۔ سر سے پا تک ٹھنڈک آگئی۔ وہ اس طرح مسکرائی جس کے معنی تھے کہ میں سمجھ گئی بس کافی ہے۔ اوّل شب اُس نے مردانہ میں مجرا کیا۔ بارہ کے بعد حویلی میں گئی۔ دوسرے دن تکلف برطرف ہم صبح ہی جا براجے۔ وہ منہ ہاتھ دھو رہی تھی۔ بولی اللہ رے شتابی تشریف رکھئے۔ میں ابھی حاضر ہوئی۔ اتنا خیال رہے بڑا اور کڑے بیٹھنا ہوگی۔ میں نے کہا" جو انکار کرے سو کافر"

معلوم ہوا کہ لاڈلے میاں کی خالہ زاد بہن نے یہ لال جوڑا ...

پر مکان ہی میں نے کہا بس اب میں سمجھ گیا۔ دل بلیوں اچھل رہا تھا۔ کچھ شکل تو نکلی۔ پتہ تو معلوم ہوا۔ آگے خدا خود مسبب الاسباب ہے ـــــــ میں نے گھر آ اپنی ماموں زاد بہن کو بلا بھیجا ان سے قدرے بے تکلفی تھی، اور ہمیشہ شادی کا شدید تقاضہ کرتی تھیں۔ اب کے بھی انہوں نے آتے ہی وہی خانگی دہرائی لے شادی کر لو نا۔ ایسی بھی کونسی گھڑی موئی منہ سے نہیں نکل گئی کہ اب کسی طرح ہامی بھرتے ہی نہیں۔ اللہ جانے سونا سونا گھر برا لگتا ہے۔ میں کہتی ہوں بھیّی اماں کیا آپ کا دل نہیں چاہتا کہ چاندسی بہو بیاہ کر لائیں۔ گھر میں چھم چھم کرتی پھرے پوتا پوتی کھلائیں۔ میں نے کچھ جواب دیا۔ اماں نے کہا بیٹی کیا کہوں، میری تو دعائیں مانگتے مانگتے نگوڑی زبان بھی سوکھ گئی۔ یہ میاں راضی ہی نہیں ہوتے۔ جو انکا ایک آدھ بھائی اور ہوتا تو بھی میں صبر کر لیتی۔ اب تو اللہ رکھے خاندان کا نام انہی کے دم سے چلنا ہے۔ پر ماں بندی کیا کرے۔ یہ راضی بھی ہوں۔ تم جانو لڑکی تو ہیں نہیں جو زبردستی باندھ دوں۔

اماں کا سہارا ملتے ہی وہ تو مجھ پر چھا گئی۔ ادھر ظہر کا وقت ہو رہا تھا۔ والدہ دوسرے کمرہ میں نماز پڑھنے چلی گئیں اور ادھر اس نے مجھے لُتے ہاتھوں لے ڈالا۔ اللہ نہ کرے جو ایسی ناکہن اولاد ہو۔ سچ کہتی ہوں جو میرا شمس الدین ایسا خود (خودسر) ہوا تو کان پکڑ گھر سے باہر نکال دونگی۔ میں کہتی ہوں ایسی بھی کیا ضد۔ لو اب تو اپنے کانوں سے سن لیا کہ بھیّی اماں دن رات دعائیں مانگتی ہیں۔ میرے مولا اس گھڑی ان کی سن لے۔ آخر کار بڑے ناکر نکر کے بعد ہم بھی نیم راضی ہو گئے۔ اور باتوں باتوں میں یہ آواز بھی کان میں ڈال دی کہ لاڈلے میاں کی خالہ زاد بہن سے کرا دو تو ہم راضی ہیں۔ وہ بولی۔ لے یہ کونسی بڑی بات ہے۔ اللہ جانے اس وقت سارے شہر میں چراغ لے کر ڈھونڈو تو میرے بھائی سا لڑکا نہیں جڑے گا۔ اللہ نے چاہا تو کہنے کی دیر ہے۔ راضی ہونے کی دیر نہیں۔ ـــــــ اور لڑکی بھی اللہ جانے تمہارے قابل ہی ہے، لاکھوں کروڑوں میں ایک۔ اس وقت شہر بھر میں جواب نہیں۔ چھوٹی تارا ماتھے چاند، اندھیرے میں بیٹھ جائے تو اجالا ہو جائے۔ ہاں ایک بات بتاؤ۔ یہ تمہارا خیال وہاں کیونکر پہنچا۔ میں نے کہا۔ آپا۔ لاڈلے میاں سے اپنی دانت کاٹی روٹی ہے۔ جانے بوجھوں میں رشتہ ہو تو نباہ اچھی ہوتی ہے۔ بس اتنی بات ہے۔ اور کچھ نہیں۔ اس نے ٹیڑھی آنکھوں سے میری طرف دیکھا اور مسکرا کر چپ ہو گئی۔ غرضکہ میرے منہ سے ہاں نکلنی تھی کہ سارا کنبہ دوڑ پڑا بات پکی ہو گئی۔ جانبین سے تیاریاں ہونے لگیں۔

دن رات دھما چوکڑی مچی رہتی۔ تین مہینہ بعد بیاہ محفلیں ہوئیں۔ دور دور سے طائفے بلائے گئے۔ مہرا کو پل پل کی خبر دی جا رہی تھی۔ بھلا وہ کیونکر نہ آتیں میں نے ہیرے کے جڑاؤ کڑے اپنے ہاتھ سے پہنائے پر اللہ رے تیری آن، جاتے ہوئے ریل سے ہاتھ نکالا ایک ڈبیہ مجھے دے دی۔ اب جو کھول کر دیکھتا ہوں کوئی چار رتی کا گلابی ہیرا انگوٹھی میں جڑا پڑا دمک رہا ساتھ ایک پرچہ بھی تھا، اس میں لکھا تھا۔ خدا کی قدرت حلال کی ہے۔ بیگم صاحبہ بہن سکتی ہیں۔ ۱ ش

خواجہ محمد شفیع دہلوی

حکیم جی

"مردک"

(از حضرت اللہ پوری)

پہلے ایک لطیفہ ملاحظہ ہو ــــــ: "کہتے ہیں کہ خلیفہ ہارون رشید عباسی اکثر راتوں کو بھیس بدل کر رعایا کے حال کا نگراں ہوتا تھا۔ چنانچہ ایک شب خلیفہ، جعفر، مسرور سوداگروں کی صورت بنائے، دریا کے کنارے گشت لگا رہے تھے۔ ناگہاں ایک طرف سے نغمۂ دل آویز کی صدا آئی۔ کوئی ماہرِ فن موسیقی بلحن داؤدی رباب پر حسرت انگیز اشعار اس لسوز دھن میں گا رہا تھا کہ خلیفہ سر دھننے لگا۔ اب دھن یہ سوار ہوئی کہ دیکھنا چاہیئے کون گا رہا ہے۔ تینوں اُسی طرف روانہ ہوئے جدھر سے وہ جگر پاش آواز آ رہی تھی۔ قریب پہنچنے پر دیکھا کہ ایک چھوٹے سے کچے مکان سے صدائے دلکش نکل کر فضا پر موسیقیت طاری کر رہی ہے۔ مسرور نے "دقِ باب" کیا۔ گانا بند ہو گیا۔ آواز آئی "کون ہے؟" مسرور نے خلیفہ کے اشارے سے جواب دیا "ہم سوداگر دمشقی ہیں۔ راستہ بھول کر چلے آئے ہیں، ہمیں رات کی رات پناہ دیجیے۔" ایک نوجوان اعرابی نے باہر نکل کر تینوں کا پرتپاک استقبال کیا۔ خلیفہ نے مکان میں داخل ہو کر دیکھا کہ رومی قالین پر رباب رکھا ہوا ہے اور سامنے نبیذ (ایک قسم کی شراب جو اس وقت رائج تھی) کے شیشے کشتی میں قرینہ سے لگائے ہوئے ہیں۔ اعرابی نے پہلے تو روٹی پنیر اور بھونے ہوئے گوشت سے مہمانوں کی تواضع کی اور آپ رباب اُٹھا کر بجانے لگا۔ خلیفہ نے نبیذ کی ایک گلابی اٹھائی، جام بھر کر حلق سے فرو کر لیا۔ جب کچھ سرور ہوا خلیفہ نے ہاتھ کے اشارے سے نوجوان کو روک کر پوچھا "بھئی! تمہیں معلوم ہے میں کون ہوں؟" اعرابی نے کہا "ابھی تو تم کہہ چکے ہو کہ تم سب دمشقی سوداگر ہو۔" خلیفہ نے کہا "نہیں وہ غلط تھا۔ میں خلیفۂ بغداد کی فوج کا افسرِ اعلیٰ ہوں۔" اعرابی نے کہا "اچھا ہوگے۔ لو ایک اور گانا سنو۔" اتنے میں خلیفہ نے دوسرا جام نوشِ جان کیا اور پھر اعرابی کو روک کر بولا "بھئی تم جانتے ہو میں کون ہوں؟" اعرابی نے چڑھ کر کہا "ہاں سن تو لیا تم خلیفہ کی فوج کے افسرِ اعلیٰ ہو۔" خلیفہ نے کہا "نہیں یہ بھی غلط ہے۔ میں خلیفہ کا وزیرِ اعظم جعفر ہوں۔" اعرابی حیرت سے خلیفہ کا مُنہ تکنے لگا اور سمجھا کہ نشے میں لایعقل ہو رہا ہے۔ اب خلیفہ نے تیسرا جام بھرا لیکن جیسے ہی چاہا کہ لبوں سے لگائے کہ اعرابی نے ہاتھ مروڑ کر جام چھین لیا اور کہا "اب میں تمہیں ہرگز نہ پینے دوں گا۔ دو جام میں تو تم وزیرِ اعظم بن گئے۔ تیسرے میں تو شاید یہ کہہ بیٹھو گے کہ میں خود خلیفہ ہوں۔......."

... ...

تو نتیجہ یہ نکلا کہ حکیم جی ہو جانا صحیح۔ سند یافتہ تکمیل الطب کالج لکھنؤ بھی ہونا درست لیکن اس کے ساتھ ساتھ "ملّا فاضل۔ مولوی عالم فاضل صدرالافاضل" ہونا بالکل ناجائز۔ اسلئے کہ ان دُم چھلوں کے لگ جانے سے حکیم حکیم نہیں رہتا بلکہ وہ بیک وقت حکیم منطقی فلسفی۔ فقیہہ۔ شاعر۔ ادیب۔ خطیب۔ مدرس۔ ناظم۔ نثار وغیرہ کا ایسا "معجون مرکب" بن جاتا ہے جس پر واحدی صاحب کا یہ لیبل "اسے ہر موسم میں اور ہر وقت استعمال کیا جاسکتا ہے" بالکل چسپاں نظر آتا ہے۔ اور ایسی حالت میں "تجزیہ" کرنے پر بھی اسکی "حکیمیت" کا "مفرد" نظر آنا محال ہوجاتا ہے۔ اسلئے ہماری رائے ناقص میں تو لفظ "حکیم" کے ساتھ "ملّا فاضل۔ مولوی فاضل۔ عالم فاضل صدرالافاضل" کا لفظ بالکل "فاضل" ہے اور اسے "مدِّ فاضل" کی طرح الگ کر دینا چاہئے۔

اس قسم کا حکیم اگر شب کو ذرا ترشّح ہو کر کھل جانے کے بعد کسی مشتبہ گلی سے دبے پاؤں نکلتا ہوا دکھائی دے اور آپ کہیں پوچھ بیٹھیں "قبلہ حکیم جی۔ ادھر کہاں سے" تو وہ ایک خالص عربی انداز پیدا کرنے کی کوشش کرتے ہوئے قرأت کے ساتھ جواب دیگا "ازبسکہ تقاطر امطار ہو رہا تھا اور یہ اقرب طرق تھا، فلہٰذا ادھر ہی سے عازم ہو کر مطلع منزل کی"۔ یہ دوسری بات ہے کہ آپ "اقرب طرق" کے معنی نہ سمجھیں اور بطور خود یہ سمجھ لیں کہ حکیم جی کسی کی "قربت" حاصل کرنے کی غرض سے گئے تھے، اور "مقاربت" کے بعد واپس تشریف لا رہے ہیں۔ اور اگر یہ عجیب الخلقت سند یافتۂ لکھنؤ آپ کی معیّت میں جاتا ہوا ایسی جگہ پہنچ جائے جہاں سے دنیا کے اس "آٹھویں عجائب" کو الگ راہ لینی ہو تو وہ فوراً مصافحہ کو ہاتھ بڑھا کر حلق سے بولے گا "ہٰذا فِراقُ بَینِی وَبَینِکُم"۔ یہ دوسری بات ہے کہ آپ عربی داں نہ ہوں اور صرف لفظ "فراق" سن کر اور مصافحہ والی "دست درازی" دیکھ کر خائف ہو جائیں کہ لکھنؤ کا یہ "سحت یافتہ" کہیں بارے "فراق" میں تو نہیں ہے۔

خدا جانے یہ لکھنؤ کی صحبت کا اثر ہے یا التعلیم کا کہ اس قسم کے حکیم کے سائن بورڈ پر "ماہر امراض مخصوصۂ مردانہ و زنانہ" کا لکھا ہونا ایسا ہی ضروری ہے جیسا حکیم جی کا "اردو نما عربی" بولنا۔ "شفاء الملک" لکھنا تو ایسے حکیم کا پیدائشی حق ہے۔ درآنحالیکہ درحقیقت وہ مرض سے زیادہ مریضوں کا "صفایا" کرنے کے اعتبار سے "شفاء الملک" کے بجائے "سفاء الملک" خطاب پانے کا زیادہ مستحق ہوتا ہے۔ ایسا حکیم لکھنؤ کی روایات برقرار رکھتے ہوئے زرد رو۔ منحنی۔ دبلا پتلا ہوتا ہے۔ آنکھوں میں حلقے۔ گالوں میں گڈھے۔ چال میں غضب کی لچک اور لچک کے ساتھ کلائی سی لیک۔ جسم پر مارچ سے لیکر دسمبر تک باریک تنزیب کی عبا۔ نین سکھ کا پاجامہ۔ پیر میں سلیم شاہی جوتے اور سر پر گدی تک اوڑھی ہوئی دوپلّی ٹوپی ٹکڑا میچ حصوں میں گوندے سے چپکا یا ہو جیسے وہ ٹوپی کے نام سے یاد کرتا ہے۔ داڑھی کا زنخداں پر اس طرح نشان جیسے کسی بے ریش نے ہو بہو داڑھی کے کترے ہوئے بال اٹھا کر ٹھوڑی سے چپکا

ئے ہوں۔ عبا کا دامن بار بار سنبھالنے کے باوجود "جامہ سے باہر" دسمبر سے فروری تک تو جسم پر گلشن کا گلشن یعنی لکھنؤ کے چھاپے والے کپڑے کی شیروانی جس پر اکثر رات کو چلتے ہوئے دیکھ کر گمان ہوتا ہے کہ کوئی لحاف چرا کے بھاگا جا رہا ہے۔ غرض اپنے اطوار۔ کردار۔ گفتار۔ رفتار میں وہ "لکھنویت" کو کہیں ہاتھ سے جانے نہیں دیتا اور اپنے حرکات و سکنات سے ہمیشہ یہ ثابت کرنے کی کوشش کرتا رہتا ہے کہ وہ خالص لکھنوی ہے۔ بہاری نہیں۔

تو ہمارے "حکیم جی" حکیم ابو الفضل سند یافتہ تکمیل الطب کالج لکھنؤ مولوی فاضل "شاید ابو الفضل اور مولوی فاضل" یکجا ہونے کے باعث شہر میں حکیم "ابو الفضول" مشہور ہیں۔ وضع قطع کا ذکر صفحات ماقبل میں ہو چکا ہے۔ آپ کے سائن بورڈ پر جس کی نظر پڑتی ہے وہ محو ہو کر رہ جاتا ہے۔ شاید وہ سوچنے لگتا ہے کہ ایک ہی شخص ایک ہی وقت میں "ارسطوئے جہاں۔ لقمانِ دوران۔ مسیحِ زمان ماہر امراض مخصوصہ مردان و زنان شفاء الملک" کے ساتھ ساتھ "مولوی فاضل" کیسے ہو سکتا ہے؟

ہمارے حکیم جی کو مطب کرتے ہوئے پانچ سال کا عرصہ گذرا ہے، اتنی مختصر مدت میں آپ نے اپنی "شفاء الملکی" کا "شہر خموشاں" میں ایسا "سکہ" جمایا ہے کہ ہر "گوشہ آباد" آپ کی "شوخی تجویز" کا "نقش فریادی" ہو کر آپ کے سائن بورڈ سے بزبان حال التجا کر رہا ہے کہ "بھیا سائن بورڈ۔ خدا کے لئے اس شعر کو بھی کہیں [illegible] میں جگہ دے دو۔" ؎

کرے نہ "ذبح" جو عاشق تو وہ نہیں معشوق
مریض کو نہ "پچھاڑے" تو پھر حکیم نہیں

میں میڈیکل کالج میں پڑھتا تھا۔ اور میرے لنگوٹیا یار میاں شمیم نے حال ہی میں وکالت شروع کی تھی۔ میاں شمیم کی خانہ آبادی کو چھ مہینے گذرے ہونگے کہ ایک دن وہ گھبرائے سے نازل ہوئے اور کہنے لگے "دو کل سے میری اہلیہ کو ہسٹیریا کے دورے پڑ رہے ہیں۔" میں نے کہا "تو پھر چلوں میں" کہنے لگے "میاں میں تو یونانی دوا کی تاثیر کا قائل ہوں۔ کسی حکیم ہی سے رجوع کرونگا۔ تمہارے خیال میں حکیم ابو الفضول کیسے حکیم رہیں؟" میں نے سنجیدگی سے کہا "بھئی۔ یونانی دوا کا قائل ہونا دوسری چیز ہے لیکن ہر فاضل طب یونانی کو ماہر سمجھنا غلط ہے۔ اگر تمہیں حکیمی علاج ہی کرانا ہے تو شہر میں حکیموں کی تعداد [illegible] کے جراثیم سے کسی طرح کم نہیں ہے حکیم [illegible] حکیم "چقندر" حکیم "ادرک" وغیرہ وغیرہ" لیکن میرے یار کو وکالت پاس کرنے کی وجہ سے ہر بات میں "سند" کی ضرورت محسوس ہوتی تھی۔ کہنے لگے "لیکن یہ سب حکیم تو سند یافتہ نہیں ہیں ......"

وکیلوں سے تو خدا بچائے۔ بے فیس لئے بھی اگر کسی کی حامی [illegible] تو اس کی تعریف میں زمین و آسمان کے [illegible] ملا دیں۔ ہم نے لاکھ سر کھپایا۔ مگر وہ یہی کہے گئے ؎

جو لکھنؤ سے "شفائی سند" کرے حاصل
تو اس حکیم سے بڑھ کر کوئی حکیم نہیں

آخر یہ تجویز "ہوئی" کہ آج شام کو حکیم جی کے مطب میں مع اہلیہ شمیم ہم لوگ جائیں اور انکی "شفاء الملکی" کا امتحان لیں۔ غرض شام کو دو رکشوں پر لد کر ہم لوگ حکیم جی کے مطب میں پہنچے۔ حکیم جی نے ہمیں دیکھتے ہی "لو گرفتار مطلب" کی طرف اپنی توجہ مبذول کی اور ایک شانِ بے نیازی سے نبض ٹٹولنے لگے۔ ہم نے زنانے رکشے کو سائبان میں روک دیا اور خود مطب میں جاکر دو کرسیوں پر بیٹھ گئے۔ دفع الوقتی کے لئے اِدھر اُدھر کی گپ کرنے لگے۔ دورانِ گفتگو میں شمیم نے کہا :۔ "اس بار تو سی۔ آر (مشہور کانگریسی لیڈر C.R.) آل انڈیا کانگریس کمیٹی میں خوب بولا" "تو اس سے ہوا کیا" میں نے اعتراضاً کہا۔ "سی۔ آر کا تو ساتھ کسی نے نہیں دیا" حکیم جی دفعتاً اچھل پڑے جیسے انہیں کسی نے چپت رسید کردی ہو۔ فرمانے لگے :۔

"استغفراللہ۔ کیا فرماتے ہیں آپ ؟ یہ بات مسیلمہ کذاب کے دعوی پیمبری کی طرح بالکل غلط ہے"

ہم نے حیرت سے حکیم جی کا منہ دیکھا اور ان کا مطلب نہ سمجھتے ہوئے پوچھا "تو پھر آپ کا کیا خیال ہے؟" ایک مولوی فاضلانہ انداز سے فرمانے لگے "تاریخِ طبری۔ تاریخ ابن خلدون ایسی معتبر کتابوں میں صاف صاف مذکور ہے کہ جب ایک سیار (گیدڑ) بولتا ہے، تو جماعتِ "سیاران" اس کی ہم نوائی اُسی طرح کرنے لگتی ہے جیسے مشاعرہ میں مصرعہ اٹھایا جاتا ہے۔ یہ آپ نے کیا بے سمجھے بوجھے کہدیا کہ سیار بولا اور کسی نے اس کا ساتھ نہیں دیا"

میں نے پیک تھوکنے کے بہانے منہ پھیر کر ہنسی ضبط کی اور حکیم صاحب سے کہا "حکیم جی۔ کم از کم اس بار تو ایسا نہیں ہوا" فرمانے لگے "تو اسے یکے از مستثنیات سمجھ لیجئے" شمیم نے ہمارے زور سے چٹکی بھری اور کہا "بھلے آدمی پہلے کام تو ختم کرلو" میں نے کہا "حکیم جی۔ ایک مریضہ کو لیکر حاضر ہوئے ہیں۔ ذرا نبض دیکھ لیجئے" حکیم جی زنانے رکشے کے قریب پہنچے۔ اہلیہ شمیم نے اپنا ہاتھ پردے سے باہر نکالا اور حکیم جی نے نبض دیکھنی شروع کی۔ گہری خاموشی چھائی ہوئی تھی۔ حکیم جی کی انگلیاں نبض کی رگوں پر "ہارمونیم" کے ماہر کی انگلیوں کی طرح "رقص" کر رہی تھیں۔ گویا نبض کی گہرائیوں میں اتر جانا چاہتی ہیں۔ حکیم جی نبض دیکھ کر اپنی کرسی پر واپس تشریف لائے۔ گہری تشویش ان کے چہرے سے نمایاں تھی۔ لیکن انکی آنکھوں کی گہرائیوں میں "شیطنت کی چمک" جھلک رہی تھی۔ بہر تقدیر حکیم جی نے "مرض سلسل البول" تجویز فرمایا۔ شمیم نے ہر چند کہا کہ انہیں "اختناق الرحم" کی شکایت ہے۔ غشی کے دورے پڑتے ہیں۔ لیکن لکھنؤ کا سند یافتہ یہی کہے گیا "جی ہاں بجا ہے۔ اوّل اوّل اختناق الرحم ہی تھا۔ ولے بباعث ازدیاد سلسل البول کی صورت اختیار کر گیا" میں نے جی ہی جی میں کہا "یا مظہر العجائب سلسل البول حاضر اور اختناق الرحم غائب" حکیم جی نے نسخہ لکھ کر حوالے کیا۔ اور ہم سب وہاں سے شمیم کے گھر آئے۔ شمیم تو اپنی اہلیہ کو حکیم جی کی تجویز سمجھانے گیا اور میں برآمدے میں آرام کرسی پر دراز ہو گیا۔

تھوڑی دیر بعد شمیم باہر نکلا۔ چہرہ غصہ سے سرخ اور منہ میں کف بھرا ہوا۔ ہم نے پوچھا "کیوں بھئی خیر تو ہے؟"

کہنے لگا "یہ حکیم شیطان مجسّم ہے"۔ میں نے کہا "کیوں بوالفضول کو فضول گالیاں دے رہے ہو۔ آخر بتاؤ تو ہوا کیا؟" بولا "ابھی جو میں اندر گیا تو میری اہلیہ نے کہا کہ "میں تو زہر کھا لوں گی، لیکن اس نگوڑے کلموہے حکیم کا علاج نہ کرونگی"۔ وجہ پوچھنے پر انہوں نے کہا "نبض دیکھتے وقت اس مونڈی کاٹے نے میرا ہاتھ اسی طرح دبایا جیسے تم کبھی کبھی دبادیا کرتے ہو۔ نوج تم دکھاتے مجھے ایسے حکیم سے"؟" بس اب میں جاتا ہوں سینے پر چڑھ کر خون پی لونگا مردود کا"۔ میں نے کہا "بھئی بہت ممکن ہے کہ حکیم جی نے قصداً ایسا نہ کیا ہو۔ اس کی تحقیق کرنا ضروری ہے"۔ شمیم نے کہا "میں تو اس کمبخت کی صورت بھی اب نہ دیکھونگا، تمہیں تحقیق کرو"۔ ہم نے تحقیق کرنے کا وعدہ کیا اور شمیم سے رخصت ہو کر گھر آئے۔ لیکن واقعہ وہی تھا جو اہلیہ شمیم نے بیان کیا تھا۔ یعنی حکیم جی کو "سودا" ہو گیا تھا۔ میرے دوست کی بیگم کے "ساعد سیمین" کو دیکھ کر حکیم جی پنجہ جھاڑ کے پیچھے پڑے تھے۔ شک تو مجھے بھی ہوا تھا مگر شمیم کے بیان سے تصدیق ہو گئی۔ مزید تشفی کے لئے میں حکیم جی کے مطب میں دوسرے روز علی الصباح نازل ہو گیا۔ ایک ہی رات میں "سوز تپ فرقت" نے حکیم جی کا رنگ "زعفرانی" کر دیا تھا۔ ہونٹ سوکھے ہوئے "انجیر" بن گئے تھے۔ ہمیں دیکھتے ہی حکیم جی نے "پرتپاک" استقبال کیا اور چھوٹتے ہی "سوالوں کا تار باندھ دیا" "مریضہ تو خیریت سے ہیں نا؟" "کچھ افاقہ تو ضرور ہو گیا ہوگا؟" "آپ سے انہیں کیا نسبت ہے؟" "وہ جو گورے گورے سے آدمی تھے وہ کون تھے؟" وغیرہ وغیرہ"۔ تہہ کی بات پا کر میں نے حکیم جی کو "شافی" جواب دیا۔ اور وہاں سے ٹلنے کی غرض سے پوچھا "آپ کے ہاں معجون مفرح الارواح ہے؟"۔ حکیم جی کی روح پھڑک گئی، مگر کہنے لگے "فی الحال تو موجود نہیں ہے"۔ میں یہ کہہ کر کہ ذرا حکیم "ادرک" کے یہاں دیکھ لوں، وہاں سے رخصت ہو کر سیدھے میاں شمیم کے یہاں پہنچا۔

اب "صورت" یہ تھی کہ حکیم جی تو ہمارے دوست کی "خورشید رو" اہلیہ کے سوز فرقت سے "برف کی طرح" پگھل رہے تھے، اور یہاں یاروں میں یہ رائے جم رہی تھی کہ کس طرح اس حکیم کا "کچومر" نکالا جائے۔ تجویز یہ ہوئی کہ حکیم جی سودائی ہو گئے ہیں۔ عشق کا جن چڑھا ہے، اسے شیشہ میں اتار کر "گل حکمت" کر دینا چاہیئے۔ بس حکیم جی کے لئے یہی "اکسیر" ہے۔ اسی وقت میاں شمیم کی اہلیہ کو میری "محترمہ" کے پاس پہنچا دیا گیا۔ گھر میں صرف شمیم اور میں رہ گیا۔ ایک ماما بھی روک لی گئی۔ اس کے بعد میڈیکل کالج سے انسانی ہڈیوں کا ایک ڈھانچہ سب کی آنکھ بچا کر کپڑے میں لپیٹ کر رکشے پر لاد کر شمیم کے گھر لایا گیا۔ تین جاپانی موٹروں کی اسپرنگیں نکالیں، اور انہیں انسانی ڈھانچہ میں اس طرح فٹ کر دیا گیا کہ ذرا سی حرکت میں "گھڑ گھڑ" کی صدائیں آنے لگیں۔ اس ڈھانچہ کو ایک مکلف بستر پر لمبا لمبا لٹا کر اوپر سے چادر ڈال دی گئی۔ گویا وہ ڈھانچہ مندرجہ ذیل شعر کی تشریح ہو کر رہ گیا۔ ۵

روتے روتے سو گیا ہے ہجر میں بیمار غم ایک چادر سر سے لیکر پیر تک تانے ہوئے

جب شام ہو گئی تو ماما سے ایک کالی بلی پکڑوائی۔ ڈھانچے والے کمرے کے متصل ایک دوسرا کمرہ تھا جس کا ایک

دروازہ اوّل الذکر کمرہ میں کھلتا تھا۔ بلّی کو لیکر ہم لوگ آخرالذکر کمرے میں آ گئے۔ بیچ کا دروازہ بند کر دیا گیا اور ماما کو سکھا پڑھا کر حکیم جی کے یہاں بھیجا گیا۔

جاڑوں کا شباب تھا۔ رات کے نو بج رہے تھے کہ ماما حکیم جی کے یہاں جاکر کواڑ پیٹنے لگی۔ حکیم جی گھبرا کر باہر نکل آئے۔ دریافت کرنے پر ماما سے معلوم ہوا کہ ان کی "خاص الخاص" مریضہ کو غشی کا دورہ پھر پڑ گیا ہے۔ میاں ہنیا سکندرآباد گئے ہیں۔ گھر میں کوئی مرد صورت نہیں ہے، لہٰذا ماما گھبرا کر حکیم جی کے یہاں آئی ہے۔ حکیم جی یہ سنتے ہی خوشی سے استسقا کے مریض کی طرح پھول گئے۔ جلد از جلد لباس تبدیل کر کے اور میدان خالی سمجھ کر دوڑتے ہوئے ماما کے ساتھ ہو لئے۔

یہاں یارانِ طریقت انتظار میں تو تھے ہی۔ جیسے ہی آہٹ ہوئی ہم نے اپنے کمرے کا چراغ گل کر دیا اور بلّی کا منہ باکر ڈھانچے والے کمرے کے پیش آنے والے واقعات کا انتظار کرنے لگے۔ آنکھیں کواڑ کے درزوں سے ملا دیں۔ دیکھا کہ حکیم جی نے کمرے میں داخل ہو کر پہلے اِدھر اُدھر دیکھا، یہ اطمینان کر لینے کے بعد کہ مکان میں اور کوئی نہیں ہے آپ نے ماما سے کہا "بھاگ کر جلدی سے گرم پانی لاؤ، مریضہ کو سینک کی ضرورت ہے۔" ماما تو پڑھائی ہوئی تھی ہی، چپکے سے باہر نکلی اور آہستگی سے اس نے کنڈی لگا دی۔ حکیم جی نے صحبت غیروں سے خالی دیکھ کر آہستہ سے سر کی جانب سے لحاف سرکائی۔ لیکن ہاتھ لگاتے ہی حکیم جی ایک چیخ کے ساتھ ہٹے ہی تھے کہ "گھرا گھر گھر گھر" کی صداؤں نے اوسان خطا کر دیئے۔ گھبرا کے دروازہ کی طرف بھاگے، مگر وہ تو "درِ توبہ" کی طرح بند تھا۔ حکیم جی اس کمرے میں گویا مرتبان میں "بند فصل زمانی" تھے۔ گلا خشک اور کابوس کے مریض کی طرح حکیم جی کی چیخیں کمرے کے حدودِ اربعہ میں "صدا بصحرا" ثابت ہو رہی تھیں۔ اب ہم نے آہستہ سے اپنی طرف والا دروازہ ذرا سا کھول کر بلّی کو چھوڑ دیا۔ بلّی گھبرا کے کودی اور لگی زور زور سے "میاؤں میاؤں" کرنے۔ حکیم جی سراسیمگی کے عالم میں اِدھر سے اُدھر کسی راستہ کی تلاش میں دیوانوں کی طرح دوڑ رہے تھے۔ کالی بلّی کو دیکھتے ہی رہے سہے حواس بھی بر جا نہ رہے۔ انہیں یقین ہو گیا کہ یہ گھر جنّاتوں کا مسکن ہے۔ "اَشْہَدُ اَنْ لَّا اِلٰہَ اِلَّا اللّٰہ ———" کلمہ پڑھنے کی دو تین آوازیں ہمارے کان میں آئیں اور اس کے بعد حکیم جی ہسٹیریا کے مریض کی طرح چکرا کر زمین پر آ رہے۔

ہمیں جب ان کے بیہوش ہونے کا یقین کامل ہو گیا تو ہم دروازہ کھول کر اندر آئے۔ نسیم گھبرایا کہ حکیم جی کہیں مرحوم تو نہیں ہو گئے۔ واقعی حکیم جی عرق عرق تھے۔ صورت مسخ معلوم ہوتی تھی۔ ہم نے اپنا ڈاکٹری آلہ ان کے سینہ پر رکھا۔ قلب کی حرکت میں ناگہانی صدمہ کا اثر نمایاں تھا۔ ان کی زندگی سے مطمئن ہو کر ہم نے ڈھانچہ کو حکیم جی کے پہلو میں اس طرح لٹایا کہ اس کا ہاتھ ان کے گلے میں اور ان کا ہاتھ اس کے گلے میں۔ اسپرنگوں میں پھر کنجی بھر کر ہم پھر دوسرے کمرے میں جا کر بیٹھ گئے۔ اور دروازوں کی راہ تماشا دیکھنے لگے۔ رات بھر حکیم جی کو آدھ آدھ گھنٹہ پر ہوش آتا رہا لیکن اپنے پہلو نشین کو دیکھتے ہی حکیم جی پھر بیہوش ہوتے رہے۔ "کلمہ" اور "قلیا" اور کبھی کبھی "آیت الکرسی" کی آواز

بھی ہم نے سنی۔ صبح ہونے کے قریب جب وہ آخری بار بیہوش ہوئے تو ہم اور شمیم ان کی ہلکی پھلکی "لاش" اٹھا کر مکان کے باہر لائے۔ شمیم کے مکان میں لوہے کے تاروں کی احاطہ بندی تھی۔ بمشکل ہم انہیں پھاٹک تک لائے ہوں گے کہ سامنے کی گلی میں آہٹ سی معلوم ہوئی۔ ہم نے جلدی سے حکیم جی کو وہیں سبزہ پر رکھ دیا اور اُلٹے پاؤں برآمدہ میں آکر کھڑے ہو گئے۔ کوئی آیا نہیں۔ لیکن صبح کی ٹھنڈی اور جاں بخش ہوا سے حکیم جی کو ہوش آگیا۔ اس وقت مطلع صاف ہو گیا تھا۔ حکیم جی نے ارد گرد کے مناظر کو خوف کی نگاہوں سے دیکھا۔ جب یہ اطمینان ہو گیا کہ وہ "بھوت" یہاں نہیں ہے تو حکیم جی اُٹھ کر پھاٹک کی طرف دوڑے۔ لیکن پھاٹک مقفل تھا۔ کھڑے ہو کر سوچنے لگے کہ اب کیا کیا جائے کہ ہم نے برآمدے سے کہا "میاؤں میاؤں"۔ حکیم جی سمجھے کہ پھر بلا نازل ہوا چاہتی ہے۔ گھبرا کر جست جو کرتے ہیں تو "یا حیدر کرار" پھاٹک کے اس پار" لیکن ٹوپی اور جوتہ آج تک اس واقعہ کی یادگار راقم الحروف کے پاس موجود ہیں۔ یاروں کو دیکھنے کی دعوتِ عام ہے۔

... ...

"حکیم جی"

لقمان کا جواب ہیں بیشک حکیم جی،
اس پر بھی بیٹھے مارتے ہیں جھک حکیم جی
کوئی خریدنے جو دُکاں پر دوا گیا،
تو اس کی جان کے ہوئے گاہک حکیم جی
بتایا کسی کا حال جو استعمال سے ہوا
پانی مِلا کے دیتے ہیں کندھک حکیم جی
آیا کوئی مریض بواسیر کا اگر
دیتے ہیں اس کو پیس کے ادرک[1] حکیم جی
"احمق" بہار والے تو کہتے ہیں صاف صاف
پنجاب والے کہتے ہیں "احمک" حکیم جی

قطعہ

آئی تھی اِک حسین مریضہ دُکان پر
دیکھا جو اس کو ہو گئے بھونچک حکیم جی
یاروں نے بھی بچا کہ نگہ دیکھ ہی لیا
مل مل کے آنکھ تکتے تھے ٹک ٹک حکیم جی
بلوایا رات ان کو مریضہ کے نام سے
اِک گھر میں رات بھر رہے بندھک حکیم جی
بھوتوں سے رات بھر انہیں پالا پڑا وہاں،
بھاگے صبح کو کُود کے پھاٹک حکیم جی

ایں کار از تو آید و "مردک" چنیں کند
مردک حکیم جی اے مردک حکیم جی

اور اب شہر میں حکیم جی "حکیم مردک" کے نام سے مشہور ہیں۔

اللہ پوری

[1] ادرک بواسیر کے لئے بہت مضر ہے۔

"ماثرِ ندیم"

(از علامۂ معانی ایجاد حضرت حافظ سید فضلِ حق صاحب آزاد مدظلہم)

اشکِ حسرت کے سوا زیرِ لب آہوں کے سوا　　اور کیا جرم؟ محبت کے گناہوں کے سوا
مونسِ روزِ جدائی کوئی ہوتا بھی تو کون　　اشکِ پیہم کے سوا غم شدہ آہوں کے سوا
دست و پا اپنے ہی محشر میں گواہی دینگے　　اور ہوگا نہ گواہ اپنے گناہوں کے سوا
اسکی رحمت کی جو بندوں کو خبر ہو جاتی　　کوئی کرتا نہ کوئی کام گناہوں کے سوا
نگہِ مہر کبھی، لطف کبھی، ناز کبھی　　اور آنکھوں میں ہے کیا انکی نگاہوں کے سوا
آبرو جنکی ہے اے بارشِ رحمت تجھ سے　　کون ہیں کون وہ ہم نامہ سیاہوں کے سوا

حسنِ اخلاق حسیناں یہ نہ بھلائے آزاد
یہ کسی مد میں نہیں جھوٹے گواہوں کے سوا

کیا قیامت ہے ان آنکھوں میں نگاہوں کے سوا　　سب پرائی ہیں نگاہیں مری آہوں کے سوا
میں نے حسرت بھری اک آہ جو کھینچی تو کہا　　آپکا کام ہی کیا اور تری آہوں کے سوا
سربسر کاتبِ اعمال کا یارب ہے قصور　　خیر کا نام نہیں ہے جو گناہوں کے سوا
کہیے کس سوچ میں جان سے مارا کس کو　　چھینٹیں ہیں خون کی بھی اور گواہوں کے سوا
میں کہونگا تو وہ سچی ہی کہونگا ناصح،　　زندگی کا ہے مزا کس میں گناہوں کے سوا
کیا نکالی تھیں بے راہ روی کی راہیں　　چل سکا بھی کوئی روندی ہوئی راہوں کے سوا؟

حشر میں داورِ محشر سے چھڑیگی آزاد
سب کھسک جائینگے ہم نامہ سیاہوں کے سوا

کیا ہوئے وہ جام و پیمانے کے دن / جو گئے وہ پھر نہیں آنے کے دن
اب کہاں وہ سیر صبح و سیر شام / وہ گئے گزرے ہوا کھانے کے دن
ہو گئے لنبے وہ گھونگھر والے بال / لد گئے وہ آئینے شانے کے دن
تھے تو گنتی ہی کے دن کیا دن وہ تھے / تلملانے اکڑ کر اترا جانے کے دن
خویشتن داری کی کبھی طاقت کہاں / آ گئے جی سے گزر جانے کے دن
دل کو سمجھانے کی کب سوجھی تو کب / ہیں سنبھلنے کے نہ سنبھلانے کے دن
دن پھریں گے اب جو نکلا ہے ندیم / ورنہ پھرتے کب ہیں پھر جانے کے دن
کتنے سمجھ والوں ہی کے دم تک جو تھے / وہ تڑپنے اور تڑپانے کے دن
کیریوں میں اُف وہ کوئل کی کہک / آئے آئے دل دکھا جانے کے دن

کام ہیں آزاد اپنے نا تمام
آ گئے دنیا سے اٹھ جانے کے دن

اب کہاں وہ اپنے ہاتھ آنے کے دن / تھے جو تھے وہ جام و پیمانے کے دن
دل کے آ جانے کی ہی کچھ اور بات / تھے ابھی کچھ دل کو سمجھانے کے دن
ان کا ہنس ہنس کے جلانا وقت سحر / واہ رے وہ شمع و پروانے کے دن
فکرِ دنیا نے کیا دل کو اداس / آ گئے پھولوں کے کمھلانے کے دن
خوش دمی کا ہات آنا ہے محال / سوچ کی راتیں ہیں غم کھانے کے دن
شہر سارا گھپ اندھیرا بے چراغ / کب ہیں اس ظلمت میں جا پانے کے دن
کیوں نہ ہو سب کو "بڑے دن" کی خوشی / مفت ہاتھ آتے ہیں گھر جانے کے دن
آتے ہیں خوشیوں کے دن بھی گاہ گاہ / آئے دن ایسے کہاں آنے کے دن
کہتی ہے دنیا کہ ٹھیرو کچھ ابھی / آ گئے ہیں کوچ کر جانے کے دن
ناتوانی نے مجھے بٹھلا دیا / اب نہیں گھر سے کہیں جانے کے دن

ہے گل سیراب فکرِ آزاد کی
آئیں گے اس کے نہ مرجھانے کے دن

اب نہیں وہ جام و پیمانے کے دن
آگئے وہ جو تھے آجانے کے دن

یاد تھی جن کی وہ یارب آگئے
کیا پھرے ہیں اپنے ویرانے کے دن

ٹھنڈی ٹھنڈی پھر ہوا چلنے لگی،
آئے دل کے درد بڑھ جانے کے دن

دین والے بھی اُدھر ہی جھک پڑے
واہ وا دُنیا کے دیوانے کے دن

کیا بتوں کی یاد اے مردِ خدا
آگئے یادِ خدا آنے کے دن

آگئی آئی گئی سب اپنے سر
آتے آتے آگئے جانے کے دن

دن خدا کے ہیں جو سچ پوچھو تو ہاں
دن خوشی کے ہیں نہ غم کھانے کے دن

آنا جانا ان کا جانے کا نہیں
رات کے جاتے ہی ہیں آنے کے دن

پوچھتے ہو ہم سے، مزدوروں سے کیا
راتیں سونے کی ہیں چار آنے کے دن

اب تو ہے آزاد کٹ مرنے سے کام
ہیں نہ مسجد کے نہ بتخانے کے دن

تم ہنسے جاؤ جو روتا ہے زمانہ روئے

(از مرزا فدا علی خنجر لکھنوی)

جب سُنے کوئی مرے غم کا فسانہ روئے
تو سہی بات جو تا حشر زمانہ روئے

ہم ہیں غم کیش ہمیں لطف طرب سے کیا کام
جب پڑی کان میں گلبانگ ترانہ روئے

زینت مجلس ماتم ہیں تمہارے آنسو
غم کے ماروں کو غرض کیا جو زمانہ روئے

دل کا ماتم کبھی آلام جہاں پر گریہ،
مل گیا جب کوئی رونے کا بہانہ روئے

شادی و غم سے ہے معمورہ دنیا آباد
تم ہنسے جاؤ جو روتا ہے زمانہ روئے

عشرت محفل ارباب گزشتہ ہے ہے
ہم بیاں کرکے بہت اپنا فسانہ روئے

آہ کیا پوچھتا ہے باعثِ گریہ ہمدم
آگیا یاد وہ خوش باش زمانہ روئے

تشنۂ جام شہادت کیلئے آفت ہے
جب خطا ہو گیا قاتل کا نشانہ روئے

یوں گزر جادۂ ہستی سے گزرنے والے
غیر بھی سوگ منائے جو زمانہ روئے

خلش ناوکِ بیداد غضب ہے خنجر
پڑ گیا دل پہ جہاں کوئی نشانہ روئے

گردشِ ایّام

(از عکاسِ معانی حضرت فیض جھنجھانوی)

اُس قبرِ شکستہ کو دیکھ کر جو دہلی میں جانبِ غرب میدان تیس ہزاری میں پامال ہر خاص و عام اور بقولِ معتبر زیب النسا مخفی کی خلوتگہِ آرام ہے۔۔

مضمحل ہے گوشۂ مغرب میں یوں آفتاب — جیسے ڈھل جائے کسی کا وقت سے پہلے شباب
دم بخود ہے یوں بلندی پر شعاعِ آخری — جیسے محرومِ تخاطب ہو نگاہِ اجتناب
محو ہو کر رہ گئے کچھ یوں نقوشِ آب و گل — جس طرح افلاس میں آکر چلا جائے شباب
یوں کھٹکتا ہے دلِ فطرت میں پیکانِ سکوت — جیسے پیری میں جوانی کا گناہِ کامیاب
تھم گئی ہے چلتے چلتے اس طرح نبضِ حیات — ٹوٹ جائے بجتے بجتے جس طرح تارِ رباب
پل رہی ہیں ظلمتیں یوں زیرِ دامانِ شفق — جسطرح پیری جواں پی پی کے ہو خونِ شباب
ہے تو کچھ ایسا امتزاجِ نور و ظلمت، جسطرح — نا امیدی میں سکوں، امید میں ہو اضطراب

دی مجھے آواز ایسے میں دلِ ناکام نے
تجربے جس پر کئے ہیں گردشِ ایام نے

دیکھ وہ بکھری ہوئی سی خاک، پھیلا سا غبار — جانبِ مغرب، سرِ میداں، قریبِ رہگذار
مرقدِ زیب النسا ہے، اور بایں حالِ تباہ — ہم بتلانے پر بھی جسکو کہہ نہیں سکتے مزار
تھرتھراتی ہے جہاں آتے ہوئے موجِ نسیم — پرورش پاتی ہے جسمیں گردشِ لیل و نہار
ہے یہی وہ غنچۂ پامال، جس پر شمع ساں — مسکراتی ہے خزاں، آنسو بہاتی ہے بہار
چشمِ عبرت کیلئے وہ منزلِ حسرت، جہاں — ہے شگفتِ غنچہ بھی لوٹے ہوئے دل کی پکار
اس جگہ مخفی ہے وہ گنجینۂ حسن و جمال، — جسکی خدمت میں تجلی گرد تھی، جلوے غبار
جس کی نظروں سے عطا ہوتا تھا بجلی کو سکوں — جس کا دلِ سیماب کو تقسیم کرتا تھا قرار

دیدۂ کشور کشا میں جذب عالمگیر تھا
جس کی ہر چینِ جبیں میں جوہرِ شمشیر تھا

ہے یہاں خوابیدہ وہ پیغمبرِ شعر و سخن — جسکے سوزِ دل سے روشن تھا چراغِ انجمن
ناخنِ وحشت سے جسکے دامنِ عرفاں[۱] تھا چاک — جسکے قدموں پر اچھلتی تھی کلاہِ اہرمن
جسکے عکسِ دیدۂ فطرت نگر کے فیض سے — صبح نورانی قبا تھی، شام رنگیں پیرہن
مہر و مہ جس کے جلو میں کارواں در کارواں — لالہ و گل جسکی خدمت میں چمن اندر چمن
تھی لبِ رنگیں پہ جسکے شوخیِ حدِّ کمال — تھا دلِ روشن میں جسکے جلوۂ تکمیلِ فن
جسکو دی فکرِ رسا نے رفعتِ عرشِ بریں — جس نے دی طبعِ رواں کو موجۂ گنگ و جمن
کھل کھلا پڑتے تھے جسکی بات پر افسردہ دل — مسکرا اُٹھتے تھے جسکے شعر سے آشفتہ تن

سرگذشتِ شمعِ محفل، قصۂ پروانہ تھا
جس کا حرفِ زیرِ لب اک مستقل افسانہ تھا

جس سے برپا تھا کبھی ہنگامہ حشر آفریں — آہ اب اسکو میسر فاتحہ خواں بھی نہیں
اسکی تربت کا ہر اک ذرّہ ہے یوں سہما ہوا — جیسے ویرانے میں کھو جائے کوئی ناز آفریں
آج ہے وہ اس مقامِ کس مپرسی پر جہاں — تا قیامت آ نہیں سکتا خیالِ ہم نشیں
ہے جہاں کچھ اس طرح ہستی ہم آغوشِ اجل — جس طرح کر دے کوئی زہر آب میں حل انگبیں
ہے جہاں یوں دیدۂ حسرت پہ ہر منظر گراں — جس طرح مومن کے دِل پر ہو گناہِ اوّلیں
جس پہ یوں پڑتی ہے لہرا کر شعاعِ آفتاب — جس طرح کامل پہ ناقص کی نگاہِ نکتہ چیں
ہے جہاں کچھ یوں مکدر شیشۂ صبحِ بہار — ہو شبِ فرقت میں جیسے جلوۂ ماہِ مبیں

فیض یہ قبرِ شکستہ سرزمینِ ہند پر
داغ ہے قحطِ مروّت کا جبینِ ہند پر

فیض جھنجھانوی

ؔ۱ اصل مسودہ میں "یزداں" تھا۔ مگر "ادارہ" اس کو گوارہ نہ کر سکا - ۱۲

"شباب"

(از حضرت حمید عظیم آبادی)

عام طور پر "جوانی یا شباب" پر جو نظمیں لکھی گئی ہیں یا لکھی جاتی ہیں، اُن میں تو کسی خاص معشوقہ کی جوانی کا ذکر ہوتا ہے، اور کہیں عام عورتوں کے شباب کا عالم پیش کیا جاتا ہے۔ لیکن اس نظم میں بلا امتیاز مرد و زن صرف شباب کی فطری کیفیتیں پیش کرنے کی کوشش کی گئی ہے۔ حمید عظیم آبادی

بس اک کروٹ میں فطرت کی چلن بدلا، ادا بدلی
نظر کی کیفیت بدلی، سخن بدلا، حیا بدلی
وہ اندازِ ستم بدلا، وہ طرزِ دلربا بدلی
نظر آتی ہے گویا ساری دُنیا کی فضا بدلی
زمانہ یک بیک بدلا، دلوں میں پیچ و تاب آیا
شباب آیا کہ دُنیا کے سکوں میں انقلاب آیا

کسی نے آکے چھیڑا ایک بیکل دل کی تمنّا کو
کسی نے کر دیا آباد گویا دشت و صحرا کو
تموّج زا کسی نے کر دیا خاموش دریا کو
کسی نے خواب سے جیسے جگایا سوئی دُنیا کو
اُٹھی انگڑا ئیاں لیتی ہوئی دیوی محبت کی
نئی بستی لگی بسنے امید و شوق و حسرت کی

عجب سرشار عالم ہوتا ہے عہدِ جوانی کا
اُترتا ہی نہیں جامِ مئے پُرکیف کا نشہ
خرد سے کام ہی رہتا نہیں اِس دَور میں اصلا
سروں میں ہر گھڑی رہتا ہی نازِ حُسن کا سودا
خوشی سے نازوالوں کے جفاؤ جور سہتے ہیں
نظر کے تیر بھی دل میں تمنّا بن کے رہتے ہیں

بدل جاتا ہی اندازِ تخاطب بھی، تکلّم بھی
تغیّر زا نظر آتا ہے لہجے کا ترنّم بھی
فزوں ہوتا ہی ذوقِ نکتہ سنجی و تفہّم بھی
جھجک کے ساتھ بڑھ جاتا ہی احساسِ توہّم بھی
تلاطم سا بپا ہوتا ہے دریائے تمنّا میں
نئی اک جان آجاتی ہے گویا دل کی دُنیا میں

تنفّس کا تموّج بھی بدل دیتا ہے رُخ اپنا
اُمڈ آتا ہے ارماں کے تلاطم کا نیا دریا
نظر آتا ہے انساں کو نیا عالم نیا نقشا
خدا کی شان پل بھر میں بدل جاتی ہی کل دُنیا
حیا شوخی کے پردے میں قضا کا کام کرتی ہے
جفاؤ جور کی دیوی نہا دھو کر نکھرتی ہے

جبیں پر دوڑنے لگتی ہیں موجیں جامِ عشرت کی
رُخِ گلگوں دکھاتا ہے بہاریں صبحِ جنت کی
خمِ گیسو میں پڑجاتی ہیں گرہیں دامِ الفت کی
بھنویں تن کر کمانیں کھینچ لیتی ہیں محبت کی

پلک اُٹھ کر لگاتی ہے نگاہِ ناز کی برچھی
نظر جھک کر گراتی ہے دلِ بیتاب پر بجلی

سراپا حسن ہو جاتی ہے انساں کی نظر گویا
نظر آتا ہے ہر شے میں کرشمہ حسنِ صنعت کا
نمو کے موج زن ہوتے ہیں رگ رگ میں کئی دریا
اُبھر پڑتے ہیں دم بھر میں نقوشِ حسنِ بے پروا

جدھر اٹھتی ہیں آنکھیں حسن کا گلزار ہوتا ہے
جوابِ گل نگاہِ شوق میں ہر خار ہوتا ہے

کبھی رفتار میں لغزش، کبھی چالیں ہیں مستانہ
جنوں کے کیف میں چلتا ہو جیسے کوئی دیوانہ
کبھی لب پر محبت کا سرور آمیز افسانہ
کبھی انداز ترکانہ کبھی نظروں میں میخانہ

یہ وہ مستی کا عالم ہے کہ عقل و ہوش کی دنیا
ڈبو دے زاہدِ خلوت نشیں بھی ہو کے بے پروا

حمید اک خواب ہی بھولا ہوا وہ دورِ کیف افزا
نہ وہ سر ہے نہ وہ سودا، نہ وہ قصے، نہ وہ چرچا
ضعیفی نے بدل ڈالا مری تصویر کا نقشا
مآلِ کار کا دل کو لگا ہے ہر گھڑی دھڑکا

خوشا وہ عقل کو رہبر بنائے جو جوانی میں
نہ لغزش ہو قدم کو جس کے عیش و کامرانی میں

حمید عظیم آبادی

نیرنگ سخن

(از حضرت افقر موہانی وارثی)

بڑھیگا موئے قاتل حشر میں دستِ جنوں میرا
کہ چھپ سکتا نہیں ہے دامنِ قاتل سے خوں میرا
نہ دیکھیں دیکھنے والے تماشائے جنوں میرا
کبھی تو پوچھ لیں بہرِ خدا حالِ زبوں میرا
ازل کے دن سے وہ برگشتہ قسمت ساتھ لایا ہوں
بنا سکتی نہیں واللہ کچھ دنیائے دوں میرا
سرِ محشر وہ کافی ہوگا تصدیقِ شہادت کو
گرا دامانِ قاتل پر جو کوئی اشکِ خوں میرا
فلک کیسا، زمیں کیسی، یہ سب کہنے کی باتیں ہیں
کیا کرتا ہے گردش یونہی بختِ واژگوں میرا
ادا کہتی ہے ظالم کی کہ دیوانہ بنا ڈالا
نظر کہتی ہے دیکھو چل گیا دل پر فسوں میرا
یقیناً دل میں خونِ حسرت و ارماں ہوا افقر
کہ یہ آنسو نظر آتا ہے اب تو لالہ گوں میرا

نیرنگِ فطرت

(از حضرت فطرت صدیقی)

شبنم کے موتیوں سی جھلکتی ہے چاندنی — کلیوں کو دامنوں میں شراروں کا رقص ہے
ہے ماورائے فہم ہمارے جنوں کی شان — ہر ولولہ ہزاروں شراروں کا رقص ہے

نغمہ خاموش ہوا ٹوٹ گیا تارِ رباب — سعیٔ گفتار کی اک یہ بھی سزا ہے شاید
جذبۂ شوق کی ہر خواب کی تعبیر ہے خوب — عالمِ جذب میں ہر نالہ رسا ہے شاید

کھینچ گیا اتنا کہ بس ٹوٹ گیا تارِ رباب — درد کچھ ایسا زیادہ تھا کہ دل سہہ نہ سکا
دل مرا اشک بنا، کہہ گیا افسانۂ شوق — قطرۂ خوں بھی تری بزم میں چپ رہ نہ سکا

کشمکش عشق کی ہے اور ہے دلِ بے پروا — موجۂ غم ہے کہ چڑھتا ہوا طوفاں کوئی
خندہ زن جرأتِ پروانہ پہ ہے شمع کی لو — ایسی بے ذوقی پہ یا رب ہو نازاں کوئی

دیکھو کہیں وہ نہ دیکھتے ہوں — یہ بادہ کی مستیاں نہیں ہیں
اندازِ بیانِ شوق میں اب — وہ پہلی سی شوخیاں نہیں ہیں
ہر چند نظر نہیں اب آتے — دیکھو تو مگر کہاں نہیں ہیں

سوزِ غم بھی اشک بھی آہِ سحرگاہی بھی ہے — کتنے عنواں ہیں تمنا کے فسانے کے لیے

شعلے جو چند نورِ فضا آسماں کے ہیں — بجلی کہاں ہیں تنکے مرے آشیاں کے ہیں
دل کی نشاط کیا ہے طوافِ حریمِ دوست — سر کا سرور سجدے اسی آستاں کے ہیں

عبدالعزیز فطرت صدیقی

طوفانِ نوح

(نتائجِ سخن حضرت نوح ناروی)

آتشِ عشق سے رونے کا قرینا آیا — تپ ادھر آئی اُدھر ہم کو پسینا آیا
ہاں، نہ آیا تو محبت میں نہ جینا آیا — اور سب کچھ ہمیں دُنیا کا قرینا آیا
عشق کا طور محبت کا قرینا آیا — جب سے مرنے لگے اُن پر ہمیں جینا آیا
ہم کو تلچھٹ کی طرح خُم میں جگہ لینی تھی — عمر بھر پیتے رہے پھر بھی نہ پینا آیا
عید کا چاند مبارک ہو ہمیں اور تمہیں — سب گلے ملتے ہیں جس میں وہ مہینا آیا
ہمسری اُس رخِ پُرنور کی آسان نہ تھی — شمع کو فرطِ ندامت سے پسینا آیا
روز سو بار جیے عشق میں سو بار مرے — نہ تو مرنا ہمیں آیا، نہ تو جینا آیا
کثرتِ داغِ جگر باعثِ توقیر ہوئی — مَیں یہ سمجھا کہ مرے ہاتھ دفینا آیا
اب ستم سے کوئی محفوظ رہے یا نہ رہے — خیر تم کو تو ستانے کا قرینا آیا
دو طرح کا مری توبہ نے دکھایا عالم — جام کو جوشش، صراحی کو پسینا آیا
عمر ساری اسی صورت سے مری ختم ہوئی — اِک مہینا گیا اور ایک مہینا آیا
لطف و اخلاق، کرم، مہر، محبت کیا چیز — آپ کے دِل میں جو آیا بھی تو کینا آیا
دوڑ کر پہنچے مرے پاس مرے خیر طلب — بحرِ غم میں لبِ ساحل جو سفینا آیا
بس تمہیں جان ہی لینے کی ادائیں آئیں — بس ہمیں جان ہی دینے کا قرینا آیا
ہم محبت میں کسی شوخ کی مرتے ہی رہے — ہے یہ جینے کا خلاصہ کہ نہ جینا آیا
لوگ کہتے ہیں کہ شبنم ہے، یہ شبنم تو نہیں — گرمیِ حسن سے پھولوں کو پسینا آیا
مے کشو مژدہ کہ رُت پھرتی ہی تقدیر پھری — عیش کا وقت، مسرت کا مہینا آیا
چرخ سے پوچھتے ہو ظلم و ستم کے انداز — قہر بھی ڈھانے کا تم کو نہ قرینا آیا
ہو گیا عشقِ حقیقی کا سبب عشقِ مجاز — ایک زینے سے بڑھے دوسرا زینا آیا
ہے یہ مطلب کہ پیوں اور پلاؤں بھی شراب — جام کے ساتھ مرے سامنے مینا آیا
اہلِ وحشت سے کوئی کہہ دے کہ ہشیار رہیں — جسمیں بڑھتا ہے جنوں پھر وہ مہینا آیا
بن گیا ابرِ کرم حشر میں وہ میرے لئے — دیکھ کر فردِ عمل کو جو پسینا آیا
اور سب چل دیئے اے نوح نہ ٹھیرا کوئی — کام طوفان میں آیا تو سفینا آیا

REGD NO P. 294

ماہ ستمبر سنہ ۱۹۴۲ء
REGD NO P. 294

صوبہ بہار کے اسکولوں کیلئے سنہ ۱۹۳۱ء سے منظور شدہ ماہنامہ

ندیم گیا

قیمت سالانہ للعہ
قیمت ششماہی [illegible]

قیمت فی پرچہ ۶/

مرتبہ: سید حسن امام

جلد ۲۰	بابت ماہ ستمبر سنہ ۱۹۴۲ء	نمبر ۳

فہرست مضامین ماہ ستمبر

حصۂ نثر

حصۂ نظم

پنڈت جواہر لال نہرو کی شہرۂ آفاق کتاب

"جگ بیتی"

دنیا کی تاریخ سنین و سلاطین کی فہرست کا نام نہیں ہے۔ نہ مختلف حکمران خاندانوں کے عروج و زوال اور تاج و تخت کے لئے زور آزمائی کرنے والوں کی کشمکش کو تاریخ سے تعبیر کیا جا سکتا ہے۔ دراصل تاریخ نام ہے افراد کی ذہنی اور سماجی ارتقا کا۔ جماعتی نظام کی تنظیم کا۔ تہذیب و تمدن کے اصولوں کی تدوین کا، اور علوم و فنون کی ترویج کا۔ پھر تاریخ کا دائرہ کسی ایک ملک یا قوم کے حالات تک محدود نہیں ہوتا، اس کے پیش نظر تمام ممالک اور تمام اقوام ایک سلسلہ میں منسلک ہوتے ہیں، اور ایک دوسرے سے متاثر ہوتے اور متاثر کرتے ہیں۔

"جگ بیتی" میں پنڈت جواہر لال نہرو نے خاص طور پر ان ہی اصولوں کو پیش نظر رکھا ہے، اور مختلف زمانوں میں تمام ممالک اور تمام اقوام کے حالات پیش کر کے دنیا کی ایک یکجائی تصویر کھینچی ہے اس لئے ان کی یہ کتاب ہندوستان کے تاریخی ادب میں ایک جدت ہے۔ ایک تنوع ہے، جسکی مثال مشکل سے مل سکے گی۔

سیاسی مصروفیتوں کے باوجود پنڈت جی کا وسیع مطالعہ اور غیر معمولی غور و فکر کی عادت اس کی متقاضی تھی کہ "جگ بیتی" جیسی تصنیف منظر عام پر آئے۔ چنانچہ ان خطوط کی شکل میں جو پنڈت جی نے جیل سے اپنی لڑکی کے نام لکھے، یہ کتاب اہل ذوق کے ہاتھوں میں پہنچے گی۔ اب "مکتبہ جامعہ" نے محمود علی خاں جامعی سے سلیس اردو میں ترجمہ کرا کر پیش کرنے کا فخر حاصل کیا ہے۔

قیمت جلد اول ۳ روپے

نظرات

ناقہ را می راند لیلیٰ سوئے خلوتگاہِ ناز،
ساربان در رہ حدی میخواند مجنوں می گریست!

لیلیٰ جا ہے جس کو آپ مان لیں، ساربان بھی آپکا خاص، مگر خدا ناکردہ مجنوں آپ کیوں ہونے لگے؟ جنون اسی کا حصہ ہے جو واقعات کو دیکھتا رہا، مگر اس کو روتا رہا کہ ؎

ابر اشکبار و ما خجل از ناگریستن
دارد تفاوت آب شدن تا گریستن

آپ کی سمجھ میں کاہے کو آیا ہوگا - بات یہ ہے کہ آپ کے سمجھنے کے لئے لکھ ہی نہیں رہا ہوں، چونکہ معلوم ہے کہ ؎

بجمع ماتمیاں حرفِ من اثر دارد
بہ بزمِ عیش نداند کسے زبان مرا

جولائی میں دار السلطنتِ بہار نے خدمتِ زبان کا نام لیکر جو کانفرنس زیر صدارت ظفر الملت منعقد کی تھی، اس کی کامیابی بڑی حد تک مولانا مسعود عالم ندوی اور شاہ جعفر حسین صاحب بی اے (کینٹب) کی معقولیت کی رہینِ منت ہے۔ اگر جوزہ پمفلٹ وقت سے پہلے تقسیم ہو جاتا یا اسکی تیاری میں تاخیر دیکھکر کانفرنس کے التوا کی رائے پر عمل ہوتا تو کانفرنس اس حد تک کامیاب ہوتی جسکی جائز توقع کیجاتی تھی۔ کیونکہ سو فیصدی "ہندوانی" سے بیزاری ایک کھلی حقیقت ہے۔ اس کانفرنس کی رپورٹ کا حشر بھی وہی ہوتا معلوم ہوتا ہے جو پمفلٹ کا ہوا۔ اس وقت تک ارکانِ کانفرنس نے اسکو شائع نہیں کیا ہے جو قابلِ افسوس ہے۔

حضرت سیماب اکبر آبادی نے حال میں "بزمِ سوسائٹی" فتحپور سیکری کے اجتماع کے سامنے جو خطبۂ صدارت ارشاد فرمایا ہے، اس میں سے ذیلی اقتباس پر مفکرین کو عموماً اور شعرا کو خصوصاً غور کرنا چاہیے :-

"...... بآوازِ بلند اپنے دور کے تمام شعرا سے خطاب کرتا ہوں کہ موجودہ عہد کے انقلابی تقاضوں سے آگاہ ہوں، وقت کی آواز توجہ سے سنیں اور اپنی ذہنی و طبعی قوتوں سے انقلاب کا مقابلہ کریں جو انگلینڈ - فرانس - جرمنی - رشیا - یونان - جاپان - چین اور برما کی پرسکون فضاؤں کو تاراج و برباد کر کے ہندوستان کیطرف آنیکے لئے پر تول رہا ہے۔ اپنے ملک ہندوستان کی تمام اقوام کو للکار کر جگائیں، انہیں انقلاب سے بچنے کی تدبیریں بتائیں، انہیں زندگی کی شاہراہ پر پرامن طریقوں سے گذرنے کے طریقے سمجھائیں اور اپنے الہامی نغموں سے ایسی فضا پیدا کر دیں کہ انہیں سن کر ایک مرتبہ انقلاب بھی اپنی جگہ پر جھوم جائے۔"

موقر معصر ہفتہ وار "اولو العزم" الہ آباد کے بانی جناب ڈاکٹر سید نجم الدین احمد جعفری صاحب نے "مسلم اہل قلم کی علیحدہ جمعیت" کی تعمیر پر رائے طلب کی ہے۔ دل تو یہی چاہتا ہے کہ اس طرح کی "تفریقِ تنظیم" نہ ہوتی تو بہتر تھا۔ مگر تجربہ مجبور کرتا ہے اور ضرورت ناگزیر ہے تو پھر ماننا ہی پڑے گا کہ ع

آرزوؤں سے بدلجاتی ہیں تقدیریں کہیں! — جہاں ہر شعبۂ زندگی میں "حفاظتِ خود اختیاری" کا اصول کارفرما ہے۔ صحافت کی دنیا کو بھی مجبوری اسکو انگیز کرنا ہی ہوگا۔ لہذا ع مردِ آخر بیں مبارک بندہ ایست!

مئی کے ندیم میں "سبط الحسن بلیغ مرحوم" پر مضمون شایع ہوا ہے، اس پر ادارتی نوٹ میں انکی سکونت "موضع بازید پور ضلع مونگیر" غلط درج ہوگئی ہے۔ "بازید پور ضلع گیا" لکھنا چاہیئے تھا۔ ناظرین تصحیح فرمالیں۔ یہ معلوم کرنا بھی دلچسپی سے خالی نہ ہوگا کہ حضرت بلیغ کے دو صاحبزادے سید نور الحسن نور مرحوم، اور اسیر الدین صاحب اسیر مرحوم سے ہماری عزیزداری تھی اور راقم الحروف کو دونوں حضرات سے کامل واقفیت تھی، مگر یہ خبر نہ تھی کہ حضرت بلیغ سے انکا کیا واسطہ ہے۔ جناب نور کا کلام تو تلف ہوگیا۔ شاید باڑھ ضلع پٹنہ والوں کی بیاضوں میں کچھ ہو تو ہو۔ اسیر کے کلام کا کچھ پتہ چلا ہے۔ کوشش جاری ہے کہ حاصل کرکے ہدیۂ ناظرین کیا جائے۔

حضرت خواجہ حسن نظامی مدفیوضہ کے شکریہ کیلئے الفاظ نہیں ملتے جو دلی جذبات کی صحیح ترجمانی کرسکیں۔ ندیم پر "ایسی" توجہ "عین مراد" ہے! — اسی طرح خواجہ غلام محمد صاحب برادر خواجہ عشرت مرحوم کا لطف و کرم زیر بار احسان کررہا ہے جنہوں نے اشاعتِ غیر مطبوعہ منثورات عشرت کی عزت ندیم کو بخشی ہے۔

فخر و مباہات کے ساتھ ندیم اپنی بزم میں تین نئے کرمفرماؤں کو "خوش آمدید" کہتا ہے۔ مولانا سید عبد الباری آسی جو واقعی اسی جوش خلوص کے ساتھ شریک بزم ہوئے ہیں جنکا اُن کو حق تھا اور جسکی ان سے امید تھی صفحے کے صفحے اشاعت ندا کے اور آئندہ بھی اس کی تصدیق کیلئے ملاحظہ ہوں۔ جناب ایس۔ ایم۔ یامین نقش اسسٹنٹ اگزیکیوٹو انجنیر بلوچستان جنکی غزل شریکِ اشاعت ہے۔ جناب احمد ندیم قاسمی صاحب بی۔اے جنکی بدولت ندیم کو "آب میانِ وکیم" پاکر خوش ہونگے۔ قاسمی صاحب کی نظم "انتباہ" شریکِ اشاعت ہے، اور افسانہ آیندہ پیش ہوگا۔

بیگم عنایت الرحمن نے انگریزی کے ایک بے حد دلچسپ اور سنسنی پیدا کردینے والے ناول کا ترجمہ ندیم کو عنایت فرمایا ہے۔ جو اسی اشاعت سے سلسلہ وار چھپا کریگا۔ خیال یہ ہے کہ اختتام پذیر ہوکر ناظرین کیلئے کتابی صورت میں مجلد ہوسکے اسلیئے اس کے صفحات آخر رسالہ لگائے جاتے ہیں اور ان کا شمارہ علیحدہ قایم کیا جاتا ہے۔

فہرستِ مضامین ماہ اکتوبر

ندیم

جلد ۲۰ بابت ماہ ستمبر ۱۹۴۲ء نمبر ۳

فہم قرآن

"تشریح سورۂ یوسفؑ"

(۲)

از جناب سیّد ناظم ہاشمی گیاوی

اب اس فیصلے کے بعد جبکہ عصمتِ یوسفؑ ظاہر ہوگئی، اور امراۃ عزیز کی خطا کاری روشن ہوگئی، لازم تھا کہ عزیز مصر حضرت یوسف علیہ السلام کے ساتھ اچھا برتاؤ کرتا، اور عورت کے لئے ایسی سزا تجویز کرتا جو وقت کے لحاظ سے مناسب و موزوں ہو — لیکن ایسا نہیں ہوا — بے گناہ قید میں ڈالا جاتا ہے، اور مجرم و خطا کار کی کوئی سزا نہیں ہوتی۔ آخر اس کا سبب کیا ہے؟ — کتابوں کے مطالعے سے یہ معلوم ہوتا ہے کہ مصر میں برائیاں آہستہ آہستہ گھر کرتی جارہی تھیں اور اتنی برائی لائقِ درگذر سمجھی جاتی تھی — یہی وجہ تھی کہ امراۃ عزیز خطا کار ثابت ہونے پر بھی اپنی ڈھٹائی اور فریب کاری سے باز نہیں آئی — اور بالآخر حضرت یوسف علیہ السلام کو قید کرا کر دم لیا —

امراۃ عزیز کی دوسری سازش کیا تھی؟

وَقَالَ نِسْوَةٌ فِي الْمَدِينَةِ امْرَأَتُ الْعَزِيزِ تُرَاوِدُ فَتَاهَا عَنْ نَفْسِهِ قَدْ شَغَفَهَا حُبًّا إِنَّا لَنَرَاهَا فِي ضَلَالٍ مُبِينٍ ○ فَلَمَّا سَمِعَتْ بِمَكْرِهِنَّ أَرْسَلَتْ إِلَيْهِنَّ وَأَعْتَدَتْ لَهُنَّ مُتَّكَأً وَآتَتْ كُلَّ وَاحِدَةٍ مِنْهُنَّ سِكِّينًا وَقَالَتِ اخْرُجْ عَلَيْهِنَّ فَلَمَّا رَأَيْنَهُ أَكْبَرْنَهُ وَقَطَّعْنَ أَيْدِيَهُنَّ وَقُلْنَ حَاشَ لِلَّهِ مَا هَٰذَا بَشَرًا إِنْ هَٰذَا إِلَّا مَلَكٌ كَرِيمٌ ○ قَالَتْ فَذَٰلِكُنَّ الَّذِي لُمْتُنَّنِي فِيهِ —

(اب شدہ شدہ امرأۃ عزیز کا شہر میں چرچا ہونے لگا) شہر کی عورتیں کہنے لگیں کہ عزیز کی بیوی اپنے غلام پر مرگئی ہے، اس کی محبت میں فریفتہ ہوگئی ہے۔ ہم تو اُسے ایک صریح بدچلنی میں پاتے ہیں۔ عزیزِ مصر کی بیوی نے جب یہ باتیں سُنیں تو اُن عورتوں کو بلا بھیجا۔ اُن کے لئے ایک مجلس قائم کی۔ اور ان میں سے ہر ایک کے ہاتھ میں چھُری دی۔ پھر یوسف علیہ السلام سے کہا اُن کے سامنے آجاو۔ پس جب یوسف علیہ السلام کو اُن عورتوں نے دیکھا تو بڑائی کرنے لگیں، اور کہنے لگیں حاشاللہ یہ آدمی نہیں ہے بلکہ ایک فرشتہ ہے بزرگ۔ امرأۃ عزیز نے جب اُن عورتوں سے یوسف علیہ السلام کی یہ تعریف سُنی تو کہنے لگی کہ کیا تم اسی واسطے طعنے دے رہی تھیں ــــــ"

یہ واقعہ ہے کہ مصر کی عورتوں میں کوئی پردہ کا رواج نہ تھا۔ کیونکہ امرأۃ عزیز کا اُخْرُجْ عَلَیْهِنَّ کہنا اس بات پر دال ہے، لیکن اس سے بھی انکار نہیں کیا جا سکتا کہ بدکاری و بُرائی اُس زمانہ میں بھی ویسی ہی بُری تھی جیسی اب ہے۔ کیونکہ طعن و تشنیع دینا اور اہانت کی نظر سے عزیزِ مصر کی بیوی کو دیکھنا اس کا بیّن ثبوت ہے۔

اب یہاں پر مولانا حفظ الرحمٰن صاحب سیوہاروی نے بھی انہیں باتوں کا اعادہ کیا ہے۔ جیسا کہ ترجمان القرآن میں مولانا ابوالکلام آزاد نے بیان فرمایا ہے۔ لیکن مجھے کسی حال میں اس رائے سے اتفاق نہیں ہے۔ کیونکہ جن عورتوں کو عزیزِ مصر کی بیوی نے مدعو کیا تھا، اُن کے کسی طور و طریقہ سے یہ پتہ نہیں چلتا ہے کہ وہ یوسف علیہ السلام پر ڈورے ڈالنے لگی تھیں۔ بلکہ عین صواب یہی تفسیر ہے کہ ان عورتوں نے حُسن سے مرعوب ہو کر عالمِ بے خودی میں اپنے ہاتھ کاٹ ڈالے تھے۔ مولانا محترم کے پاس حضرت یوسف علیہ السلام کا وہ اظہارِ خیال ہے جو آگے آتا ہے۔ لیکن میرے لئے حضرت عائشہ صدیقہ رضی اللہ عنہا کی ایک مستند حدیث ہے، دوسرے قرآن کریم کا صحیح اسلوب بیان۔ وَلَقَدْ رَاوَدْتُّهٗ عَنْ نَّفْسِهٖ فَاسْتَعْصَمَ ؕ وَلَئِنْ لَّمْ یَفْعَلْ مَاۤ اٰمُرُهٗ لَیُسْجَنَنَّ وَلَیَكُوْنًا مِّنَ الصّٰغِرِیْنَ ۝ قَالَ رَبِّ السِّجْنُ اَحَبُّ اِلَیَّ مِمَّا یَدْعُوْنَنِیْۤ اِلَیْهِ ۚ وَاِلَّا تَصْرِفْ عَنِّیْ كَیْدَهُنَّ اَصْبُ اِلَیْهِنَّ وَاَكُنْ مِّنَ الْجٰهِلِیْنَ ۝ فَاسْتَجَابَ لَهٗ رَبُّهٗ فَصَرَفَ عَنْهُ كَیْدَهُنَّ ؕ اِنَّهٗ هُوَ السَّمِیْعُ الْعَلِیْمُ ۝ ــــــ"

طعنے دینے کا اظہار خیال کر کے امرأۃ عزیز نے اب حقیقت حال کا بھی یہاں پر انکشاف کر دیا۔ کہ "میں نے ہی اسے بہکایا۔ لیکن یہ بچ رہا (پھر دھمکی کے ساتھ کہنے لگی) اگر اس نے وہ نہیں کیا جو میں کہہ رہی ہوں تو البتہ قید کیا جائیگا یا ذلیل و رسوا ہوگا۔ (جیسے ہی امرأۃ عزیز کی گفتگو حضرت یوسف علیہ السلام نے سُنی) کہا اے خدا مجھے قید پسند ہے اس بات سے جس کی طرف یہ بلا رہی ہیں۔ اور اگر تُو نے ان کے مکر کو مجھ سے نہ ہٹا دیا تو میں ان کی طرف جھُک پڑونگا اور نادانوں میں سے ہو جاؤنگا۔ پس اس کے رب نے اس کی دعا قبول کی اور اس سے اس کا مکر دُور کر دیا۔ بیشک وہ سُننے والا جاننے والا ہے۔"

آیاتِ مذکورہ میں جس وجہ سے مولانائے محترم یا عہدِ حاضر کے مفسرین کو شبہات ہوئے ہیں، وہ حضرت یوسف علیہ السلام کی دُعا ہے جو عورتوں کے مکر سے نجات کے لئے کی گئی ہے۔ بظاہر یہ بات جلد سمجھ میں آجاتی ہے کہ واقعی اگر عورتوں نے

لم بیخودی میں اپنے ہاتھ کاٹ ڈالے تو پھر اُن کا یہ مکر کیسے ثابت ہوتا ہے - اور حضرت یُوسف علیہ السلام اسے کید سے کیوں تعبیر
رہے ہیں - پھر خدا بھی ان کے مکر سے حفاظت کرنے کا وعدہ فرما رہا ہے - لیکن یہ کوئی زیادہ الجھاؤ نہیں ہے - اگر عمیق نظری سے
، لیکر سمجھنے کی کوشش کیجائے ــــــ امرأۃ عزیز شہر کی عورتوں کی دعوت دیتی ہے - ظاہر ہے دعوت میں پھل ہی کا
نظام ہوگا - ورنہ پھر چھُری سے صرف کیا مطلب نکالا جا سکتا ہے - قرآن کریم اس بارہ میں کچھ زیادہ بیان نہیں کرتا - اور نہ
یہ اموضوع بحث ہے ــــــ عورتیں مدعو کیجاتی ہیں ، کس کی طرف سے ؟ امرأۃ عزیز کی طرف سے ! کس ضمن میں ؟
، بات کا جواب دینے کے لئے کہ وہ امرأۃ عزیز کے ضحکے کیوں کر رہی تھیں ــــــ عورتیں دعوت میں شریک ہیں -
سف علیہ السلام پس پردہ ہیں - امرأۃ عزیز کہتی ہے - اُخْرُجْ عَلَيْهِنَّ ، ان کے سامنے آجاؤ - جب یُوسف
یہ السلام مجمعِ حسینانِ مصر کے سامنے آجاتے ہیں - تو ایک ایسا موقعہ یہ کہ دعوت ہے ، ہاتھ میں چھُری اور پھل ہے - پھر سامنے
بہ نظارہ ہے ، ایسا نظارہ جس سے عقل حیران رہ جاتی ہے " فَلَمَّا رَأَيْنَهٗٓ اَكْبَرْنَهٗ وَقَطَّعْنَ اَيْدِيَهُنَّ ۡ وَقُلْنَ
حَاشَ لِلّٰهِ مَا هٰذَا بَشَرًا ۭ اِنْ هٰذَآ اِلَّا مَلَكٌ كَرِيْمٌ ○ " کیا اس سے بھی زیادہ استعجاب و حیرت کی کوئی مثال
ہو سکتی ہے کہ یہ تو انسان نہیں ہے ، فرشتہ ہے نیکوکار ــــــ اس خیال سے متعلق میرے پاس حضرت عائشہ صدیقہ
ی اللہ عنہا کی حدیث ہے ، جیسا کہ اوپر کے سطور میں اس کا اظہار کیا گیا ہے کہ مصری عورتوں نے حضرت یُوسف علیہ السلام
دیکھ کر اپنے ہاتھ کاٹ ڈالے ، اگر ہمارے حبیبؐ کو دیکھ پاتیں تو دل کے ٹکڑے کر ڈالتیں ــــــ اگر عورتوں کا ہاتھ کاٹنا
لی بنا بر عمل میں آیا تو پھر کیا وجہ ہے کہ حسن سے مرعوبیت کی یہ تمثیلی حدیث اظہارِ حق کا اعلان کر رہی ہے ــــــ ان
رتوں کے کسی طور و طریقہ سے بھی یہ پتہ نہیں چلایا جا سکتا ہے کہ ان عورتوں نے حضرت یُوسف علیہ السلام پر ڈورے ڈالے ــــ
رہ یہ سوال اپنی جگہ پر باقی رہتا ہے کہ حضرت یُوسف علیہ السلام کی دعا رجمع کے صیغہ میں کیوں آئی - لہٰذا عرض ہے کہ یہ کوئی
نب کی بات نہیں ہے - یہ بھی اسلوبِ بیان ہے ، کہیں جمع بول کر وحدت مراد لیجاتی ہے - اور کہیں وحدت سے جمع مراد لیجاتی ہے -
ب جگہ قرآن کریم کفار و مشرکین کو چیلنج دیتا ہے " اِنْ كُنْتُمْ فِيْ رَيْبٍ مِّمَّا نَزَّلْنَا عَلٰي عَبْدِنَا فَاْتُوْا بِسُوْرَةٍ مِّنْ
مِّثْلِهٖ " اگر تمہیں اس کتاب کے بارہ میں شبہہ ہو جو ہم نے اپنے بندے پر اُتاری ہے تو تم اس جیسی ایک سُورہ بھی بنا لاؤ -
لن دوسری جگہ فرماتا ہے - اَمْ يَقُوْلُوْنَ افْتَرٰىهُ ۭ قُلْ فَاْتُوْا بِعَشْرِ سُوَرٍ مِّثْلِهٖ ــــــ کیا یہ سب کہتے ہیں کہ یہ
وٹ افترا ہے ، تو آپ اُن سے کہہ دیجئے (اے رسُول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم) کہ اس جیسی دس سُورہ ہی بنا لاؤ ــــــ
اب جب ایک جگہ ایک سُورہ پر چیلنج دی جا چکی ، تو دوسری جگہ دس سُورہ پر چیلنج دینے کے کیا معنی ؟ ــــــ
اہر ہے یہاں بھی وہی مراد ہے جو پہلی آیت سے مراد لیجا سکتی ہے - کبھی کثرت بول کر قلت مراد ہوتی ہے - اور کبھی قلت بول کر
ت - بہرکیف اسی طرح حضرت یُوسف علیہ السلام نے جمع بول کر مراد صرف امرأۃ عزیز لیا ہے - کیونکہ اگر برائی پر کوئی
سامل تھا تو امرأۃ عزیز تھی ، نہ کہ عام زنانِ مصری ــــــ اسی طرح جس وقت عزیز مصر سے دروازہ پر ملاقات ہو جاتی

ہے اور حقیقت حال عیاں ہوجاتی ہے۔ تو عزیز مصر کا کہنا اِنَّہٗ مِنْ کَیْدِکُنَّ اِنَّ کَیْدَکُنَّ عَظِیْمٌ ۝ کس مصلحت کی بنا پر تھا صرف ایک عورت کی خطا کاری کی بنا پر عام عورتوں کی طرف سے یہ خیال کیوں پیدا ہوا۔ — اگرچہ آخر میں تخاطب اسی عورت سے ہوجاتا ہے۔ اِنَّكِ كُنْتِ مِنَ الْخَاطِئِيْنَ ۝ تو بلاشبہ خطاکار ہے — ان آیات کے پیش نظر میں یہ کہنے کیلئے مجبور ہوں کہ حضرت یوسف علیہ السلام نے یا تو عام عورتوں سے متعلق مکر و کید کو ضروری سمجھتے ہوئے یہ دعا کی یا پھر جمع بول کر وحدت مراد لی۔ عام عورتوں سے متعلق مکر و کید کے کیا معنی ہیں؟ — یعنی خلقی طور پر عورت میں مکر و کید کا جذبہ موجود ہونا۔ جیساکہ جمہور کا مسلک ہے۔ مثلاً ایک دفعہ کا واقعہ ہے کہ حضور صلی اللہ علیہ وسلم کا گذر عورتوں کی طرف ہوا۔ وہ بیٹھی ہوئی کچھ باتیں کر رہی تھیں۔ آپ نے فرمایا۔ تمہارا ایمان میں کمزوری ہے۔ عورتیں کہہ اُٹھیں کیسے یارسول اللہ — فرمایا کیا تمہارے نماز و روزے میں کمی نہیں ہوتی۔ کہا کیوں نہیں۔ پھر فرمایا کیا تم مردوں کی عقل کو خراب نہیں کرتی ہو کہنے لگیں کہ یہ تو ہمارے عقل و خرد کی دلیل ہے۔ فرمایا نہیں یہ ایمان کی کمزوری ہے۔ — اس نقطۂ نظر کے ماتحت اگر حضرت یوسف علیہ السلام نے اپنے رب سے دعا طلب کی تو مسئلہ صاف ہے۔ اور زیادہ تاویل کی ضرورت بھی پیش نہیں آتی — علاوہ بریں کید کا ایک تشریحی پہلو اور باقی ہے۔ کہیں کہیں کید ترکیب و تدبیر کے معنی میں بھی مستعمل ہے۔ مثلاً ذٰلِكُمْ وَاَنَّ اللّٰهَ مُوْهِنُ كَيْدِ الْكٰفِرِيْنَ ۝ یہ بات تو ہو چکی، یاد رکھو اللہ کافروں کی تدبیر کو سست کر دیگا۔ دوسری جگہ ارشاد باری تعالیٰ ہے مَنْ كَانَ يَظُنُّ اَنْ لَّنْ يَّنْصُرَهُ اللّٰهُ فِي الدُّنْيَا وَالْاٰخِرَةِ فَلْيَمْدُدْ بِسَبَبٍ اِلَى السَّمَآءِ ثُمَّ لْيَقْطَعْ فَلْيَنْظُرْ هَلْ يُذْهِبَنَّ كَيْدُهٗ مَا يَغِيْظُ ۝ جسے یہ گمان ہو کہ اللہ اُس کی (یعنی مومنین کی) دنیا و آخرت میں مدد نہیں کریگا۔ تو اسے چاہئے کہ آسمان سے ایک رسّہ لٹکائے، پھر اس سے پھانسی لے لے۔ پھر دیکھے کہ آیا اسکی تدبیر اس کے غصّے کو دور کرتی ہے — یہاں پر بھی کید سے تدبیر مراد ہے — ہر جگہ کید کے لغوی معنی اگر لئے جائیں تو بہت سے مواقع میں بڑی تکالیف کا سامنا کرنا پڑیگا اسی آیت کو لے لو۔ اگر یہاں پر کید کے معنی مکر لئے جائیں تو کیسی مشکل ہے — اچھا پھر اپنا خیال انہیں آیات کی جانب منعطف کیجئے جس کا ذکر قبل کیا جا چکا ہے — عزیز کی بیوی تمردانہ انداز میں یوسف علیہ السلام کے متعلق کہتی ہے کہ جو میں کہتی ہوں اگر اس نے نہ کیا تو البتہ قید کیا جائیگا یا ذلیل و رسوا ہو گا — جواب میں فوراً ہی یوسف علیہ السلام نے دعا کی رَبِّ السِّجْنُ اَحَبُّ اِلَيَّ مِمَّا يَدْعُوْنَنِيْٓ اِلَيْهِ ۝ "اے پروردگار مجھے قید پسند ہے اس بات سے جس کی طرف یہ بلا رہی ہیں —" بلاشبہ حضرت یوسف علیہ السلام کی یہ دعا تھی، لیکن یہ دعا اس کی دھمکی کے جواب میں تھی، جو عزیز کی بیوی نے بالاعلان دی تھی۔ لیکن یوسف علیہ السلام نے بخصوصیت دعا اُن تمام عورتوں سے جو اس وقت حاضر تھیں نجات کیوں طلب کی؟ — اس مسئلہ کی وضاحت بڑی حد تک کیجا چکی ہے۔

(باقی آئندہ)

سید ناظم ہاشمی گیاوی

دقیقہ رس

(غیر مطبوعہ)

(از جناب خواجہ عبدالرؤف عشرتؔ مرحوم لکھنوی)

دقیقہ رس میری ایک جدید تالیف کا نام ہے۔ اسمیں مَیں نے نثر نویسی کے چند قواعد مرتب کئے ہیں تاکہ مبتدیوں کو صحیح عبارت لکھنا آسان ہو جائے۔ یہ کتاب ابھی تک پریس میں نہیں گئی ہے۔ میں چاہتا ہوں کہ اس کے بعض مضامین پہلے رسالہ میں چھپ جائیں اور ان کے متعلق جو مفید تنقید ایڈیٹر صاحب یا دیگر حضرات سے مجھے موصول ہو، اپنی کتاب کی اصلاح کر لوں تاکہ کسی قسم کی غلطی کا شک باقی نہ رہے۔ میں نے اس بات کا ارادہ کر لیا ہے کہ جب کتاب ملک کے فائدہ کے لئے لکھی جائے تو اس پر اہل ملک کی رائے کا حاصل کرنا بھی ضروری ہے۔

اس سے یہ فائدہ ہو گا کہ مجھے اپنی کمزوری بھی معلوم ہو جائیگی اور کتاب بھی غلطیوں سے پاک ہو جائیگی۔ آیندہ اگر زندگی نے وفا کی تو مَیں اپنی تمام تالیف اسی طرح پہلے سے شایع کر کے مقتدر اصحاب کی رائے لیا کرونگا۔

اقسام معانیِ الفاظ

جو اساتذہ کہتے ہیں کہ نثر میں بھی شاعری ہوتی ہے ان کا قول اس لحاظ سے سچ ہے کہ نثر میں بھی شاعرانہ تخیل کا آنا ممکن ہے، بشرطیکہ ہم الفاظ کو موثر بنانے کے لئے ان کے محلِ خاص پر صرف کریں جو شعر کا پورا پورا مزہ دیں۔ اسکے لئے ضرورت ہے علم معانی، علم بیان، علم محاورات صرف نحو علم لغت پر عبور حاصل کرنے کی، اور کچھ مشکل بات نہیں ہے۔ ہماری زبان میں سب کچھ موجود ہے لیکن ہم اسکی طرف توجہ نہیں کرتے۔

صاحبِ آبِ حیاتؔ کی نثر میں اسی سبب سے نظم کا مزہ ملتا ہے کہ وہ ان باتوں سے واقف تھے۔ میری اس کتاب کی غرض یہی ہے، کہ لوگوں کو دلچسپ معنی خیز عبارت لکھنے کا طریقہ آجائے، اور کافی مشق ہو جائے، اور اس کی مدد سے نثر میں شاعری کر سکیں، اور ان کا شمار بہترین منشیوں میں ہو۔ سب سے پہلے محل صرف الفاظ پر مبسوط بحث کرنا چاہتا ہوں، تاکہ یہ بات اچھی طرح واضح ہو جائے کہ ہماری دن رات کی بات چیت میں بڑے بڑے مسئلے علم معانی و بیان و محاورات صرف و نحو کے ہوتے ہیں، اور ہم انکو محسوس نہیں کرتے۔ اگر اصول سے کام لیں تو عمدہ سے عمدہ عبارت انہیں لفظوں میں لکھ سکتے ہیں جن کو ہم برابر بولتے ہیں، موقع سے صرف ہو جائیں تو وہی لفظ جادو کا اثر رکھتے ہیں۔ اب معلوم کرنا چاہیئے کہ لفظوں کے معنی کئی قسم کے ہوتے ہیں۔ ہر ایک معنی کو اپنے محل پر صرف کرنا لطف کلام کو زیادہ کرتا ہے۔

اوّل لغوی معنی - یعنی اہل لغت نے جس لفظ کے جو معنی مقرر کئے ہیں۔ فرض کیجئے مارنا ایک مصدر ہے لغت والوں نے اس کے معنی چوٹ لگانا کے لئے ہیں۔ اس لفظ کو اگر ہم لغوی معنی پر صرف کریں تو اس طرح تحریر کر سکتے ہیں:

"مولوی صاحب نے لڑکوں کو آج خوب مارا۔"

سننے والا بخوبی سمجھ سکتا ہے کہ آج لڑکوں کی بہت مرمت ہوئی۔

آدمی کے معنی لغت میں انسان کے ہیں۔ جملہ میں اس طرح لکھتے ہیں :-

"ایک آدمی سڑک پر جارہا ہے۔"

اس سے یہ مفہوم واضح ہوگیا کہ ایک انسان ہے جو سڑک پر جارہا ہے۔

دوم اصطلاحی معنی - مارنا کے معنی لغت میں چوٹ لگانا کے ہیں، لیکن اہل اصطلاح نے اس کے معنی قتل کرنا کے بتائے ہیں۔ جب ہم کو اصطلاحی معنی بولنا مقصود ہونگے تو اس لفظ کو جملے میں اس طرح صرف کریں گے :-

"نواب بہادر نے آج ایک شیر مارا۔"

ع پلنگ اژدہا و شیر نر مارا تو کیا مارا

اب سمجھنے والا سمجھ جائیگا کہ شیر کو مار ڈالا یعنی شیر کا شکار کیا۔

آدمی کے معنی لغت میں انسان کے ہیں، لیکن اصطلاح میں ملازم کے مقرر کئے گئے ہیں۔ جب آدمی کے اصطلاحی معنی بولنا مقصود ہونگے تو جملے میں اس طرح لکھیں گے :-

"کل آپکا آدمی آیا تھا، میں نے اسکو خط کا جواب لکھ کر دیدیا۔"

اس سے معلوم ہوگیا کہ نوکر آیا تھا۔

سوم محاورے کے معنی - یہ معنی چند مقررہ الفاظ کے ساتھ ادا کئے جاتے ہیں۔ جیسے مارنا کے لغوی معنی چوٹ لگانا کے ہیں، اصطلاحی معنی قتل کرنا کے ہیں۔ لیکن محاورے میں شرط بدنا کے ہیں، اور اس میں ہاتھ کا لفظ لگا کر بولتے ہیں۔ ہاتھ مارنا بمعنی شرط بدنا، جملے میں اس طرح بولیں گے :-

"آؤ سو سو روپے کی بازی رہی ہاتھ مارو، ہمارا مرغ بھگادیگا۔"

اس سے معلوم ہوگیا کہ ہاتھ مارنا شرط بدنے کے معنی پر آیا ہے۔ ہاتھ مارنا کے معنی محاورے میں قتل کرنا کے بھی آتے ہیں۔

ع اک ہاتھ مار چھیلا دو ٹوک ہو جائے

چوتھے تشبیہ کے معنی - ایسے معنی لینے میں ایک چیز کو دوسری چیز سے مناسبت دیکر دوسرے معنی میں صرف کیا جاتا ہے جس میں مناسبت مل جاتی ہو۔

"تمہارا چہرہ تو گلاب کی پتی ہے۔"

یہاں چہرے کو گلاب کی پتی سے تشبیہ دی اور سمجھنے والا سمجھ گیا۔

پانچویں مجازی معنی - جو نہ لغت میں ہوں نہ اصطلاح میں، نہ محاورے میں۔ بلکہ ایک معنی ان سب کے خلاف بنا لیا ہو۔ اس کی دو صورتیں ہیں۔ ایک استعارہ، دوسرے مجاز مرسل۔ استعارہ وہ ہے کہ ایک لفظ کے معنی دوسرے لفظ سے مانگ لئے جائیں، بشرطیکہ دونوں لفظوں میں تشبیہ بھی ہو۔ اس طریقہ سے ہر لفظ کے صدہا معنی پیدا ہو جاتے ہیں، اور زبان میں ایک وسیع میدان پیدا ہو جاتا ہے۔ یعنی صرف اپنی عبارت کو سنوارنے کے لئے دوسرے لفظ کے معنی مانگ لیتے ہیں اس سے نیا لطف آجاتا ہے۔

"خوشنما بارہ دری کے صدر مقام میں مسند زریں پر ایک چاند کا ٹکڑا دس گیارہ برس کا نہایت شان و شوکت سے بیٹھا تھا۔ سپاہیوں نے قرینے سے پہچانا کہ یہی حضرت برجیس قدر بہادر ولیعہد شاہ اودھ ہیں۔"

چاند کے ٹکڑے کو خوبصورت بچہ کے معنی میں استعمال کیا۔ ظاہر ہے کہ چاند کے ٹکڑے کے معنی خوبصورت بچہ کے کسی لغت میں، کسی اصطلاح میں، کسی محاورے میں نہیں ہیں نہ

مجاز کی برکت ہے کہ ہم نے اس کے وسیلے سے یہ معنی حاصل کئے۔ اور چونکہ دونوں میں ایک تشبیہ پائی جاتی ہے اس لئے ہم اس کو استعارہ کہتے ہیں۔

"میں نے اندر جاکر دیکھا تو زرنگار کرسی پر ایک کاٹھ کا الّو بیٹھا ہوا ہے، جسے سب علے والے حضور حضور کہتے ہیں، دل نے کہا یہ سب دولت کے کرشمے ہیں جسے خدا دے"

کاٹھ کے الّو کے معنی بیوقوف آدمی کے کسی لغت میں نہیں ہیں، اسی استعارے کا فیضان ہے جو ہم نے ایک نئے معنی بنالئے۔ اس سے معلوم ہوگیا کہ استعارے میں ایسی گنجائش ہے کہ ہر لفظ کو جس میں دوسرے لفظ سے ذرا بھی مشابہت پائی جائے اسکے معنی میں صرف کرسکتے ہیں۔ استعارے کی پوری کیفیت ہماری کتاب 'مضمون نویسی' میں دیکھو۔

ششم مجاز مرسل ۔ اس کے معنی بھی لغت، اصطلاح تشبیہ و استعارہ سے جدا ہیں، اسکے قواعد عجیب واقع ہوئے ہیں ایک بے جان چیز کو جاندار قرار دیکر اسکے ہاتھ پاؤں بنالیتے ہیں۔

"قبلۂ عالم عقل کے ناخن لیجئے۔ لکھنؤ سے لکھیم پور پچاس کوس ہے۔ پیدل چلنے والا آدمی ایک دن میں کس طرح پہنچ سکتا ہے"

اس عبارت میں عقل کو جاندار تجویز کرکے اس کے ہاتھ پاؤں ناخن سب کچھ مان لئے۔

عقل کے ناخن لو سے یہ مراد ہے کہ عقل کے ناخن بڑھ گئے ہیں، ان کو کٹوا ڈالو۔ ظاہر ہے ناخن کا بڑھنا بدنمائی کا سبب ہے، اور جب ناخن کٹ جاتے ہیں تو عیب دور ہوجاتا ہے۔

تو جب عقل کے ناخن کاٹے جائیں گے، اسکی بدنمائی دور ہوجائیگی، یہی مراد یہاں بھی ہے کہ تمہاری عقل خراب ہوگئی ہے اسے درست کرو۔

ناخن لینا معنی درست کرنا لغت اصطلاح میں نہیں ہیں لیکن مجاز مرسل کی بدولت معنی لے لئے اسلئے کہ ہم نے عقل کو مجسم انسان قبول کیا۔

اور بھی مجاز مرسل کے مختلف طریقے ہیں کبھی جز کو کل کے معنی پر بولتے ہیں

"بہار کی فصل تھی، تمام باغ کھلا ہوا تھا"

ظاہر ہے کہ باغ نہیں کھلتا، بلکہ اس کے شجر، ثمر، گل اور پتّے لاتے ہیں۔ باغ کل ہے، پھول جز۔ اس جملہ میں پھول کے معنی پر باغ کو استعمال کیا

جو لوگ یہ کہتے ہیں کہ استعارے، تشبیہات، مجاز مرسل سے زبان میں الجھاؤ پیدا ہوتا ہے، وہ حقیقت میں الفاظ کے بامحل استعمال سے واقف نہیں ہیں۔ اور دور از کار استعارات اور خلاف قرائن الفاظ سے اسکو چیستان بنادیتے ہیں، ورنہ حقیقت یہ ہے کہ ہمارے روزمرہ کی بات چیت عام لوگوں کی زبان سے ہزاروں استعارے اور تشبیہات بے تکلف نکل جاتے ہیں جو زبان کی زینت ہیں۔

صاحب آب حیات نے خود بہت استعارے آب حیات میں لکھے ہیں، مگر دوسرے شعرا کو استعارہ لکھنے پر برا کہا ہے۔

مجاز مرسل کی تعریف یہی ہے کہ بامحاورہ ہو۔ جیسے:۔

ع رُوئے سخن کسی کی طرف ہو تو روسیاہ

یہاں سخن کو جاندار تصور کرکے اس کا منہ قائم کیا ہے۔

ع لب سوفار نے جگر میں چٹکی لی

سوفار کو جاندار بناکر لب قائم کیا اور اس کا جگر میں چٹکی لینا ثابت کیا۔ مطلب صرف اتنا ہے کہ سوفار جگر میں اتر گیا، مگر اس طرح کہنے میں ایک مزہ آگیا۔

ہفتم پھبتی ۔ یہ معنی بھی لغت اور اصطلاح سے جدا گانہ ہوتے ہیں۔ ایسی تشبیہ دینا جس سے ذم کا مفہوم نکلتے

پستہ قامت اور بیوقوف آدمی پر چھوٹے پاؤں کے گدھے کی پھبتی کہتے ہیں۔ حالانکہ کسی لغت واصطلاح میں گدھے کے معنی بیوقوف کے نہیں ہیں۔

آٹھویں طنز - اس میں تمام الفاظ کے معنی مخالف لغت واصطلاح آتے ہیں۔

" آپ تو بڑے سچے ہیں " یعنی بہت جھوٹے ہیں۔

" تم ضرور آؤ گے " یعنی نہیں آؤ گے۔

کبھی فعل کو محذوف کر دیتے ہیں۔ " آپ اور نماز " مطلب یہ ہے کہ تم کبھی نماز نہیں پڑھو گے۔

نویں کنایہ - ایک ایسا جملہ جو صفت کا بیان کیا جائے جس کے ملزوم سے لازم تک ذہن پہنچ جائے۔

" جیسے تم تو زمین ناپتے آتے ہو "

یہ جملہ ایسے آدمی کے متعلق کہیں جو لنگڑا ہو۔ ظاہر ہے کہ لنگڑا آدمی بھی ایک جگہ قدم ٹیکتا ہے اور جھک کر دوسرا قدم اٹھاتا ہے جس طرح زمین ناپنے والا جھکتا ہے۔

دسویں مثل - جو بالکل خلاف معنی الفاظ ہوتے ہیں مثل کم سے کم دو لفظوں میں اور زائد سے زائد دو جملوں میں

" پھٹ پڑے وہ سونا جس سے ٹوٹیں کان "

معنی یہ ہیں کہ وہ دولت کس کام کی جس سے اپنی جان کو تکلیف ہو

" جنگل میں مور ناچا، کس نے دیکھا "

یہ کہ پردیس کی راحت بیکار ہے جسے دوست احباب دیکھ سکے۔

بعض مثلیں ٹھیٹھ ہندی میں ہوتی ہیں مگر وہ بجنسہ اردو میں بولی جاتی ہیں۔

" جنہیں چاو گھنیرے انہیں دکھ بہتیرے "

معنی یہ کہ جو ناز میں پلتے ہیں وہی تکلیف اٹھاتے ہیں۔ گھنیرے اور چاو اردو میں نہیں بولے جاتے مگر مثل میں آکر جائز ہو جاتے ہیں

" چندن کی چٹکی بھلی، گاڑی بھرا نہ کاٹھ "

یعنی کم اچھی چیز بہت خراب چیز سے بہتر ہے۔

" پھیلے چار بگھارے پانچ " معنی انتہا کا جھوٹا۔

" حج کا حج، بنج کا بنج " معنی یہ کہ ثواب بھی اور تجارت بھی۔

گیارہویں محاورہ لفظی کہ ہاتھ کے اشارے سے معانی بیان کئے جاتے ہیں۔ اور معنی الفاظ بغیر اشارہ دست کے مساعدت نہیں کرتے۔

" فرخ آباد سے اتنے اتنے بڑے تربوز آئے تھے "

" اتنی سی ڈبیا، اتنا سا منہ "

عاشقانِ زمانہ جتنے ہیں | میرے آگے کے اتنے اتنے ہیں
چمن میں وہ غنچہ دہن جو گیا | بس اتنا سا غنچہ کا منہ ہو گیا

خواجہ عبد الرؤف عشرت لکھنو

طنزیاتِ ماپوری

حصہ اوّل کی جلدیں اب تھوڑی رہ گئی ہیں۔ جلد طلب کیجئے ... ... مجلد ... غیر مجلد

حصہ دوم بھی تیار ہے۔ قدر دان ٹوٹے پڑ رہے ہیں ... ... مجلد ... غیر مجلد

المشتہر ... معتمد انجمن ... [illegible]

بنیا شاہی

از حضرت خواجہ حسن نظامی مدفیضنہ

اُردو زبان میں بنیا شاھی حقارت کا لفظ ہے۔ اور کسی کنجوس کی بات کا ذکر کرنا ہو تو بنیا شاہی کہا کرتے ہیں۔ مگر جب سے کاٹھیاواڑ کی بنیا قوم میں گاندھی جی پیدا ہوئے اور ان کی شہرت ہوئی تو بنیا شاہی لفظ کی حقارت میں پہلی سی آب و تاب باقی نہیں رہی ہے۔

مسٹر محمد علی جناح بھی خوجہ قوم میں ہیں، اور خوجے اور بوھرے اور میمن سب بنیا قوم سے اسلام میں داخل ہوئے تھے، اسلئے مسٹر محمد علی جناح کو بھی بنیا قوم کا رتن کہہ سکتے ہیں۔

ہندو قوم میں چار ذاتیں ہیں، اور ان کی تقسیم منو جی جیسے بڑے قانون داں نے کی تھی۔ اور ان چاروں فرقوں کے کام بھی مقرر کر دیئے تھے۔ سب سے اونچی ذات کا نام برھمن رکھا تھا، اور اس کا کام مذہب کی خدمت قرار دیا تھا۔ دوسری ذات کا نام چھتری رکھا تھا اور کام حکومت و جنگ۔ تیسری ذات کا نام ویش رکھا تھا اور کام تجارت و زراعت چوتھی ذات کا نام شُدر رکھا تھا اور کام محنت و خدمت مقرر کیا تھا۔ ان چاروں ذاتوں کے مجموعہ کو وہاں آشرم کہتے ہیں۔ اور ان چاروں کے کام کی بڑی مضبوط حد بندی کی گئی تھی، یہاں تک کہ اگر کوئی ذات اپنے مقررہ کام کے سوا کوئی دوسرا کام کریگی تو مہا پاپ (بڑا گناہ) کرے گی۔ اس لحاظ سے کہا جاتا ہے کہ پنڈت جواھر لال نھرو، اور گاندھی جی سیاسی کام کر کے مھا پاپ کر رہے ہیں۔ کیونکہ سیاسی کام فقط چھتریوں کیلئے مخصوص ہے۔ مگر تاریخ سے معلوم ہوتا ہے کہ ہندو حکومتوں اور اسلامی حکومتوں کے زمانے میں برہمن اور ویش یعنی بنیئے سیاسی کام بھی کرتے تھے مرھٹوں کے حکمران پیشوا کہلاتے تھے۔ اور وہ سب برھمن تھے۔ اور مسلمان بادشاہوں کے بہت سے وزیر بھی برہمن اور بنیئے ہوئے ہیں، لہذا گاندھی جی اور نھرو جی کا سیاست میں دخل دینا کوئی نئی بات نہیں ہے۔ شیر شاہ کے زمانے میں ریواڑی کے ایک غریب بنیئے نے اتنی ترقی کی تھی کہ وہ رفتہ رفتہ ھندوستان کا شہنشاہ ہو گیا تھا۔ اور دھلی کے تخت پر بیٹھ کر اس نے اپنا لقب بکرماجیت رکھا تھا۔

ریواڑی دہلی کے قریب ایک مشہور قصبہ ہے۔ پنجاب ھائیکورٹ کے سابق جیف جج سر شادی لال بھی اسی ریواڑی کے بنیئے ہیں، جہاں بنیا شاھی کا بانی پیدا ہوا تھا۔ یہ بنیا راجہ بکرماجیت تاریخوں میں ھیمو بقال کے نام سے مشہور ہے۔ اور مغل مورخوں نے اپنے بادشاہوں کو خوش کرنے کے لئے اس کا ذکر ایسی

تاریخوں میں بہت حقارت سے کیا ہے۔ حالانکہ انصاف سے دیکھا جائے تو ھیمو بقال نے اپنی خداداد لیاقت سے اتنی ترقی کی تھی کہ شیر شاہ افغان کی سلطنت کا وارث قرار پایا تھا۔ اور اکبر اعظم کی فوج سے پانی پت کے میدان میں ایک فیصلہ کن لڑائی لڑا تھا۔

تاریخوں سے معلوم ہوتا ہے کہ ھیمو بقال بازاروں میں پھیری لگا کر نمک بیچا کرتا تھا، بہت بدصورت تھا ایک آنکھ سے بھینگا تھا۔ نمک کا تھیلا کندھے پر رکھے، لونوُن لونوُن پکارتا پھرتا تھا۔ شیر شاہ مر گیا۔ اور سلیم شاہ اس کا بیٹا تخت پر بیٹھا تو ھیمو اسکی فوج کے بازار میں بھی نمک بیچنے جانے لگا۔ وہاں ایک دن خود سلیم شاہ نے اس کو دیکھ لیا۔ اور بازار کی خرید فروخت کی کچھ باتیں پوچھیں۔ ھیمو نے ایسی جرأت اور واقفیت سے جواب دیئے کہ سلیم شاہ نے اس کو فوجی بازار کا داروغہ بنا دیا۔ پھر بازار کا کوتوال مقرر کر دیا۔ سلیم شاہ کے بعد اسکے جانشین عدلی نے اس کو فوجی اختیارات دے اور افغان باغیوں کے مقابلوں کے لئے بھیجا۔ ھیمو جہاں گیا فتح پائی اور بڑے بڑے شہ زور افغانوں کو مار مار کر بھگا دیا۔

اسی زمانہ میں ھمایوں، ایران کی مدد لیکر ہندوستان پر آیا اور دلی جیت لی۔ اور اپنے سپہ سالار بیرم خان کے ساتھ اکبر کو پنجاب کی مہمات سر کرنے کیلئے بھیجا، اور خود شیر شاہ کے بنائے ہوئے مکان شیر منڈل کی چھت سے گر کر مر گیا۔ اکبر اپنے سپہ سالار کے ساتھ پنجاب میں تھا۔ دھلی میں ھمایوں کا مشہور جرنیل تردی بیگ حاکم تھا۔ ھیمو نے یہ خبر سنی تو افغانوں کی جرار فوج لیکر دھلی پر چڑھ دوڑا۔ تردی بیگ مقابلہ کی تاب نہ لایا اور بھاگ گیا۔ جب پنجاب میں اکبر کے پاس پہنچا تو بیرم خان نے اکبر کی اطلاع کے بغیر تردی بیگ کو مار ڈالا تاکہ مغلوں کے دلوں سے ھیمو بقال کا خوف دور ہو جائے، اور وہ تردی بیگ کو کم ہمت سمجھنے لگیں۔

ھیمو بقال نے دلی جیت کر یہاں ایک بڑا دربار کیا اور اپنا لقب راجہ بکرماجیت قرار دیا۔ اور پھر فوراً بے شمار ہاتھیوں اور توپخانوں کی فوج لے کر دھلی سے پنجاب کی طرف بڑھا، تاکہ اکبر کا خاتمہ کرکے ہندوستان کا خود مختار بادشاہ بن جائے۔ مگر افسوس ہے کہ پانی پت کے میدان میں اکبر کے ایک نوعمر سردار علی قلی خان شیبانی نے صرف پانچ ہزار مغلوں سے ھیمو پر حملہ کیا۔ اور پہلے ھیمو کا آتش خانہ چھین لیا۔ اور پھر ہاتھیوں کی فوج پر حملہ کیا۔ مغلوں کے گھوڑے، ہاتھیوں کو دیکھ کر بدکتے تھے، اسلئے مغل پیدل ہو گئے اور ایک مغل بچے نے ھیمو کے ہاتھی کو پکڑ لیا۔ کیونکہ ھیمو کی افغان فوج بھاگ گئی تھی۔ اور ھیمو کی آنکھ تیر سے زخمی ہو گئی تھی۔ ھیمو کو گرفتار کر کے اکبر کے پاس لایا گیا۔ مگر اکبر نے ھیمو کو قتل کرنے سے یہ کہہ کر انکار کیا کہ میں بندھے دشمن پر ہاتھ اُٹھانا مردانگی نہیں سمجھتا، اسلئے بیرم خان نے بیٹھے بیٹھے تلوار کا ایک ہاتھ ایسا مارا کہ ھیمو کا سر کٹ کر گر پڑا۔ اور اس طرح بنیا شاہی کا بانی ہمیشہ کے لئے ختم ہو گیا۔

مغل مؤرخ کچھ ہی لکھیں مگر حق یہ ہے کہ ھیمو بقال نے مغلوں اور پٹھانوں کو اُن کے عروج کے زمانے میں مغلوب کر کے دھلی پایہ تخت چھین لیا تھا۔ اور شروع سے آخر تک کسی مہم میں اسکو شکست نہیں ہوئی تھی۔ صرف پانی پت میں اسکو شکست ہوئی اور اس کی وجہ مخصوص یہ تھی کہ اس کی فوج میں سب افغان تھے اور وہ اس وقت تک اس کے مددگار رہے جبتک کہ ھیمو مسلمان بادشاہ کا نوکر تھا۔ اور افغان سمجھتے تھے کہ وہ اسلامی سلطنت کا نوکر ہے۔ مگر جب ھیمو نے راجہ بکرماجیت لقب اختیار کر کے ہندو حکومت کا اعلان کیا تو وہ سب منحرف ہو گئے۔ حالانکہ اس وقت قحط کی اتنی شدت تھی کہ کمئی کا آٹا ایک روپے کا دو سیر آتا تھا۔ اور بیشمار بھوکے ھیمو کی فوج میں بھرتی ہو گئے تھے۔ لیکن انہوں نے مسلمان فوج کو مقابلہ میں دیکھا تو ھیمو کا ساتھ چھوڑ کر بھاگ گئے۔

بہر حال ھیمو بقال نے اپنے خون کے حرفوں سے تاریخ میں یہ بات لکھوا دی کہ غریبوں اور گمناموں کو حقارت سے نہ دیکھنا چاہیئے، کیونکہ جب خدا چاہتا ہے تو ان میں بھی ھیمو جیسے آدمی پیدا کر دیتا ہے، جس کی صورت بھی اچھی نہ تھی، علم بھی کچھ نہ تھا۔ جسم بھی مضبوط نہ تھا۔ برادری کا زور بھی نہیں تھا۔ حالات بھی موافق نہ تھے۔ پھر بھی خدا نے اسکو اتنی ترقی کرنے کا موقع دیا کہ دلی جیتی اور بکرماجیت ثانی بن کر دنیا سے رخصت ہو گیا۔

حسن نظامی

لمحات

از شنکر سروپ بھٹناگر صاحب ایم۔ اے

(۱)

تارے ایک ایک کر کے غائب ہو گئے ہیں!
جیسے کہ صبح ہوتے ہی ایک ایک کر کے چراغ بجھ گئے ہوں!!
آسمان ایسا لگتا ہے جیسے کہ اس کی دنیا اجڑ گئی ہو!!
رات بھر میں تارے دیکھتا رہا!
رات بھر میں نے بھی اپنی آرزوؤں کے پھول بنائے
...... وہ آسمان پر تاروں کی طرح چمکنے لگے!!
مگر جب مجھ کو ہوش آیا ....
نہ معلوم میرے تارے کہاں غائب ہو گئے!!
میں بھی آسمان کی طرح لٹا ہوا معلوم ہونے لگا!
جیسے کہ میری دنیا بھی اجڑ گئی ہو!!

(۲)

مجھے کالی رات اچھی لگتی ہے!
دنیا تاریک ہو گئی ہو! ـــــ اور اسکی تاریکی کو دوبالا کرنے کیلئے!!
تارے آسمان میں بے شمار چمک رہے ہوں!!!
ایسی رات میں رات سائیں سائیں کرتی ہے!
مجھے ایسی کالی رات اچھی لگتی ہے!
جب رات سائیں سائیں کرتی ہے ـــــ تو مجھے معلوم ہوتا ہے کہ
کوئی ویوگی لمبی لمبی سانس لے رہا ہے!! ـــــ دن بھر کے شور و غل
میں ـــــ میرا یہ احساس دبا رہتا تھا!! ـــــ مگر جب
رات آتی ہے ـــــ تو میں بھی ویوگی کی طرح ...... اور
بھولی ہوئی یاد جگاتا ہوں! ـــــ مجھے ایسی کالی رات اچھی لگتی ہے۔

علیگڈھ اور ادبِ اُردو

عناصرِ اربعہ

نذیر احمد[1]

از جناب مشیر احمد صاحب علوی ناظر بی-اے (علیگ)

نذیر احمد ۲۳ رجمادی الاول ۱۲۵۲ھ مطابق ۶ دسمبر ۱۸۳۶ء بروز سہ شنبہ بمقام موضع ریہڑ پرگنہ افضل گڈھ تحصیل نگینہ ضلع بجنور میں پیدا ہوئے۔ ابتدائی تعلیمات اپنے والد ماجد مولوی سعادت علی کی نگرانی میں حاصل کیں، اور حفظ کلام مجید کی سعادت[?] عظمیٰ

---

[1] نذیر احمد کے والد ماجد مولوی سعادت علی خاندانی جھگڑوں کی وجہ سے بجنور چلے آئے اور اکثر وہیں رہا کرتے تھے۔ مولوی سعادت علی شاہ عبد الغفور کی اولاد میں تھے جو اعظم پور مضافات بجنور کے رہنے والے تھے، اور ان کو شاہ عبد القدوس گنگوہی سے بیعت کا شرف بھی حاصل تھا۔ کہا جاتا ہے کہ شاہ عبد الغفور صاحب کرامات و مقامات بھی تھے واللہ اعلم ۔ مولانا نسباً شیخ صدیقی تھے، بجنور انکا مولد نہیں، وطن اقامت نہیں بلکہ وطن اصلی تھا۔ چار برس کی عمر میں بجنور گئے، بچپن میں گداز جسم تھے۔ نہایت چلبلے تھے، کبھی ایک نشست میں حجامت نہیں بنوائی ابتدائی تعلیم والد ماجد سے حاصل کی۔ مینا بازار۔ پنج رقعہ۔ سہ نثر ظہوری، اپنے والد سے پڑھیں۔ فارسی کے ساتھ عربی بھی شروع کر دی تھی ۹ برس تک اپنے والد کی نگرانی میں تعلیم حاصل کرکے عالم بے بدل مولوی نصر اللہ خاں ڈپٹی کلکٹر کے فیض تربیت میں داخل گیارہ برس تک اُن سے پڑھا۔ نحو عربی میں شرح ملا تک اور منطق میں تہذیب اور میر قطبی، اور فلسفہ میں میبذی تک پڑھا۔ فارغ التحصیل ہونے کے لئے اُن کے والد ماجد اُن کو دہلی لے گئے ۔ اور مولوی عبد الخالق جو اورنگ آبادی مسجد میں درس دیتے تھے اُنکے حلقہ اثر میں شامل کر دیئے گئے۔ کچھ عرصہ کے بعد انہیں کی پوتی سے اُن کی شادی بھی ہوگئی ۔ مکتب کی روایتی تعلیم سے برداشتہ خاطر ہمیشہ رہتے تھے۔ اتفاق سے دہلی کالج کی طرف جا نکلے مسٹر ٹیلر پرنسپل کے اس وعدہ پر کہ اُن کو للعہ وظیفہ ماہوار ملے گا، وہ جنوری ۱۸۴۵ء میں کالج کی دوسری جماعت میں شامل ہوگئے اور برابر وظیفہ پایا۔ تاریخ و ریاضی سے نفرت تھی۔ ذکاء اللہ اُن کے ہم سبق تھے۔ ۱۴ سال کی عمر میں شفیق باپ کا سایہ سر سے اُٹھ گیا۔ ان کی بیوی مولوی عبد القادر کی بیٹی تھیں، مفتی صدر الدین خاں نے نکاح پڑھا تھا اور گیارہ ہزار کا مہر بندھا تھا۔ اپنی والدہ کے اصرار سے اپنے خاندان کی ایک خاتون سے عقد کر لیا تھا، لیکن طلاق کی نوبت آگئی۔ غیرت و حمیت کا بڑا جذبہ تھا، سسرال کے کھانے کبھی نہیں کھاتے تھے، بلکہ سے رماہوار اپنے کھانے کی قیمت بیوی کو ادا کرتے اور صرف دال چپاتی کھا کر پیٹ بھر کر

حاصل کرکے کچھ عرصہ بعد "بیت السلام" دہلی چلے گئے اور وہیں مستقلاً سکونت اختیار کرلی۔ دہلی میں ایک مسجد کے قدیم روایتی مکتب میں مولوی نصر اللہ اور مولوی عبد الخالق کے حضور میں زانوئے ادب تہ کیا۔ یہ تعلیم کیا تھی؟ اور کس پیمانہ کی، ہم کو مطلق علم نہیں ہے۔ بہرحال وہ مذہبی روایتی حدود سے یقیناً زیادہ نہ ہوگی، لیکن اس تعلیم کا نقش اس قدر گہرا ضرور رہا کہ وہ تمام عمر مختلف ماحول میں بھی مذہبی خانقاہ سے باہر نہ نکل سکے۔

(حاشیہ متعلق صفحہ سابق)

شکر کیا کرتے تھے۔ کبھی مولوی عبد القادر کے افطار میں بھی شریک نہیں ہوئے۔ سنہ ۱۸۵۴ء کے آخر میں ۸ برس کی مکمل تعلیم کالج میں ختم کرنے کے بعد کنجاہ ضلع گجرات میں بمشاہرہ للعہ ماہوار مدرس ہوگئے۔ لیکن ۲ سال کے اندر ہی ملازمت ترک کرکے کانپور ڈپٹی انسپکٹری کے عہدہ پر چلے گئے۔ جہاں فکر صاحب انسپکٹر مدارس سے ناچاقی ہوگئی اور نذیر احمد استعفیٰ دیکر دہلی واپس چلے گئے۔ دہلی پہنچنے سے قبل ہی ملک میں غدر ہوگیا اور اس ہنگامۂ مشرق میں نذیر احمد اور اُن کے خاندان نے بہت ناقابل بیان صعوبتیں اٹھائیں۔ کہتے ہیں کہ ابتدائے غدر میں نذیر احمد نے ایک انگریز خاتون کی جان بچائی تھی، جسکے صلہ میں غدر فرو ہونے کے بعد الہ آباد کے ڈپٹی انسپکٹر مدارس مقرر کیے گئے۔ اور یہیں منشی عبد اللہ خاں امین عدالت سے انگریزی پڑھی اور عمدہ لیاقت حاصل کرلی۔ اس دور میں میر نادر علی ذوالقدر ڈپٹی کلکٹر الہ آباد کی سفارش سے نذیر احمد کو قانون انکم ٹیکس کے ترجمہ کی خدمت گورنمنٹ سے ملی۔ لیکن اس وقت بھی اُن کی قسمت نے یاوری نہ کی۔ منشی شیو پرشاد انسپکٹر مدارس نے سعی سفارش سے ترجمہ میں شرکت کی، اور شریک کیا ہوئے انکم ٹیکس ایکٹ کا ترجمہ نذیر احمد سے چھین لیا، اور اُن سے ماتحت کلرک کا کام لینے لگے، نذیر احمد مجبور تھے لیکن انہوں نے بھی بابو شیو پرشاد کو زچ کر دیا۔ اب تعزیراتِ ہند کا ترجمہ منشی عظمت اللہ اور مولوی کریم بخش کی شرکت میں ملا اور اسکے صلہ میں کانپور کی تحصیلداری ملی، اور ضابطہ فوجداری کا ترجمہ ختم ہونیکے بعد ڈپٹی کلکٹر ہوگئے۔ دو برس تحصیلدار رہے ۱۸۶۱ء سے ڈپٹی کلکٹری میں تعینات ہوئے۔ مرآۃ العروس اسی دور کی یادگار ہے۔ اسی زمانہ میں ہنری لیسورن کی ہیئت کی مشہور کتاب کا ترجمہ سمٰوات کے نام سے کیا جو اصلاح و درستی کیلئے بذریعہ ریزیڈنٹ حیدرآباد امیر کبیر کے پاس بھیجی گیا۔ یہ ہیئت دانی میں مشہور تھے اس صلہ میں سر سالار جنگ نے حیدرآباد دکن میں ایک اہم کام کیلئے منتخب کیا۔ مولوی سید حسین بلگرامی نے خط لکھا، پھر نواب محسن الملک کا خط آیا، لیکن جب علیگڈھ کے پیر مغاں سید احمد کی معرفت سرکار نظام کا مراسلہ ملا تو اپنی بیوی اور بیٹے سے مشورہ کرنے کے بعد یکم اپریل ۱۸۷۷ء کو اعظم گڈھ سے رخصت لیکر دہلی گئے اور ۲۷ اپریل کو حیدرآباد پہنچکر نواب محسن الملک کی کوٹھی میں فروکش ہوئے، اور حسن عمل کی صلہ میں برابر ترقی کرنے لگے۔ اور بورڈ آف ریونیو کے ممبر ہوگئے۔ سر سالار جنگ انکے بڑے قدردان تھے اس عہد میں انہوں نے نظام سابق کیلئے ایک نصاب بھی تیار کیا۔ سر سالار جنگ نے اپنے صاحبزادہ میر لائق علی خاں کو جو سالار جنگ ثانی ہوئے انکی شاگردی میں دیا۔ راجہ کشن پرشاد بھی انکے ہم جلیس تھے، دونوں نذیر احمد کے حضور میں باادب درس لیتے تھے جب شاگرد رشید سن تمیز کو پہنچے اور حیدرآباد کے وزیر سالار جنگ ثانی کہلائے تو لوگوں کا خیال تھا کہ شاید اقبال کا ستارہ نذیر احمد کا اب اور چمکے گا، لیکن یہ خبر کسی کو نہ تھی کہ نذیر احمد کے عروج کی انتہا ہو چکی تھی بلکہ زوال کا وقت قریب آ گیا تھا۔ شاگرد جب زیر سلطنت بنے تو نوجوان تھے ہی اور حوالی موالی انکے مزاج میں در خور [illegible]

۱۸۲۵ء میں دہلی کا مشہور کالج قایم ہو چکا تھا جو برطانوی دورِ اقتدار کی سب سے بڑی سندی درسگاہ تھی بطور حقیقۃً ہندوستان میں مغربی علوم و افکار کا پہلا مرکز تھا انگریزی ملازمت کیلئے اسی دانش گاہ کے تربیت یافتہ زیادہ پسند کئے جاتے تھے، اور اس حقیقت سے انکار بھی نہیں کیا جا سکتا ہے کہ اس درگاہ کے باکمالوں نے حکومتِ برطانیہ کے ابتدائی عشرہ میں ہندی دماغوں کو کافی متاثر کیا۔ اور اس سلسلہ میں بہت اہم اور بیش قیمت خدمات بھی انجام دیں، مشہور فرانسیسی مستشرق گارسن ڈی تاسی[1] نے اپنے بلند پایہ خطبات میں اس دانش گاہ کا تذکرہ بڑے ادب و احترام سے کیا ہے۔ اور سی ۔ ایف اینڈریوز[2] اور ڈاکٹر عبدالحق[3] نے بھی علم و ادب کی نشر و اشاعت میں اس جامعہ کو بڑی اہمیت دی ہے۔ ماسٹر رام چندر۔ مولوی ذکاء اللہ۔ محمد حسین آزاد الطاف حسین حالی وغیرہ اسی مرکزِ علم کے مشہور طلبا رہ چکے تھے۔ اس درسگاہ میں مشرقی و مغربی طرز کی سموئی ہوئی تعلیم ہندی نوجوانوں کو دی جاتی تھی۔ اس دورِ کہن میں اس کالج نے اکثر قابلِ ذکر شخصیتوں کو دنیائے ادبیات میں روشناس کیا۔ نذیر احمد بھی ۸ جنوری ۱۸۴۵ء کو اس درسگاہ میں داخل ہوئے۔ اس دور میں عقائدِ وہابیہ کا زور تھا۔ لیکن نذیر احمد نے اس مسموم اور تنگ نظر فضا کو قطعاً پسند نہ کیا۔

اگر نذیر احمد اس مدرسہ کے فارغ التحصیل نہ ہوتے تو وہ غالباً کسی مذہبی مدرسہ میں قدیم دقیانوسی قسم کے محض ایک مولوی ہوتے، جس کا کام کفر ساز انجمنوں کی تنظیم ہوتا۔ وہ بھی دوسروں کی کمزوریوں اور نقائص کی تلاش میں رہتے اور ان کی خلقی خامیوں سے ناجائز فوائد حاصل کرتے رہتے۔ بلکہ ایک بڑی حد تک خلق اللہ کے گمراہ کرنے سے بھی احتراز نہ کرتے ۔ ——— یہ سب ہوتا لیکن وہ ادب کے لئے بیکار ہو جاتے ، یا بقول ایک ادیب کے " نذیر احمد جہالت کے مسموم پردوں میں ہمیشہ کیلئے مستور ہو جاتے" اور اس طرح زمانہ کے نئے معتقدات جدید ماحول اور لطیف طرزِ انشا سے ہمیشہ کے لئے محروم ہو کر کسی پرانے زاویہ میں گم ہو جاتے۔ دہلی کالج کی اعلیٰ تربیت اور برتر تعلیم کا یہ ادنیٰ کرشمہ تھا کہ نذیر احمد نے وسعتِ علم اور آزادیٔ رائے سے بردباری اور اصلیت خیال کے جذبات بہین اور اس کالج کی سموئی ہوئی فضا میں سیکھے اور ان میں تحقیقات کا جذبہ پیدا ہو گیا۔ اس اشرف تعلیم نے نذیر احمد کے کردار گفتار، تحریر و تقریر میں آیندہ چل کر نمایاں انقلاب پیدا کر دیا۔ نذیر احمد اس مدرسہ میں عرصہ تک رہے،

(حاشیہ متعلق صفحہ سابق) :۔ سالار جنگ کا رخ بدلا اور نذیر احمد وظیفہ یاب ہو کر دہلی چلے آئے اور دنیا ان کو بجائے "بجنوری" کے دہلوی کہنے لگی۔ حالانکہ ان کو دہلی سے کوئی واسطہ نہیں ہے۔ انکی سسرال دہلی ضرور تھی۔

(حیات نذیر۔ سیر المصنفین و مختلف رسائل سے یہ حالات منتخب کئے گئے ہیں۔ ناظر کاکوروی)

[1] روح گارسن ڈی تاسی ۔ ناظر کاکوروی ۲۷۔ امین آباد پارک لکھنو (انوار المطابع لکھنو)

[2] ذکاء اللہ ۔ سی۔ ایف۔ اینڈریوز

[3] معاصرین ڈاکٹر عبدالحق ۔ انجمن ترقی اردو۔ دہلی

اور ہنگامۂ مشرق سے ۴ سال قبل ۱۸۵۳ء میں کالج کو خیرباد کہا۔ اُس وقت ملک کی خوش قسمتی سے ڈاکٹر ٹیلر[1] اس درسگاہ کے پرنسپل تھے۔ اس تعلیمی دَور میں نذیر احمد نے تاریخ یا مغربی تعلیم سے مطلق دلچسپی نہ لی۔ اور وہ معمولی موٹی مذہبی تعلیمات سے لیس ہو کر میدانِ عمل میں آئے اور کامیاب ہوئے۔ اُنکے والد ماجد نے انگریزی تعلیم کی اجازت نہیں دی تھی کیونکہ نصرانیوں کی زبان سیکھ کر "کرستان" ہو جانے کا اندیشہ تھا۔ کچھ بھی ہوا انہوں نے اس خامی کو سید احمد کی طرح اپنے دورِ ملازمت میں پورا کیا

نذیر احمد کا تعارف علیگڈھ کے پیر میکدہ سے ملازمت کے دور میں ہوا، اور اس رسمی تعارف نے جلد ہی محبت و اخلاص کا گہرا رنگ اختیار کر لیا، اور نذیر احمد نے بالآخر سید احمد کی کہربائی طاقت تسلیم کرتے ہوئے اُنکے حضور میں سرِ تسلیم خم کر دیا۔ اور نہایت درجہ بہادری و جرأت سے انگریزی تعلیمات کی جدید برقی لہروں کو مس کیا اور ہر آئینہ کامیاب ہوئے۔ نذیر احمد کی ملازمت کی زندگی گجرات (پنجاب) کے ایک اسکول سے شروع ہوتی ہے لیکن جلد ہی وہ ۱۸۵۴ء میں کانپور گئے اور یہیں سے الٰہ آباد کے ڈپٹی انسپکٹر مدارس مقرر ہوئے۔ اسی دَور میں انہوں نے حسبِ ایما حکومتِ ہند قانون انکم ٹیکس اور تعزیراتِ ہند کا سلیس اردو ترجمہ کیا اور اسکے بعد ضابطہ فوجداری اور قانون شہادت کو بھی اردو جامہ پہنایا۔ اور اس صلہ میں وہ ڈپٹی کلکٹر کے عہدہ پر سرفراز کئے گئے اور اس حیثیت سے مختلف اضلاع میں تعینات رہے۔

حیدر آباد کا دربار اس دَور میں اپنی نفاست کیلئے ممتاز و بلند درجہ رکھتا تھا، تاریخی و سیاسی حیثیت سے بھی دربار میں ہندوستانی سماج کا عطر موجود تھا۔ لکھنؤ و دہلی کی جھلک حیدر آباد میں نظر آتی تھی۔ افقِ ہند پر جو جدید ستارہ ضوفشاں ہوتا وہ حیدر آباد میں آفتاب بن کر چمکتا۔ نذیر احمد بھی امیر الامراء کی نظرِ انتخاب سے بچ نہ سکے اور ۱۸۷۷ء میں حیدر آباد چلے گئے اور وظیفہ یاب ہو کر دہلی آئے۔ اب سید احمد کے تعلیمی و اصلاحی لائحہ عمل میں مخلصانہ شریک ہوئے۔ اور سید احمد کے ادنیٰ سے ادنیٰ حکم سے بھی سرتابی کو کبھی گوارہ نہ کیا، اور بقول ایک عزیزہ کے "اگر کسی وقت نذیر احمد کو کسی روحانی حیثیت سے مرشد کی تلاش ہوتی تو وہ بخوشی علیگڈھ کے پیرِ مغاں کے دستِ حق پرست پر بیعت کر کے اُن کو مرشدِ کامل تصور ہی نہیں تسلیم بھی کر لیتے"

قدیم درسِ نظامی کے حلقہ بگوش جنکی تعداد ملک میں کسی طرح کم نہ تھی، نذیر احمد کی آزاد خیالی کو پسند نہ کرتے تھے۔ گو نذیر احمد سید احمد کے مذہبی آزاد خیالی کو پسند نہ کرتے تھے، لیکن سید احمد کا دل و دماغ قومی خدمت کے جذبہ سے سرشار تھا اور نقطۂ کمال تک پہنچ چکے تھے، نذیر احمد اس حیثیت سے بھی سید احمد کے مرید و معتقد سے زائد نہ تھے۔ سید احمد کی یہ بڑی کامیابی تھی کہ انکے جانشین بہت مستقل مزاج اولوالعزم اور شجاع ملے۔ نذیر احمد بھی اسی گروہ میں یقیناً شمار کئے جا سکتے ہیں۔ لیکن قاعدہ ہے وفاشعاروں کا حلقہ زیادہ وسیع نہیں ہوا کرتا، اسی لئے سید احمد کے پرستاروں میں نذیر احمد کا درجہ کافی بلند و ممتاز نظر آتا ہے۔

(باقی آئندہ)

---

[1] بوح گارس ڈی ٹاسی - ناظر کا کوروی امیر محل لائبریری نفیس ملغ امیر محل حصہ کاکوری لکھنؤ -

سیٹھ جی سفر میں

(از حضرت اللہ پوری)

ہر کہ داند داند، وہر کہ نداند بداند کہ راقم الحروف کا "انتقال" ہوگیا۔ لیکن انا للہ پڑھنے کی نہ وجہ ہے نہ ضرورت۔ اسلئے کہ یہ "انتقال" "روحانی" یا "جسمانی" نہیں بلکہ صرف "مکانی" ہے مختصر لفظوں میں ظرافت مآب حضرت اللہ پوری اپنے سابق مستقر سے رسی تڑا کر بگٹٹ بھاگ نکلے اور ان دنوں بفضل خدا ایوان شریف میں دندنا رہے ہیں۔ ملحوظ خاطر عاطر ناظرین با تمکین رہے کہ بلا سے "ایوان شریف" کوئی نہیں کہتا لیکن چونکہ ہم جیسے ذات شریف .... یہاں جلوہ فرما ہیں اسلئے اب سے "ایوان شریف" نہ کہنا شرافت کو الٹی چھری سے ذبح کرنا ہے۔

عام طور سے سفرنامے، تاریخ اور جغرافیہ کا مجموعہ ہوا کرتے ہیں، لیکن ہمارا سفرنامہ "صرف اُن" کارناموں" سے بحث رکھتا ہے جو دوران سفر میں یا تو کسی ہم سفر سے یا خود ہماری ذات ظرافت صفات" سے معرض وقوع میں آئے ہوں۔ سفر کو بزرگوں نے "وسیلۂ ظفر" اور کبھی "صورت سقر" سے تعبیر کیا ہے لیکن ہمارے جیسے خوش فکروں کے لئے تو بسا اوقات "تفریح بسر" ہوا کرتا ہے۔ چنانچہ یہ مختصر مضمون ان ہی "تفریح بسر" حالات کا مرقع ہے جو ہدیۂ ناظرین ہے :-

"رانچی روڈ اسٹیشن پر ہم، ہماری بندوق، ہمارا بستر اور ایک عدد ٹرنک ریل گاڑی پر سوار ہوئے۔ ڈبہ بالکل خالی تھا۔ ہم نے ایک سیٹ پر بستر لگایا۔ بندوق ایک طرف لمبی لمبی لٹا دی، ٹرنک سیٹ کے نیچے رکھوا کر ہم بستر پر لیٹ کر سونے کی کوشش کرنے لگے، اور دو تین منٹ تک ایسا محسوس ہوا کہ واقعی ہم سو گئے ہیں، اور شیریں و فرحتناک خواب دیکھ رہے ہیں۔ لیکن تھوڑی دیر بعد ہی "دھڑا دھڑا"، "کھٹا کھٹ" کی آواز نے آنکھ کھولنے پر مجبور کر دیا۔ غنودگی میں ہمیں یقین آگیا کہ "گولہ باری" ہمارے خانہ میں ہو رہی ہے۔ ڈبہ میں دھواں سا چھا گیا تھا اور ایک ہلکی ناگوار سی بو تمام ڈبہ میں پھیلی ہوئی تھی۔ بمباری کا پورا منظر سامنے آگیا، اور ہم نے گھبرا کر آنکھیں بند کر لیں کہ یک بیک گھڑگھڑاہٹ کی صدا ڈبے کے دروازہ پر معلوم ہوئی۔ "میرے خدا" میں نے سوچا "گولہ باری کے ساتھ ساتھ دشمنوں نے ٹینک سے بھی حملہ کر دیا ہے۔ الامان الحفیظ"۔ دو تین ثانیوں کے بعد گھڑگھڑاہٹ ختم ہوئی، اور ساتھ ہی ساتھ چند نامانوس صدائیں کان میں آنے لگیں۔ اب ہم نے یقین کر لیا کہ ضرور کچھ "گول مال" ہے، اور ہم اب جنگی قیدی ہیں۔ یہ خیال آتے ہی جی بھر آیا، آنکھوں سے آنسو بے اختیار رواں ہو گئے۔ اپنی بیچاری "کمسن" ستارہ کی ناکام و نامراد جوانی کی یاد سے کلیجہ منہ کو آگیا۔ اور ذرا ایمان سے کہیے گا کیا ایک نوجوان فوجی قیدی کی نوجوان دلہن "سہاگن بیوہ" نہیں ہو جاتی ؟

معاً یہ خیال آیا کہ ان لوگوں کو آنکھیں کھول کر دیکھنا چاہیے کہ آخر یہ ہیں کیا بلا؟ اور اگر خدانخواستہ وہی ہیں جو ہم سمجھے بیٹھے ہیں تو پھر ان کی منت و خوشامد کیجائے۔ الحاح وزاری سے کہا جائے کہ "حضور پر نور ہم فوجی نہیں فدوی ہیں صاحب سیف نہیں،

صاحبِ قلم ہیں۔ رہی یہ بندوق تو لائسنس دیکھ لیجیے، یہ محض جانوروں کو مارنے کے لئے ہمیں دی گئی۔ آدمیوں پر چلانا تو دُور، اٹھائی بھی نہیں جاسکتی"۔ یہ سوچ کر جی کڑا کرکے ہم نے آنکھیں ایکدم کھول دیں۔ لاحول ولاقوۃ۔ سامنے کی سیٹ پر دو عدد مارواڑی اور ایک عدد سیٹھانی صاحبہ خاص مارواڑی زبان میں محوِ گفتگو ۔ ۔ ۔ ۔ اب ہم نے سلسلۂ واقعات پر غور کرنا شروع کیا۔ ہم جنہیں بم کے گولے سمجھے تھے وہ گٹھریاں تھیں جنہیں وقت کی کمی کے باعث دھڑادھڑ ڈبے کے اندر پھینکا جارہا تھا۔ ناگوار بُو غالباً ہینگ، گھی، سرسوں کے تیل کی تھی جو سیٹھ صاحبان کے کپڑوں سے آرہی تھی۔ اور دھواں وہ گرد تھی جو گٹھریوں کے بے محابا پٹکنے سے خود گٹھریوں سے اور زمین سے اُٹھ کر ہوا میں منتشر ہورہی تھی۔ گھڑگھڑاہٹ کی صدا ٹین لوہے کے بکس کی تھی جسے گھسیٹ کر سیٹھ صاحبان نے اپنے سامنے رکھا تھا، اور جسے ہم ٹینک کا دباؤ سمجھتے تھے وہ ان تینوں کا مشترکہ بوجھ تھا ۔ الحمد للہ

سلسلۂ خیالات یہیں تک پہنچا تھا کہ انجن نے سیٹی دی اور ایک عدد مارواڑی تو گاڑی سے یوں کودے جیسے بے ٹکٹ سفر کرنے کی حالت میں اکثر راقم الحروف کو بھی چھلانگ لگانی پڑی تھی۔ اب چلتی ہوئی گاڑی کے اس ڈبے میں ہم تھے اور سیٹھ جی اور سیٹھانی صاحبہ۔ گاڑی چھوٹتے ہی سیٹھ جی نے ایک بڑی سی گٹھری اپنی طرف کھسکائی اور اسے کھول کر پوری، حلوا، مٹھائیاں، پورے پورے اُبلے ہوئے آلو، کچے پکے پھول، بڑے، پاپڑ، چند قسم کے اچار نکال کر سیٹ پر یوں رکھ دیئے کہ اسٹیشن کے حلوائی کی دکان کا منظر آنکھوں کے سامنے آگیا۔ اب سیٹھانی صاحبہ نے بھی لمبا گھونگٹ چہرے سے سرکایا اور دونوں ریل پر "رفتن" کے ساتھ ساتھ "خوردن" کی منزل طے کرنے لگے۔

راقم الحروف نے کالج کی زندگی میں "صاحبانِ نظر" کے سامنے ایک تھیوری پیش کی تھی جسے اہلِ نظر نے تجربہ کی کسوٹی پر پرکھ کر ہمیں کالج کے "نوبل پرائز" کا مستحق گردانا تھا۔ وہ زرّیں تھیوری یہ ہے :۔ "مارواڑی، بچپن میں بہت خوبصورت ہوتا ہے لیکن جوں جوں بڑا ہوتا جاتا ہے، بدصورت اور کریہہ المنظر ہوتا جاتا ہے"۔ اور اس کے بعد غالباً اس سے زیادہ کہنے کی ضرورت نہیں کہ سیٹھ جی اور سیٹھانی کم از کم زندگی کی پچاس بہاریں دیکھ چکے تھے۔ بہرکیف رائچی روڈ سے دونوں نے کھانا شروع کیا۔ جین پور میں "دہی بڑے"۔ برمو میں "مٹر آلو" "چنا جور گرم"۔ "بالائی"۔ "ربڑی"۔ "پاپڑ" خریدے گئے اور کھانا جاری رہا۔ برمو اسٹیشن تک ان دونوں کا مُنہ ریل کے ساتھ ساتھ چلتا رہا یعنی ہر اسٹیشن پر کچھ نہ کچھ خریدنے کیلئے انہیں ہاتھ روکنا پڑا۔ لیکن اس کے بعد تو توبہ ہی بھلی۔ ریل اسٹیشن پر رُکے تو رک جائے، کھانا کہاں رکتا ہے۔ اور مسافروں کے دماغ کو تو اسٹیشنوں پر پہیوں کی گھڑگھڑاہٹ کی آواز سے سکون ملتا ہوگا لیکن یہاں تو اسٹیشن پر بھی چپڑ چپڑ کی گھناؤنی صدا گاڑی کے پہیوں کا بدل ثابت ہوتی رہی۔

تقریباً پندرہ اسٹیشن گذر گئے لیکن کھانا ختم ہونے کو نہ آیا، اور ہم اطمینان سے غور کرتے رہے کہ یہ کھانا جو دس پندرہ آدمیوں کے لئے کافی تھا دونوں کے پیٹ کے کس گوشہ میں "ڈیا پنٹ" توڑ رہا ہے کہ یکایک سیٹھ جی گھبرائے ہوئے کھانا چھوڑ کر اٹھ کھڑے

ہوئے اور "لٹیا" اٹھا کر فوراً بیت الخلا کے اندر جا براجے۔ سٹھانی صاحبہ بدستور کھانا "ملاحظہ" فرماتی رہیں تھوڑی دیر بعد سیٹھ جی برآمد ہوئے اور پھر ہاتھ دھوکر کھانے پر ڈٹے ہی تھے کہ سٹھانی صاحبہ اُٹھ کھڑی ہوئیں اور وہیں تشریف لے گئیں جہاں سے سیٹھ جی ابھی آئے تھے۔ سیٹھ جی نے ان کے غائبانہ میں پس خوردہ کھانے اٹھا کر گٹھڑی میں باندھے کہ سٹھانی صاحبہ برآمد ہوئیں، اور سیٹھ جی پھر لُٹیا لیکر بیت الخلا کے اندر۔ یکے بعد دیگرے بیت الخلا کی سیر کا یہ دلچسپ ڈرامہ تھوڑی دیر تک کچھ وقفہ کے ساتھ ہوتا رہا۔ لیکن فوراً ہی "آواگون" کا یہ سلسلہ اتنی تیز رفتاری سے جاری ہوا کہ راقم الحروف کو سچ مچ تھوڑی دیر کے لئے مسئلہ تناسخ کا قائل ہو جانا پڑا۔ بادی النظر میں ایسا محسوس ہوتا کہ ابھی جو سیٹھ جی "اندر" تشریف لے گئے تھے، وہ سٹھانی صاحبہ کا روپ دھار کر واپس آرہے ہیں، اور ابھی جو سٹھانی صاحبہ سیٹ پر تشریف رکھتی تھیں وہ سیٹھ صاحب کا "روپ" دھار کر اندر "چلی" ہوگئیں ہیں۔ اور تھوڑی دیر بعد خصوصاً جب "لٹیا" بیت الخلا کے دروازہ ہی پر ایک نے دوسرے سے جھپٹنا شروع کر دی تو یہ خیال اور راسخ ہوتا گیا۔ ریل اب یہاں آکر پور اسٹیشن پر رکی، سٹھانی صاحبہ تو "اندر" تشریف رکھتی تھیں، سیٹھ جی کھڑکی سے گردن باہر نکال کر دیکھنے لگے۔ شاید انہیں کسی کا انتظار تھا۔ ایک طرف سے آواز آئی "جے رام جی کی"۔ سیٹھ جی نے سلام کے جواب میں انہی الفاظ کا اعادہ کیا۔ اتنی دیر میں سٹھانی صاحبہ نے دروازہ کھولا۔ نو وارد نے پوچھا "بھیّا کشل کھیم ہے نہ؟" مگر توبہ کیجئے یہاں اب جواب دینے کی فرصت کس کم بخت کو تھی۔ سیٹھ جی پیٹ پکڑے جلدی سے لٹیا اُٹھا کر بیت الخلا کے اندر ہو گئے۔ نو وارد بیچارہ حیران و پریشان کھڑا کا کھڑا رہ گیا اور ریل وہاں سے چھوٹ گئی۔ ہم نہایت دلچسپی سے یہ سارا منظر کھلی ہوئی آنکھوں سے دیکھ رہے تھے۔ رات کے کوئی دو تین بج رہے تھے، اب سونے کا سوال ہی نہ تھا، اسلئے کہ گاڑی صبح کو گیا پہنچتی ہے، جہاں مکرمی ایڈیٹر صاحب "ندیم" ازراہ عزت افزائی خاکسار کو اپنی زیارت بخشنے والے تھے۔ ہم نے دفع الوقتی کے لئے ان سے پوچھا "سیٹھ جی۔ آپ کا دولت خانہ؟" سیٹھ جی یہ سنتے ہی متوحش نظروں سے ہمیں دیکھنے لگے۔ ہم نے پھر کہا "سیٹھ جی میں آپکا دولت خانہ پوچھ رہا ہوں"۔ سیٹھ جی سہم سے گئے اور بے اختیار انکی نظر اس لوہے کے بکس پر جا پڑی جو انکی سیٹ کے سامنے رکھا ہوا تھا۔ ہمیں انکی کج خلقی پر بہت غصہ آیا اور ہم نے ذرا درشت لہجے میں کہا "سیٹھ جی۔ یہ کون سی تہذیب ہے کہ میں تو آپسے دولت خانہ پوچھ رہا ہوں اور آپ ہیں کہ گُپ چُپ بیٹھے ہیں"۔ لیکن سیٹھ جی نے جواب کے بدلے آنکھیں بند کرلیں، گویا سمادھی میں بیٹھے ہوں۔ جل بھن کر ہم نے کہا "نہیں بتاتے آپ، اچھا سمجھونگا میں آپسے"۔ یہ کہہ کر ہم غضبناک حالت میں اپنی سیٹ پر واپس آئے۔ دل میں آیا کہ اب سو ہی رہا جائے۔ بستر پر لیٹے تو کوئی چیز پشت و پہلو میں چُبھتی معلوم ہوئی۔ دیکھا تو بستر کے نیچے بندوق کا ایک "گھوڑا" (شکاریوں کی اصطلاح میں گھوڑا اُس پرزے کا نام ہے جسکے دباتے ہی بندوق سر ہو جاتی ہے) اُبھرا ہوا تھا۔ ناچار بندوق بستر سے باہر نکالی۔ اور اس کے رکھنے کے لئے مناسب جگہ تجویز کرنے لگے کہ ناگہاں سیٹھ جی اور سٹھانی صاحبہ کی چیخ اور پکار "دوڑو۔ دوڑو۔ ڈاکہ ڈاکہ" نے اوسان خطا کر دیئے۔ بندوق ہاتھ سے چھوٹ گئی۔ گاڑی چلتے چلتے رکنے لگی۔ ہم نے دیکھا کہ وہ دونوں لوہے کے بکس سے چمٹے ہوئے بے تحاشا چیخ رہے ہیں

ابھی ہم غور کرنے بھی نہ پائے تھے کہ ڈاکو کس طرف ہیں کہ گاڑی رکی اور انسانوں کا ایک جم غفیر دوڑتا ہوا ڈبے کے اندر داخل ہوا۔ سیٹھ جی ان کے آنے سے چیخنا بند کرکے اُٹھ بیٹھے کہ ریلوے گارڈ ہاتھ میں ٹارچ لئے ڈبے کے اندر داخل ہوا۔ آتے ہی اس نے تحکمانہ لہجے میں پُوچھا "زنجیر کس نے کھینچی ؟" اس کے لہجہ نے ہمیں یقین دلایا کہ وہ یو۔پی کا باشندہ ہے۔ سیٹھ جی نے ہاتھ جوڑ کر کہا "سرکار ہم نے"۔ "کیوں تمہیں کیا خطرہ درپیش تھا ؟"۔ سیٹھ جی "سرکار ڈاکو ...."۔ گارڈ :۔ "کیا کہا ڈاکو؟ کہاں سے آیا۔ کدھر گیا ؟"۔ سیٹھ جی :۔ "غریب پرور، نہ کہیں سے آیا اور نہ کہیں گیا"۔ گارڈ :۔ "تو پھر کیا ہوا۔ زمین کھا گئی یا آسمان"۔ سیٹھ جی نے آنکھیں نیچی کرکے ہماری طرف اُٹھائی "سرکار، وہاں ..... وہ ..." اب خیال فرمائیے ہمارے جیسے اچھے کھاصے جنٹلمین کو گارڈ ڈاکو کیسے سمجھ لیتا؟ اس نے کہا "سیٹھ جی مذاق کر رہے ہو کیا ؟ وہاں تو کوئی ڈاکو نہیں"۔ سیٹھ جی نے ہاتھ جوڑ کر گارڈ کے پیر پکڑ لئے "سرکار ہماری جان بچائیے۔ بھگوان آپکو بڑا صاحب بنا دیگا"۔ بظاہر گارڈ اس دعائیہ جملے سے مسرور ہوتا معلوم ہوا۔ "مگر یہ تو بتاؤ کس سے تمہاری جان بچائیں ؟"۔ سیٹھ جی :۔ "حضور یہ صاحب بہادر ہی ڈاکو ہیں"۔ گارڈ کے لبوں پر ایک حقارت آمیز تبسم پیدا ہوا۔ ہماری طرف مخاطب ہو کر گارڈ نے پوچھا "کیوں صاحب آپ ڈاکو ہیں"؟ تماشائیوں کی نگاہیں میری طرف اُٹھیں۔ ہم نے انداز وقار قائم رکھتے ہوئے جواب دیا "صاحب میں تو خاصہ بھلا مانس ہوں، نہ جانے سیٹھ جی کو کیا غلط فہمی ہوئی"۔ اب گارڈ نے سیٹھ جی سے پھر پوچھا "سیٹھ جی۔ سچ سچ بتلائیے قصہ کیا ہے ورنہ پچاس روپے جرمانے میں داخل کرنے ہونگے"۔ جرمانہ کا نام سُنتے ہی سیٹھ جی کے حواس تشریف لے گئے۔ کہنے لگے "غریب پرور پہلے واقعہ تو سُن لیجئے۔ پھر آپ مائی باپ ہیں، جی چاہے جرمانہ کیجئے۔ جی چاہے جیل بھیجئے"۔ گارڈ :۔ "تو جلد بتلاؤ، گاڑی آدھ گھنٹہ لیٹ ہو گئی ہے"۔ سیٹھ جی "غریب پرور، مختصر یہ ہے کہ گاڑی جو پہاڑپور سے چھوٹی تو یہ صاحب بہادر میرے پاس آکر پُوچھنے لگے کہ بتاؤ تمہاری دولت کہاں ہے ؟ ہم نے کچھ جواب نہیں دیا۔ انہوں نے پھر وہی سوال کیا ذرا سخت لہجہ میں۔ میں پھر خاموش رہا۔ انہوں نے تیسری بار ڈانٹ بتائی، لیکن میں نے "جمع" بتانے کی حامی نہیں بھری، اسکے بعد یہ صاحب اپنی سیٹ پر گئے اور حضور بندوق (ہماری گری ہوئی بندوق کی طرف اشارہ کرکے اور گھگھیا کر) اگر ذرا بھی زنجیر کھینچنے میں دیر ہوتی تو غریب پرور میں بندوق کا نشانہ بن گیا ہوتا" یہ کہہ کر سیٹھ جی زار زار مثلِ ابر نوبہار رونے لگے، جیسے واقعی ان کی سیٹھانی بیوہ ہو گئی ہو۔ گارڈ (ہماری طرف مخاطب ہو کر) "کیوں صاحب کیا یہ حقیقت ہے"۔ ہم "دیکھئے ابھی سب کچھ آئینہ ہوا جاتا ہے (سیٹھ جی سے) سیٹھ جی کیا پوچھا تھا ہم نے آپ سے ؟"۔ سیٹھ جی (اکڑ کر) "دولت پوچھی تھی اور کیا ؟" ہم "سیٹھ جی ذرا یاد کرکے جواب دیجئے۔ میں نے آپ سے یہی پوچھا تھا نہ کہ سیٹھ جی آپکا دولت خانہ"۔ سیٹھ جی: "ہاں ہاں دولت خانہ۔ دولت ...... اور خانہ یعنی دولت کا گھر ہی تو پُوچھا تھا آپ نے"۔ "بھگوان آپکا بھلا کریں۔ ڈاکو ہو کر ستیہ بولتے ہیں، لیکن یہ بتائیے میں آپکو تجوری کیسے بتا دیتا ؟"۔ ہم (گارڈ سے مخاطب ہو کر) "ملاحظہ فرمایا آپنے اس خربے دُم کی حماقت۔ ہم تو پُوچھیں انکا گھر، اور یہ سمجھیں کہ دمڑی گئی"۔ گارڈ (سیٹھ جی سے) "سیٹھ جی نہایت

افسوس کی بات ہے کہ آپ نے بالکل بے وجہ زنجیر کھینچ کر تمام مسافروں کو مفت تکلیف دی اور گاڑی ایک گھنٹہ لیٹ کرادی، اور ایک شریف آدمی پر صریح جھوٹا مگر خوفناک الزام لگایا۔ اسلئے حسب قانون پچاس روپے جرمانے میں داخل کیجئے۔" اب سیٹھ جی کاٹو تو لہو نہیں بدن میں۔ کبھی میرا مُنہ دیکھتے ہیں اور کبھی گارڈ کا۔ کہ گارڈ نے ڈانٹ بتائی، "روپے جلدی نکالو ورنہ تمہیں یہیں جنگل میں اتار دیا جائیگا۔" چاروناچار سیٹھ جی نے کمر سے نوٹوں کا پلندہ کھولا۔ دس کے پانچ نوٹ مُنہ لسورتے ہوئے گارڈ کو دیئے جسے لیکر گارڈ نے رسید لکھ دی اور وہاں سے چلنے ہی کو تھا کہ سیٹھ جی نے دس روپے کا دوسرا نوٹ نکال کر گارڈ کی طرف بڑھایا۔ گارڈ: "یہ کیا ہے؟" سیٹھ جی "حضور یہ دس روپے ان صاحب بہادر کو دیکر انہیں کسی دوسرے ڈبے میں بٹھادیں، اب تو "جمع" کی جگہ معلوم ہوگئی۔ سرکار ہماری جان گئی، اب مجھے جیتا نہ چھوڑیں گے۔" گارڈ (بمشکل ہنسی ضبط کرتے ہوئے) "یہ کیسے ہوسکتا ہے؟ میں کسی مسافر کو مجبور نہیں کرسکتا کہ وہ کسی دوسرے ڈبے میں جا بیٹھے۔" اب سیٹھ جی ہیں کہ حسرت سے ایک ایک کا مُنہ تک رہے ہیں اور تماشائیوں پر ہنسی کا دورہ پڑ رہا ہے۔ بالآخر سیٹھ جی نے تماشائیوں سے مخاطب ہوکر کہا "بھائیو۔ میں دو آدمی آپ میں سے اپنی نگرانی کے لئے چاہتا ہوں صرف گیا تک کیلئے اس خدمت کے لئے میں پانچ روپے فی آدمی اُجرت دُونگا۔"

آخر مسافروں میں سے دو غریب آدمیوں نے حامی بھرلی اور سیٹھ جی کی یا دوسرے لفظوں میں ہماری نگرانی ہونے لگی، اسی "نظربندی" کی حالت میں ہم گیا پہنچے، یہاں جناب ایڈیٹر صاحب ازراہ ذرہ نوازی راقم الحروف کی "مضحکہ انگیز صورت" ملاحظہ فرمانے کیلئے تشریف لائے تھے، ملاقات محض سرسری رہی اور ان ہی کے لفظوں میں اسے "خواب بیداری" سے تعبیر کیا جاسکتا ہے۔ واپس آکر جو ڈبے میں دیکھتے ہیں تو سیٹھ جی معہ سٹھانی صاحبہ عاشق کے دل کی طرح غائب ہیں بے اختیار ہمارے مُنہ سے یہ شعر نکلا ؎

رفتم برائے ساختنِ اسباب "سیٹھانی" نماند یک لحظہ غافل بُدم و ہیہات "سیٹھم" دور شد

سون پور تک کوئی قابل ذکر واقعہ پیش نہیں آیا۔ سون پور میں گاڑی بدلی گئی۔ دیکھتے کیا ہیں کہ سیٹھ جی ایک ڈبے میں پہلے ہی سے براجمان ہیں، ہم نے قصداً اسی ڈبہ میں سامان رکھوایا۔ ہمیں دیکھتے ہی سیٹھ جی کے مُنہ پر ہوائیاں چھُٹنے لگیں، لیکن خیریت یہ تھی کہ اس ڈبہ میں اور بھی مسافر تھے اور دن کا وقت تھا۔ ہم نے پوچھا "سیٹھ جی آپ تو صبح گیا میں اُتر گئے تھے نا؟" سیٹھ جی "نہیں صاحب میں نے صرف ڈبہ تبدیل کرلیا تھا" ہم "آخر کیوں؟" سیٹھ جی "مجھے آپ سے ڈر معلوم ہوتا ہے ...." اور مسافروں کی آمد نے سلسلۂ گفتگو منقطع کردیا۔ سون پور سے دگھوارا اسٹیشن تک کوئی خاص بات نہیں ہوئی۔ دگھوارہ اسٹیشن پر ایک صاحب بہادر (ہندوستانی) ہیٹ کوٹ پتلون زیب بدن فرمائے ہوئے ہاتھ میں جوتے کا برش اور بوٹ پالش لئے ہوئے ڈبے میں داخل ہوئے۔ ہم نے انہیں دیکھتے ہی زور سے فی البدیہہ یہ شعر پڑھا ؎

اپنے جوتوں سے "مسافر" بھی رہیں اب ہشیار ایک "صاحب" چلے آتے ہیں چماروں کی طرح

ان صاحب بہادر نے آتے ہی ہمارے جُوتوں کی "مرمت" قرار واقعی شروع کردی اور اس کے بعد دوسرے مسافروں کے جُوتوں پر پالش لگا کر سیٹھ جی کی طرف بڑھے ہی تھے کہ سیٹھ جی دفعتاً راستہ روک کر کھڑے ہوگئے اور بولے "صاحب پہلے یہ بتایئے آپ کون ذات ہیں، ہندو، مسلمان یا کرسٹان"۔ صاحب "ہم ہندو ہیں"۔ سیٹھ جی:۔ "ہندو ہیں تو کس آسرے ہیں"۔ صاحب:۔ "ہم برہمن ہیں"۔ سیٹھ جی:۔ "رام رام برہمن ہو کر شودر کا کام کرتے ہیں"۔ صاحب "جی نہیں، ہم ایم۔ اے پاس ہیں لیکن ہم نے یہ پیشہ محض اسلئے اختیار کر رکھا ہے تاکہ عوام کے دل میں مزدوری کی وقعت ہو یہ ڈگنیٹی آف لیبر[ط] ہے"۔ سیٹھ جی:۔ "یہ لیبر گیبر تو ہم نہیں جانتے۔ منو شاستر میں صاف صاف لکھا ہے کہ برہمن سے شودر کا کام لینے والا سُور کی یونی میں جاتا ہے، تو آج میں آپ سے پالش جوتے پر کرالوں اور کل کو گُوہ کھاتا پھروں، نا صاحب باز آیا میں"۔

ط DIGNITY OF LABOUR

یہ ردوقدح ہو ہی رہی تھی کہ جھیرہ اسٹیشن آگیا۔ سیٹھ جی نے قلی کو آواز دی، سامان ان کے سر پر لدوایا اور چلے تھے کہ ہم نے انہیں گھیر کر پوچھا "سیٹھ جی۔ میں آپ کو اس وقت تک نہ جانے دونگا جب تک آپ یہ نہ بتائیں کہ میرے جسم کے کس حصّہ سے آپ کو ڈر معلوم ہوتا ہے"۔ سیٹھ جی:۔ "اجی آپ کے جسم سے تو میں قطعی خائف نہیں ہوں، آپ ایسوں کو تو میں روز کشتی لڑا سکتا ہوں"۔ ہم:۔ "تو پھر آپ نے یہ کیوں کہا تھا کہ ہم سے آپ کو ڈر لگتا ہے"۔ سیٹھ جی:۔ "اجی صاف بات تو یہ ہے کہ مجھے آپ سے نہیں، آپ کی بندوق سے ڈر لگتا ہے"۔ ہم:۔ "لیکن وہ بھری ہوئی تو نہ تھی"۔ مگر اب جواب کون دیتا ہے، سیٹھ جی یہ جا وہ جا آنکھوں سے اوجھل ہوگئے۔

تو عرض ہے کہ اگر آپکے پاس سفر میں بندوق ہو اور ڈبّے میں سیٹھ جی ہمسفر، تو لِلّٰہ یا تو پہلے ہی گارڈ سے کہہ دیجیے کہ زنجیر کھینچنے پر گاڑی نہ روکے، یا بندوق کو بریک میں دیدیجئے۔ یا سیٹھ جی کو دکھا کر گارڈ کے حوالہ کر دیجیے، ورنہ مفت میں "ڈاکو" کے "معزز" خطاب سے سرفراز ہو جائیں گے۔

مانیں نہ مانیں ناظرین یہ اختیار ہے
ہم سیٹھ جی کی داستاں دہرائے جاتے ہیں

اللہ پوری

رُباعی

امشب کہ برات ہر دو عالم باشد
لطف و کرمت بخلق پیہم باشد
خواہم گہر افشانیٔ دستِ کرمت
پُر دامنم از دُرِّ مرادم باشد

بے روزگاری

(از جناب سید اخلاق حسین صاحب رضوی)

ظفر، بمبئی ٹرامو ے کمپنی کے دفتر کے اُس حصّہ میں کھڑا تھا جو "ایر کنڈیشنڈ" ہونے کی وجہ سے کافی خنک تھا۔

کوسوں دُور، ڈاکر کی سڑک پر جھلستی ہوئی ہوا اور جلجلاتی گرمی کی دوپہر میں پیدل چل کر آنے کے باعث اسکے چہرے سے وحشت برس رہی تھی اور پیشانی پر پسینہ کے قطرات شبنم کی اُن بوندوں کی طرح مجتمع ہوگئے تھے جو گلابی جاڑوں کی صبح کو درختوں کے چوڑے چکلے پتوں پر بکھری رہتی ہیں........ مگر دفتر میں داخل ہوتے ہی اُسے ایسا معلوم ہوا جیسے وہ "فردوسِ بریں" میں آگیا ہو۔

اس نے ہیٹ اتار کر بغل میں لے لیا اور جیب سے رومال نکال کر چہرے اور پیشانی کے پسینے کو خشک کیا، پھر ہر چیز کا سرسری نظروں سے جائزہ لیتا ہوا آگے بڑھا۔

آج وہ قدرے مسرور تھا، کیونکہ اسے یقین تھا کہ ٹرامو کمپنی کے افسرِ اعلیٰ کے نام وہ شہر کے ایک ایسے معزز اور مشہور رئیس کا سفارشی خط لایا ہے جو علاوہ خطاب یافتہ اور ذی عزت ہونیکے کمپنی کا حِصّہ دار بھی ہے۔

وہ دل ہی دل میں سوچ رہا تھا کہ ابتدائے جنگ سے جبکہ وہ ایک جرمن فرم میں ملازم ہونیکے باعث اپنی اسامی برطرف کر دیا گیا تھا ——— اور اسی پر کیا منحصر اسی کیطرح تقریباً چار ہزار تعلیم یافتہ نوجوانوں کو بے روزگاری کا شکار ہونا پڑا تھا ——— اس عرصہ میں اس نے نہ معلوم کتنے خان بہادروں، سروں، اور راؤ بہادروں کے بنگلوں اور کوٹھیوں کی خاک چھانی تھی، مگر ہر مرتبہ وہ ان سرمایہ داروں کی تغافُل کوشیوں کے باعث ناکامی و نامرادی کا شکار ہوا تھا۔ اب ملتوں کی مُسلسل کاوشوں کے بعد وہ اپنے مقصد میں کامیاب ہوتا نظر آرہا تھا

اسے توقع تھی کہ اب وہ ضرور ملازم ہو جائیگا، کیونکہ کمپنی کے دفتر میں حال ہی میں سات اسامیاں خالی ہوئی تھیں جن کا ہنوز کوئی انتظام نہ کیا گیا تھا۔ اس خیال سے اسکو گونہ ڈھارس ہوئی اور ایک لمحہ کیلئے اس کا دھوپ سے کمہلایا ہوا چہرہ مسرّت و طمانیت سے شگفتہ ہوگیا۔ اب بہت جلد وہ بھی اسی خنک مقام میں بیٹھ کر کام کریگا۔ اس خیال کے آتے ہی اسکی بھٹکتی ہوئی نظریں دفتر کے کلرکوں پر پڑیں جو اپنی اپنی میزوں کے سامنے بیٹھے ہوئے ضروری کاغذات کی خانہ پری اور دیکھ بھال میں منہمک تھے۔

سامنے والی گیلری سے کچھ دُور داہنی طرف، رنگین و منقش شیشوں سے گھرا ہوا سکریٹری کا کمرہ تھا، جس کے اسپرنگ دار دروازہ کے ہر بار کھلنے اور بند ہونے پر ظفر کی نگاہیں غیر ارادی طور پر ہر طرف سے سمٹ کر ادھر جم جاتیں، اور ہر مرتبہ جبکہ چپراسی ادھر سے آتا اُسے امید ہوتی کہ شاید وہ اسے صاحب کے پاس چلنے کا اشارہ کر رہا ہے، مگر اپنے متعلق کوئی حکم نہ پاکر

ل "Air Conditioned"

وہ بدستور امید و بیم کے لمحات میں گم ہو جاتا۔

ظفر کو اسی طرح کھڑے کھڑے تقریباً دو گھنٹے ہو گئے اب کوئی ایک بجنے والے تھے۔ مگر صاحب نے اسے ہنوز طلب نہیں کیا تھا، اور اب تو لنچ[۱] کا وقت بھی ہو رہا ہے۔ شاید وہ جانے سے پیشتر ہی مجھے انٹرویو کے لئے بلا لیں۔ آج میرے سر میں سخت درد ہو رہا ہے۔ کیونکہ صبح گھر میں پیسے نہ ہونیکے باعث چاء سے محروم رہنا پڑا تھا۔ وہ دل ہی دل میں جانے کیا کیا سوچ رہا تھا کہ ایک مرتبہ سکریٹری صاحب اپنے کمرے سے باہر تشریف لاتے دکھائی دیئے۔ وہ بڑے تمکنت و وقار کے ساتھ چھڑی گھماتے اس کے قریب سے گذرتے ہوئے باہر جانے لگے۔ ظفر نے بیتابانہ، مگر مشتاق نظروں سے انہیں دیکھا اور مؤدبانہ سلام کرتا ہوا ان کے پیچھے پیچھے ہو لیا۔ اس امید میں کہ شاید صاحب کے موٹر میں تشریف رکھتے وقت اسے کچھ عرض کرنے کا موقع مل جائے، مگر وائے نامرادی! اس نے ظفر کا پیچھا اب تک نہ چھوڑا تھا۔

صاحب نے نہ تو مڑ کر دیکھا اور نہ ہی اتنا موقع دیا کہ کوئی ان سے اپنا دکھڑا روئے۔ کیونکہ دفتر کے باہر ظفر جیسے اور بھی کتنے بے روزگار، پام کے درختوں کی طرح قطار اندر قطار ساکت و صامت کھڑے صاحب کے نکلنے کا انتظار کر رہے تھے۔

صاحب کے جاتے ہی سب کے سب اس طرح منتشر ہو گئے جیسے کوئی جوشیلا مجمع پولس کی لاٹھی چارج سے تتر بتر ہو جاتا ہے۔ ظفر نے صاحب کی ہوا میں فراٹے بھرتی ہوئی شیورلٹ پر حسرت بھری نگاہیں ڈالیں اور اپنا ہیٹ بدستور بغل میں دبائے دفتر میں داخل ہو کر چپراسیوں والی بنچ پر انہیں لوگوں کیساتھ بیٹھ گیا۔

[۱] Lanch

اگر اسے آج بھی ناکامی ہوئی تو ـــــــ؟ بیٹھے ہی بیٹھے اس نے دل میں سوچا۔ اس خیال کے آتے ہی ظفر کے پژمردہ چہرہ پر اور بھی مُردنی چھا گئی۔ امید کی ہلکی شعاع جو مسلسل ناکامیوں کے بعد مستقبل کے جھروکے سے اسے جھانک رہی تھی وہ بھی مفقود ہوتی ہوئی نظر آنے لگی۔ اب وہ کہاں جائیگا؟ خان بہادر صاحب کے درِ دولت پر وہ حاضری دے چکا تھا موصوف کے متعلق مشہور ہے کہ بڑے غربا پرور اور مخیر واقع ہوئے ہیں، مگر وہاں اسے کورا جواب مل چکا تھا۔ ایک دوسرے مسٹر کی خدمت میں وہ انکے ایک دوست کا سفارشی خط لیکر حاضر ہو چکا تھا، مگر وہاں موجودہ جنگ حائل ہو گئی۔ گرانی، کام کا فقدان اور کساد بازاری کے باعث انکے ہاں بھرتی کے بجائے تخفیف ہو رہی تھی۔ پھر وہ ایک راؤ بہادر کے دولت کدہ پر کتنی بار گیا، مگر ہر مرتبہ اسے مایوس ہو کر واپس آنا پڑا، کیونکہ ہر مرتبہ سیٹھ صاحب کسی نہ کسی قومی کام اور دیہات سدھار کے باعث حویلی میں موجود نہ رہتے۔

یہ خیالات ظفر کے دماغ میں ساکن فلمی ریل کیطرح دوڑتے ہوئے معلوم ہوئے۔ وہ پریشان ہو گیا اور دل بہلانے کی غرض سے دفتر کے کمپاؤنڈ میں آ کر اضطرابی حالت میں ادھر ادھر ٹہلنے لگا۔ دفتر کا احاطہ پودوں، بیلوں، درختوں اور کیاریوں سے بھرا ہوا ایک بہت بڑے حلقہ میں آراستہ و پیراستہ تھا، وہ روشوں کے درمیان گردن جھکائے آہستہ آہستہ قدم رکھتا ہوا ٹہل رہا تھا۔ دھوپ سے بچنے کے لئے اس نے اپنا بوسیدہ ہیٹ سر پر رکھ لیا اور دونوں ہاتھ پشت پر ڈال لئے۔

شہر کی ہنگامہ خیزی پر مئی کی تپتی ہوئی دوپہر نے تھوڑا بہت اثر ضرور کیا تھا۔ پھر بھی موٹریں اور وکٹوریہ،

ٹریاں اور بسیں اسی تعداد میں سڑکوں پر تیرتی ہوئی دکھائی دے رہی تھیں۔ یکایک ظفر کے تخیلات کو لاری پر جاتے ہوئے ایک مجمع کے فلک شگاف نعروں نے منتشر کر دیا۔ انہیں سے ایک کے ہاتھ میں کانگریس کا سہ رنگا قومی جھنڈا تھا جو فضا میں لہرا رہا تھا اور لاری کے وسطی حصہ میں ایک چوبی مجسمہ تھا جو کسی قوم پرست انگریز سے مشابہ تھا۔ یہ لوگ بڑے افتخار کے ساتھ "ہندوستان آزاد کرو ——— شہنشاہیت مردہ باد ——— ڈاؤن[۱] وِدھ ڈیماکریسی ——— قسم کے نعرے لگاتے ہوئے چلے جا رہے تھے۔ ان کے دل آزادی کی تڑپ اور جذبہ حب الوطنی سے اس درجہ معمور تھے کہ ان پر دوپہر کی جھلجلاتی ہوئی دھوپ کا کوئی اثر نہیں معلوم ہوتا تھا۔

ظفر نے ان پر سے اپنی نفرت بھری نظریں ہٹا کر کمپاؤنڈ کے سبز مخملی فرش پر گاڑ دیں اور اپنے کوٹ کی اندرونی جیب ٹٹولی۔ ڈیڑھ بج جانے کی وجہ سے اسے شدت سے بھوک لگ رہی تھی۔ ناشتہ کا ذکر کیا! اس نے آج صبح چائے تک نہ پی تھی۔ اسے یقین تھا کہ اس کی جیب خالی ہوگی، مگر اس کے تعجب کی انتہا نہ رہی جب اس کی انگلیوں نے جیب کے ایک گوشہ میں کوئی ننھی سی سخت چیز محسوس کی۔ اس نے اسے باہر نکالا۔ چونی؟ وہ حیرت زدہ ہوکر زیر لب بڑبڑایا، ساتھ ہی تیز قدم اٹھاتا ہوا کمپاؤنڈ سے متصل شان اسلام ریسٹوران کی طرف چل دیا۔

راستہ بھر غور کرنے کے باوجود وہ چونی کی موجودگی کے عقدہ لاینحل کو نہ سمجھ سکا اور بالآخر اسے قدرتِ کبریائی کا کرشمہ سمجھ کر کھانے کی میز پر بیٹھ گیا۔

ظفر کھانے پر اس گدھ کی طرح ٹوٹا ہوا تھا جو کئی پہر مسلسل فضا میں بھوکا پرواز کرنے کے بعد لب ساحل کسی لاش کو دیکھ کر بے تحاشا اتر کر اس پر ٹوٹ پڑے۔

کھانے سے فارغ ہوکر اس نے چائے منگوائی اور آہستہ آہستہ چسکیاں لیتا ہوا دوسری میز پر پڑے ہوئے روزنامہ کو اٹھا کر دیکھنے لگا۔

"عوام کو تعلیم دینا اشد ضروری ہے" سر پرشوتم داس ٹریکم داس کی یوتھ پارلیمنٹ میں تقریر۔ "مولاوا میں فرقہ وارانہ فساد - تین سو افراد زخمی اور ساٹھ ہلاک ......" "ہندو لیگ کی مجلس عاملہ کا اجلاس۔ پاکستان اسکیم کے خلاف زبردست محاذ کا قیام ......" "جمہوریت اور آزادی کے نام گاندھی جی کی ہریجن میں اپیل۔ ہمارا مقصدِ حیات خطرہ میں ہے۔ حریت کو زندہ رکھیئے" ...... "قتل کرنے کے بعد لاش کی بوٹیاں اڑا دیں" ...... "بے روزگاری کے دفعیہ پر غور و خوض" ...... "سر تصدق بھائی بیرنٹ کا مستحسن اقدام ......"

ظفر نے غصے سے بے قابو ہو کر اخبار پھینک دیا۔ اس کا سر چکرانے لگا تھا۔ "عوام کو تعلیم اشد ضروری ہے۔ ہنھ! تاکہ خواندہ بے روزگاروں کی تعداد میں خاطر خواہ اضافہ ہو۔ اور جب کرسی پر حافظ ہوکر گڑگڑائے تو قومی تحریک یا دیہات سدھار کا بہانہ کر کے ٹال دیا جائے ...... بے روزگاری کے دفعیہ پر غور و خوض ...... سر تصدق بھائی کا مستحسن اقدام ...... اگلے ماہ سنٹرل اسمبلی کے الکشن میں کامیاب ہونے کا حربہ ...... دھوکہ، فریب، " ظفر بڑبڑاتا ہوا اٹھ پڑا۔

دو بج رہے تھے، صاحب بہادر کے آنے کا وقت ہو چکا تھا اسلئے وہ بھی وہاں سے مختلف خیالات کو دماغ کے گوشہ میں لئے ہوئے چل پڑا۔ رسٹوران کے دروازہ پر کھڑی ہوئی ایک جوان بھکارن نے پیسہ طلب کیا۔ اس کی آغوش میں

[۱] Down with Democracy

اور ارد گرد تقریباً کئی گورے - معصوم، بدصورت، لنگڑے اور بھینگے لڑکے اور لڑکیاں جمع تھے جو ماں سے بھیک مانگنے کا سبق سیکھ رہے تھے۔ پاس ہی ایک بڑی مونچھوں کا "کھو رہے والا" پان کی، دوکان پر کھڑا جوان بھکارن کو لالچی نظروں سے دیکھ رہا تھا، ظفر آگے بڑھا۔ کبھی اسکا خیال وسیع ہوکر سارے ملک کے بیروزگاروں اور مصیبت زدوں کے لئے ہمدردانہ جذبات سے معمور ہوجاتا۔ کبھی سمٹ کر انفرادی کشمکش میں مبتلا ہوجاتا، اور آخر ادھیڑبن میں گرفتار وہ دفتر میں داخل ہوکر اس جگہ پہنچ گیا جہاں وہ پہلے کھڑا ہوا تھا۔

صاحب اسکے دفتر میں پہنچ جانے کے تھوڑی ہی دیر بعد تشریف لائے، انکے انداز رفتار میں ہزاروں غم نصیبوں کی آرزوؤں اور تمناؤں کو کچلنے کا ولولہ تھا اور انکے سنجیدہ اور متین چہرے کے چڑھاؤ و اتار میں سینکڑوں بیروزگاروں کی روٹی کا انحصار !!

اس مرتبہ بھی ظفر نے صاحب کو اس انداز سے جھک کر سلام کیا جیسے وہ گڑگڑا کر ان سے نوکری کی بھیک مانگ رہا ہو۔ صاحب نے خدا ترسی سے اپنے کمرے میں داخل ہوتے ہی پہلے اسے بلوایا اور رسمی گفتگو کے بعد اپنے نائب کو بلا کر انگریزی میں حکم دیا کہ ظفر سے کمپنی کا فارم بھروالیا جائے اور جب جگہ خالی ہو تو بلا کر اس کا تقرر کردیا جائے ...... اور اپنی مادری زبان میں اس سے کہا کہ اسکے ساتھ بھی ویسا ہی سلوک کرنا جس کی تمکو ہدایت کیگئی ہے ہمیشہ یاد رکھو کہ ہم پارسی ہیں اور ہمیں پہلے اپنی قوم کے اُن اٹھارہ ہزار افراد کو روزی میں لگانا ہے جو کانگریسی صوبائی حکومت کے مظالم سے "امتناع مسکرات" کے شکار ہوئے ہیں "

ظفر نے بددلی سے فارم بھر دیا اور واپس چلا آیا۔

دوسرے دن وہ رکروٹنگ افسر کے ہاں پہونچکر فوج میں بھرتی ہوا، اور اب وہ اپنی بے روزگاری دُور کرچکا تھا!

سیّد اخلاق حسین رضوی

"برسات میں موہنی سی"

(از جناب عنایت الرحمن صاحب عنایت پھپھرا وی)

برسائے آگ بادل دِل پر بغیر تیرے
برسات کی گھٹائیں کیا کیا رُلا رہی ہیں
فرقت میں رو رہا ہوں بجلی چمک چمک کر
بادل برس برس کر کھل کھل گئے ہیں لیکن
فرقت کی اشک باری دلکو بٹھا ہی دیگی
او مستِ ناز ساقی دِل تجھکو ڈھونڈھتا ہے
آنکھوں سے تار بارش یا دم بدم ہی دِل میں
او یاد آنیوالے، او بھول جانیوالے
او موہنی عنایت موہن ترا تھا کل تک،

بجلی جلائے جی پر خنجر بغیر تیرے
چھلکا رہا ہوں دل کا ساغر بغیر تیرے
کیا کیا نہ ہنس رہی ہے مجھ پر بغیر تیرے
آنکھیں مری ابھی تک ہیں تر بغیر تیرے
برسات میں گریگا یہ گھر بغیر تیرے
بے کیف ہورہا ہے ساغر بغیر تیرے
رگ رگ میں چبھ رہے ہیں نشتر بغیر تیرے
بجلی کیطرح دل ہے مضطر بغیر تیرے
برسات میں جیئے گا کیونکر بغیر تیرے

مصحفی کی دو نادر اور نایاب مثنویاں

اگرچہ میں بذاتِ خود اب تک تحقیق نہیں کرسکا کہ مصحفی کی مثنویاں کتنی ہیں کس کس موضوع پر ہیں اور کب اُنہوں نے لکھی ہیں مگر محترمی مولوی امیر احمد صاحب علوی کاکوروی نے کسی اعتبار کی بنا پر مصحفی کی حیات پر روشنی ڈالتے ہوئے نگار مصحفی نمبر ۱۹۳۹ء کے صفحہ ۶ سطر ۱۴ میں تحریر فرمایا ہے کہ مصحفی کی چھوٹی بڑی بیس مثنویاں ہیں، جس میں سے بحر المحبت مثنوی دریائے عشق میر کا جواب ہے۔ مجھے فخر ہے کہ اگر یہ تحقیق درست ہے تو علاوہ اُن دو مثنویوں کے جو بحر المحبت اور شعلۂ عشق کے نام سے موسوم ہیں اور جنہیں مولوی عبد الماجد دریابادی اور مولانا حسرت و مولانا آفق امروہوی نے شایع بھی کرا دیا ہے یا گلزارِ شہادت جس کا کسی رسالہ میں شایع ہونا بتایا گیا ہے۔ اُن کی چھ مثنویاں غریب خانۂ مصحفی[1] جس میں اُن کے گھر کا حال ہے۔ کھٹمل نامہ[2] جس میں کھٹملوں کے جور و ستم کی روداد ہے۔ سردی نامہ[3] جس میں سردی کی افراط کی کیفیت ہے۔ تابستان[4] جس میں گرمی، لُو، دھوپ کی شدت کا حال ہے۔ بیانِ آتش زدگی[5] جس میں آگ لگنے کی کیفیت ہے۔ ہجو مودی خانہ[6] جو مودی خانہ کی زبونی اور بدانتظامی کا کچا چٹھا ہے۔ میں طبع کرا چکا ہوں اور یہ بھی سب نگار سنہ ۳۹ء مصحفی نمبر میں چھپ چکی ہیں۔

ایک اور مثنوی در صفت طفلِ حجام بھی تذکرہ میر حسن میں اقتباس کے طور پر درج ہوئی ہے، اس حساب سے اب تک دس[5] مثنویاں شایع ہو چکی ہیں۔ مولوی امیر احمد صاحب نے یہ بھی فرمایا ہے کہ مخطوطات حسرت میں ایک مثنوی نانخواہ ہے۔ مگر وہ کسی دوسری جگہ راقم کی نظر سے نہیں گذری۔ آج اُس مثنوی کو بھی شایع کرنے کی نوبت آگئی۔ میرے پاس مصحفی کے تین دیوان قلمی موجود ہیں، منجملہ اُن تینوں دیوانوں کے ایک دیوان ہے کہ جس کا پہلا شعر یہ ہے۔ ؎

لگے گر ہاتھ میرے تار اس زلفِ معنبر کا
تو ہووے باعثِ شیرازہ ان اجزائے ابتر کا

مولوی امیر احمد صاحب نے لکھا ہے کہ کتب خانہ رام پور کے دیوان دوم مخطوطہ مورخہ سنہ ۱۲۱۱ھ کے اول میں یہی شعر ہے، اور آخری غزل کا مقطع یہ ہے:۔ ؎

اے مصحفی بوسہ کا سائل تو میں ہوں لیکن
یہ ڈر ہے وہ گالی تو مجھ کو نہ سُنا بیٹھے

مگر یہ عجیب واقعہ ہے کہ میرے یہاں اس دیوان میں اوّل میں تو یہ غزل ضرور ہے، مگر آخر غزل کا مقطع یہ ہے:۔ ؎

پھرتا ہے تو جو گلیوں کے اندر خراب و خوار
اے مصحفی یہ کس کی تجھے بددعا لگی

بلکہ دیوان دوم جس کی ایک غزل کا یہ مقطع ہے

[5] یعنی سات مثنویاں شایع کردہ مولانا آسی صاحب اور بحر المحبت[1]۔ شعلۂ عشق[2]۔ گلزار شہادت[3] (ادارہ)

مدّت ہوئی کہ ایک تو دیواں میں کہہ چکا　　اے مصحفی ہوا ہے یہ دیوان دوسرا

کے اوّل میں یہ غزل ہے :-

سایہ میں زلفوں کے چھپا رکھا　　چتون کی دکھا خوبی سُرمہ کو لگا رکھا

اور غزل آخر کا یہ مطلع ہے :-

کوئی ایسا نہیں ملتا کہ ہمکو ہم سے لیجاوے　　دکھا دے اور عالم اور اس عالم سے لیجاوے

اس اختلاف سے وہی ایک بدیہی بات معلوم ہوتی ہے کہ اُن کے دواوین کی ترتیب صحیح اور یکساں طور پر نہیں ہوئی۔ اور جہاں جس نے جیسا پایا لکھ لیا۔ اسی بنا پر میں یہ کہہ سکتا ہوں کہ مندرجہ بالا دیوان جو میرے پاس ہے اور جس کا مطلع اوّل رامپور کے دیوان دوم کے مطابق ہے۔ دیوان دوم نہیں ہے بلکہ اور کوئی دیوان ہے۔ جس کو صحیح طور پر میں ابھی معلوم نہیں کر سکا۔ کیونکہ اس دیوان کے آخر یا اول میں نہ کتابت کی کوئی تاریخ ہے اور نہ یہ کہ کون سا دیوان ہے۔ میں نے اس کو ردیف نون کے وسط تک باستیعاب پڑھا، مگر اس سے بھی کوئی پتہ نہ چلا۔ البتہ صورتِ دیوان سے یہ معلوم ہوتا ہے کہ یہ بہت قدیم ہے۔ اس کی لوح قدیم وضع کی زرافشاں ہے۔ اور آخر میں وفات مصحفی کے متعلق ایک قطعہ بھی پایا جاتا ہے جو درج ذیل ہے:

چو آں مصحفی نظیریِ عہد　　ز دنیا بدار السّلام آمدہ　　بچشم ترم در غمِ یاد اُو　　سحر تیرہ ہم رنگِ شام آمدہ
تخلص ازاں مصحفی یافتہ　　کہ مصحف بخط خوش کلام آمدہ　　بہ ہندی و ہم فارسی دری　　املٔے باعجازِ تام آمدہ
زہمنامیش با کلامِ مجید　　بہ خلد بریں شاد کام آمدہ　　نشانِ نجا تش چہ کم باشد ایں　　کہ آتش بہ مصحف حرام آمدہ
بجو لانگہ فکرِ تاریخ اُو　　سمندِ خرد خوش خرام آمدہ　　ہمیں مصرع ۔ آمد بدل　　کہ آتش بہ مصحف حرام آمدہ

اس دیوان پر مرزا محمد تقی خاں لکھا ہوا ہے۔ یہ غالباً مرزا محمد تقی خاں ہوس مصنف لیلےٰ مجنوں ہیں۔ اس دیوان میں مصحفی کی رباعیوں کے علاوہ دو مثنویاں بھی پائی جاتی ہیں، ایک تو وہی مثنوی ناگخواہ ہے جو مولوی امیر احمد صاحب کو مطبوعات حسرت کے سوا اور کہیں نہیں مل سکی، دوسری ایک مثنوی ہے جس کا ذکر اس وقت تک کہیں نہیں سُنا گیا۔ اور دوسرے کسی دیوان میں میری نگاہ سے بھی نہیں گزری، اس مثنوی کا نام جوہری بچہ معروف بہ "جذبۂ عشق" یا جذبۂ عشق معروف بہ "جوہری بچہ" ہے جس میں دو سو ستاون شعر ہیں، اور جہاں تک میرا خیال ہے بحر المحبت کے بعد اُن کی تمام تر مثنویوں سے زیادہ بڑی، زیادہ دلچسپ زیادہ صنایع و بدایع لفظی و معنوی پر مشتمل ہے۔ اگرچہ مصنف نے یہ خیال نہیں کیا کہ مثنوی کے لئے جہاں اور کئی باتیں ضروری ہیں وہاں قصّے کی دلچسپی بھی ضروری ہے خواہ وہ کسی صورت سے پیدا کیجائے۔ مگر اس میں یہ صرف اتنی سی بات ہے کہ ایک جوہری بچہ تھا جو اپنی بیوی کا عاشق زار تھا۔ وہ بیمار ہو کر مر گئی، تو یہ بھی دفعتہً مر گیا۔ بس انہی چار فقروں میں یہ داستان تمام ہو جاتی ہے۔ مگر اس اختصار میں بھی جہاں جہاں شاعرانہ زور آوری کی ضرورت تھی وہاں اُن کا دماغ معطل نہیں رہا۔ چنانچہ ابتدائی تمہیدی عشق کا بیان چھتیس شعروں میں پھیلا ہوا ہے۔ اسی طرح ہر ایک مقام کو نہایت شرح و بسط کے ساتھ پیش کیا ہے جسکی

وجہ سے مصحفی کی قوت شاعری اور قدرت بیان کا صحیح اندازہ ہوتا ہے، اور اسی طرح صاف صاف یہ بھی معلوم ہو جاتا ہے کہ وہ مختلف رسوم و عادات سے کتنے واقف تھے، چنانچہ جب وہ ارتھی کے اٹھنے کا سماں دکھاتے ہیں تو بتلاتے ہیں کہ قوم کے چھوٹے بڑے دروازے پر جمع ہوئے ارتھی اٹھی تو اسمیں کلاوے اور پان کا بھی ذکر کر دیتے ہیں، یا جب مرگھٹ میں ارتھی کو لیکر گئے ہیں تو وہاں اسوجہ سے کہ اہل ہنود میں مردے کو دو مرتبہ غسل دیتے ہیں۔ ایک جب ارتھی تیار کیجاتی ہے اور ایک جب کہ ارتھی مرگھٹ میں پہنچتی ہے اسی لیئے جمنا میں غوطہ دینے کا ذکر کیا گیا ہے۔ یہی چیز ہے جو مشاہدۂ شاعر میں آتی ہے۔ اور اسکے بغیر کسی شاعر کی قوتِ بیان میں جان اور کلام میں زور نہیں پیدا ہو سکتا۔

میرا یہ خیال ہی کہ مصحفی نے یہ مثنوی میر کی کسی مثنوی کے جواب میں کہی ہے۔ اور چونکہ معاملاتِ عشق میں میر صاحب نے بھی عشق کی طرفہ کاریوں کا بڑے زور کے ساتھ ذکر کیا ہے، اسی طرح مصحفی کی مثنوی کا بھی اٹھان ہے۔ مگر آگے بڑھ کر فرق ہو گیا ہے مصحفی جگ بیتی بات کہہ رہے ہیں۔ اور میر صاحب اپنی بیتی۔ اور بقول شخصے شنیدہ اور دیدہ میں بڑی زبردست مسافت ہے اسلیئے میر بہت زیادہ کامیاب ہیں۔ مگر مصحفی نے اس کمی کو اپنی قوت بیان سے پورا کرنا چاہا ہے۔ یا پھر اگر اس مثنوی کو دیکھ کر انہوں نے یہ داستان نظم کی ہے تو انہیں کی دوسری مثنویوں کی لَے میں یہ راگ گایا گیا ہے۔ اصل یہ ہی کہ اس قسم کی مثنویاں اس وقت میں اکثر کہی گئی ہیں۔ سوداؔ، قائمؔ وغیرہ کے یہاں بھی اس قسم کی مثنویاں موجود ہیں۔ مگر اتنا ضرور ہوا ہے کہ ان سب لوگوں نے مثنوی میں دلچسپی کے خیال کو زیادہ مدنظر رکھا ہے، اور اپنی قدرتِ بیان کے ساتھ ساتھ کسی حیرت ناک واقعے کو شامل کر کے مثنوی کا صحیح مقصد پورا کر دیا ہی مصحفی اس بارہ میں ناکام رہے، اور جہاں تک میں اندازہ کر سکا ہوں یہ دلچسپ نہیں ہو سکی۔ پھر بھی وہ دوسرے لوگوں سے کم نہیں رہے۔ بلکہ جہاں تک ہو سکا وہ قدم بہ قدم گئے۔

یہ میں پہلے ہی لکھ چکا ہوں کہ مصحفی کی اس مثنوی کا نہ میں نے پہلے نام سنا اور نہ کہیں اس کا ذکر آیا۔ بلکہ مصحفی کے اور کئی دیوان دیکھے مگر یہ مثنوی کہیں نہیں پائی، اس کے بعد مثنوی نانخواہ بھی ملاحظہ ہو۔ یہ مثنوی زیادہ تر مزاحیہ رنگ میں معلوم ہوتی ہے، مگر دراصل ایسا نہیں ہے، مجھے بڑی خصوصیت سے اُن لوگوں سے کچھ عرض کرنا ہے جو فرمایا کرتے ہیں کہ اردو میں ایسی نظمیں نہیں تھیں جو نیچرل ہوں، اس کا اس دَور ترقی میں اضافہ ہوا۔ وہ لوگ آنکھیں کھولیں اور دیکھیں کہ اردو میں متقدمین نے کیا کچھ نہیں لکھا۔ مگر آپ کو بدگمانی پیدا ہو گئی ہے اور کبھی اُن کے کارناموں پر منصفانہ اور غائرانہ نظر ڈالنے کا اتفاق ہی نہیں ہوتا۔ ورنہ ایسی ایسی چیزیں ہزاروں کی تعداد میں موجود ہیں جو مثنویوں، نظموں اور دیگر اصنافِ سخن میں موجود ہیں۔

میں نہیں جانتا کہ مصحفی کو کونسی ضرورت پیش آئی کہ انہوں نے "نانخواہ" پر مثنوی لکھی، مگر یہ ضرور کہونگا کہ ایک معمولی چیز "اجوائن" پر اتنے شعر کہہ لینا کوئی آسان بات نہیں ہے۔ اور پھر ان میں شاعرانہ اندازِ بیان کا پایا جانا اور بھی کمال ہی۔ مثنوی آپکے پیش نظر ہے ملاحظہ فرمایئے۔ مجھے تو یہ خوشی ہی کہ میں ایسی چیز پیش کر رہا ہوں جس سے نقاد بھی بے خبر تھے۔ حالات تو کجا، نام بھی معلوم نہ تھا، اور اس لیئے وجود میں بھی ایک دھوکا ہی دھوکا معلوم ہوتا تھا۔ یہ خدمت شاید کم نہ ٹھیریگی کہ ایک مایۂ ناز اور مشہور

شاعر کے گم شدہ جواہر افکار اہلِ ذوق کے سامنے پیش کئے جاتے ہیں۔ اور اسی کے ساتھ ندیم کو بھی خوش نصیب کہونگا کہ سب سے پہلی مرتبہ یہ چیز اسی کے صفحات کے ذریعے سے لوگوں کے سامنے پہونچے گی۔

(عبدالباری آسی)

مثنوی جوہری بچہ

عشق ہے جوہرِ محیطِ جہاں　　عشق ہے جسمِ آدمی میں جاں
عشق ہے کائنات کا مفہوم　　گر نہ ہو عشق تو ہیں سب معدوم

عشق ہے شمعِ انجمن افروز　　عشق سے ہے یہ گرمیٔ شب و روز
عشق سے ہے زمین کا کوہاں　　تا قیامت بہ زیرِ بارِ گراں

عشق سے کوہ پائے بر جا ہے　　عشق سے اضطرابِ دریا ہے
عشق سے آسماں ہے سرگرداں　　عشق سے ہے یہ گردشِ دوراں

عشق سے ہے سرِ فلک پر شور　　عشق سے جن و انس کا ہے ظہور
عشق سے ہے دوام عالم کا　　عشق سے ہے نظام عالم کا

عشق ہے باعثِ قوامِ جہاں　　عشق ہے چاشنیٔ شیرۂ جاں
عشق سے آبِ بحر جاری ہے　　عشق طوفانِ بیقراری ہے

عشق کی ہر جگہ ہے شان نئی　　عشق رکھتا ہے آن بان نئی
عشق ہے آشنائے خستہ دلاں　　عشق ہے مدّعائے خستہ دلاں

عشق سے ہے محبتِ زن و مرد　　عشق ہے درمیاں میں جوہرِ فرد
عشق سے دل میں درد ہوتا ہے　　عشق خود آہِ سرد بھرتا ہے

عشق سے سینہ چاک ہے گُلِ صبح　　عشق سے ہے فغانِ بلبلِ صبح
عشق سے ہے فروغ لالۂ باغ　　عشق سے سینۂ چمن ہے داغ

عشق سے یار ہووے بیگانا　　عشق ہر شمع کا ہے پروانا
عشق سے آشنا نگاہ ہوئی　　عشق سے دلکو دلمیں راہ ہوئی

عشق سے کافر آکے ہو دیندار　　عشق سے پہنے اہلِ دیں زنّار
عشق سے دیدہ ہو تماشائی　　عشق سے جاوے عقل و دانائی

عشق سے خونِ مردہ کھاوے جوش　　عشق سے ہوشیار ہو بے ہوش
عشق میں گبر بھی مسلماں ہے　　عشق عاشق کا دین و ایماں ہے

عشق ہے وہ بلائے خانہ خراب　　جس سے طاقت کا زہرہ ہووے آب
عشق وہ زخمِ تیغِ خوش خم ہے　　جسکا الماس سودہ مرہم ہے

عشق سے ہے نظارۂ در و بام　　عشق سے عہدِ صبح و وعدۂ شام
عشق سے ذوق کوچہ گردی ہے　　عاشقی زورِ بامردی ہے

گرچہ جلادِ عشق ہے سفاک　　قابلِ عشق کب ہے ہر ناپاک
عشق کب لب کی تیغ مارے ہے　　عشق عاشق کا سر اُتارے ہے

عشق میں مرد سر لگاتے ہیں　　عشق میں جی پہ کھیل جاتے ہیں
شمع کا کب گداز خس جانے　　وزرِ پروانہ کیا مگس جانے

عشق سے قیس سر پٹک کے مُوا　　عشق سے کوہکن کا خون ہوا
عشق گر جی کسی کا لیتا ہے　　اُس کو پھر جان تازہ دیتا ہے

عشق ہے جانِ طالب و مطلوب　　عشق ہے جذبِ جاذب و مجذوب
عشق کے جذب ہیں بچندیں طور　　وہی سمجھے جو دیکھے کرکے غور

نہ فقط خس کو اینچ لیتا ہے　　عشق لوہے کو کھینچ لیتا ہے
بر سرِ مطلب اب میں آتا ہوں　　عشق کا جاذبہ سُناتا ہوں

خاکِ دہلی میں اک جوانِ حسیں　　صاحبِ وضع صاحبِ تمکیں
تھا شکارِ خدنگ کاریٔ عشق　　دل میں رکھتا تھا بیقراریٔ عشق

رات دن اشک جاری رہتے تھے　　اُسکی چشموں سے چشمے بہتے تھے
دلمیں رکھتا تھا بسکہ پنہاں درد　　گلِ سا رخ اُس کا ہوگیا تھا زرد

گریہ تھا جوہری وہ پاک نژاد — عشق تھا اُس میں جوہر فولاد
عاشق زار اپنی زن پہ تھا — بلبل اس خانگی چمن پہ تھا

نہ وہ زن تھی رقم جواہر کی — کیا کروں وصف حسن و زیور کی
حسن ایسا کہ کہئے لعبت چیں — نور ایسا کہ جو نہ ہووے کہیں

سطح سینہ تھا مثل آب تنک — چھاتیاں اُسمیں وہ حباب تنک
رنگ کندن تھا جو دمکتا تھا — جس میں جوبن پڑا چھلکتا تھا

دی تھی یہ نازکی نے اسکو بہار — جس سے ہر عضو اُس کا تھا گلزار
پنجہ مرجاں سے باج لیتا تھا — گل سے عارض خراج لیتا تھا

کیا کہوں غبغب اور گلو کی صفا — جس کا روکش نہ تھا ید بیضا
بسکہ ساعد میں تھی صفائے بلور — باج دیتے تھے جسکو ساعد حور

دیکھ کافر کی شوخیٔ رفتار — دنگ رہتے تھے مردم بازار
اُس چتون کی وہ نگاہ تھی قہر — جسکو کرتا سلام سارا شہر

تسپہ وہ برچھیاں نگاہیں تھیں — جس سے مژگاں تمام آہیں تھیں
تھی وہ اس خوبی و صفا کیساتھ — ہوتی میلی نظر سے جسکی گات

دیکھ اُس کے وہ گوہر دنداں — تھا بہت اپنے کام میں حیراں
جا کے بیٹھی تھی لعل سے لب پر — لعل سے اُٹھ گئی تھی اُسکی نظر

گھر سے بازار تک اگر جاتا — دو قدم چل کے وہیں پھر آتا
اُس کو بن دیکھے رہ نہ سکتا تھا — رات دن اُس کے منہ کو تکتا تھا

دل نہ لگتا تھا جب کہ اور کہیں — قبلہ کرتا تھا اُس صنم کے تئیں
گاہ پاؤں پہ سر کو رکھ دیتا — گاہ چپ چپ بلائیں ہی لیتا

گاہ جاتا لپٹ گلے سے وہیں — چومتا گہ لب اور گاہ جبیں
گہ جھٹک ہاتھ کو ہٹا دیتا — گہ لپٹ کر اُسے لٹا دیتا

گاہ کرتا وہ جو کہ ہے دستور — چومتا گاہ نرگس مخمور
گاہ اُس لب سے بوسہ پاتا تھا — گاہ دشنام تلخ کھاتا تھا

دل سے کاڑھے تھا اپنے عشق کا سوز — اس طرح محو حسن تھا شب و روز
عشق کی طبع میں مدارا نہیں — گالی کیا دھولی بھی گوارا نہیں؟

عرصہ کرتا تھا بسکہ اس پہ تنگ — دیکھ زن اُسکی چاہتوں کے رنگ
گاہ ناخوش تو گاہ خوش ہوتی — گاہ ہنستی تو گاہ پھر روتی

اُس سے کہتی کہ کیا بلا ہے تو — کیوں بلا سا مجھے لگا ہے تو
جوں جوں اس سے لگا چلا جاتا — وصل میں ہجر کا مزا پاتا

بحر اُلفت میں تھا جو یکسر غرق — وصل اور ہجر میں نہ پاتا فرق
وصل میں اُس پہ جو گھڑی گزری — ساعت ہجر سے کڑی گزری

مثل ماہی کے گرچہ تھا تہ آب — پر نہ تھا اُس کی تشنگی کا حساب
دن بدن چاہ بڑھتی جاتی تھی — مرگ دیکھ اُس کو مسکراتی تھی

لیک فارغ ز فتنہ سازی چرخ — غافل از کار حیلہ بازی چرخ
عیش و عشرت میں پاکے اُنکے تئیں — کیا دونوں پہ چشم بد نے کہیں

یوں جدائی اگر نہ ٹھیرائی — سبب ہجر موت ہو آئی

زوجۂ جوہری تھی نرم اندام — پنبہ لیتی تھی اس سے نرمی وام
گر ہوا اس بدن سے لگ جاتی — برگ گل کی طرح وہ تھرّاتی

کبھی گر چلتی جوں نسیم بہار — پتہ پا اُس کے سبزہ تھا سر خار
اُس نے جب خوب سا فشار دیا — اُس نے گرمی میں آ بخار کیا

لب پہ تبخالے یوں ہوئے اسدم — جس طرح برگ گل پہ ہو شبنم
وہیں کملا گئی وہ جیسے پھول — گئی کمھلا کے اپنی سدھ بدھ بھول

حال اپنا سبھوں کو دکھلا کر — بستر عشق پر پڑی جا کر
چشم بیمار اُس کی ہو کے نزار — بن گئی رشک نرگس بیمار

حلقے آنکھوں کے سب نکل آئے — دیدے کچھ بے خطا نکل آئے
رنگ ہلدی سا ہو گیا پیلا — چہرہ آنے لگا نظر نیلا

گل عارض پہ پھر گئی سبزی — دہر الفت نے یہ سرایت کی
اُس کی ماں بہنیں اور ہمسائے — دیکھ کر اُس کو سخت گھبرائے

کوئی بولی ہے اس کو درد جگر — کوئی بولی اسے لگی ہے نظر
کوئی بولی کہ اس کو سکتہ ہوا — کوئی بولی کسی نے سحر کیا
کوئی بولی کھڑی تھی کوٹھے پر — پڑ گئی ہے کسی کی اسپہ نظر
کوئی بولی پری کے سائے تلے — آ گئی ہے کہیں یہ بال کھلے
کوئی بولی بلاؤ سیانے کو — کوئی بولی اسے فلیتہ دو
کوئی بولی کہ دور ہی جاؤ — مرچیں جا کر کہیں پڑھا لاؤ
کوئی بولی کہ صدقہ دو فی الحال — کوئی بولی دکھاؤ جا کر فال
کوئی بولی کہ بید کو لاؤ — اسکی ناڑی تو اس کو دکھلاؤ
الغرض تھی بہت یہ ہانک پکار — نہ کھلے تھا کسی پہ یہ اسرار
کہ یہ نازک بدن جو کمھلائی — یاں یہ یک اسپہ کیا بلا آئی
بسکہ ہے نت مزاج حسن غیور — نہیں راضی بہ یک نظارۂ دور
نہ کہ یہ اختلاط پنہاں ہو — یکدگر دامن و گریباں ہو
وہ جو خاقت ہیں ان میں نرم اندام — جام صحبت سے کم ہیں ہے آشام
دیکھ شوہر نے اس کا حال زبوں — کیا آنکھوں کو غرق لجۂ خوں
جو دوائی کسی نے بتلائی — وہیں بازار سے وہ منگوائی
فال جا کر کہیں دکھاتا تھا — نقش لکھوا کہیں سے لاتا تھا
کبھی باہمن سے پوچھتا کہ یہ ماہ — آ گیا کیوں کسوف میں ناگاہ
کبھو رمال کے کنے جاتا — اس سے ہر بار قرعہ پھکواتا
کبھی جوگی جو کوئی پاتا تھا — گھر میں لا کر اسے دکھاتا تھا
بہر تیمار آں مہ دلکش — تھی بہت اس کی کہربا آتش
الغرض جو جتن تھے سب وہ کئے — لیک بیمار مرگ کیونکہ بچے
بعد یک چند وہ زن بیمار — اسی حالت میں مر گئی اکبار
طائر روح کر گیا پرواز — ہو گیا صعوہ صید چنگل باز
صرصر مرگ ناگہاں آئی — چمن حسن میں خزاں آئی
چہرہ اسکا جو رنگ میں تھا ورد — ہو گیا برمثال لالہ زرد
لعل لب تھے جو شکل لعل مذاب — جوں در مردہ ہو گئے بے آب
دست رنگیں جو اسکا تھا دلکش — دی لگا اس نے اور ہی آتش
در دنداں میں وہ صفا نہ رہی — چشم و ابرو کی وہ ادا نہ رہی
ہو گئی چشم سے نظر رخصت — چھا گئی اس میں صورت حیرت
کر کے پابوس اٹھ گئی رفتار — ہاتھ ہلنے سے رہ گئے اکبار
بن گئی بعد اس کی صورت آہ — ہو گیا روز زلف کا بھی سیاہ
غنچے فندق کے تھے سو مرجھائے — پھول رنگ حنا کے کمھلائے
گات میں اسکی وہ نہ لوچ رہا — نور مہ دیکھ اسکو سوچ رہا
اور سے اور ہو گئی صورت — بن گئی جیسے کاٹ کی مورت
دیکھ یہ شکل اس کی آخر کار — تھی عروسی جو اسکی ہار سنگار
سن کے فریاد و گریہ و زاری — صرف ماتم ہوئی بہ یکباری
بن گئی میل سرمہ صورت آہ — ہو گیا سرمہ وہاں کا روز سیاہ
سر پہ مسی نے اپنی ڈالی خاک — برگ پاں نے کیا گریباں چاک
——— طلائی ٹوٹ — لی دہیں ——نے چھاتی کوٹ
——— س اتار — چشم حیراں بنی تھی نرگس وار
گو نجے سے کھل کے دل پہ نقش الم — نتھ کا حلقہ تھا حلقۂ ماتم
تھے کرن پھول وہ جو مثل چراغ — غم فرقت میں ہو گئے تھے داغ
جھومکے وہ جو جگمگاتے تھے — سر افسوس کو ہلاتے تھے
یک طرف دست بند بازوبند — حلقہ غم میں تھی اسیر کمند
یک طرف کانوں کی وہ جو دانی — پڑی آٹھ آٹھ آنسو روتی تھی
آنکھیں چھلوں کی بھر بھر آتی تھیں — دل پہ بانکوں نے بانکیں کھائی تھیں
انگلیاں ہو گئی تھیں یوں عریاں — جیسے شاخیں گلوں کی فصل خزاں
وہ جو جھومر تھا زیور اک سر راج — سر بسر لٹ گیا تھا اسکا راج
دیکھ چمپا کلی کو خوش رونی — سر پٹکتے تھے مانگ کے موتی
تھا جو تعویذ سر کے بالوں پر — کسی کونے پڑا تھا خستہ جگر
چاند رہتا تھا وہ جو زیب جبیں — نخل ماتم بنا تھا ہو کے حزیں
آرسی تھی جو رونق ابہام — بن گئی تھی وہ غم سے داغ تمام

جگنی جگنو سی جو چمکتی تھی   اشکِ خونناب ہو ٹپکتی تھی
جوڑی اک اور تھی۔ دھانی   دست ______
تسبیہ انوٹ کا تھا جو حالِ زبوں   ہوگیا تھا برنگِ حلقہ نگوں
نہ وہ توڑے رہے تھے نے وہ چھڑے   روتے تھے اک بہم گلے سے کڑے
وہ جو پاؤں کی اُسکی تھی خلخال   سوکھ کر ہوگئی تھی رشکِ ہلال
اُس کے ماتم میں گرم شیون تھا   سینہ ہر اک کا شکلِ روزن تھا
گھر میں اس جوہری کے دھوم پڑی   تھی جو غم کی گھٹا وہ جھوم پڑی
تھیں زنیں قوم کی جو پیر و جواں   آئیں سر پیٹتی بہ آہ و فغاں
سُن کے مردوں نے بھی سراپا دھنا   جب خبر گو سے حرفِ کال سنا
بڑے چھوٹے برسمِ قومِ ہنود   آکے دروازے پر ہوئے موجود
ہوا حاضر وہیں بہ یکباری   کی اُٹھانے کی اُس کے تیاری
لے چلے کرکے جب کہ اطلس پوش   یکہ گر خویش و قوم دوش بدوش
دم بدم رام رام سب کی صدا   جائے تھی تا بہ گنبدِ خضرا
اُسکی ارتھی کو چاروں ___ براں   لئے جاتے تھے مثلِ تختِ رواں
اُسدم اس نازنیں کو نہلا کر   غوطے پانی میں کتنے دلوا کر
شعلہ اک گرم آسماں کو گیا   نہیں معلوم وہ کہاں کو گیا
کیا کہوں میں غرض وہ رشکِ قمر   ہوگئی جل کے وہیں خاکستر
یعنی حسن اُسکا آگ میں جو ملا   آگ کا شعلہ تھا یدِ بیضا
گرچہ خود شمع تھی وہ جانانہ   جل گئی لیک مثلِ پروانہ
آکے بیٹھا خستہ بہ شکلِ حزیں   تھا اسی کا خیال اُسکے تئیں
شب گذری کہ دل اُدھر کو کھنچا   جا کے بستر پہ وہ مریض گرا
تھی جو اُسکی رسومِ ماتم کی   بارہ دن تک وہ رسم باہم کی
کیا کہوں اُس جوان کا میں احوال   عشق تھا بسکہ اُسکے نت اقبال
سو بھی فرقت سو کس مصیبت کی   ہو نہ اُمید جس سے رحلت کی
اپنے یاروں سے یوں کہا جا کر   اک غریبی سی ہو کے دست بسر

تھے کڑے ہاتھ کے جو سبزہ نما   پس کر کھا گئے تھے وہ ہیرا
کرتے پاؤں کی انگلیوں کی جو یاد   بچھوے کرتے تھے دم بدم فریاد
گل ماتم کھلے تھے شاخ بہ شاخ   مرکیوں کی ہوئے تھی دل سوراخ
جب سے کنگن گیا تھا ہاتھ سے چھوٹ   موتیوں کی پڑی تھی مالا ٹوٹ
اِس سوا اور بھی تھا جو زیور   میرے حدِ شمار سے باہر
زر و زیور کو جب ہوا یہ غم   اور کھنچا دور نازنیں ماتم
پہنچی گھر گھر برادری میں خبر   کہ گئی آج اُس کی جورو مر
سر سے چادر اُتار کر رو دیں   ہو کریں دھاڑیں مار کر روئیں
تھے جو واں خویش قوم یکدیگر   چلے کپڑے پہن کر اُس کے گھر
اتنے میں ارتھی کا جو تھا ساماں   لے کلاوے سے تا بہ بیڑہ پاں
ڈال ارتھی پہ اُس پری رو کو   سرو گلرو بتِ سمن بو کو
نالہ و فریاد دل خراشی تھی   آنسوؤں سے گلاب پاشی تھی
قدم اس دھج سے اُنکے پڑتے تھے   گویا سخت اور اجل سے لڑتے تھے
پہنچے جمنا سے جبکہ ہوکر پار   بیچ مرگھٹ کے بادلِ افگار
ڈھیر میں لکڑیوں کے رکھوایا   آگ دی اور اس کو بھڑکایا
بعد شعلے کے اک دھواں سا اُٹھا   اس زمیں سے وہ آسماں سا اُٹھا
آگ نے جو اُسے جلایا تھا   اپنے تئیں شعلہ اک بنایا تھا
آگ کی لو جو اُس کی لٹ کو لگی   وہ بدن سے لپٹ کے اُسکے چلی
شوہر اس کا کیا کریا کر   یک دگر جب نہا کے آیا گھر
تھے جو اعیاں دے تسلی کر   گئے اُٹھ جبکہ اپنے اپنے گھر
بارے جوں توں بہ تعزیت داری   صرف جو تھا بہ حالِ بیماری
تیرھواں دن ہوا جو نہی اکبار   آئی پھر وہیں مرگِ عاشقِ زار
جونہی ماتم سے اک فراغ ہوا   سینہ فرقت میں داغ داغ ہوا
جی رُکا جان پر بلا آئی   جن میں اپنے ___ ٹھہرائی
کہ میں ہوتا ہوں تم سے رخصت آج   تھے دیئے دل پہ داغِ حسرت آج

ہے خبر شرط کہہ چلا تم سے
کہیو جو تو جیسے ماجرا تم سے

ایکے اُس خواب گہہ میں بادلِ زار
تان چادر کو سو رہا اک بار

نہ جدائی کا کچھ رہا دھڑکا
ہوگیا صبح وصل کا تڑکا

اِس نے جا کر کے جونہی مُنہ کھولا
نہ ہلے لب نہ مُنہ سے کچھ بولا

ایک ماتم سرا وہ خود گھر تھا
ماتم اک اور بھی ہوا اُس جا

نیلم اس غم سے داغ درد ہوا
رنگ پکھراج کا بھی زرد ہوا

سرخ یاقوت تھے سو خوں روئے
موتی سب اشک آبلوں روئے

رنگ لہسنیے کا سیاہ ہوا
کھا کے فیروزہ زہرِ غم کو ہوا

کو وقت غم کی جو تھی گمید کی پر
جلوہ کرتا تھا وہ بھڑک دیگر

جس طرح اشک خون کے ہمراہ
خوں کی اک بیٹ نمود ہو ناگاہ

تھا جو الماس کا بڑا دانا
آپ وہ زہر کا تھا پیمانا

لعل لوٹیں تھے خون میں بسمل
چُنّیوں کے جو چھید پڑے تھے دل

سن کے یہ ماجرائے جانکاہی
رنگ یاقوت زرد تھا کاہی

لیکن اُس گُل کا جب یہ حال سنا
سُوکھ کر تسمہ سی ہو گئی کانٹا

پتھروں کا ہو جب یہ حال بنا؟
آدمی کیونکہ ہو نہ جامہ سیاہ

سن کے اس واقعے کو پیر و جوان
شکلِ تصویر رہ گئے حیران

کوئی بولا کہ زہر کھا کے مُوا
کوئی بولا کہ یہ تو تھا ہی ہوا

جوہری سارے ہو کے خستہ جگر
تیرہویں دن پھر آئے اُسکے گھر

اُسی صورت بہ شکلِ زود رانود
جا کے سر گھٹ ذبح کر کے فود

آگ میں جس طرح جلے ہے شمع
جل گیا یہ بھی زبان میان جمع

ذرہ اُس کا پڑے جو خار اپر
جل کے ہو جائے وہ بھی خاکستر

قصہ یہ شہر میں ہوا مشہور
آیا سب کی زباں پہ یہ مذکور

لیک انجام عشق تھا جو یہی
اُسکی ہمت پہ آفریں ہی کہی

کوئی عاشق جو اسکو دیکھے گا
دیوے گا طبعِ مصحفی کو دعا

ہوئی یہ مثنوی جو مجھ سے تمام
جذبۂ عشق میں نے رکھا نام

کہہ کے یہ بات اپنے گھر کو گیا
تھا جدھر رہ رہے دل اُدھر کو گیا

کھنچ گئی روح جانبِ محبوب
ہوگئے ایک طالب و مطلوب

اِس میں سوتے ہوئے جو دیر ہوئی
بولی ماں یوں اسے جگا دو کوئی

مُردنی رخ پہ آشکار ہوئی
دوڑیو دوڑیو پکار ہوئی

دیکھ اُس جوہری کا مُردہ جمال
ہوگیا سب جواہروں کا یہ حال

ہوئے ماتم میں اُسکے اشک فشاں
خاک پر لوٹتا گوہرِ غلطاں

تھا جو وہ تا نہ بڑا بحال تباہ
ہوگیا رنگ سرخ اُسکا سیاہ

سر پہ اپنے صدف ہیں ہو غمناک
ڈالی درِ یتیم نے بھی خاک

اشک ہو نگوں کے کچھ نہ تھے گلگوں
بجھنے ہیرے کا بھی جگر تھا خوں

رو میں سر جو مر موتیوں کی لڑی
عقد شکوک لوٹ لوٹ پڑی

کہ اُسے پی کے وہ ہیں مر جاوے
قصہ کوتہ کرے گزر جاوے

یشم[۲] کی بھی تھی جو وہاں تختی
بن گئی تھی وہ لوحِ بدبختی

تھی ترازو جو وزنِ گوہر کی
چھاتی کر لی تھی اُس نے پتھر کی

سب جواہر کو تھا جو اسکا غم
بن گئے تھے وہ صورتِ ماتم

الغرض جب خبر یہ سب کو ہوئی
کہ مُوا وہ بھی جس کی تھی پونجی

بڑے چھوٹے سب اسکے ...
تھے جو نزدیک و دور گھر آئے

سن کے اس ماجرے کو آخر کار
ہوگیا بند جوہری بازار

گھر سے مردے کو اُس کے اٹھوا کر
[illegible]

اُسکو بھی آگ کے حوالہ کیا
نہ رہی استخواں نے نالہ کیا

سچ ہی یہ ہے کہ عشق کی ہے وہ آتش
جس کا شعلہ ہے تند اور سرکش

گئے پھر گھر کو خویش و بیگانہ
جل گئے تھے جو شمع و پروانہ

بات مجھ تک بھی یہ جونہی پہنچی
حد کر لطف اُس گھڑی تو میرا جی

عاشقی میں یہ تازہ تھا مضموں
میں نے اُسکے تئیں کیا موزوں

کہ عجب قصہ مختصر ہے یہ
لعل لب پارۂ جگر ہے یہ

سلہ ؟ (ادارہ)

۲؎ یشم کا پتھر سیاہ ہے (ادارہ)

مثنوی نانخواہ

کیا کروں وصف تیرے اجوائن   تو ہے آرام جان و راحت تن   باؤ گولے کا تو نے سر توڑا   ریح نے تیرے ہاتھ گھر چھوڑا
اشتہا تجھ سے صاف ہوتی ہے   موت سر کو پکڑ کے روتی ہے   بھوک لگتی ہے تجھ سے صبح و شام   تب تو ہے نانخواہ تیرا نام
سوئے ہضمی کو دیوے ہے تو شفا   امتلا تجھ سے ہے اسیر بلا   تجھ سے فوراً ڈکار آتی ہے   گل جاں پر بہار آتی ہے
تیرے درجے سے ہے تری تیزی   سو نتیجہ حدت کو تیری کب پہنچی   گاہ کھولے تو سدہ امعا کا   گہ کرے بلغم لزج کو فنا
بلغمی سرفہ جسکو ہوتا ہے   تیرا اک دانہ اس کو کھوتا ہے   ہاتھ پاؤں میں جسکے ہو گنٹھیا   ہے ترا تیل اس کا عقدہ کشا
تیری گرمی میں کچھ نہیں ہے قصور   تجھ سے سردی کا درد سر ہو دور   بسکہ تو اسکے تشنج کی ہے دوا   درد اور ورم تجھ سے ہووے فنا
وقت حاجت ترے عرق کا قطور   کرتا ہے درد گوش کو بھی دور   ہڑ کے پانی نے کی بہت تیزی   پر نہ پہنچا وہ گرد کو تیری
بنت تو لذت ہر اک نمک کی چکھی   عرق کھیکوار میں بھی رہے   کوئی تجھ سے بنائے پچپاونا،   باندھ لاوے کوئی ترا دونا
تو نہ چورن میں ہو اگر داخل،   پھر وہ چورن بنے تو کیا حاصل   وہ جو اجزا کو کوٹ چھانتے ہیں   جزو اعظم تجھی کو جانتے ہیں
قدر سنبل کی تیرے آگے نہیں   حق نے دی ہے وہ تیزی تیرے تئیں   تیرے دو دانے جو کوئی کھاوے   وہ ہیں عمر دوبارہ وہ پاوے
درد دکھ میں جو ہووے تو درکار   جھاڑ اور پھونک کر تجھے اکبار   بعض پانی کیساتھ کھاتے ہیں   بعضے سوکھی ہی پھانک جاتے ہیں
الغرض خشک و تر تو ہے نافع   ہیضہ محتبس کی ہے دافع   تجھ کو کب پہنچے زنگی ہڑ بھونڈی   بیپلا مور ہے تری لونڈی
بسکہ گرمی ہے تیری بر سر کار   تر پھلے کا بھی سرد ہے بازار   گر تری منفعت کو پائے کوئی   نہ مربے کو ہڑ کے کھائے کوئی
جہاں تیرے عرق کی قیمت ہے   عرق بادیاں فضیحت ہے   بسکہ تو ہے محلل بلغم   تجھ سے گھٹتا ہے نزلِ بلغم
منفعت تجھ میں ہیں نہفتہ ہزار   ریگ صحرا ہے جس کا ہو نہ شمار   نخل صحت کو تن میں بوتے ہیں   تیرے دو دانے دکھ کو کھوتے ہیں
تو غریبوں کے کام آتی ہے   رخ صحت انہیں دکھاتی ہے   کوئی کھا جائے گر دو لقمہ زیاد   اسکو کر دے ہے معدے میں آباد
تیرے دانے کو مرغ اگر کھاوے   سنگدانہ ہو آب بہ جاوے   قسم تیری جو ہے خراسانی   اور بھی اسمیں ہے تن آسانی
جوف کو اس سے سینک جو دیوے   پوٹلی اسکی درد چن لیوے   گر ستھورے میں ہو نہ دخل ترا   نہ زچہ کو ہو اس سے نفع ذرا
اور جو گھٹی میں تو نہ ہو مخلوط   طفل ہووے نہ فربہ اور مضبوط   بسکہ تو ہے عزیز دینداراں   از برائے شفائے بیماراں
وہ جو قرآں کرے ہے اکثر ختم   رمضاں میں کیے ہے تجھ پر ختم   بعد ازاں ہاتھوں ہاتھ پیر و جوان   تجھ کو لیجاتے ہیں تبرک جاں
چاٹے کوئی جو تیری پتی ذرا   بارغ کے بلغ پھر تو کرے ہوا   کھاوے حیواں اگر ترے اشجار   نہ نباتات کا رہے آزار
میں تو لاؤں اکھاڑ پاؤں جہاں   بیچ دیں سب ترے ہی اروی جاں (؟)   لیکے دو پھول جو ترے کھاوے   غنچہ طبع اس کا کھل جاوے
باغ جنت میں گر نہ ہووے تو   میں تو ہرگز کروں نہ ادھر رو   کیونکہ واں کے جو کھائیے میوے   کون اصلاح ان کو پھر دیوے
ہو زباں تیز آیت تا نہ مرے (؟)   کسطرح کر سکوں میں وصف ترے   مصحفی کو جلا دیا تو نے   شعر کا یہ صلا دیا تو نے

کدوئے تلخ

وہ کدو جسکو اودھ اور یو-پی میں لوکی کہتے ہیں، اگر تلخ نکل جائے تو تریاق اعظم کا حکم رکھتا ہے۔ خوش قسمتی سے گیا کے قیام میں مجھے اُسکے نادانستہ استعمال کا اتفاق ہوا۔ قدرتِ خدا کا یہ بھی ادنیٰ کرشمہ ہے کہ اسکی تلخی کو جانِ شیریں کا محافظ بنادیا ہے۔ ذیل کی نظم اسی واقعہ کی تحت میں لکھی گئی ہے۔

عظمت حسین عظمت لکھنوی

(نظم)

تجھ سے ہے اے کدوئے تلخ سخن، یاد کرتے ہیں تجھکو کام و دہن
تیرے اوصاف ہوں بیاں کس سے راز ہیں تجھ میں علم و حکمت کے
ہے شدیدی و افصرائی میں ہر ح تیری لکھی شفائی میں
بھاگتے تجھ سے ہیں مرض سارے وہ ہوں انساں کی یا کہ حیواں کے
کھالے دو چار تیرے گر لقمے جلدی امراض دُور ہوں سارے
خارش و داد یا اکوتہ ہو ہیچش و قبض ہو کہ ہیضہ ہو
ورمِ قلب ہو کہ دردِ جگر دق ہو سل ہو دمہ ہو یا غمِ سر
کربِ امعا ہو یا کہ دردِ شکم خون فاسد ہو یا تپِ بلغم
نزلۂ کہنہ نزلہ و سرسام سب کا کرتا ہے تو ہی کام تمام
الغرض جتنے ہیں مرض پیدا نام سُن کر ترا ہوں دم میں فنا
خیر یہ تو مرض ہیں جسمانی تو ہے تریاقِ دردِ روحانی
تجھ میں پنہاں ہے وہ لطافتِ روح دُور جس سے کہ ہو کثافتِ روح
تجھ میں تنزیہہ کی وہ قوت ہے معرفت کی ہوں منزلیں سب طے
تلخیوں کا بھرم مگر ہے تو صبرِ تلخ ست کا ثمر ہے تو
نیم ہو ایلوا ہو یا ہو سم تیرا ثانی نہیں خدا کی قسم
یاد جسکو بھی تیرا نام رہے زندگی بھر وہ تلخ کام رہے
ذائقہ تیرا گر کوئی لکھے جانِ شیریں سے ہاتھ دھو بیٹھے
نزع میں کھائے تجھکو گر بیمار تلخیٔ موت یک قلم ہو فرار
مجھ پہ گذرا یہ واقعہ بھی ہے تجربہ بھی مشاہدہ بھی ہے
گر کسے بر زباں نہد یک بار تن ز جاں جاں ز تن شود بیزار
مختصر ہے یہ تیری حدِ صفات ہم کہ مار جانتے ہیں آبِ حیات
بھول سکتا نہیں کبھی عظمت مر کے یاد آئیگی تری نعمت

عظمت لکھنوی

مسجد جامع دہلی

(از لفٹنٹ ازہر قدوائی آئی۔ایم۔ایس)

اِک اشتیاق لے کے میں آیا تھا دُور سے — دہلی کے مقبروں کی زیارت کے واسطے
پہلے سلام بھیجا بہ سرکارِ اولیا — غالب کی قبر پر بھی میں پڑھ آیا فاتحہ
اشکوں کا تار بندھ گیا مینہ جیسے ابر سے — کہا کیا لپٹ کے رویا ہمایوں کی قبر سے
کچھ اور مقبروں کی میں کر کے زیارتیں — آیا کہ دیکھوں شہر کی بھی کچھ عمارتیں
وہ لال قلعہ جیسے اک اجڑا ہوا مکاں — یا وہ چمن کہ جس کا نہ ہو کوئی باغباں
اُترے ہوئے شباب کی تصویر دیکھ لی — اُلٹی سی ایک خواب کی تعبیر دیکھ لی
کچھ دور لال قلعے سے اور اک مزار ہے — شاہِ جہاں کی شان کی اک یادگار ہے
واں جمعہ جمعہ فاتحہ خوانی کے واسطے — آتے ہیں اب بھی لوگ بہت دُور دُور سے
کچھ رنگ اور گرد پرانا سا اب بھی ہے — اِس مقبرے پہ پہلا زمانہ سا اب بھی ہے
اور جمعۃ الوداع کو ہوتا ہے عرس بھی — اس کا کہ جسکی خاک بھی باقی نہیں رہی
جسکے فسانے سنتے ہیں سب لوگ رشک سے — مرنے پہ جسکے چشمِ جہاں[1] میں ہیں اشک سے
دیکھو یہاں پہ اشرف الاقوام دفن ہے — مسجد میں شانِ مذہبِ اسلام دفن ہے

دل سے وفورِ رنج میں سب ضبط کھو کے میں — لوٹا کچھ آبدیدہ و بے چین ہو کے میں
اجڑی سی اب ہے گلشنِ اسلام کی بہار — دہلی ہے میری نظروں میں اک مجمعِ مزار
بس دیکھنے دکھانے کی اک چیز رہ گئی
یعنی مکاں تو لٹ گیا، دہلیز رہ گئی

[1] اصل میں خدا تھا (ادارہ)

ازہر قدوائی

برسات

(از پروفیسر رسا ہمدانی ٹرپیل ایم اے (گولڈ میڈلسٹ)

جھومتی آتی ہے وہ کالی گھٹا کس شان سے
کالی کالی کاکلیں ہر سمت پھیلاتی ہوئی
برق ہے یا کوئی بجلی کی چھری دامن میں ہے
آرہی ہے اسکو رہ رہ کر وہ چمکاتی ہوئی
اُف خرام ناز اس کالی گھٹا کا دیکھئے
ہلکی ہلکی ننھی ننھی بوندیں ٹپکاتی ہوئی
کس ادا سے یہ فلک پر چھا رہی ہے اس گھڑی
بھاگتی، اُڑتی، ٹھٹکتی، پیچ و خم کھاتی ہوئی
آرہی ہے زندگی پودوں میں دیتی ہر طرف
سُرخیٔ خوں پھول کی ہر رگ میں دوڑاتی ہوئی
موتیوں کو پھینکتی، دھوتی ہوئی کلیوں کے مُنہ
سبزۂ خوابیدہ کو چھینٹوں سے چونکاتی ہوئی
مسکراتی، لڑکھڑاتی، جھومتی آتی ہے وہ
میکشوں کیواسطے اک کیف برساتی ہوئی
وہ کھلی بوتل، وہ مے رنگین ساغر میں ڈھلی
وہ اٹھی اک نازنین لفظوں کو بکھراتی ہوئی
وہ اُٹھے انگڑائیاں لیتے ہوئے میخوار بھی
دخترِ رز دکھلائی دی جو سامنے آتی ہوئی
کم نہیں بجلی سے ہے یہ لال ہونٹوں کی ہنسی
ہے زمیں پر کی گھٹا یہ زلف بل کھاتی ہوئی
باغ میں جھولا پڑا، غنچے حسینوں کے کھلے

جمنا

(از جناب اختر صاحب ہوشیارپوری بی اے ایل ایل بی)

اے سُبک رفتار جمنا حاملِ کیف و سُرور
تیری دامن میں ہیں امواجِ طرب نزدیک و دُور
ہیں ترے شاداب ساحل رُوکشِ خلدِ بریں
تیری پہلو گلستاں ہیں، تیرا سینہ مرمریں
تیرے دل میں سربسر سیال چاندی موجزن
ناظرِ و نکا دل لُبھا لیتی ہے تیری ہر پھبن
تجھ میں جُنباں تیری موجوں کی زبانیں بے شمار
کہہ رہی ہیں چپکے چپکے روئدادِ روزگار
تیرے دل میں رازہائے گردشِ ایام ہیں
تجھ کو از بر سارے شاہانِ سلف کے نام ہیں
تُو نے دیکھے ہیں ہزاروں انقلابِ دلگداز
غازیوں نے تیرے دامن پر پڑھی اکثر نماز
تُو نے دیکھے ہیں خموشی سے چمن لُٹتے ہوئے
خانداں برباد ہوتے بانکپن لٹتے ہوئے
تُو نے دیکھی ہیں وہ دورِ چرخ کی نیرنگیاں
دم بخود تھے جن کے افسانوں سے اندازِ بیاں
تُو نے دیکھے ہیں شہنشاہوں کی وہ رعب و جلال
ذلت و خواری تھا دامن میں لئے جن کا مآل
بات کر مجھ سے کہ ہے مجھکو بھی اس کی آرزو
کس لئے خاموش ہے، کر گفتگو، کر گفتگو
مجھ کو کر آگاہ شان و شوکتِ اسلام سے

(برسات)

اِک پری جھُولے پہ ہی کچھ نازسی گاتی ہوُئی
یہ گھٹائیں، یہ ہوائیں، یہ فضائے دلفریب
آئی ہے برسات کتنا دل کو تڑپاتی ہوُئی
آرہی ہی ہائے رہ رہ کر پپیہے کی صدا
کوئل اِس دم کوکتی ہی غم سے تھرّاتی ہوُئی
جس کا پی پردیس میں ہی، دل ہی اُسکا بیقرار
رو رہی ہی دیکھ کر کالی گھٹا آتی ہوُئی
اس تصوّر سے رسا برسات میں بھی لُطف ہے
چاندسی تصویر پہلو میں ہی شرماتی ہوُئی

٭

(جمنا)

کر منوّر دل مرا ز رکاری پیغام سے
ساحلوں پر تیری کس کس رنگ سی ہوتی تھی جنگ
کِسطرح دیوانہ کر دیتی تھی وسعت کی اُمنگ
کِسطرح شاہوں کو شاہوں نے جھکایا خاک پر
کِسطرح ذرّات چمکے سینۂ افلاک پر
سُورما کِسطرح پستی سے بلندی تک گئے
کِسطرح دہقان بامِ ہوشمندی پر گئے
کِسطرح سکّہ بٹھایا شہریاروں نے یہاں
کِسطرح محشر اُٹھائے تاجداروں نے یہاں
جس طرح بھی ہوسکے مجھ کو سُنا یہ داستاں
گذرے ہیں سینے پہ تیرے کیسے کیسے کارواں

٭

انتباہ

(از جناب احمد ندیم قاسمی صاحب بی۔اے)

وہ چرخ کے ماتھے پہ چمکتا ہے ستارا
وہ غم نے بھرا روح کی خلوت میں طرارا
جھونکے ہیں کہ سرگوشیاں کرتے ہوئے بھُتنے
ندی ہے کہ شعلوں کا گرجتا ہوا دھارا
شبنم کے یہ قطرے ہیں کہ دہکے ہوئے آنسو
یہ نیم ہی یا دیو کوئی انجمن آرا
سینے میں چٹختے ہیں تمنّا کے کھلونے
اور کٹتا ہے امید کے دریا کا کنارا
احساس پہ بھٹکے ہوئے رہرو کا گماں ہی
سینے میں بھڑکتے ہوئے دوزخ کا نظارا
جب رُوح ہی گھُٹتی ہو تو کیا سعیٔ خموشی
جب سانس ہی رُکتی ہو تو کیا صبر کا یارا
پردیس میں سوئی ہوئی اے ملکۂ مغرور
لیتا رہوں کبتک ترے پیماں کا سہارا
آتی ہی تو آ ورنہ وہ تاروں کی جلو میں
کرتے ہیں فرشتے مجھے مرنے کا اشارا
اب ختم بھی کر سلسلۂ ناز کہ شاعر
مرجائیگا پر بھیک نہ مانگے گا دوبارا

احمد ندیم قاسمی

٭

غزلیات

کلامِ مبارک

(از فصیح العصر حضرت مبارک عظیم آبادی)

لاکھ قسمیں کھاؤ زلفیں تھام کے — دل ہے حلقے میں تمہارے دام کے
سُن لو گر نالے کسی ناکام کے — لوٹ جاؤ گے کلیجا تھام کے
روکنا جو نکا ہوائے شوق کا — تھا منا اُڑتے ہیں پردے بام کے
نامبارک نکلی طرح آشیاں — چار تنکے بھی نہ نکلے کام کے
کہہ رہا ہے یہ محبت کا مزا — لے محبت میں مزے الزام کے
ہم تمہاری ہر ادا کے ہیں شکار — تیر سب نکلے ہمارے نام کے
پاؤں اُن مستوں کے دھو کر پیجیے — جو نہیں منت کشوں میں جام کے
تم مبارک آ چکے اُس بزم سے — جو اٹھے بیٹھے کلیجا تھام کے

مبارک عظیم آبادی

خرابِ محبت بناؤ تو جانیں

(از حضرت سید افقر موہانی وارثی)

دمِ نزع بالیں پہ آؤ تو جانیں — کسی ڈوبتے کو بچاؤ تو جانیں
نظر ہو گئی گم تجلیِ رُخ میں — ذرا پھر سے صورت دکھاؤ تو جانیں
نگاہوں کی صورت خیالوں میں بھی تم — نہ آؤ نہ آؤ نہ آؤ تو جانیں
بھڑکتے ہوئے برق کے تیز شعلو — قفس کو بھی آکر جلاؤ تو جانیں
قیامت کا مٹ جائے دنیا سے جھگڑا — کوئی ایسا فتنہ اٹھاؤ تو جانیں
بنا ہے حجابِ دُوئی جو نظر میں — وہ پردہ بھی آکر اُٹھاؤ تو جانیں
یہ مانا نہیں دل کو تم نے لیا ہے — ذرا نیچی نظریں اُٹھاؤ تو جانیں
خرابِ جہاں ہو کے افقر کرے کیا — خرابِ محبت بناؤ تو جانیں

افقر موہانی

"نشترِ فصاحت"

(از لفٹننٹ ازہر قدوائی آئی۔ ایم۔ ایس)

نہیں پابندِ حدِ آشیاں کا — جنوں شاکر ہے جورِ باغباں کا
تغافل ہے تو پھر کیسی جفائیں — تمہیں کچھ پاس ہی اپنی زباں کا
ستم ہے آڑ میں قسمت کی مجھ پر — جفائیں نام لے کر آسماں کا
انہیں کیا آپ کی بربادیوں سے — یہ قصہ آپ لے بیٹھے کہاں کا
خوشی ہی ایک وقتی جذبۂ دل — بہار اِک عارضی رُخ گلستاں کا
نہیں کوشش رہینِ کامیابی — ہمیں چسکا ہے سوزِ امتحاں کا
نہ منزل ہے۔ نہ کوئی راہِ منزل — نہ رہبر کا، نہ احسانِ کارواں کا
عجب ناکامیوں کی داستاں ہے — فسانہ میری عمرِ رائگاں کا
زمانہ کوششِ مبہم کا طالب — تمہیں غم ایک سعیِ رائگاں کا

فسانہ خشک سا تھا دل کا ازہر
یہ جادو تھا مری طرزِ بیاں کا

ازہر قدوائی

(از ایس ایم۔ یامین صاحب نقش، اسسٹنٹ اگزیکیٹو انجینیر این ڈبلو آر)

ہاں دلِ دردآشنا دکھلا دے شانِ آرزو — آ رہا ہے کوئی بہرِ امتحانِ آرزو
اللہ اللہ! یہ تصور جلوۂ برقِ جمال! — ذرہ ذرہ دل کا ہی آتش بجانِ آرزو
نیل ہی تیری نظر کی چوٹ کا دل میں نہاں — کیوں کہوں اسکو سویدا ہے نشانِ آرزو
وصل سے بڑھکر سکوں حاصل ہے فرقت میں یوں — تیری صورت جب تصور میں ہو جانِ آرزو
جذب کامل ہے تو پھر شرحِ بیاں سے کیا غرض — خامشی بن جائیگی خود ہی زبانِ آرزو
ہنسکے میری زندگانی کی خزاں کردو بہار — یوں رہے بیرنگ کبتک گلستانِ آرزو
اس طلسمِ رنگ و بو سے اسکو کچھ نسبت نہیں، — کیا بتائیں آپکو کیا ہے جہانِ آرزو
انتہائے ضبط سے ہونے لگا افشائے راز — ہر نظر خود بن گئی ہے داستانِ آرزو
اشک افشاں شمع ہی خاکسترِ پروانہ پر — کون ہو سکتا ہے ایسا کامرانِ آرزو
نیشتر کیونکر کہوں تیری نگاہِ ناز کو — سرخیِ امید ہے عنوانِ جانِ آرزو
مرحلے میں نقش کے اشعار پر اہلِ سخن! — "ان گلوں میں ہی بہارِ بوستانِ آرزو"

تبصرے

(۱) نظارۃ الحسنین علی سر الشہادتین
قیمت ۲ر
شفیق - جونپوری
دفتر طارق - جونپور

حضرت مولانا شاہ عبدالعزیز محدث دہلوی رحمۃ اللہ علیہ کے عربی رسالہ کو اپنے حاشیہ کے ساتھ جناب شفیق جونپوری نے طبع کرایا ہے۔ خدا انکی سعی مشکور فرمائے۔ اگر شفیق صاحب ترجمہ کر کے حاشیہ بھی اردو میں تحریر فرماتے تو زیادہ مفید ہوتا۔ کاغذ و طباعت معمولی۔

---

(۲) "ملتِ ابراہیم"
از عرشی امرتسری
قیمت ۵ر دفتر امت مسلمہ امرتسر

مولانا عرشی نے قرآنِ حکیم سے ملتِ ابراہیم کی تشریح و تفصیل لکھکر تدبر فی القرآن کا ثبوت دیا ہے۔ جو باتیں لکھی ہیں، انکے مفید و کارآمد ہونے سے انکار نہیں ہو سکتا، مگر "اہل قرآن" ہی کے نکتۂ نگاہ سے ہر استنباط کا نتیجہ لازمی ہے کہ حلقۂ اثر محدود ہو کر رہے۔

---

(۳) "شاہ نعمت اللہ ولی"
مرتبہ ایم۔ اے حفیظ - قیمت ۱۴ر
مولوی ارادت اللہ - درگاہ شاہ ارزاں
ڈاکخانہ مہنا رو - پٹنہ

جناب حفیظ کی محنت قابلِ داد ہے۔ اور تحریر شگفتہ۔ اسی صفحات پڑھنے کو ہیں۔ آمدِ سخن جو کچھ ضمناً بھی لکھ گئے ہیں، معلومات میں اضافہ کرنے کیلئے بہت ہیں۔
ملک کو عموماً اور صوبہ والوں کو خصوصیت کے ساتھ مستفید ہونا چاہیے۔

---

(۴) "کوشلیا" از ایم اسلم - قیمت عہ
(۵) "شرابی" از ایم۔ اسلم قیمت ۶ر
(۶) "انگبین" از عطاء اللہ پالوی قیمت ۶ر
(۷) "ربابِ شکستہ" از جمیل احمد کندا پوری قیمت ۸ر

مرسلہ:-
مسرز نرائن دت سہگل اینڈ سنز۔ تاجران کتب لوہاری گیٹ۔ لاہور

خوبصورت مجلدات مع گرد پوش نمونہ آرٹ کی اشاعت میں سہگل صاحبان کی کوششیں کامیاب ہیں۔ انتخابِ مصنفین کے اعتبار سے بھی فراخدل۔ پنجاب والوں کی خدمتِ اردو دیکھ کر رشک نہ سہی غبطہ ضرور ہوتا ہے۔
ایم۔ اسلم صاحب کی کتابوں کے متعلق کچھ کہنے ہی کی ضرورت نہیں ہے۔ مشک آنست کہ خود ببوید نہ کہ عطار بگوید۔ اپنے خاص طرز میں لکھنے والوں میں اسلم صاحب قابلِ رشک شہرت کے مالک ہیں۔ ان کا قلم بہت لکھتا ہے مگر بہت خوب لکھتا ہے۔ "کوشلیا" اس وقت کا افسانہ ہے جب راجپوتی غیرت و حمیت ضرب المثل تھی، اور "شرابی" ان افسانوں کا مجموعہ ہے جن میں سے ایک ایک فسانہ ڈنکے کی چوٹ کہہ رہا ہے کہ اسلم کی بے تکلف روانیِ قلم دیکھنی ہو تو مجھے دیکھو۔ اہلِ ذوق سے ان کتابوں کی سفارش جراتِ بیجا ہے۔

تیسری کتاب "انگبین" عطاء اللہ پالوی کی کاوش و محنت کی رہینِ منت ہے۔ "انگبین" نوشجان واندشدار وہی لیکن اس کے پیدا کرنے والوں کو "نیش زن" ہی کہا جاتا ہے۔ پالوی صاحب نے "دلِ پرشباب" کی دعوت کیلئے "تیر و نشتر" مہیا کرکے "آرٹ" کو اردو ادب میں روشناس کیا ہے۔ انکی سعی مشکور ہے یا نہیں، اس کا جواب صرف یہ ہے کہ نسائی حسن اپنی نزاکت اور نزہت اگر کھو بھی بیٹھے تو بھی اس کی یادگاریں محفوظ کردینے والے کی قدر ہوگی! "انحطاطِ نسائیت" لکھ کر پالوی صاحب نے وقت کی اہم ضرورت پوری کی ہے، مگر ؏ گوشِ سخن شنو کجا، دیدۂ اعتبار کو!

"ربابِ شکستہ" میں دہشت انگیز قصے ہیں، جن کا انتساب جمیل صاحب نے اپنے قبلہ گاہی محترم کے نام کیا ہے! جو دلچسپی سے خالی نہیں۔ بشیر ہندی صاحب نے سوالیہ نشان کے تحت "جدید دورِ ادب کے خالق" ہونے کا دعویٰ کرتے ہوئے جو کچھ لکھا ہے اس کے ابتدائی سطریں اچھی طرح سمجھ میں نہ آئیں، اور جمیل صاحب کے لئے تعارف کی ضرورت سے انکار کی توجیہہ مبہم رہ گئی۔ اس قسم کے قصوں سے دلچسپی رکھنے والوں کی تعداد محدود ہے۔ بہر کیف اپنے قدردانوں میں اسکی مقبولیت ہوسکتی ہے!

---

(۸) "جگ بیتی" حصۂ اوّل
از پنڈت جواہر لال نہرو - مترجمہ
محمود علی خاں (جامعی)
قیمت ۸ؔ، مکتبہ جامعہ - دہلی

۵۵۲ صفحات کے خزانۂ معمولات، جواہر لال جی کی اطمینان سے لکھی ہوئی تحریر کا ایسا ترجمہ محمود علی خانصاحب (جامعی) نے کیا ہے کہ بادی النظر میں ترجمہ ہونے کا شبہہ بھی نہیں ہوتا۔ مولانا ذکاءاللہ مرحوم کی یادگار جناب عنایت اللہ دہلوی کے بعد ترجمہ کی یہ قدرت محمود علی خانصاحب ہی کا حصہ ہے۔ جامعہ کو فخر ہونا چاہیے کہ ایسے دماغ کی پرورش اس کے حصہ میں آئی۔

کتاب کہنے کو تو ان خطوط کا مجموعہ ہے جو قید خانہ سے پنڈت جی اپنی صاحبزادی کو لکھا کرتے تھے مگر ان خطوط میں جو کچھ ہے وہ بلاخوف تردید کوزوں میں سمندر کہا جاسکتا ہے۔ گیا میں بیٹھ کر اس پر تبصرہ کرتے ہوئے بیساختہ جی چاہتا ہے کہ "بدھی ساگر" کہوں! فارغ التحصیل جوانوں اور تشنۂ تکمیل بوڑھوں کو بھی اس کا واقعی معنوں میں "مطالعہ" کرنا چاہیے۔

جامعہ اس قسم کے انتہائی مفید تراجم پیش کرنے میں اور اداروں سے گوئے سبقت لے گیا ہے، اور ملک و ملت کی طرف سے سزاوارِ آفرین و منت ہے، لیکن مجھے افسوس ہے کہ اس کتاب کی اشاعت میں ایک کمی رہ گئی ہے۔ اسکے ساتھ ایک ضمیمہ ضرور لگانا تھا جسمیں عام اردو خواں جماعت کی واقفیت کے لئے ان باتوں کی وضاحت کردی جاتی جنکی طرف پنڈت جی نے صرف اشارہ ہی کافی سمجھا ہے۔ مثلاً صفحہ ۳۳ کے سطر پنجم کو اس جملہ پر ختم کردیا گیا ہے "شاید یہ قصہ تو تمہیں معلوم ہوگا" اندرا دیوی کو معلوم ہو یا نہ ہو۔ اردو خواں کثیر تعداد کو یقینی نہیں معلوم۔ ادارۂ جامعہ جب اس لحاظ سے کتاب پر نظرِ ثانی فرمائیگا تو بہت سی ایسی باتیں نکلیں گی۔ نقشے بھی جو دئے گئے ہیں وہ عام فہم نہیں ہیں۔ انکی تشریح کی ضرورت ہے۔

---

(۹) "ہماری کتابیں" انجمن ترقی اردو (ہند) حیدرآباد کا یہ مجلہ بابت جولائی بغرض تبصرہ آیا ہے۔ اس پر جلد ۱ - نمبر ۲ تو ہے فروری اور آخر میں نرخنامہ اشتہارات بھی، مگر کہیں سے پتہ نہ چلا کہ یہ ماہانہ ہے یا سہ ماہی۔ چندہ سالانہ کچھ ہے بھی یا مفت نذر ہے۔ ٹائیٹل رنگین یا دو اور سبز۔ مضمون نگاروں میں پنڈت برجموہن دتاتریہ کیفی دہلوی اور پروفیسر عبدالقادر سروری بھی ہیں۔ چالیس صفحات میں نصف میں مضامین نصف

سونے کا بُت

(از بیگم عنایت الرحمٰن)

(پلاٹ کے لئے میں سیکس روہمر کے مشہور ناول "دی کویسٹ آف دی سیکرڈ سلیپر" کی ممنون ہوں۔)

(پہلا باب)

پُراسرار تلاش

پروفیسر رشید گھبرائے ہوئے اپنے پرائیوٹ رُوم میں داخل ہوئے۔

"معلوم ہوتا ہے آج پھر کوئی میرے غائبانہ میں آیا تھا" انہوں نے زیرلب بڑبڑاتے ہوئے کہا۔ "شہباز" انہوں نے آواز دی۔

ایک خادم وضع نقیہہ بوڑھا "جی حضور" کہتا ہوا کمرے کے اندر داخل ہوا۔

"شہباز" پروفیسر نے سنجیدگی سے سوال کیا "کیا تم نے کسی کو میرے غائبانہ میں مکان کی چہار دیواری کے اندر یا اردگرد منڈلاتے ہوئے دیکھا ہے؟"

"نہیں حضور"! بوڑھے خادم نے مودب ہو کر جواب دیا۔

"اچھا جاؤ" شہباز با ادب سر جھکائے واپس ہوا۔ پروفیسر نے دروازے اندر سے بند کر لئے ٹیلیفون اٹھا کر حضرت گنج کوتوالی سے سلسلہ ملانے کے بعد وہ کہنے لگے "ہلو۔ آپ کون صاحب ہیں؟ آہا ہا خود آپ؟ بہت ضروری کام ہے، جلد تشریف لائیے" ٹیلیفون کا چونگا ٹیبل پر رکھتے ہوئے پروفیسر پڑی ہوئی آرام کرسی پر دراز ہو گئے۔

پروفیسر عبدالرشید ماہر آثار قدیمہ و مہتمم مردہ عجائب خانہ لکھنؤ، حال میں مشرقی دنیا کا سفر کر کے واپس آئے تھے۔ چین۔ جاپان۔ تبت۔ مصر۔ ایران، توران وغیرہ کی سیاحت انہوں نے محض آثار قدیمہ کے متعلق جدید سے جدید معلومات حاصل کرنے کی غرض سے کی تھی۔ چالیس برس کے ایک منحنی مگر خوش رو آدمی تھے۔ تعلیم اور ریسرچ کے شوق میں انہوں نے "خانہ آبادی" کے بکھیڑوں میں پڑنا پسند نہیں کیا۔ آغا میر کی ڈیوڑھی جہاں اب لکھنؤ سٹی اسٹیشن ہے، وہاں سے کوئی آدھ میل ہٹ کر انہوں نے ایک محفوظ مگر غیر آباد جگہ اپنی سکونت قرار دی تھی۔ بظاہر حالات دنیا میں ان کا سوائے بوڑھے شہباز کے کوئی ہمدم و دمساز نہ تھا۔ ان کے خوشنما بنگلے کے مکین صرف وہی دو۔ آقا اور خادم تھے۔ حکومت میں ان کی اعلیٰ قابلیت کی وجہ سے بڑی قدر و منزلت تھی، اور اسی لئے وہ مردہ عجائب خانہ لکھنؤ کے سیاہ و سفید کے مالک تھے۔

کوئی بیس منٹ گذرے ہونگے کہ ایک موٹر ان کے بنگلہ کی برساتی میں آ کر رکا۔ پروفیسر رشید نے کمرے سے باہر نکل کر اس باوردی خوشرو و خوش قامت شخص کا استقبال کیا جو ابھی ابھی موٹر سے اترا تھا۔ اسے لئے ہوئے پروفیسر

"The Quest of The Sacred sleeper" By Sax Rohmer, ط

اپنے کمرۂ خاص میں داخل ہوئے۔

"انسپکٹر فیروز" پروفیسر نے گفتگو آغاز کی۔ "مشرقی ممالک کی سیاحت میں مجھے کبھی کسی قسم کے خوف کا قطعی احساس نہ ہوا۔ تبت کے جنگلوں، پُراسرار خوفناک مٹھوں اور خطرناک پہاڑیوں سے گذرتے ہوئے بھی میں نے کبھی جھرجھری محسوس نہ کی۔ لیکن خدا جانے یہ کیا بات ہے کہ جب سے میں یہاں آیا ہوں ایک ناقابل بیان خوف مجھ پر طاری ہے۔ ہر لمحہ، ہر ساعت ہر منٹ اور ہر ثانیہ مجھے ایسا محسوس ہوتا ہے کہ کوئی سایہ کی طرح میرے تعاقب میں ہے۔ امین آباد پارک میں عجائب گھر میں اور راہ چلتے یہ خیال گذرتا ہے کہ کوئی میرا پیچھا کر رہا ہے۔ اور دو دن سے مجھے شک ہو رہا ہے کہ جب میں بکارِ سرکار گھر سے باہر جاتا ہوں تو کوئی نامعلوم شخص میرے خاص کمرے کی تلاشی لیتا ہے۔ چنانچہ یہ دیکھیے وہ ٹائم پیس میں نے جاتے وقت اُس چھوٹے ٹیبل پر رکھدی تھی، لیکن واپسی پر وہ مجھے اس لوہے کی تجوری پر پڑی ہوئی ملی، اور ابھی تک وہیں رکھی ہے۔ میں سخت حیران ہوں، کوئی چیز چوری بھی نہیں جاتی۔ پھر اس بے فائدہ تلاشی کا کیا مطلب؟ میں نے احتیاطاً کسی چیز کو ہاتھ نہیں لگایا کہ آپکی تفتیش مکمل ہوسکے۔"

"گھر میں کتنے لوگ رہتے ہیں؟" انسپکٹر نے جو گہری خاموشی سے پروفیسر کا بیان سُن رہا تھا، پوچھا۔

"صرف میں اور وفادار بوڑھا شہباز۔" پروفیسر نے جواب دیا۔

"شہباز کو بلائیے" پروفیسر نے شہباز کو آواز دی۔ بوڑھا نوکر کمرے میں داخل ہوا۔ فیروز پر نظر پڑتے ہی اس کے چہرے کا رنگ زرد ہوگیا اور سراسیمگی و پریشانی برسنے لگی۔ فیروز نے اُسے سر سے پیروں تک گھُور کے دیکھا۔ شہباز سر جھکائے بدحواسی کے عالم میں کھڑا ہوا لرزہ براندام ہو رہا تھا۔ بڑی دیر کے بعد فیروز نے اپنی عقابی تجسس آنکھیں اسکے چہرے سے ہٹاتے ہوئے کہا "اب تم جاسکتے ہو۔"

شہباز کے واپس جاتے ہی فیروز، پروفیسر سے مخاطب ہوا "آپ کا اسکے متعلق کیا خیال ہے؟"

"آہ بوڑھا شہباز۔ وہ میرا خاندانی نوکر ہے۔ نہایت وفادار اور نمک حلال۔" پروفیسر نے شہباز کی وفاداریوں کے قصے چھیڑ دیے لیکن فیروز اٹھ کھڑا ہوا۔ اور اس نے خاص کمرے کا معائنہ شروع کردیا۔ ایک طرف لوہے کا ایک پلنگ تھا جس پر پروفیسر کا مکلف بستر لگا ہوا تھا۔ پلنگ کے سرہانے لوہے کی بڑی سی تجوری جو وزن میں کم از کم سات من ہوگی، پلنگ کے دہنے بازو پر ایک ٹیبل جس پر قلم دوات، ڈائری اور خط لکھنے کے منقش کاغذ، ٹیبل کے آگے کچھ دور پر چار آبنوسی کرسیاں جن پر ریشمی گدے پڑے ہوئے تھے اور کرسیوں کے بیچ میں چار پہیئے کا ٹیبل۔ زمین پر رُوئی قالین کا فرش جس پر پیر دھنستے تھے۔ اس ٹیبل سے کچھ آگے بڑھ کر وہ دروازہ تھا جو باہر کھلتا تھا اور جس سے ہو کر ابھی فیروز داخل ہوا تھا۔ دروازہ کے متصل دیوار سے لگی ہوئی ایک لمبی الماری تھی جس میں مختلف کتابیں خوشنما جلدوں کی رکھی تھیں کمرے میں دو کھڑکیاں تھیں جن میں لوہے کی سلاخیں لگی ہوئی تھیں۔ دو سلاخوں کے درمیان ایک فٹ سے کچھ ہی زیادہ فاصلہ تھا، سلاخیں زیادہ سے زیادہ ایک ڈیڑھ گز لمبی ہوں گی۔

یہ گمان بھی نہ ہوسکتا تھا کہ کوئی ان سلاخوں سے گذر کر کمرے کے اندر آسکتا ہے۔ پروفیسر کے بیان کے مطابق کنجی اس کمرے کی صرف ایک تھی جو ہمیشہ پروفیسر کے پاس رہتی تھی۔

"ممکن ہے کہ صرف آپکا وہم ہو" فیروز نے اس معمہ کا کوئی حل نہ پاتے ہوئے کہا۔ "کمرہ ہر چہار طرف سے محفوظ ہے باہر والے قفل کو میں نے بغور آتشی شیشہ سے دیکھا لیکن کہیں سے یہ ثابت نہیں ہوتا کہ اسے دوسری کنجی سے پھیرا گیا ہے، کوئی دوسرا راستہ اندر داخل ہونے کا نہیں ہے۔"

پروفیسر خاموشی سے اپنی آنکھیں تجوری پر جمائے بیٹھا تھا فیروز نے سلسلہ گفتگو جاری رکھتے ہوئے کہا "تو آیئے اب تجوری کھول کر دیکھیں کہ آپکی پس اندازہ رقم محفوظ ہے یا نہیں۔"

پروفیسر نے تجوری کی کنجی نکالی اور نیچے بیٹھ کر تجوری کھولنے لگا۔ فیروز اس کے اوپر جھکا ہوا تجوری کے کھلنے کا انتظار کرنے لگا کہ تجوری کا پرلا حصہ ایک زوردار آواز کے ساتھ اوپر اٹھا۔ پروفیسر نے جھک کر پہلا خانہ دیکھا اور بدحواس ہو کر پیچھے ہٹا۔

تجوری کے پہلے خانے میں ایک سفید ملاقاتی کارڈ رکھا ہوا تھا جس پر مندرجہ ذیل الفاظ چھپے ہوئے تھے۔

"دلائی لاما"

پروفیسر زرد بیجان لاش کی طرح فیروز کے سہارے اس کارڈ کو سہمی نگاہوں سے دیکھ رہا تھا۔ "اس کارڈ کے کیا معنی؟" بالآخر فیروز نے سوال کیا۔ "خدا ہی بہتر جانتا ہے۔" پروفیسر نے لرزتی ہوئی آواز میں کہا۔ "میں دلائی لاما کو جانتا تک نہیں، اس کا ملاقاتی کارڈ میری تجوری میں ملنا از حد حیرت انگیز ہے۔"

"بہر کیف یہ بات تو طے ہو گئی۔" فیروز نے فیصلہ کن لہجے میں کہا "کہ آپکے روپے چوری ہو گئے اور چور کوئی شخص دلائی لاما ہے، کتنی رقم تھی یہاں؟"

"پچیس ہزار، نوٹوں میں۔" پروفیسر نے کانپتی ہوئی آواز سے کہا۔ "لیکن یہ رقم تجوری کے پہلے خانے میں نہیں تھی۔ میں تیسرے خانے میں دیکھ لوں جہاں میں نے نوٹ رکھے تھے۔"

دونوں پھر تجوری پاس پہنچے۔ پروفیسر نے دوسرا، پھر تیسرا خانہ کھولا۔ اور نوٹوں کی گڈی دونوں ہاتھ سے اٹھا کر فیروز کے حوالے کی ——— "یہ تو پورے پچیس ہزار ہیں۔"

فیروز گھبرا کر بولا "تو گویا آنے والے نے ایک پیسہ بھی نہ چرایا تو پھر وہ آیا کیوں تھا، اور تعجب پر تعجب یہ کہ اپنا ملاقاتی کارڈ کیوں چھوڑ گیا؟"

"میرے تو اوسان خطا ہوئے جا رہے ہیں۔" پروفیسر کے چہرے سے اختلاج ٹپکنے لگا۔

تھوڑی دیر تک دونوں گم سم بیٹھے رہے۔ بالآخر فیروز نے کہا "معاملہ میرے ہاتھوں سپرد کر دیجئے۔ آپ کی حفاظت کیلئے میں دو مسلح کانسٹبل متعین کئے دیتا ہوں آپ اپنے کمرہ خاص سے باہر سوائے کار ضروری نہ جائیں، اور ذرا سا شک محسوس ہوتے ہی بے تکلف مجھے فون کریں۔"

حیرت زدہ پروفیسر سے ہاتھ ملا کر فیروز اپنی موٹر پر روانہ ہو گیا۔

دوسرا باب

پُراسرار واردات

"کیوں شمشاد" فیروز نے مجھ سے پوچھا "تمہارا اس معاملہ کے متعلق کیا خیال ہے؟" "واقعہ از حد حیرت انگیز اور بعید از فہم ہے۔" میں نے تسلیم کیا

میں اور فیروز اسکول کے ساتھی تھے۔ قسمت نے یاوری کی تو فیروز انسپکٹر خفیہ پولیس ہو گیا، اور قسمت ناسازگار رہی تو میں "اخبار حقیقت" کا نامہ نگار بن گیا

لیکن ہمارے دوستانہ تعلقات اور باہمی مراسم بدستور سابق قایم تھے۔ نامہ نگاری میں مجھے فیروز سے بڑی مدد ملتی۔ وہ خبریں جو دوسرے اخباروں کو دو روز کے بعد ملتیں، مجھے قبل ہی مل جاتیں اور اس وجہ سے اخبار "حقیقت" (روزانہ) دن دونی رات چوگنی ترقی کر رہا تھا۔ رات کے ساڑھے آٹھ بج رہے تھے۔ فیروز نے پروفیسر کی داستان کے دُہرانے کے بعد میری رائے طلب کی تھی۔

"ضرور اسکی تہ میں کوئی گہرا راز ہے" فیروز بولا۔ "اور میرا خیال ہے کہ خود پروفیسر کسی وجہ سے اس راز کو چھپانا چاہتا ہے"۔ ۔ ۔ ۔ ٹن ٹن۔ ٹن۔ ٹن۔

فیروز نے ٹیلیفون کا ریسیور اُٹھا لیا۔

"ہلو۔ ۔ ۔ کون پروفیسر رشید؟ مزاج تو اچھے ہیں؟ ۔ ۔ ۔ یہ کیا فرماتے ہیں آپ ۔ ۔ ۔ ۔ ۔ ۔ آپکو کیسے یقین ہو گیا کہ آج آپ ضرور قتل کر دیئے جائیں گے؟ ۔ ۔ ۔ پھر کہیے ۔ ۔ ۔ ہاں اب میں سمجھ گیا۔ ۔ ۔ یہی نہ کہ تجوری کی کنجی کتابوں کی الماری کے تیسرے خانے میں دسویں گیارہویں کتاب کے بیچوں بیچ ایک لفافہ میں رکھی ہے، جس میں آپ نے میرے نام ایک خط لکھ چھوڑا ہے۔ ۔ ۔ ہاں ہاں۔ یہ کیا کہا؟ ۔ ۔ ۔ ولائی لاما ۔ ۔ ۔ ٹیلیفون کے زمین پر یک بیک گر جانے کی آواز کے ساتھ ساتھ انسانی بدن کے ٹیبل سے ٹکرانے کی آواز فیروز کے کانوں میں آئی اور سلسلۂ گفتگو منقطع ہو گیا۔

سراسیمہ و پریشان فیروز دوڑتا ہوا کوتوالی سے باہر نکلا۔ حسن اتفاق سے ایک ٹیکسی خالی جاتی ہوئی مل جسے روک کر ہم اور فیروز بیٹھ گئے۔ "آغا میر کی ڈیوڑھی سے آگے جلدی چلو۔ ۔ ۔ ۔ اور رفتار تیز کر دو" پندرہ منٹ کے اندر ٹیکسی پروفیسر کے خوشنما بنگلے پر کھڑی ہو گئی۔ دو مسلح کانسٹبل خاص کمرے کے دروازے کو جو اندر سے مقفل تھا اپنی بندوقوں کے کندوں سے توڑنے کی کوشش کر رہے تھے۔ ہمارے پہنچتے پہنچتے ایک کواڑ اڑاڑا دھم کر کے زمین پر آ گرا۔ اور ہم کانسٹبل کو باہر رہنے کا حکم دیتے ہوئے کمرے کے اندر داخل ہوئے۔

آہ بدنصیب پروفیسر ٹیلیفون کے آلے کے پاس قالین پر اوندھا پڑا ہوا تھا، اس کی پشت پر ایک گہرا زخم جس سے تازہ خون جاری تھا پہلے ہی نظر میں ہمیں نظر آ گیا۔ کمرہ خون سے سرابور تھا۔ فیروز نے جاتے ہی پروفیسر کی نبض پر ہاتھ رکھا۔

"آہ بدنصیب پروفیسر" فیروز یاس انگیز لہجہ میں بولا "مر گیا غریب"۔ ایک کانسٹبل کو سول سرجن کو بلانے کی ہدایت کر کے فیروز اور ہم کرسی پر بیٹھ کر ڈاکٹر کا انتظار کرنے لگے۔

صاحب سول سرجن تھوڑی دیر بعد تشریف لائے۔ کمرے کے اندر لاش کا معائنہ کرنے کے بعد انہوں نے رائے دی کہ پروفیسر کو مرے ہوئے آدھ گھنٹہ ہو چکا، اور گہرا زخم کسی مہلک ہتھیار اغلباً بہت تیز چھرے سے لگایا گیا ہے۔ صاحب سول سرجن تو معائنہ کے بعد چلتے ہوئے۔ فیروز نے اُٹھ کر کواڑ بند کر لیے۔

ناقابل حل سوال یہ تھا کہ قاتل کمرے کے اندر کیسے داخل ہوا؟ دروازہ اندر سے مقفل تھا۔ باہر دو مسلح کانسٹبل موجود تھے۔ کھڑکیوں سے کسی انسان کا داخل ہونا امر محال تھا۔ تو پھر قتل کس طرح ہوا؟ قاتل کہاں سے آیا اور کہاں غائب ہو گیا؟

"بہت ہی پراسرار قسم کا واقعہ ہے" فیروز نے کہا

D NO P. 294 REGD NO P. 294

پھولوں ڈالی

قومی، اخلاقی اور اسلامی نظموں، رُباعیات، قطعات ... اور گیتوں کا دلگداز اور ولولہ انگیز گلدستہ

جسے

خان بہادر خواجہ عزیز محسن خانصاحب غوری انسپکٹر آف اسکولس یو-پی نے شعرائے قدیم و شعرائے حال سے سجایا

انتخاب میں ایسے اشعار لیے ہیں کہ جن کا ایک ایک لفظ تیر و نشتر ہے۔ حمد، مناجات، نعت، اخلاق، عبرت نصائح اور درسِ عمل، حبّ وطن اور محبت وغیرہ عنوانات کے تحت میں موثر اور مقبول کلام جسے چھوٹے بڑے عام طور پر پسند کرتے ہیں۔

بچے اس بابرکت مجموعہ کو اپنے بزرگوں کی خدمت میں ہدیۃً پیش کرتے ہیں۔ اور بوڑھے اپنے ان کے اخلاق سنوارنے کے لئے تحفۃً دیتے ہیں۔ آپ بھی اپنے دوستوں کے بچوں کو تحفۃً دیجئے۔ محکمۂ تعلیم یو-پی نے کئی ہزار جلدیں لائبریریوں کے لئے خرید کی ہیں۔ صرف تھوڑی جلدیں بچ رہی ہیں جو ہاتھوں ہاتھ نکل رہی ہیں۔ آپ دیر نہ لگایئے۔ کاغذ لکھائی عمدہ، ٹائیٹل سہ رنگا۔ حجم ۳۵۰

قیمت ایک روپیہ آٹھ آنہ (عہ) مجلد دو روپے (عـ)

ملنے کا پتہ

صدیق بک ڈپو۔ لکھنؤ

سید جلیل امام پرنٹر و پبلشر نے
شمسی پریس محلہ گھسیار لولہ شہر گیا میں چھپوا کر دفتر رسالہ ندیم حسنین منزل انکس سے شائع کیا